مطالب الفرقان

فی

دروس القرآن

قرآن مجید کی [illegible]

سورۃ [illegible]

[illegible]

زیرنگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، [illegible]

Marfat.com

Marfat.com

مطالب الفرقان

فی

دروس القرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

سورۃ بنی اسرائیل

پرویز

زیرنگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب الفرقان فی دروس القرآن
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویزh
ناشر	....	بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور
زیرِ اہتمام	....	ادارہ طلوعِ اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	اپریل 2004ء
مطبع	....	معراج پریس، لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

میں نے سورۃ بنی اسرائیل کے ایک ایک حرف
کو پوری ذمہ داری کے ساتھ بغور پڑھا ہے
میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس کے متن میں
کوئی کمی بیشی اور الفاظ یا اعراب کی کوئی
غلطی نہیں ہے

حافظ برکت علی

حافظ برکت علی
قرآن شریف محکمہ اوقاف
گورنمنٹ آف پنجاب لاہور
رجسٹرڈ
پروف
ریڈر

Marfat.com

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینیؑ انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر

بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز ؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء)

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں
میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے
والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ھدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

[محمد اشرف ظفر]

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

مطالب الفرقان فی دروس القرآن

پیش لفظ

پہلا باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 1

مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا عظیم مقصد 24

داعیٔ انقلاب کے مشن کی اہمیت 25

یہ تو ایک ایک ذرہ اپنی اپنی جگہ گوہر تابدار تھا 26

مدینے پر کفار کی چڑھائی 26

دوسرا باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 1

مسجدِ حرام سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت 28

بیت المقدس سے آسمانوں تک جانے کا مروجہ تصور 28

قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں ہماری مروجہ بنیادی سوچ 29

تفسیر اور روایات کا باہمی ربط اور مرتبہ 29

نبی اکرم ﷺ کی جانب سے روایات کا کوئی مجموعہ نہیں ملا 29

احادیث کو اکٹھا کرنے کا پس منظر 30

روایات کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنے کا نتیجہ 31

تمام تفسیروں کی بنیاد امام طبری کی تفسیر ہے 31

واقعۂ معراج کے سلسلہ میں بیان کردہ تفسیر میں مطابقت 32

واقعۂ معراج کے متعلق مودودی صاحب کی ریڈیو پر تقریر 32

نبی اکرم ﷺ کا آسمانوں پر جانے سے قبل،
روایات کی رو سے آپ کا عملِ تطہیر 32

سفر کے لیے براق کی سواری کا ماجرا 33

اس سفر کی پہلی منزل مدینہ، دوسری طور سینا، تیسری بیت اللحم اور پھر بیت المقدس 33

کیا مسجد اقصیٰ سے مراد ہیکل سلیمانی ہے؟ 34

نبی اکرم ﷺ کی امامت میں ہیکل سلیمان کے اندر تمام
انبیاء کرام نے نماز ادا کی 35

نماز کے بعد سیڑھی کے ذریعے آسمانوں کے سفر کا آغاز ہوا 35

سدرۃ المنتہیٰ کے بعد خدا تعالیٰ سے ملاقات اور
روزوں وغیرہ کا تحفہ 36

بیت المقدس کے سلسلہ میں یہودیوں کا مطالبہ 37

مسجد اقصیٰ کے سلسلے میں مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین چپقلش کی حقیقت 37

حضور ﷺ کی بعثت سے پانچ سو سال قبل ہیکل کی تباہی 38

وہ بھی اور یہ بھی؟ 39

ایک سوال 39

یہ ہیں وہ تفاسیر جو بارہ سو سال سے دنیا کے سامنے پیش کی
جا رہی ہیں 40

Marfat.com

حضرت جبریل نے پتھر کے اندر اپنی انگلی سے سوراخ کیا 40
واقعہ معراج کی شہادت میں روایات 41
معراج کی رات ہیکل کا دروازہ بھی بند نہ ہو سکا 42
ہیکل یا مسجد کے وجود کے سلسلہ میں، یہ بھی ٹھیک اور وہ بھی ٹھیک 42
پرویز کا جرم 43
مسجد اقصیٰ کی اصل حقیقت 43
حضور ﷺ کے خلاف کفار کی سازش 43
مدینہ کا ایک نام مسجد اقصیٰ بھی تھا 44
ہجرت کا اصل مقصد 44
نام کے اس سلسلہ میں بڑی تلاش اور کامیابی 45
مملکت اسلامیہ میں مسجد کا مقام بلند 45
معراج کا اگلا حصہ 47
دنیائے علم ہمارے متعلق کیا سوچے گی 48

تیسرا باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 1 تا 5

شب معراج کے عقیدے کی حقیقت 51
خدا کی ذات مادی صفات سے ماوراء ہے 52
ہمارے ہاں بیان کی جانے والی سیرت رسول ﷺ 53
خدا کی طرف سے ملنے والی وحی کی خصوصیات 53
وحی کی روشنی میں رسول ﷺ خدا کی عظمت اور ہماری سوچ 54
قرآن حکیم ہر لحاظ سے قدم قدم پر منفرد کلام ہے 54
وحی کے سلسلہ میں حضور ﷺ کے متعلق ایک وضع کردہ عقیدہ 55
حضور ﷺ کے ساتھ جنگوں کے سلسلہ میں غیر مسلموں کے تاثرات 56
کائنات کے اس محیر العقول معجزہ کے سامنے ہر معجزہ ہیچ ہے 57
سیرت نبوی ﷺ کی عظمت کا راز: وحی کا اتباع 58
دنیائے انسانیت میں کیریکٹر کی بلند ترین خصوصیات کی حامل شخصیت 58
Cause اور Effect کا باہمی تعلق اور اس کی اہمیت 60
انسان کی عظمت کا انحصار اس کے Cause کے پیدا کرنے میں ہے 60
ذات خداوندی کسی Cause کی Effect نہیں 61
موت کے وقت اطمینان قلب کے لیے Cause بطور زادِ راہ ہوگا 61
مذہب کے خودساختہ تصورات کے تحت پیدا ہونے والے تصورات 61
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غلط عقیدت مندیوں کا نتیجہ 62
یہ حضور ﷺ کے آسمانوں پر جانے کا نہیں بلکہ ہجرت کا واقعہ ہے 63
تبلیغ ہمیشہ گھر سے شروع کرنی چاہیے 63
حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت 64
چٹان کے اوپر نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہِ بصیرت 65
مدینہ کا ایک نام مسجد اقصیٰ بھی تھا 65
فرعون کے سلسلہ میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابیوں کا ذکر اور حضورؐ کو فتح کی نوید 66
قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ، ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ 67
غلامی اور ملوکیت کا سب سے بڑا کارنامہ خود اعتمادی ختم کرنا ہے 68
حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی حالت 68
زندگی کی کامیابی کا راز خدا کی عبدیت اور راہنمائی میں مضمر ہے 69
داستانِ بنی اسرائیل کا عروج و زوال 70
فساد کا مفہوم 70
۱۹۶۵ء کی جنگ کے شہیدوں کو لاکھوں سلام 71
قوموں کی تقدیر اور عصمتوں کی حفاظت تغیر نفس پر موقوف ہے 71
بنی اسرائیل کے متعلق تاریخی شہادت 72
ایک صدی کے بعد پھر وہی ظلم و ستم 73
خدا کے وعدہ کے معنی قانونِ خداوندی کے مطابق ظہور نتائج کے ہوتے ہیں 74

چوتھا باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 6 تا 15

انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے تمام صحف کا نام تورات ہے 76
بنی اسرائیل کی تنزلی کی داستان 76
اپنی اپنی معصیت کوشیوں کا نتیجہ 77
آغاز کار انسان کی طرف سے ہی ہوگا۔ جیسا راستہ ویسا نتیجہ 79
خدا کا صحیح تصور 79
یہ تو ابھی انسانی زندگی کے سفر کا آغاز ہے 80
جہانِ فردا میں انسانی قوتِ احساس کی کیفیت بدرجہ اتم ہوگی 80
ہمارے ہاں جہنم کا تصور 81
انسانی زندگی صلاحیتوں کے توازن کا نام ہے 81
سیکولرزم نظریے کا ماحصل 83
پیش پا افتادہ یا مفادِ عاجلہ کا نتیجہ 85
قرآن حکیم کے نزدیک عقل انسانی کے لیے نفع ونقصان کے پیمانے 86
حقیقی نفع اور نقصان کا معیار مقرر کرنا انسانی عقل کے بس کی بات ہی نہیں 88
قرآنی اقدار سے جہالت اور مصائب و آلام کی تمام
تاریکیاں چھٹ جائیں گی 89
سود و زیاں کے پیمانے کی تلاش 90
رات کی تاریکی چھٹ گئی اور نورِ آفتاب جگمگا اٹھا 91
جہانِ فردا کا سرمایۂ حیات 91
ظہورِ نتائج کا وقت 92
سب سے بڑا جہنم 93
انسانی نفس کی دو سطحیں 9:
انسان کے اندر کی دنیا کے تاثرات کا نتیجہ 95
قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے 95
مومن کے نفس شعوری اور غیر شعوری میں تضاد نہیں ہوتا 96
یہ سب پروہتوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں 97

پانچواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 16 تا 22

قرآنِ حکیم کے موجودہ تراجم کا نتیجہ 98
قرآنِ حکیم کا ترجمہ نہیں ہوسکتا 99
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی بدلتی رہتی ہیں 99
زبان کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اعجاز 100
قرآنِ حکیم میں موضوعات کی تکرار کی وجہ 100
ان تراجم کا نتیجہ 101
قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان 101
لفظ اَمَرنا کا مفہوم 102
زوردروں کی بنا پر تباہی کی جانب بڑھتے جانا 102
دولت کی فراوانی کی تباہ کاریاں 103
دولت مند اکثر بیمار ہوتے ہیں 104
دنیا بھر کی تاریخ اس کی گواہ ہے 105
برطانیہ کی زبوں حالی کی مثال 105
قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل اصول 106
لوٹ مار ختم ہونے کے بعد محنت کی بجائے بھیک مانگنے کی عادت 106
دنیائے عرب میں ہی قرآن کا نزول کیوں؟ 107
قرآنی حقائق کے متعلق موجودہ تحقیق 108
فرعون کی لاش ممی کی شکل میں آج بھی محفوظ ہے 109
آخر کار قرآن کی تمام تاریخی شہادتیں سچ ثابت ہوں گی 109
ایک قوم دوسری قوم کو اپنی حفاظت کی خاطر دبا کر رکھتی ہے 110
اعمال کا نتیجہ تو جانور کی دم کی طرح پیچھے چپکا ہوا ہوتا ہے 111

Marfat.com

عمل کا نتیجہ ہمیشہ بعد میں نکلتا ہے 111
ایک اہم سوال اور اس کا جواب 112
یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے لیکن کیسے؟ 113
یہ راہنمائی صرف اور صرف قرآن حکیم میں ہی محفوظ ہے 114
طبعی قوانین ہر فرد کے لیے یکساں ہیں 114
قانون فطرت کا ہی دوسرا نام مشیتِ خداوندی یا خدا کا ارادہ ہے 115
انسانوں کے لیے خدا کا دوسرا قانون وحی کی عطا کردہ اقدار ہیں 115
جہاں بینی کے بجائے خود بینی کا انجام 115
جنت ابدی کا راز ابدی اصولوں کی اتباع میں ہی مضمر ہے 116
ہر آنے والا لمحہ اور ہر آنے والا وقت گزرے ہوئے وقت کی آخرت ہے 116
مومن اور کافر میں فرق؟ 117
مفاد عاجلہ کا نتیجہ ہی تباہی ہے 117
انسانوں میں تین قسم کی کیٹگری (Categories) ہوتی ہیں 118
صدیوں سے یورپ کی حالت پہلی کیٹگری کی تھی 118
دوسری کیٹگری (Category) 118
تیسری کیٹگری 119
فطرت کے قوانین کو نظر انداز کرنا بذاتِ خود جرم ہے 119
کائنات کی یہ نعمتیں 120
عطائے رب کے لیے رحم مادر میں بچے کی نشو ونما کی مثال 120
خدائے رحیم وکریم خالق ہی نہیں، رزاق بھی ہے 121
عطائے رب میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں 121
ربوبیت عالمینی کے آگے پھاٹک نہیں لگائے جا سکتے 122
حقیقی کبریائی مستقل اقدار کی پیروی میں ملے گی 120
متکبر کا مفہوم 123
کبریائی اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے 125
کوئی دوسرا الٰہ نہیں بنا لینا چاہیے 126
فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو اپنی خواہشات کے تابع صرف کرنے کا نتیجہ جہنم ہوگا 126
لفظ خذلا اور مخذول کا مفہوم 127
جماعتی زندگی کی ایک خوبصورت قرآنی مثال 127

چھٹا باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 23 تا 28

اہلِ مذہب تو ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی عائد ہی نہیں کرتے 128
قرآن کو سمجھنے کی بجائے ناظرہ پڑھ لینا بھی کارِ ثواب ہے 129
شرک سے پاک معیشت ہی دین ہے 130
اسلام کے مقابلے میں اسلام 130
قرآنی معاشرے میں کسی سٹیج پر بھی ذاتی ملکیت نہیں 131
ہر شخص کی ضروریات کس طرح پوری ہوں گی؟ 131
توازن کو بحال کرنا یعنی حسن کا بحال کرنا احسان کہلاتا ہے 133
احسان نہ تو بطور بوجھ ہے نہ بطور خیرات بلکہ یہ تو حسن کی بحالی کا نام ہے 134
انسان کا بچپن اور ماں کی مامتا کا اظہار 135
یہ تمام باتیں بطور وعظ نہیں بلکہ یہ قرآنی نظام کے پرزے ہیں، پہلو ہیں 135
پرورش کے سلسلہ میں رحمِ مادر کی کیفیت 137
مرغی اور اس کے چوزوں کی مثال 137
نفسیاتی تغیر کا بہترین علاج 138
خدا بھی کسی سے حکم کے ذریعے بات نہیں منواتا 140
قرآن کا اصل مقصد تو نفس کی تربیت ہے 140
یہ فریضہ ابھی ختم نہیں ہوا 141
ذا القربیٰ کا حق ہے نہ کہ خیرات 142

Marfat.com

سوال کے لفظ میں اور محروم کے لفظ میں فرق 143
ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے عقیدہ کی حقیقت 143
پورے قرآن میں صرف اسی ایک جگہ اللہ کے لیے حق کا لفظ آیا ہے 144
یہاں تو سوال پوری کی پوری انسانیت کا ہے 144
بیج کے لیے رکھے ہوئے دانوں کی قیمت 145
فلاحی ریاست (Welfare State) کی کامیابی کی کیفیت 145
جنت میں سب کچھ ہوتا ہے مگر طبقات نہیں ہوتے 146
جتنا زیادہ بیج کاشت ہوگا اس کے مطابق پھل ملے گا 146
عربوں کے ہاں اسراف کا لفظ کن معنوں میں استعمال ہوتا تھا؟ 146
ایک اور نفسیاتی کیفیت 148
باہمی معاملات سے بچنے کے لیے شرعی حیلے 148
قرآنی احکام کا اصل مقصد انسانی معاملات کو سنوارنا ہے 149
مذہب کی صلوٰۃ اور دین کی صلوٰۃ میں فرق 150
ملا کی اذان میں اور مجاہد کی اذان میں بڑا ہی فرق ہے 150

ساتواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 29 تا 33

کام صلاحیت کے مطابق اور دام ضرورت کے مطابق 152
کوئی حیوان اپنے ماں باپ کی پرورش نہیں کرتا 153
ہر گھر کو ایک یونٹ (Unit) کی شکل دی جائے گی 153
مکان (House) کی بجائے گھر (Home) کو برقرار رکھنا ہوگا 154
یورپ کی بربادی کی وجہ 154
قرآن تقلید نہیں سکھاتا بلکہ مستقل اقدار دیتا ہے 155
قرآن کے نزدیک سوال وطن کا نہیں، انسان کا ہے 155
اپنے ہاتھوں کو چھلنی نہ بننے دو اور نہ ہی درماندہ ہو جاؤ 155
مروجہ تراجم کی حالات زار 156
زمین وآسمان کے درمیان یہ تمام وسائل اور سامانِ رزق
قدرت کی طرف سے عطیہ ہے 157
وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت کا تصور قرآن کے خلاف ہے 158
قرآن کو چھوڑ دینے کا نتیجہ 158
ہر شخص اپنی محنت سے جتنا چاہے حاصل کر سکتا ہے 158
قرآن حکیم نے اولاد کی پرورش کے لیے ماں باپ کو کوئی حکم نہیں دیا 159
لڑکی اور لڑکی والوں کی حیثیت لڑکے والوں کے ہاں 159
دو تین لڑکیوں کے پیدا ہونے پر طلاقوں کی نوبت 160
قاتل کی بجائے معصوم سے پوچھا جائے گا 161
لڑکی کی پیدائش سے پہلے اس کے مقدر کا فیصلہ 161
خدائے علیم وخبیر ان مظلوم بیٹیوں سے پوچھے گا 162
قرآن حکیم کے نزدیک ''قتل'' کا مفہوم 162
پیسے بچانے کی خاطر تعلیم سے محروم رکھنا بھی قتل ہے 163
قرآنی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں عبوری دور کے انتظامات 163
اگر یہ کچھ نہیں ہے تو پھر وہاں اسلام نہیں ہے 164
یہ معاشرہ متشکل کس طرح ہوگا؟ اور قائم کیسے رہے گا؟ 164
ٹی وی پر فحاشی کے سلسلہ میں ہمارے دانشوروں کی سوچ اور کوشش 165
قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر اور
ڈاکٹر انون (J.D. Unwin) کی تحقیق 166
لفظ اثم کا مفہوم 167
جنسیاتی امراض میں مبتلا قوم کی حالت 167
فحش کے نتیجہ میں قوائے اقتصادی کے علاوہ
وسعتِ خیال بھی ختم ہو جاتی ہے 168
تنہائی کی حالت میں بھی کنٹرول کی وجہ 169

Marfat.com

اس شدت کے تحفظ کا علاج بہن بھائی کا تصور ہے 169
حلال وحرام کی حدود 170
حفاظتِ عصمت کا معاملہ نہ انفرادی 170
حرم اللہ کا مفہوم 171
انسانی جان کی قیمت 171
قتل کا بدلہ نظام لے گا، کوئی فرد نہیں 172
کسی قسم کے نقصان پر مدعا علیہ نظام حکومت ہوگا 173

آٹھواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 34 تا 38

قرآن کی پوری تعلیم اصول واساس پر مبنی ہوتی ہے 174
دین کی بنیاد ثبات اور تغیر کے امتزاج پر ہے 175
خیرات میں احترامِ انسانیت کی نفی ہو جاتی ہے 175
قرآنی معاشرے کی تیاری اور تشکیل کے مختلف پہلو 176
یتیم کا قرآنی مفہوم 177
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور اس کے لیے ایک مثال 177
یتیم سے بھی اگلا لفظ 178
اجتماعی زندگی کے قیام کا راز 179
انسانی نفسیات پر قرآن حکیم کی نگاہ 180
جب کوئی چیز واپس کرو تو معروف طریق سے کرو 181
آپ کے ہر عمل کا اکاؤنٹ ہوگا 181
امت کا مال یتیم کا مال ہوتا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول 181
عائلی قوانین (Family Laws) کی مخالفت کیوں؟ 182
نکاح کے لیے بلوغت کی کوئی شرط نہیں: ہمارے علمائے دین کا اجتماعی فتویٰ 182
وائسرائے ہند سے جناب مولانا محمد علی جوہر کا مطالبہ 183
۵۳ برس کی عمر میں چھ سال کی لڑکی عائشہؓ سے نکاح کے
سلسلہ میں بطور دلیل پیش کی جانے والی حدیث 184
باہمی طور پر پیش کیے جانے والے دلائل 184
روایات کی تاریخ 184
نکاح کی عمر کے سلسلہ میں تصریف آیات کی رو سے ثبوت 185
اصل بات: جواب دہی پر ایمان لازمی ہے 186
کسی بات کے صحیح ہونے کا پیمانہ صرف اقدارِ خداوندی ہیں 187
وعدہ کا ٹوٹنا دراصل پیمانے کا ٹوٹنا ہوتا ہے 188
ہم کیے گئے وعدوں کے متعلق پوچھیں گے 188
کیے گئے وعدے کے متعلق تم خدا سے بھی پوچھ سکتے ہو 189
کاروباری معاملات اور قرآن 190
لفظ تاویل کا قرآنی مفہوم 191
معاشرے میں اعتماد ہی کیوں باقی نہیں رہتا؟ 191
خدا سے ابلیس کا مطالبہ 192
مذہبی پیشوائیت کے ذرائع ابلاغ کا اثر اور اُن کے نتائج 193
کاروباری دنیا کے پروپیگنڈے پر اربوں پونڈ کا خرچہ 194
اس بیماری کا شافی علاج یہ ہے کہ تحقیق کیے بغیر کسی کے پیچھے مت لگو 194
سننے اور دیکھنے کے بعد عقل وفکر سے کام لینا بھی ضروری ہے 195
عدمِ اعتماد سے عدمِ سکون پیدا ہوتا ہے 195
یہ چھوٹے چھوٹے احکام بڑی بڑی خرابیوں کا ازالہ کر دیتے ہیں 196
فخر کا قرآنی مفہوم 196
تعمیری کام کیے بغیر تعریف کی خواہش 197
اس طرح اکڑ اکڑ کے چلنے والے 197

نواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 39 تا 41

قرآنی نظام مکان (House) کو ہمیشہ گھر (Home)

Marfat.com

میں تبدیل کردیتا ہے 198
ذی القربیٰ کا قرآنی مفہوم 199
راہگیر، مسافر، پورے گاؤں کا مہمان ہوتا تھا 200
اولاد کی تربیت ایسی کرو کہ نسلِ انسانی میں قابلِ فکر ہو 200
معاشرے میں اکڑ کر چلنے کی بجائے شجرِ ثمر بار کی طرح ہو جاؤ 201
کبھی غلط بیج کی کاشت نہ کرو، سب کچھ ضائع ہو جائے گا 201
قدرت کی طرف سے قوانین ملنے کا مقصد اچھے نتائج کا حصول ہے 202
خدا تعالیٰ نے اسی لیے قانون کے ساتھ حکمت کو بھی نازل کیا ہے 202
دین کے اور مذہب کے پیمانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے 203
نماز کی قبولیت کا پیمانہ حکمت ہے 203
اعمال صالح کا نتیجہ زمین پر تمکن ہے، استخلاف فی الارض ہے 204
اعمال صالح کا محسوس نتیجہ: کوئی قوم تم پر حکمرانی نہیں کر سکے گی 204
مذہب کی دنیا انسان کو ہمیشہ خود فریبی میں مبتلا رکھتی ہے 205
یہ سارے ہتھکنڈے خود کو فریب دینے کے لیے ہیں 206
ہم واپس اہلِ کتاب کی سطح پر آ پہنچے ہیں 206
وحی کی دو قسموں والا عقیدہ 206
مودودی صاحب کا فرمان کہ وحی کا 9/10 حصہ قرآن سے باہر ہے 207
گاڑی کا کانٹا اگر بدل جائے تو پھر منزل بدل جاتی ہے 208
یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے فرمودہ احکام کے برعکس ہے 209
قرآن تو ایک ایک لفظ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے، تاکید کرتا ہے 209
دنیائے انسانیت کا وقار اور مقام صرف فکرِ قرآنی سے وابستہ ہے 210
مسلمانوں کی کہانی مسلمانوں کی زبانی 210
مندروں کے منتری ہوں یا قبروں کے مجاور یا متولی یا گرجوں
کے پادری، ان سب کی سوچ کا پیکر ایک ہی ہوتا ہے 212
فقہی مسائل کے تحت مذہبی پیشوائیت کی الگ سلطنت کا وجود 212
مرد کے ذہن میں مقامِ عورت 213
ایک بیٹے کو بھی ماننے سے انکار کر دیا [illegible]
قرآن حکیم کی تکرار انسان کو بور نہیں کرتی 214
کوئی انشاء پرداز قیامت تک قرآنِ حکیم کے اندازِ بیان کا متبادل 215
کچھ تبویب القرآن کے متعلق 216
اس ذکر کے دوران یہ بندہ بھی ہارٹ فیل ہونے سے بمشکل بچا تھا 216
نزولِ قرآن کے وقت ایران اور روم کی تہذیبوں سے
ٹکراؤ اور ردِ عمل 217

دسواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 42 تا 52

خدا کے علاوہ اگر مزید قوتیں ہوتیں تو کائناتی کنٹرول تباہ ہو جاتا 219
لفظ کبریائی کا مفہوم 2
اجرامِ فلکی کی حقیقت 220
تسبیح کا قرآنی مفہوم 221
السبح کا لغوی معنی 222
خدا تعالیٰ نے کوئی شے شر اور بیکار پیدا نہیں کی 222
جنوبی امریکہ میں ایک خاص ضرورت کے تحت بھڑوں کی برآمد 223
مجھے سانپ کے زہر سے زندگی ملی 224
کائنات کے ہر ذرّے اور ہر شے پر، بڑی حلیمی کے ساتھ، 224
غفور بننے کے لیے حلیمی، تفکر، وحدت اور استقامت 225
قرآن کی طرف آنے کے لیے خالی الذہن ہونا اشد ضروری ہے 226
نفرت کا پردہ ہی حجابِ مستور ہوتا ہے 226
مومن کی ایک اہم خصوصیت 227
قرآن کا مطالبہ 227

نفرت اور اندھی تقلید دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے 227
اکثر انسانوں کو خدائے واحد کا نام راس نہیں آتا 229
کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرنے والے ہی کافر ہیں 230
اوپر خدا کا نام اور نیچے سارے انسانوں کے نام 230
خدا کے ساتھ دوسروں کو کیسے ملایا جاتا ہے؟ 231
اصل بات تو وہ ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو 231
مجلس سے باہر کی کیفیت 232
قرآن کی بات اگر دلائل و براہین سے کی جائے
تو پھر وہ تو چپک جاتی ہے 232
آپ پر جادو ہونے کے سلسلہ میں بخاری کی تفصیل
اور قرآن کی تردید 232
جادو کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی تفسیر 233
اس سلسلہ میں قرآن کا اپنا بیان 233
منافقانہ ذہن (Mind) رکھنے والوں کو کوئی صراط مستقیم نہیں دکھا سکتا 234
تعلیم یافتہ نوجوان کا اعتراض 234
موت کے بعد زندگی کے متعلق قرآن کا بیان 235
علت و معلول کا قانون اور حالت معدوم (Nothingness) 236
انشقاق (Disintegration) سے تکون و تکمل
(Integration)
قدرت نے آئن سٹائن (1879-1955) اور دہقان
کو ایک مقام پر لا کھڑا کیا 237
یہ ساری کائنات علت و معلوم کا ہی ماحصل نہیں 238
اس زندگی کے بعد کی زندگی حیات نو ہوگی، خلق جدید ہوگی 238
ایک غلط فہمی کا ازالہ 238

نبی اکرم کا اس قدر نامساعد فضا اور ناگفتہ بہ حالات میں
حیاتِ نو کی طرف آغازِ سفر 239
نبی اکرم ﷺ کے خطوط ایران اور رومن ایمپائر کے نام 240
ہجرت کا یہ واقعہ ایک پروگرام کے تابع ہوا تھا 240
ایران کی ہزار سالہ اور رومن کی صدیوں پر پھیلی ہسٹری 241

گیارہواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 53 تا 60

پرستش اور عبادت میں بنیادی فرق ہے 243
ہماری عبادت گاہوں کی اصلیت اور باہر کی زندگی 243
اصل میں احسن، حسن یا حسین کا لفظ متوازن اعتدال
کے معنوں میں 244
زبان دانی کے سلسلہ میں اقبالؒ کا احسان 244
شیطان کا عمل، بات کرنے کا انداز 245
نصیحت اور سوئی چبھونے کا مفہوم 246
معاشرے کی خوبصورت عمارت انہی اصولوں پر استوار ہوتی ہے 246
قرآن کی ایک امتیازی بات 247
زندگی بڑی خوبصورت نعمت ہے 247
کشف والہام خدا کی طرف سے ملنے والی بات نہیں 248
کشف والہام اور وحی میں بنیادی فرق ہوتا ہے 248
دنیائے عرب میں انبیاء کی بعثت 248
انبیائے کرام کے درجات میں فرق پیدا کرنے کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں 250
نفع اور نقصان کی مالک صرف ذاتِ خداوندی ہے 251
خدا کے قانون کی ایک مثال 251
کوئی چیز نہ خیر ہے نہ شر، بات صرف اس کے استعمال کی ہے 251
خدا تعالیٰ کسی کو بھی وسیلوں کے چکروں میں نہیں ڈالتا 252

یہ حضرت صاحب تو خود خدا کے قرب کے متلاشی ہیں 253
خدا اپنے درمیان کسی کو بھی حائل نہیں ہونے دیتا 254
خدا کی طرف سے پکار کا جواب اس کا عطا کردہ ضابطہ حیات ہے 254
قرآن حکیم کو سمجھنے کی مثال قرآن کے ہی آئینہ میں 255
قرآن حکیم کی تعلیم کو ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم واضح کرتا ہے 256
ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کا نتیجہ 256
قوموں کی موت وحیات کے لیے نظامِ قدرت کا ترازو 256
اندلس کے بعد سقوط ڈھاکہ کی مثال 257
فطرت کی تعزیرات میں انقلابی مسرت کا پہلو 257
مسلمانوں کے تحت الشعور میں اسلام کا جذبہ 258
کوئی قوم قدرت کی طرف سے وارننگ کے بغیر تباہ نہیں ہوتی 259
کیا کرامتوں سے ڈوبتی ہوئی قوموں کا علاج ممکن ہے؟ 259
صلاح الدین ایوبی کا عمل اور رچرڈ کی شمشیرزنی 260
انکار کی اصل وجہ اپنے خودساختہ نظام کا تحفظ ہے 261
پندارِ نفس اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا معاملہ 261
نظامِ سرمایہ داری کی نظر میں غریبوں کی محتاجی سے بچنے کا حل 262
نبی اکرم ﷺ کی ہجرت اور مکہ کی اہمیت وحیثیت آپ کی نظر میں 263
رسول ﷺ خدا کی آخری آرزو اور اس کی تکمیل 263
نبی اکرم ﷺ کا خواب 263
غلط جذبات انسان کو اعصابی طور پر تباہ کر دیتے ہیں 264
ذلت کی شکست کا تمثیلی بیان 265
شکست خوردہ قوم کے لیے غلامی کی روٹی 265

بارھواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 61 تا 65

انسانی پیدائش کی ابتداء اور تورات کا بیان 267
انسان کی علمی سطح کی کیفیت 268
ہماری سوچ پر وضعی روایات کا اثر 268
وضعی روایات کی روشنی میں پہلی لکھی جانے والی تفسیر طبری اور ہم 268
قصہ ابلیس وآدم اور قرآن 269
علم نفسیات (Psycholgy) اور قرآن کا باہمی ربط 270
قرآن کا اعلان: کائنات کی تمام قوتیں (ملائکہ) 271
عربی زبان میں الا کا استعمال 271
طین اور طینت کا معنیٰ 272
انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی 272
انسان کے پست جذبات کا نتیجہ 274
کوتل گھوڑے کی شان کے بالمقابل، ایک کبھی دیئے ہوئے ٹٹو کا مقام 274
انسان اور حیوان میں فرق صرف غیرت کا ہوتا ہے 275
جہنم جہاں انسانیت جلا دی جاتی ہے 275
صرف آواز کا حربہ 276
شعبۂ تعلیم اور ابلیس کی کارفرمائی 277
ابلیس کے ان حربوں سے کیونکر بچا جا سکتا ہے 277
انسانی زندگی میں ایک دوسرا انقلاب 278
عیسائیت کا تصورِ حیات 278
عیسائیت کے عقیدے کی بنا پر انسان مجبور قرار پا گیا 278
یورپ کے سائنسدانوں کا عیسائیت سے چھٹکارا 279
ڈارون سے مارکس تک انسانی سوچ کا ماحصل 281
قرآن کا ایک بصیرت افروز انقلابی اعلان 281
ابلیس کا اپنی غلطی سے انکار اور آدم کا اعتراف 281
قرآن کی تعلیم کے برعکس سائنس اور مذہب دونوں نے

انسان کو مجبور قرار دیا 282
قصۂ آدم انسانی نفسیات کا ہی ترجمان ہے 283
سرکشی کا نتیجہ مایوسی اور مایوسی کی انتہائی خودکشی 283
معقول جواب کا فقدان اور بہانہ سازی 284
مسئلہ تقدیر اقبالؒ کی نظر میں 285
زندگی کے معاملات میں انکار سے پہلے کی کیفیت 286
اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دینا شیطان کا عمل ہے 287
انسانی نفسیات پر ایک فرام کی تحقیق 287
اگر باطل کا نتیجہ ہمیشہ تخریب ہوتا ہے تو پھر تخریب ہمیشہ مایوسی کو جنم دیتی ہے 288
قرآن کے ایک فقرے نے زندگی کی بساط اُلٹ دی ہے 289
ابلیس و آدم کی کشمکش کی اہمیت 290

تیرھواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 66 تا 75

بلند اقدار اور انسان کے پست جذبات کی کشمکش 292
توکل کا قرآنی مفہوم اور ہمارا عمل 292
ابلیس کا اپنے شاگردوں کے لیے پروگرام 293
توکل کے سلسلہ میں خدا کے قانون کی ایک محسوس مثال 294
تدابیر کی انسانی کامیابی کا راز قانون خداوندی میں مضمر ہے 295
غلط معاشرے کی تباہی صحراؤں کی آندھی کی مانند ہوا کرتی ہے 296
سفر زندگی میں ہر آن قانون خداوندی کی نگہداشت 297
آج کی دیکھ بھال کل کی حفاظت کی ضامن ہے 298
انسان کا طبعی شعبہ ہو یا انسانیت کا، دونوں قوانین
خداوندی کے محتاج ہیں 298
بنیادی حقوقِ انسانیت 299
ہر انسان کے مدارج کا تعین اس کے اعمال کے مطابق 299
قابلِ نفرت بنانا مجرم کا جرم ہوتا ہے، انسان قابلِ نفرت نہیں ہوتا 300
صرف انسان ہی اشرف المخلوقات نہیں 300
قرآن نے کہا ہے کہ اجرامِ فلکی میں بھی متنفس ہیں 301
خدا تعالیٰ نے تو اس کائنات میں لاکھوں ملک اور
اربوں شہر آباد کر رکھے ہیں 301
موجودہ ہیتِ انسانی کی فضیلت کے بعد کی رفعتیں اور وسعتیں 301
عربی میں لفظ امام کا مفہوم اور عمل کی اہمیت 302
انسان کا اعمال نامہ ہی اس کا امام ہوگا 303
قرآن کے نزدیک قوموں کا باہمی فرق 304
انسانیت سے متعلق قوانینِ خداوندی کے انکار کا نتیجہ 305
دوسری قسم کی قوم 305
تیسرے درجے کی قوم 305
ان تین اقسام کی مزید وضاحت 306
دنیا بھر کا مسلمان یہودیوں کے شکنجے میں 306
مسجد اقصیٰ کے جلا دینے کا اقصیٰ ڈے 307
خود فریبی کی انتہا 307
قانونِ خداوندی کے اندر مصالحت کا، لچک کا، مفاہمت کا نتیجہ 308
پاکستان میں دین کے نام پر فریب دہی 309
اصول پرستی کے مقابلے میں حکمت عملی 310
نبی اکرم ﷺ پر بہتان (معاذ اللہ) 310
میں کون ہوں کہ جو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی کروں 311
اسلامی حکومت کا آئین انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہوتا 312
دین میں Compromise مفاہمت شرک ہے 312
قرآن کے اصول پر جم کر کھڑے ہونے کا نتیجہ ثبات ہے 313

قرآنی اصولوں کو بتدریج نازل کرنے میں حکمت 313
کلمہ طیبہ کا مفہوم 314
رسول کو عام لوگوں سے دگنی سزا 315
چودھواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 76 تا 81
حق کی تعریف 317
اس تمام تر مزاحم کی وجہ مذہب نہیں' دین تھا 318
ہجرت کا مفہوم 318
ذاتی مفاد پرستی کے بالمقابل نوع انسانی کی منفعت کا نظام 319
کفار کی آئے دن مدینے پہ یورش کی وجہ 320
پروگرام کی تکمیل کے لیے اور زیادہ سرگرمِ عمل ہونے کی تاکید 320
قرآن پر غور وفکر کے لیے صبح اٹھنے کی تاکید کی ہے 321
استغفار کا قرآنی مفہوم 322
زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن سے راہنمائی لینا ہوگی 323
تسبیح کا مروجہ تصور اسلام میں ہے ہی نہیں 323
اہلِ قرآن کے فرقے کا ردِ عمل 324
اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود متعین کرنا ہوں گی 324
جزئیات کے سلسلہ میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی ناکام کوشش 325
قرآن کو سب سے زیادہ نقصان' اہلِ قرآن نے پہنچایا 326
نماز کے بعد حلال وحرام کا قصہ 326
قرآن وہ کتاب مبین ہے کہ جس میں کوئی تضاد نہیں 327
قرآن یہاں تو نظامِ صلوٰۃ کی بات کرتا ہے 328
قرآنی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے صبح وشام سرگرم عمل رہو 328
میں نماز کا استحصال نہیں کر رہا 329
لفظ مزمل کا مفہوم 329
کجاوے میں بیٹھنے والی سواریوں کی خصوصیت 329
ہمارے ہاں عبادت کا مفہوم اور حضور اکرمؐ کی مصروف زندگی 331
امت کے باہمی مشورے کی اہمیت 332
یہ خلافت علیٰ منہاج رسالت کا ہی فریضہ ہوگا 332
اس وقت اسلامی مملکت کی غیر موجودی میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ 333
لاہور میں اردو میں نماز: ایک نیا فتنہ 334
قرآن کے الفاظ کا کوئی متبادل نہیں 334
میرے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا 334
تلاوت کا مفہوم قرآن کی پیروی کرنا ہے 336
اس پروگرام پر عمل کرنے کا نتیجہ مقامِ محمود ہوگا 336
حمد کا مفہوم 336
مملکت اسلامیہ کا سربراہ صفاتِ محمود کا حامل ہونا چاہیے 337
رحمت کا مفہوم 338
خدا کی حمد اسی لیے ہے کہ وہ رب العلمین ہے 338
دعا میں ہمیشہ خیر کا پہلو مضمر ہو' حق وصداقت کا پہلو ہو 339
اعلان ہو تو یہ ہو کہ حق آ گیا' باطل چلا گیا 339
رات کے ماتھے کی سیاہی کے نشان' صرف
خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہیں 339
پندرھواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 82 تا 93
دوسروں کے لیے مذہب تو قابل برداشت ہوتا ہے' دین نہیں ہوتا 342
شمعیں روشن کیجیے' اندھیرا فوراً کافور ہو جائے گا 342
مریض کا پہلا سوال 343
رحمِ مادر میں بچے کو کبھی بدہضمی نہیں ہوتی 343
سب سے پہلے غلط نظام کو بدلنا ہوگا 344

قرآن ان تمام بیماریوں کے لیے نسخہ کیمیا ہے 345
میں تمہارے علاج کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا 346
معالج کے لیے اس کی روٹی کا انتظام 346
چین والوں کے ہاں مشروط فیملی ڈاکٹرز کا رواج تھا 346
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان 346
اہل یورپ کی رقص بسمل اور ہماری حالت زار 347
مومن ظالم نہیں ہو سکتا 348
ظلم کا مفہوم 348
زندگی کا نصب العین جب مادی قرار پا جائے تو پھر یہی حال ہوتا ہے 349
ہمارے ہاں مشاکلت کے لفظ کا غلط استعمال 349
نیکی علم کا نام ہے 350
طبیعت ادھر نہیں آتی مشاکلت کا مفہوم 350
عربوں نے یہ مشاکلت کا لفظ کیسے بنایا؟ 351
انسان خود ہی اپنے پاؤں کو مختلف رسیوں کے ساتھ باندھ لیتا ہے 352
حدود اللہ کا مقصد تو انسان کو منزل مقصود تک پہنچانا ہے 352
ہر انسان اپنے اعمال کے ہاتھوں آپ گروی ہوتا ہے 353
رہن رکھا مال تو بک نہیں سکتا 354
بظاہر مالک خود ہیں لیکن قبضہ دوسرے کا ہے 354
سعی و عمل کے میدان کو انسان خود وسیع کرتا ہے 355
عربی میں ہر اس چیز کو جو پینے کے لیے ہو شراب کہتے ہیں 355
جنت کی تشبیہات کی اہمیت 356
غلط راستے پر چلنے کے لیے انسان بڑا تیز واقع ہوا ہے 357
ہمارے ہاں روح کا عام تصور 358
روح کا مروجہ تصور یونان کا دیا ہوا ہے قرآن کا نہیں 358
روح کے لیے خودی کی اصطلاح درست نہیں
اصل مفہوم نفس ہے یا انسانی ذات یا پھر وحی ہے 358
وحی کی ماہیت اور کیفیت وغیرہ کو غیر از نبی جان ہی نہیں سکتا 359
ذکر کچھ عالم امر اور عالم خلق کا 360
قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس کی مثال کوئی نہیں لا سکتا 360
مقام نبوت انسانیت میں عظمتوں کا بلند ترین مقام ہے 361
یہ چیلنج تو ہر دور کی ہر نسل کے لیے ہے 361
آج تک کسی نے قرآن کا یہ چیلنج قبول کیوں نہیں کیا؟ 362
قرآن کا اندر بیان تعریف آیات ہے 363
سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے 363
غور و فکر کرنے کی بجائے کسی معجزے کا مطالبہ 363
آپ کو ایک کتاب لانے کے لیے آسمان پر چڑھنا اور واپس آنا ہوگا 364
مذہب کی تعلیم اس کے افسانے قوم کی علمی سطح اور سوچ 365
ذاتِ خداوندی اس طفلانہ پن سے بہت بلند ہے 365
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزے 366

سولھواں باب: سورۂ بنی اسرائیل آیات 94 تا اختتام

مذہب انسان کو بہلاتا ہے جب کہ دین انسان کو ذمہ
داریوں کا شعور بخشتا ہے 368
انسان کے لیے پہلا انقلاب انسان حیوان سے ممتاز ہے 369
انسان کے لیے اگلا انقلاب اس کی بلوغت کا اعلان 369
انسان کو بچوں کی سطح پر رکھنا مذہبی پیشوائیت کے فائدے میں ہے 370
انسانوں کی بستی میں انسانوں کی سطح پر بات ہوتی ہے 370
مروجہ تراجم عقل و بصیرت کی ساری عمارت کو ڈھیر کر دیتے ہیں 371
خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا شیطان گمراہ کرتا ہے 371

Marfat.com

قرآن تو بار بار کہتا ہے کہ تم اندھے بہرے اور گونگے نہ بنو 372
اقبالؒ کے نزدیک ملا کی حیثیت 373
مذہبی مدارس کے طالب علموں کی ذہنی کیفیت 373
خود گمراہ کیا اور پھر خود ہی جہنم میں ڈال دیا 373
قرآن حکیم تو متضاد تعلیم پیش ہی نہیں کرتا 374
ایمان بالآخرت کی عملی شکل 375
تمام تر معاشرتی تباہیوں اور بربادیوں کی وجہ اور اس کا علاج 376
صلوٰۃ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد اور ہمارا عمل 377
اچھے یا برے راستے پر چلنے کا اختیار انسان کے اپنے پاس ہے 377
یہ پوری کائنات Cause & Effect پر مبنی ہے 378
Nothing (معدوم) سے Being (ہستی) میں آنے تک کا عمل 379
مومن کی پہچان اس فکر سے ہوتی ہے کہ میری انتہا کیا ہے 379
غلط نظام کے اندر پیدا ہونے والے خدشات 380
انسان کی ذمہ داری تو صرف اس نظام کو قائم رکھنا ہے اور بس 380
اس نظام کا نتیجہ نہ خوف و حزن 381
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی باہمی گفتگو 381
قوموں کی تباہی ہمیشہ اپنے محسنوں کو فراموش کر
دینے سے ہی واقع ہوتی ہے 382
افراد زندہ رہتے ہیں مگر قوم زندہ نہیں رہتی 383
قوموں کی تعلیم و تدریس کا طریق اور انقلاب کا قرآنی مفہوم 383
قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریق 384
دل کی گدازی انسان کو حساس بنا دیتی ہے 386
خدا کا صحیح تصور صرف قرآن حکیم میں محفوظ ہے 386
صفات خداوندی کی حقیقت 386
خیالات یا تصورات کے لیے الفاظ کی اہمیت 387
قرآنی الفاظ کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا 387
اردو میں نماز کے فتنہ پر پرویزؒ کی مخالف نیز تین
نمازوں اور نوروزوں کا الزام 388
خدا کے اقتدار کو تسلیم کرنے کی عملی شکل 388
المتکبر کا قرآنی مفہوم 389
خارجی کائنات میں حکمرانی خدا کی اور انسانی دنیا میں
یعنی ارض پر انسان کی کیوں؟ 389
لفظ مدثر کا قرآنی مفہوم انسانیت کے پژمردہ
درخت کو بہار نو سے آراستہ کرنے والی شخصیت 390
نظام خداوندی دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا 391
مذہب کی دنیا میں تکبیر اور کبریائی کی عظمت مسئلے مسائل کی نذر ہو گئی 392

ضروری گزارش: قارئین کرام سے التماس ہے کہ تفسیر ہذا میں اگر قرآن حکیم کے متن میں سہواً کہیں کسی قسم کی کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔ مہربانی ہوگی۔

(نوٹ) جہاں کہیں آپ قرآنی آیات کے حوالہ جات دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے عرض ہے کہ ان میں سے ایک نمبر سورۃ کا ہے جبکہ دوسرا نمبر آیت کا ہے۔ یعنی 4:2 کا مطلب ہے 4: سورۃ النسآء کی 2: دوسری آیت۔

محمد اشرف ظفر نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور

اکتوبر 2003

پیش لفظ

محترم پرویزؒ کی طرف سے پیش کردہ معارف القرآن کے سلسلہ میں ادارہ طلوع اسلام کے زیر اہتمام مطالب الفرقان فی دروس القرآن (سورۃ النحل) کا تعارف پیش کرتے ہوئے یہ بتایا جاچکا ہے کہ محترم پرویز صاحب نے معارف القرآن کے اس عظیم فکری پروگرام کی ابتدائی 1941ء میں دہلی سے کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد تعلیماتِ قرآنی کو عام کرنے کے لیے آپ ایک عرصہ تک کراچی میں اقامت پذیر رہے اور پھر لاہور تشریف لانے کے بعد دروس قرآن کا سلسلہ 1960ء میں B.25 گلبرگ لاہور سے شروع کیا جو 21 دسمبر 1967ء کو سات سال کے عرصہ میں اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد درس قرآن کا دوسرا دور تصریف آیات کی روشنی میں زیادہ مفصل انداز میں شروع کیا گیا جو پانچ اکتوبر 1984ء تک سترہ سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ یہ کاروان شوق علم وعرفاں کے موتی بکھیرتا اور نوع انسانی کے تاریک راستوں کو منور کرتا تیسویں پارہ کی سورۃ مطففین کی آیت 26 تک ہی پہنچا تھا کہ 26 فروری 1985ء کو فکر قرآنی کا یہ روشن چراغ راہی ملک بقا ہوا۔

محترم پرویزؒ کی شخصیت نے زندگی بھر قرآن حکیم کی تعلیم کو عام کرنے کے دوران اپنی ذات کے دامن کو جن تفسیری خامیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی وہ کم وبیش وہی تفسیری نقائص ہیں کہ جن کی نشان دہی اس سے پیشتر جناب علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے اپنے زورِ قلم سے محترم علامہ پرویزؒ کے پیش کردہ سلسلہ معارف القرآن کی جلد اول "اللہ" کے مقدمہ میں کی تھی اور جس کا تذکرہ اس کے بعد مطالب الفرقان فی دروس القرآن کے ضمن میں سورۃ النحل پر چھپنے والی قرآنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔ اب بھی اس موقع پر ان تفسیری نقائص کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری خیال کیا گیا ہے کہ مطالب الفرقان فی دروس القرآن سے متعلقہ بنی اسرائیل کی اس پیش کردہ قرآنی تفسیر میں مذکورہ تفسیری نقائص کا اعادہ کر دیا جائے تاکہ زیرِ نظر تفسیر کے قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔

نقائصِ تفسیر

"(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسرین نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔ علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں، اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں مرتب کئے گئے ہیں، بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے۔ دوسرے ان کی بناء محض قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانۂ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے، اس ضرورت کو محسوس

Marfat.com

کر کے اصول لکھنے شروع کیے مگر نا معلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے۔ آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ مرحوم دہلوی نے اصولِ تفسیر میں ایک رسالہ ''فوز الکبیر'' لکھا ہے۔ لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہم قرآن میں مدد مل سکتی ہے۔ ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے۔ بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہمِ قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

''الغرض تفسیرِ قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا۔ اسلیے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں، کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ فناری کا قول نقل کر چکا ہوں کہ تفسیر کے لیے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں۔ جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو''۔ (مرآۃ التفسیر صفحہ ۸)

''(۲) ان مفسرین نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے، وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح آیات و الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا، یعنی اس سے کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی اس لیے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں، جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں بتدریج اتاری گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں، قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہو سکتی۔ فہمِ قرآن کے لیے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے، جو فنِ طب میں کتبِ مفردات کی ہے جن میں حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص، آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں بن سکتا۔ بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائقِ قرآنی کا عالم نہیں ہو سکتا۔

''(۳) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی، کہہ دیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر نا قابلِ اعتبار ہیں۔ یہی حال اسبابِ نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے، جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہو سکتی

Marfat.com

تھی۔ مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے۔ جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہوگئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہوگئیں۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی' اسی قدر مسلمانوں کی قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بُعد ہوتا گیا۔

''④ ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے الا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعض بزرگ تو اس قسم کے گذرے ہیں' جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں۔ یعنی تقرباً الی اللہ خدامِ قرآن میں داخل ہوگئے۔ بجا' لیکن ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی' جس پر کسی طالبِ قرآن کی زبان سے ان کے لیے مغفرت کی دعا نکلے۔ یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہوگئیں' کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (13:17) ''وہی چیز دنیا میں رہے گی' جو لوگوں کے لیے نفع رساں ہوگی۔

''جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے' ان میں سے اکثر ایسے ہیں' جنہوں نے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدتِ طبع دکھائی ہے' مثلاً ابن نورک نے حضرت ابراہیم کے قول لیطمئن قلبی (2:260) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے۔ یا کطی السجل للکتب (21:104) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ ''سجل'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ یا مَرَجَ البَحرین (25:53) کی تفسیر علی و فاطمہ اور **اللؤلؤ و المرجان** (55:22) کی تفسیر حسین رضی اللہ عنہم یا **الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین** (3:16) کی تفسیر میں ''صابر'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ''صادق'' سے صدیق' ''قانت'' سے عمر فاروق' ''منفعین'' سے عثمان غنی اور ''مستغفرین'' سے حضرتِ علی رضی اللہ عنہم۔ غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں❶۔

''⑤ یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے

---

❶ تذکرہ الموضوعات صفحہ 84

Marfat.com

جاتے ہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں' ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں' غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کردی ہے۔

''6- یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً **غیر المغضوب علیهم ولا الضالین** (1:7) کی تفسیر میں دس قول ہیں **والفجر ولیال عشر** (89:11) کی متعدد تفسیریں ہیں **وشاهد و مشهود** (85:3) کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ **اصحاب الاخدود** (38:13) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ [1] الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں' جن کی کئی کئی تفسیریں' یا' یا' کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو' وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

''7- ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہے' تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔ جنگِ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے' ان کے چہروں' گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری وحملہ وقتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج و ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے' بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں' جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

''یہ سات بڑے بڑے عیوب و اسقام جو میں نے گنائے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔'' [بحوالہ معارف القرآن' جلد اول' 'اللہ': مقدمہ' ص۔۳۵]

محترم پرویز صاحبؒ نے سورۃ بنی اسرائیل کی شروع کی آیات کے متعلق روایتی تفاسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے' اس کے داخلی

---

[1] تفسیر جامع البیان

Marfat.com

تضادات اور تاریخی جائزے کے ساتھ ساتھ تصریف آیات کی روشنی میں ایسا مواد پیش کیا گیا ہے، جو قارئین کے سامنے، شاید پہلی دفعہ نظروں سے گزرے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں پرویز صاحب کی وضاحت

''اس سلسلہ میں محترم پرویز صاحب کا کہنا یہ ہے کہ'' مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نور قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔'' [معراج انسانیت۔از پرویز]

جیسا کہ سورۃ النحل کے پیش لفظ میں اس حقیقت کو بیان کیا جاچکا ہے کہ درس کا انداز تصنیفی انداز سے مختلف ہوتا ہے، تاہم قرآنی حقائق پر گہری نظر رکھنے والے ہمارے قابل صد احترام رفیق ڈاکٹر منظور الحق صاحب نے دروس کے تقریری انداز کو مربوط تحریری انداز میں پیش کرتے وقت اس مقصد کو ہر آن اور ہر لمحہ پیش نظر رکھا کہ اس عمل کے دوران مقرر کے الفاظ بھی قائم رہیں اور متکلم کا بیان کردہ قرآنی مفہوم بھی مجروح نہ ہو۔ ادارہ طلوع اسلام اس رفیق محترم کو مذکورہ تاریخی کام کے سرانجام دینے پر دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے جن کی شبانہ روز سعی و کاوش اور مسلسل جگر کاوی نے اس اہم ترین کام کو حسن وخوبی کے ساتھ اشاعت کے مراحل سے ہمکنار کیا۔

آخر میں بزم طلوع اسلام لاہور کے تمام رفقائے کار میرے شکریہ کے مستحق ہیں جن کی بھرپور معاونت سے مطالب الفرقان فی دروس القرآن کے اس سلسلۂ زریں کی دوسری جلد جو کہ سورۃ بنی اسرائیل پر مشتمل ہے اشاعت پذیر ہوئی۔ میری دعا ہے کہ نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور نے جو عزم اس تاریخی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کر رکھا ہے وہ بحسن وخوبی سرانجام پائے تاکہ قرآنی حقائق کے اس بے مثل اور انمول خزینہ سے آنے والی نسلیں، کارگاہ حیات میں، اپنی تاریک راہوں کو روشن کرتی رہیں۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (5:97)

ایاز حسین انصاری

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام، لاہور

68.327

1049

Marfat.com

پہلا باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیت 1: تمہید)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

آج 8 جون 1975ء سے سورۃ بنی اسرائیل' سترہویں سورت شروع ہوئی۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (17:1)۔کہا: کیا بات ہے ان کی تدبیروں کی! آپ ﷺ کی ذات کے خلاف کفار نے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ انتہائی تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح سے' سارے قبائل کا ایک ایک نمائندہ مل کر' آپ ﷺ کو راتوں رات قتل کر دیا جائے' تا کہ روز روز کا ٹنٹا ہی ختم ہو جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ تیرہ سال ہو گئے ہیں' اس نے مستقل طور پر زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ اُس کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے انؐ کے متعلق کہا کہ ''گھبراؤ نہیں۔ یہ دیکھو کہ وہ ان کی گرفت سے کتنا اونچا ہے' جس نے یہاں ان کے لیے یہ تدبیر کی اور وہ راتوں رات ان کو یہاں سے نکال کے مدینے کی طرف لے گیا''۔ دیکھتے ہیں کیسا ربط ہے! کہا جاتا ہے کہ آیتوں میں باہمی ربط نہیں ہے جبکہ قرآن تو ''الحمد سے والناس'' تک مربوط چلا جا رہا ہے۔ سبحان اللہ۔ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔ لہٰذا بات جو یہاں شروع کی ہے تو وہ لفظ ''ہم'' سے شروع کی ہے۔ دیکھا آپ نے لفظ ''سبحان'' کتنا عجیب آیا ہے! ان کی گرفت سے کتنا اونچا ہے' کتنا دور ہے وہ' جس نے یہ انتظام کر دیا ہے: راتوں رات تمہیں ان کی گرفت سے نکال کے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گیا''۔ مقصود صرف یہ نہیں تھا کہ تمہاری جان بچ جائے۔ کیا اتنی سی بات تھی؟ اس کے لیے تو خود قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۔ (3:143) محمد ﷺ بجز ایں نیست کہ وہ صرف خدا کا پیغام لانے والا ہے۔ اَفَا۟ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ۔ (3:143)۔ اگر کل کو یہ مر جائے یا قتل بھی کر دیا جائے' تو کیا تم اپنے پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟ جان کا سوال نہیں تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ کاہے کے لیے یہ حفاظت تھی؟ کہا: لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا(17:1) تا کہ وہ آنے والا انقلاب آئے' جس کی علامات ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھیں۔ وہ انقلاب اندر ہی اندر' ابھی ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا تھا۔ یہ انتقالِ مکان اس لیے کیا گیا تھا تا کہ وہ نشانیاں جو ابھی آنکھوں سے غیر مرئی تھیں' نظر نہیں آئی تھیں' وہ مشہود شکل میں سامنے آ جائیں۔

Marfat.com

مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا عظیم مقصد

عزیزانِ من! یہاں سے ہجرت کی بات شروع ہوتی ہے' یہاں سے اس پروگرام کے اندر ایک نیا دور آتا ہے۔ یہ دَور ہر رسول کی زندگی کے اندر آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ذہن میں کیا کیا سوال اٹھ رہے ہیں: یہ مسجد اقصیٰ' یہ مکے سے وہاں بیت المقدس جانا' معراج شریف' یہ تمام چیزیں ہیں' جو آپ کے ذہن میں اٹھ رہی ہیں۔ یہ باتیں بچپن سے سنتے چلے آئے ہیں۔ وہ یہی آیت ہے جس سے ان باتوں کی ابتدا کی جاتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ وہ بات چھڑی ہے' مگر وقت صرف پانچ منٹ ہے سو یہ بات درمیان میں رہ جائے گی۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔ آج ہم تمہیداً کچھ کہیں گے۔ اسے غور سے سنیے گا۔

ایک رسول نے طبعی قوانین کے تابع' بہرحال' کسی خاص مقام میں ہی پیدا ہونا ہوتا ہے۔ وہیں وہ پیدا ہوتا ہے' وہیں وہ اپنی ابتدائی زندگی بسر کرتا ہے' وہیں وہ اس ابتدائی زندگی کے بعد منصب نبوت پر سرفراز کیا جاتا ہے۔ جب سرفراز کیا جاتا ہے تو وہیں سے اس کے پروگرام کا آغاز ہو جاتا ہے۔ وہیں وہ اپنی تبلیغ شروع کر دیتا ہے۔ وہیں سے اس کی مخالفت شروع ہوتی ہے۔ وہ دلوں اور ذہنوں کو بدلتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ دلوں اور ذہنوں سے بتوں کا نکالنا' دنیا میں مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ یہ پتھر کے بت کا نکالنا تو آسان کام ہوتا ہے کیونکہ اس نے کہیں آگے پیچھے تو ہونا نہیں ہوتا۔ اس کی دعوت بڑی انقلاب آفریں ہوتی ہے۔ وہ مفاد پرستی کے ہر بت کو توڑتا ہے۔ ان کے ہر باطل عقیدے کو باطل قرار دیتا ہے۔ ان کی ہر غلط روش کو غلط کہتا ہے۔ اس کے جتنے بھی مخالف ہوتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہوتا' جو صحیح راستے پہ چل رہا ہو۔ مخالفت کا ہجوم تو آنا ہی ہے۔ جس راستے پہ کوئی قوم چلی جا رہی ہے' اس کے اندر سے اگر کوئی داعی یا مبلغ ایسا اٹھتا ہے جو ان سے وہ کچھ نہ کرنے کو کہتا ہے جس پہ وہ پہلے ہی دن سے کاربند ہیں' تو مخالفت تو ہونی ہی ہے اور پھر یہ تو اس کے سامنے لاکھوں کروڑوں کی تعداد کا ہجوم مخالفت تھا۔

میں اپنی ذات کو درمیان میں نہیں لاتا۔ میں قرآن کی آواز سناتا ہوں تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ دیکھیے' ساری عمر گذر گئی۔ میرے تسلسل اور التزام کو تو کم از کم چالیس سال ہو گئے ہیں۔ میں صبح شام' دن رات جو بھی Means میرے اختیار میں تھے اور ہیں' میں انہیں ایک ایک سانس میں استعمال کر رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ''تم دیکھو تو سہی' کیا نتیجہ نکلا؟ چند نفوس' ذرا سا دائرہ' اور اس کے مقابل ان فلاں صاحب کو دیکھیے کہ کل انہوں نے یہاں پہ آواز بلند کی' اور آج کروڑوں کی تعداد میں آواز دینے والے ان کے ہم رکاب ہیں''۔

Marfat.com

داعیٔ انقلاب کے مشن کی اہمیت

بات سیدھی سی ہے صاحب! جن لوگوں نے جو رَوش پہلے سے اختیار کر رکھی ہے' جو اسی روش کی طرف ان کو دعوت دیتا ہے' صرف تھوڑے سے الفاظ بدل کر استعمال کرتا ہے' کہتا وہی ہے جو کچھ وہ کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ تو پہلے دن سے ہی اس کے متبعین (Followers) ہوتے ہیں۔ یہ نہ بھی کہتا تو بھی یہ اس کے پیروکار (Followers) تھے' لیکن وہ داعیٔ انقلاب تو ان کی کسی ایک رَوش کو نہیں بلکہ ان کی ہر رَوش کو باطل قرار دے رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان میں سے اتنے بھی نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ آ جائیں تو یہ بھی غنیمت ہے۔

انقلاب کا مشن تو بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ وہ بوجھ تھا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی: وِزْرَکَ o الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ (94:2-3)۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی۔ یہ جماعت ان لوگوں کی تھی جو کمر شکن ہوتے ہیں۔ نبی یہ کرتا ہے کہ اپنے اس ماحول میں' اپنے اس معاشرے کے اندر' یہ دعوت دیتا ہے' دیئے چلا جاتا ہے' اور ہر قسم کی مخالفت ہوتی چلی جاتی ہے۔ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (110:2)۔ لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہوتے چلے جاتے۔ یہاں یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ فوراً ہی ایک جمِ غفیر ساتھ ہو جائے۔ یہاں تو ایک ایک دو دو افراد جسے وہ ٹپکنے والے کہتے ہیں' کہیں آ کے شامل ہوتے ہیں۔ مسلسل تیرہ سال جدوجہد کی' گالیاں کھائیں' مار کھائی' پٹے' بھاگے' اذیتیں سہیں' صعوبتیں برداشت کیں' مشکلات کے سمندر عبور کیے۔ یہ سارا کچھ 13 سال تک کرنے کے بعد اب ہجرت کا وہ زمانہ آیا۔ یہ تیرہ سال کا عرصہ' نبوت کی 23 سالہ زندگی کا قریباً 60% سے بھی زیادہ بنتا ہے۔ یہ ہے ابتدائی دور۔ اس سے پہلے کا سارا حاصل کیا تھا؟ مسلسل جدوجہد' اذیتیں' صعوبتیں' مشکلات۔

جب وہ داعیٔ انقلاب دیکھ لیتا ہے کہ اس میں سے جتنے ذرے نکلنے تھے' وہ اب نکل آئے تو وہ اس مقام کی طرف چلا جاتا ہے' جہاں کی فضا اس کے لیے سازگار ہوتی ہے۔ یہاں تو وہ سان (Whetstone) نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ وہ سان گول سا پتھر ہوتا ہے' اسے لیے لیے نہیں پھرتے۔ بلکہ وہ ایک جگہ گھڑی ہوئی ہوتی ہے' اس کے نیچے ریت ہوتی ہے اور اوپر پتھر ہوتا ہے۔ سان کی تکنیک آپ نے دیکھی ہوگی۔ وہ لوہے کو سان پہ اوزار تیز کرنے کے لیے چڑھاتے تھے۔ اس میں سے شرارے نکلا کرتے تھے۔ یاد ہے وہ سکول جاتے ہوئے' ہم وہاں کھڑے ہو جاتے تھے۔ دیکھنا اسے' وہ جو لوہے کے ذرے ہوتے ہیں' وہ سان کے اندر اور اس کے نیچے ریت کے اندر ملتے چلے جاتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ریت کے اندر وہ لوہے کے ذرے کہاں ہیں۔ وہ ذرے تو ریت ہی ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ مقناطیس سے کھیلا کرتے تھے۔ وہ مقناطیس

Marfat.com

دو پیسے میں یا ایک آنے میں ملا کرتا تھا۔ اس کو اس سان کے اندر پھیرتے تو وہ لوہے کے ذرے اس کے ساتھ لگ جاتے تھے۔ باقی تو پھر وہی ریت کی ریت رہ جاتی تھی۔ رسول کے ابتدائی دور کے اندر یہ جو تیرہ سال کا عرصہ تھا' اس میں وہ اس ریت کے اندر ملے ہوئے فولاد کے ذرات کو اپنی مقناطیسی کشش سے الگ کرتا چلا گیا۔ اور جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ اب باقی ریت ہی رہ گئی ہے' وہ ان ذروں کو اپنے ساتھ سمیٹ کے اس مقام کی طرف چلا جاتا ہے' جہاں کی فضا اس کے لیے زیادہ شاندار و سازگار ہوتی ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ یہ نہ فرار ہوتا ہے' نہ Escapism ہوتی ہے' نہ جان بچانا ہوتا ہے' نہ ہی یہ چیز ہوتی ہے جو مخالفین کہتے ہیں کہ مکے کی زندگی کمزوری کی زندگی تھی' وہاں تو صاحب! درویشی تھی' وہاں تو فقیری تھی۔ نہیں ایسا نہیں۔ مدینے میں آئے تو مملکت ملی۔ اب جنگ بھی شروع ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ اسے مکے مدینے کی دو زندگیوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔

وہ ﷺ تو اس دوران ان ذرات کو اکٹھا کر رہے تھے۔ اور پھر یہ ذرے تو پوچھو ہی نہیں! ان میں سے ایک ایک ذرہ آفتاب تھا۔ یہ وہ ذرات تھے جن کے متعلق خدا یہ کہتا ہے کہ ''اے رسول! تیرے لیے خدا اور تیرے یہ ساتھی کافی ہیں۔'' یہ تھی قیمت ان ذروں کی! ایک ایک ذرہ گوہر نایاب تھا۔

یہ تو ایک ایک ذرہ اپنی اپنی جگہ گوہرِ تابدار تھا

عزیزانِ من! رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ یہاں خدا نے یہ نہیں کہا کہ اے رسول! تیرے لیے صرف اکیلا خدا ہی کافی ہے۔ ان کے لیے خدا کہتا ہے کہ: ''یہ ہم سے راضی ہوئے' ہم ان سے راضی ہوئے''۔ یہ تھا ان کا مقام! بات کسی نے یوں کہی ہے کہ: ''یہ تیرا اور خدا کا اتباع کرتے ہیں۔ تو ان کو لے' اب یہ یہاں کیوں اپنا وقت ضائع کریں''۔ وہ مقام' جہاں کی فضا اس پروگرام کے لیے زیادہ سازگار ہوتی ہے' وہاں جانے کے بعد یہ پروگرام عمل میں آتا ہے۔ وہاں اختیار حاصل ہوتا ہے' مملکت حاصل ہوتی ہے۔

مدینے پر کفار کی چڑھائی

یہ اگر کچھ نہیں کہتے تو پھر یہ بھی ان سے کچھ نہیں کہتا۔ مگر یہاں تو ساری دنیا فساد سے بھری پڑی تھی۔ کیا یہ ساری دنیا کے ساتھ جا کے جنگ کرتا پھرتا؟ نہیں۔ باقی رہی یہ بات جو قرآنِ کریم نے کہی کہ **وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ** (16:126)۔ اگر تمہیں ان کا پیچھا کرنا پڑے تو اسی حد تک پیچھا کرو' جس حد تک انہوں نے تمہارا پیچھا کیا تھا۔ مگر مکے میں تو حالت یہ تھی کہ یہ جب بھی بیٹھے' انہوں نے ان کی انتہائی مخالفت کی۔ وہ یہاں مدینے میں اس بات کو کبھی بھی گوارا نہیں کرتے کہ یہاں یہ نظام کامیاب ہو۔ انہیں معلوم تھا کہ اس نظام کے اثرات یہیں تک محدود نہیں رہیں گے۔ یہاں ایک دفعہ بھی بطورِ

Marfat.com

نمونہ اگر یہ نظام قائم ہوگیا تو یہاں جنتِ ارضی بن جائے گی۔ اگر یہاں اِذَاجَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ [1] (110:1) ہوگیا تو اس کے بعد انہیں پتہ تھا کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا [2] (110:2) ہوگا۔ پھر ان کا کچھ نہیں رہے گا۔ اس لیے وہ دوسرا پہلو بدلتے ہیں۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ آپؐ نے مکے میں لشکرکشی کر کے ان کے اوپر چڑھائی نہیں کی تھی، بلکہ مدینہ میں رہنے والوں کے خلاف کفار چڑھائی کر کے آگئے تھے۔ پھر یہاں انہیں مدافعت کرنا پڑتی ہے۔ اتنا قیمتی متاع، اس کے ساتھ اتنا بلند نصب العین اور پھر یہ رسول بھی رسالت کی آخری کڑی! کیسا تحیرزا سماں تھا! میں سمجھتا ہوں کہ وہ دعا جو آپ نے بدر کے میدان میں مانگی تھی، بڑی گراں قدر ہے۔ اس روایت کا جس میں یہ دعا درج ہے عجیب انداز ہے، عزیزانِ من! روایت تو خود چمک کے کہہ دیتی ہے کہ میں رسول کی ہوں۔ بدر کے میدان میں آپ ﷺ نے ان جانثاروں کو صف میں کھڑا کر دیا اور آپ نے پیچھے کھڑے ہوکے، جنگ کے لیے آواز دینے سے پہلے سجدہ میں گر کے، خدا سے کہا: مَابِکَ الْمَلِکُ ''تو جانتا ہے کہ یہ چند رفیق ہیں، جو تیرے دین کی خاطر تیار کیے گئے ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آج یہ شکست کھا کے ختم ہو گئے، تو نبوت کا تو خاتمہ ہے ہی، پھر قیامت تک تیرے نام کو بلند کرنے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔ میں اپنے لیے نہیں، ان کے لیے نہیں'' ''میں تیرے ناں دی لاج رکھن واسطے کہناں'' [3]۔ بات بڑی ٹھیک ہے۔ آخری رسول تھا معاذ اللہ، معاذ اللہ، معاذ اللہ، نقل کفر کفر نباشد، وہ دریدہ دہن کہتا ہے کہ ''یاد رکھیے گا'' دہراتا ہوں، کہ اگر اس خدا کی یہ ضربِ آخر بھی چٹک کر رہ گئی ہوتی تو آج نام بھی مسلمان جیسا نہ ہوتا۔ آج ابوجہل ہوتا، رام داس ہوتا۔ اتنی سی بات واضح کر دینا بہت ضروری ہے کہ ''آج اگر یہ ضربِ آخر ہو۔ معاذ اللہ، یہ نہ رہے، تو رسالت تو ختم، نبوت ختم، وہ ختم، یہ سلسلہ ختم، تو قیامت تک تیرا نام بلند کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اس لیے انہیں آکر سنبھال لے۔ ہمارا کام تو یہ تھا کہ اس مقصد کے لیے، تیری مدافعت کے لیے، ہتھیلی پہ سر رکھ کر ہم نکل آئے ہیں۔ عزیزانِ من! دیکھیے، یہ ہے ہجرت۔ یہاں کہا تھا کہ یہ جو تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے ہیں، ان سے مت گھبراؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور اس کے بعد ہے: سُبْحَانَ الَّذِی (17:1)۔ یہ دوسرا مقام شروع ہوگیا۔ یہ ہے ہجرت عزیزانِ من!۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو آپ کے ذہنوں میں ابھر رہی تھیں، اُن کے متعلق ہم اگلے درس میں دیکھیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

---

[1] جب قانونِ خداوندی کے مطابق تجھے غلبہ ونصرت حاصل ہوجائے اور ان لوگوں کی مخالفت ختم ہوکر دین کے دروازے ہر طرف سے کھل جائیں۔

[2] لوگ جوق در جوق اس نظامِ خداوندی میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔

[3] میں (یہ کچھ) آپ کے نام کی لاج اور عظمت وآبرو رکھنے کے لیے کہتا ہوں۔

دوسرا باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیت 1 مسلسل)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

عزیزانِ من! آج جون 1975 کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل سے ہوتا ہے۔ اسے سورۃ اسریٰ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے شروع میں ہی ''اسریٰ'' کا لفظ آیا ہے۔ یہاں سے 17 ویں سورۃ' پندرواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

مسجدِ حرام سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت

تمہیدی بات تو میں نے سابقہ درس میں ہی پیش خدمت کر دی تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ کہا تھا کہ یہ ایسی آیت ہے جسے ذرا وضاحت سے سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی کیا جاتا ہے کہ ''پاک ہے وہ ذات کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گئی' مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک''۔ اس ترجمے میں ''کی طرف'' لے گئی کے بجائے ''تک لے گئی'' ہے۔ مسجدِ اقصیٰ کے گرد و پیش کا ماحول بڑا بابرکت ہے اور لے جانے کا مقصد یہ تھا: لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (17:1)۔ تاکہ وہاں ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔ یہ وہ عام ترجمہ ہے جو ہمارے ہاں کیا جاتا ہے۔ بات اس میں یہ ہے کہ ان کے ترجمہ کے مطابق' خدا اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا۔ یہ ہے وہ آیت جو معراج شریف کے واقعہ کی بنیاد ہے۔ اس کے متعلق میں ابھی عرض کرونگا۔

بیت المقدس سے آسمانوں تک جانے کا مروجہ تصور

اس واقعہ کے دو حصے بتائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ نبی اکرمؐ ایک رات مکہ سے بیت المقدس گئے' یروشلم گئے جو کہ یہودیوں کا وہ مقدس مقام یا ہیکل ہے جسے اس اعتبار سے بیت المقدس کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے اس ہیکل میں' راتوں رات اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو مکہ سے وہاں لے گئے۔ اس واقعہ کا یہ پہلا حصہ بتایا جاتا ہے اور اس کی بنیاد یہ آیات ہیں' جو اس سورۃ کے شروع میں آئی ہیں۔ پھر اس کا اگلا حصہ یوں بتایا جاتا ہے' کہ حضور ﷺ بیت المقدس سے آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرشِ معلیٰ پر تشریف لے گئے اور وہاں جا کے باری تعالیٰ سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے پھر واپس بیت المقدس تشریف لائے' اور پھر راتوں رات واپس مکہ تشریف لے آئے۔ یہ ہے جسے واقعہ معراج کہا جاتا ہے۔ پہلا حصہ مکہ سے یروشلم تک کا ہے۔ اس کے لیے تو یہ آیت ہے جبکہ دوسرے حصے کی تفصیل کے لیے سورۃ النجم کی

Marfat.com

آیت نمبر 53 پیش کی جاتی ہے کہ آپ آسمانوں پہ تشریف لے گئے اور حضور ﷺ کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوئی۔

قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں ہماری مروجہ بنیادی سوچ

ہمارے ہاں تو گویا بنیادی زور اس پہ دیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو تفاسیر سے سمجھنا چاہیے۔ تفاسیر کے متعلق بھی سب سے زیادہ قابلِ اعتبار وہ تفاسیر ہیں' جو روایات کی رو سے تفسیر کرتی ہیں یعنی رسول اللہؐ کی طرف جو احادیث منسوب ہیں' ان کے ذریعے سے قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہیں تو گویا یہ تفسیر ہے جو قرآنِ کریم کی بقول ان کے خود رسول اللہ ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس عقیدے کی رو سے تو اس تفسیر سے الگ کوئی قرآن کی تفسیر بیان ہی نہیں کی جاسکتی۔ قرآن کے کسی مفہوم کے متعلق اگر یہ چیز بتائی جائے کہ خود حضور ﷺ نے یہ مفہوم بتایا ہے تو پھر کونسا مسلمان ایسا ہے جو اس کی جرآت کر سکے کہ میں اس سے بہتر مفہوم دے سکتا ہوں۔ معاذ اللہ۔ لہٰذا یہ تو ہے ہی نہیں کہ میں اس سے الگ مفہوم دیتا ہوں' یہ تو تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ تفاسیر جن کی تائید میں یہ روایات ساتھ دے دی جاتی ہیں' وہاں واقعی ایک بہت بڑی مشکل پیدا ہوتی ہے کہ ان سے الگ ہٹ کر' کس طرح سے کوئی دوسری تفسیر کی جائے۔ اس پہ اگر کوئی مفسر یا کوئی شخص اپنے خیالات کی رو سے' اپنی فکر کی رو سے' کوئی چیز پیش کرتا ہے تو وہ اس کی اپنی رائے ہے۔ جس کے مطابق یہ تفسیر کی گئی جبکہ ہمارے ہاں تو عقیدہ یہ ہے کہ رائے یا فکر یا قیاس' حدیث کے معاملے میں یا دین کے معاملے کے اندر' قطعاً منع ہے اور وہ تو پھر اہل الرائے ہیں جن کے پرانے جھگڑے چلے آتے ہیں۔

تفسیر اور روایات کا باہمی ربط اور مرتبہ

لیکن بہرحال تفسیر جو روایات کی رو سے بیان کی جاتی ہے اس کے متعلق یہی عقیدہ ہے کہ وہ روایات حضور ﷺ کی فرمودہ ہیں۔ جیسا کہ میں متعدد بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآنِ کریم کو اسی شکل میں جس میں یہ ہمارے پاس موجود ہے' جمع' مرتب' مدون فرما کر امت کو دیا اور امت کے پاس' ہر جگہ' ہر مسلمان کے پاس' اس کا ایک نسخہ تھا۔ قرآن کی تو عظمت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ وہی قرآن ہے جو اُس وقت سے اِس وقت تک ہمارے پاس ایک حرف کے تغیر و تبدل کے بغیر چلا آ رہا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے۔ ویسے تاریخی شہادات بھی ہمارے پاس موجود ہیں کہ ''یہ قرآنِ کریم وہی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ غیر مسلموں تک بھی اس تاریخی شہادت کی تائید کرنے والے موجود ہیں''۔

نبی اکرم ﷺ کی جانب سے روایات کا کوئی مجموعہ نہیں ملا

لیکن احادیث کے متعلق یہ صورت نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی روایات کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بھی کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انہوں نے ایسا کوئی بھی مجموعہ مرتب کرنے سے روکا' منع کیا۔

Marfat.com

احادیث کو اکٹھا کرنے کا پس منظر

بہرحال سب سے پہلا مجموعہِ احادیث جو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے وہ امام بخاری کی کتاب ہے جسے عام طور پر بخاری شریف ہی کہا جاتا ہے۔ وہ ان کا مجموعہ ہے۔ امام بخاری کی وفات رسول اللہ ﷺ کے ڈھائی سو سال بعد ہوئی۔ 256ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ تو گویا یہ پہلا مجموعہ جو مرتب ہوا ہے' وہ 256ھ میں ہوا اور اس کے بعد جو باقی کتب احادیث گنائی جاتی ہیں ان میں سے سُنیوں کے ہاں ان کے چھ مجموعے ہیں جنہیں یہ صحاحِ ستہ کہتے ہیں یعنی صحیح کتابیں۔ تو گویا یہ رسول اللہؐ کے اتنا عرصہ بعد مرتب ہوئے۔ مرتب بھی کسی تحریری written مواد سے نہیں ہوئے' تحریری طور پر بھی' ان کے پاس پہلے کوئی مجموعہ نہیں تھا۔ اسی لیے ان کو روایات کہا جاتا ہے۔ یہ زبانی روایت چلی آتی تھی کہ میں نے اس سے سنا' میں نے اپنے باپ سے سنا۔ یعنی روایت یوں چلتی ہے: ''میں نے یوں سنا''۔ اس طرح سے' تو اڑھائی سو سال میں رسول اللہ ﷺ تک پہنچتے ہوئے آپ سمجھ لیجیے کتنے راوی آئیں گے جو یہ کہیں گے کہ میں نے اپنے باپ کے الفاظ سے سنا' میں نے ان سے سنا۔ اور پھر ایسے بھی نہیں ہے کہ آخر میں یہ کہا ہو کہ یہ رسول اللہؐ کے الفاظ ہیں جو ہم دہرائے چلے آرہے ہیں۔ یہ روایات وہ الفاظ نہیں ہیں جو حضورؐ کے اپنے ہوں بلکہ یہ بالمعنیٰ ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا' سننے والے نے اس کا مطلب یہ سمجھا اور پھر وہ مطلب وہاں سے جامعینِ حدیث تک اڑھائی سو سال تک پہنچا اور اس طرح یہ مطلب' زبانی ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتا چلا آیا اور اس کے بعد امام بخاری نے یہ تہیہ کیا کہ میں ان منتشر روایات کو جمع کروں۔ انہوں نے خود یہ لکھا ہے کہ انہوں نے کوئی چھ لاکھ کے قریب اس قسم کی روایات جو اس زمانے میں عام مشہور تھیں' لوگوں کی زبان سے سنیں' جمع کیں اور ان میں سے انہوں نے قریباً پانچ لاکھ ترانوے ہزار روایات کو' جو ان کے معیار کے مطابق نہیں تھیں' مسترد کر دیا اور صرف بقایا قریب چھ سات ہزار کو اپنے مجموعے کے اندر شامل کیا۔ باقی روایات کے مجموعے بھی اسی طرح کے ہی ہیں جو ان کے بعد اسی شکل میں مرتب ہوکے' ہمارے پاس آئے۔ تو یہ ہیں وہ روایات جن کو احادیثِ رسول اللہؐ کہا جاتا ہے یعنی ان روایات کی صحیح پوزیشن تو یہ ہے کہ انہیں حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ساری چیز منسوب علیہ الرسول ہے' جس کی حضور ﷺ کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ یہ نہ تو حضورؐ کے الفاظ ہیں نہ حضورؐ نے خود ان کی تصدیق فرما کر امت کو آگے دیا اور اگر حضورؐ نے کوئی تصدیق قدہ صحیفہ دیا ہوتا جو امت میں آگے چلتا تو اس کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی۔ یہ قرآن بھی جو رسول اللہؐ نے یہ کہہ کے دیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرا صحیفہ' جو حضور ﷺ کی اپنی سنت اور احادیث پر مشتمل ہوتا اور اس انداز سے آپؐ اسے امت کو دیتے' تو وہ امت کے پاس غیر اضافی شکل میں ہوتا تو اس کے بارے میں کہا جاتا کہ یہ حضور ﷺ کے اقوال و ارشادات ہیں۔ لیکن جو موجودہ مجموعے ہیں' ان کے متعلق تو یہی چیز ہوگی کہ یہ حضور ﷺ کی طرف منسوب ہیں۔ اس طرح سے یہ زبانی مرتب ہوئے اور یوں ہماری طرف آئے۔

Marfat.com

روایات کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنے کا نتیجہ

اب ان روایات کی بنیادوں پر ہمارے ہاں قرآنِ کریم کی تفسیر کی جاتی ہے اور اس تفسیر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے الگ تفسیر نہیں بیان کی جاسکتی کیونکہ یہ تفسیر خود رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ ہے۔ جبکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ روایات ہیں جو اس طرح سے مرتب ہوئیں اور وہ بھی رسول اللہؐ کے الفاظ نہیں ہیں۔ جو سب سے پہلا راوی ہے' وہ بھی حضورؐ کے الفاظ نہیں بیان کرتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ حضورؐ نے کچھ فرمایا' جس کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں اور اس طرح سے بات آگے چلی۔ لہٰذا عزیزانِ من! ان حقائق کو بنیادی طور پہ سمجھ لینا ضروری ہے اور وہ اس لیے کہ جتنی تفاسیر ہمارے ہاں کی ہیں' وہ سب اسی طرح سے مرتب ہوئیں۔ سب سے پہلی تفسیر آپ کے ہاں امام طبری ❶ کی تفسیر کہلاتی ہے۔ وہ امام بخاری سے بھی ذرا بعد میں ہوئے ہیں۔ ان کی وفات 310ھ میں ہوئی ہے۔ پہلی مفصل و کامل تفسیر امام طبری کی ہے جو تیس جلدوں کے اندر ہے۔ انہوں نے ہر آیت کے متعلق روایات جمع کردی ہیں۔ اب سیدھی بات ہے کہ جب روایات کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں' تو گویا یہ تفسیر جو ہے' وہ خود رسول اللہ ﷺ کے کلام کی' بیان کی ہوئی تفسیر ہوگئی۔

تمام تفسیروں کی بنیاد امام طبری کی تفسیر ہے

اب اس کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد قرآن کریم کی جتنی بھی تفاسیر لکھی گئیں ان سب کی بنیاد امام طبری (310-224ھ) کی یہی تفسیر ہے۔ اگر اس میں کچھ کمی بیشی ہوئی ہے' تو ان کی بنیاد بھی یہی روایات ہیں کیونکہ احادیث کے تو کئی مجموعے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ کہا کہ ''نہیں'' یہ روایت جو طبری نے دی ہے' یہ ضعیف روایت ہے' اس کے مقابلے میں فلاں روایت جو ہے' وہ زیادہ قوی ہے' اس لیے اس کی جگہ یہ ہونی چاہیے''۔ تبدیلی اگر ہوئی ہے تو اتنی ہوئی ہے۔ یہ مختلف فرقوں کے اندر جتنے جھگڑے آپ دیکھ رہے ہیں' ان جھگڑوں کی بنیاد یہ ہے کہ ایک فرقہ ایک روایت کو کہتا ہے کہ ''یہ صحیح ہے''۔ دوسرا کہتا ہے: ''نہیں یہ تو ضعیف ہے لہٰذا جو میں پیش کر رہا ہوں یہ صحیح ہے''۔ چنانچہ ان کے ہاں روایات میں بھی اختلافات ہیں اور تفاسیر میں بھی۔ اگر ایک تفسیر دوسرے سے اختلاف کرتی ہے' تو وہ اسی حد تک کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ''روایت ضعیف ہے'' کمزور ہے۔ جو میں روایت پیش کر رہا ہوں' یہ اس سے زیادہ قوی ہے''۔ جنہوں نے اس میں اپنے خیال سے کچھ کہا ہے جیسے امام رازی کی تفسیرِ کبیر ہے یا اور بھی ایسی تفاسیر ہیں جنہوں نے خود اپنے طور پہ بھی کچھ کہا تو ان کو Condemn کردیا گیا کیونکہ وہ تفسیر بالرائے ہیں' اور اس کے لیے دلیل یہ دی کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمودہ

---

❶ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی ولادت ۲۲۴ھ کی ہے اور وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: حضرت علامہ تمنا عمادی و دیگر علمائے کرام' امام زہری (حدیث و سیرت کے مدون) و امام طبری (تفسیر و تاریخ کے مدونِ اول) تصویر کا دوسرا رخ' الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۳-۷-اے بلاک نمبر ا' ناظم آباد' کراچی۔ ۷۴۶۰۰ (سال طباعت درج نہیں ہے۔)' ص ۳۱۳۰۔

Marfat.com

تفسیر کے خلاف ہے اس لیے ہم کیسے اس کو تسلیم کریں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب بھی مسلمانوں سے یہ کہ دیا جائے کہ صاحب! یہ تفسیر حضور ﷺ کی تفسیر کے خلاف ہے' اس سے الگ ہے' تو وہ کون مسلمان ہے جو اس کو برداشت کر سکے گا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہے بلکہ وہ تو منسوب علیہ رسول ہے چنانچہ یہ بات واضح نہیں کی جا سکی۔

واقعہ معراج کے سلسلہ میں بیان کردہ تفسیروں میں مطابقت

بہر حال مذکورہ آیات کی تفسیر کچھ یوں ہے کہ نبی اکرمؐ کو ایک رات جبریل امین مکہ سے یروشلم' بیت المقدس لے گئے۔ بیت المقدس سے پھر آپ کو جبریل عرش معلیٰ' آسمانوں کی طرف لے گئے اور واپس اسی طرف سے آپ تشریف لائے۔ یہ واقعہ تفاسیر کے اندر روایات کی رو سے بیان ہوتا ہے۔ اس واقعہ کی جزئیات میں روایات کے فرق کی بناء پر کہیں کہیں تھوڑا بہت فرق ہے لیکن اس کا ماحصل ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اس میں ہمارے ہاں کے متقدمین ہوں' یا موجودہ دور کے مفسرین' یا پھر متاخرین' بنیاد ان تفسیروں کی یہی روایات ہی ہیں جن کی روشنی میں یہ واقعہ آج بھی اسی طرح بیان کیا جاتا ہے۔ میرے پاس متقدمین کی بھی تفاسیر ہیں جن میں یہ سارے واقعات درج ہیں۔ لیکن میں نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ ہمارے دور کے مفسرین میں سب سے شہرت یافتہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی [1] ہیں' میں انہیں لوں۔ انہوں نے بڑی ضخیم تفسیر لکھی ہے۔

واقعہ معراج کے متعلق مودودی صاحب کی ریڈیو پر تقریر

واقعہ معراج کے متعلق 1951ء میں مودودی صاحبؒ نے ریڈیو پہ ایک تقریر بھی کی تھی۔ ریڈیو کی تقریر تو پھر آپ جانتے ہیں کہ ساری دنیا میں نشر ہوتی ہے۔ بعد میں یہ تقریر ان کے رسالہ ترجمان القرآن کی اگست 1951 کی اشاعت میں بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے تفسیر وغیرہ میں بھی وہی کچھ لکھا' جو اس ریڈیو پہ ہونے والی تقریر میں کہا تھا۔ اس لیے میں اس تقریر پر زور دے رہا ہوں کیونکہ قرآن کی ان روایات کی یہ تفسیر دنیا میں بھی نشر ہوئی۔ کہا یہ گیا کہ یہ روایات رسول اللہ کی بیان فرمودہ ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا آسمانوں پر جانے سے قبل' روایات کی رو سے آپ ﷺ کا عملِ تطہیر

وہ روایات یہ تھیں کہ ''حضرتِ محمد ﷺ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے۔ باون سال کی عمر تھی۔ کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکا یک جبریل فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپ کو زم زم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زم زم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا'' میرا خیال ہے کہ میں تنقید چھوڑتا چلا جاؤں۔ تنقید آپ خود کر لیجیے۔ بارہ سال منصب نبوت پہ فائز ہوئے بھی گذر چکے تھے۔ بارہ سال کے بعد عملِ تطہیر آ رہا ہے۔

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1978ء)

Marfat.com

عمل میں کیسے آ رہا ہے: ''سینے کو چاک کیا جا رہا ہے۔ اسے پھر زم زم کے پانی سے دھویا جا رہا ہے۔ اس میں پھر علم' بردباری اور دانائی اور ایمان ویقین بھرا جا رہا ہے''۔ بارہ سال کے بعد یہاں سے نبوت کے دعویٰ کی ابتداء ہو رہی ہے۔ Physically یہ علم اور بردباری اور دانائی کا بھرنا تو ایک طرف رہا' ایمان اور یقین بھی اس وقت Physical Disection کے بعد سینے کے اندر بھرا جا رہا ہے۔ میں اس لیے یہ زور دے رہا ہوں کہ یہ ہماری وہ تقاریر ہیں جو ساری دنیا میں سنی جا رہی ہیں اور آگے اس پہ اضافہ کر دوں کہ پھر یہ وہ تفسیریں ہیں جن کے ترجمے اب انگریزی میں ہو رہے ہیں اور انہیں اتنی شہرت دی جا رہی ہے کہ ہوٹل کانٹی نینٹل لاہور (Hotel Continental Lahore) ہوٹل میٹروپولیٹن کراچی (Hotel Metropolitan Karachi) میں اس تفسیر کی تعارفی تقریبات ہوتی ہیں' ان کے انگریزی کے ترجمے ہوتے ہیں' انہیں دنیا بھر میں نشر کیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو اس کے اندر دنیا کو دی جاتی ہے کہ یہ ہے قرآن کی تفسیر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے' اور یہ ہے وہ مقامِ نبوت جو پہلے فقرے میں پیش کیا جا رہا ہے: علم' بردباری اور دانائی اور ایمان ویقین سے آپ ﷺ کا سینہ بھر دیا۔

سفر کے لیے براق کی سواری کا ماجرا

''اس کے بعد آپ کی سواری کے لیے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا''۔ جانور کا قد بھی بتایا جا رہا ہے' رنگ بھی بتایا جا رہا ہے۔ ''برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام براق تھا'' لیکن قرآن میں یہ نام نہیں ہے۔ ہاں۔ براق نام ہے' اور اس کی تصویریں تو آپ نے مختلف مقامات میں ٹنگی ہوئی دیکھی ہونگی' وہ پیچھے سے گھوڑا' آگے سے اس کا چہرا انسان کا اور پر لگے ہوئے' براق نے اڑنا جو تھا۔ یہ تصویریں ہمارے ہاں عام لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہرحال وہ تو کہیں گے کہ مصوروں کے خیالات ہیں۔ لیکن یہاں بات یہ ہے کہ وہ ایک جانور تھا' خچر سے ذرا کم تھا۔ یہ اس کا رنگ تھا۔ برق رفتاری کی وجہ سے اسے براق کہا جاتا تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ یہ جانور تھا جو حضرتِ نوحؑ کے وقت سے لے کر حضورؐ کے زمانے تک اسی سواری کے لیے مخصوص تھا۔ یہ جانور Physical تھا' اسی صورت میں اس کو خچر کے برابر ایک جانور کہیں گے کہ وہ طبعی طور پر مویشیوں جیسا ایک جانور ہوگا۔ اس کے لیے وہ مخصوص تھا۔ جب آپؐ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریل نے تھپکی دے کر کہا: ''براق تُو کیا کرتا ہے تُو تو وہ ہے جس پر حضرتِ نوحؑ کے بیٹے حضرتِ عیسیٰؑ سواری کرتے چلے آئے''۔ یہ چیزیں کہتے ہوئے' جھجک تو ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن وہ تو ایک ایک فقرے میں کچھ تو کہنا اور دہرانا ہی پڑے گا۔ ''براق تُو کیا کرتا ہے' آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت اور کوئی انسان' تجھ پر سوار نہیں ہوا''۔

اس سفر کی پہلی منزل مدینہ' دوسری طورِ سینا' تیسری بیت اللحم اور پھر بیت المقدس

پھر آپ اس پر سوار ہوئے اور جبریل آپ کے ساتھ ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی' جہاں اتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبریل

نے کہا: ''اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے''۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی' جہاں خدا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے تھے۔ تیسری منزل بیت اللحم کی تھی' جہاں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ چوتھی منزل بیت المقدس کی تھی' جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔ یہ کہتے ہیں کہ بیت المقدس یہودیوں کا وہ معبد یا ہیکلِ سلیمانی تھا' جو یروشلم میں واقع تھا۔ میں ابھی اس کی تاریخ پیش کرونگا اور انہی کی زبانی پیش کرونگا۔ اب بھی عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ بیت المقدس یہودیوں کے اس معبد یا اس ہیکلِ سلیمانی کو کہا جاتا تھا۔ اس سفر کے دوران ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا: ''ادھر آؤ''۔ آپ نے توجہ نہ دی۔ جبریل نے بتایا: ''یہ یہودیوں کی طرف بلاوا تھا''۔ دوسری طرف سے آواز آئی: ''ادھر آؤ''۔ آپ اس کی طرف مخاطب نہ ہوئے۔ جبریل نے کہا: ''یہ عیسائیت کا داعی تھا''۔ پھر ایک عورت نہایت ہی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریل نے کہا: ''یہ دنیا تھی''۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریل نے کہا: ''دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجیے''۔ آپ خدا کے ایک رسول ہیں جنہیں یہ ساتھ ساتھ بتایا جاتا ہے۔ پھر ایک شخص ملا' جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا' مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریل نے کہا: ''یہ شیطان تھا' جو آپ کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا''۔ بیت المقدس پہنچ کر آپ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا' جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ابھی میں عرض کرونگا' باندھنے کی شکل کیا تھی؟ جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے' یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پہلے انبیاء حضرتِ نوح علیہ السلام سے شروع ہوئے تھے اور یہ یروشلم جو ہیکلِ سلیمانی تھا' وہ تو یہودیوں کے پیغمبروں کے وقت میں آ کے بنا تھا۔ لیکن بقول ان کے وہ پہلے انبیاء بھی یہیں آیا کرتے تھے اور اسی مقام پر' اسی ہیکلِ سلیمانی میں' براق کو باندھا کرتے تھے۔

کیا مسجدِ اقصیٰ سے مراد ہیکلِ سلیمانی ہے؟

یہودیوں کا یہ معبد' جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے' بطور ٹیمپل (Temple) مشہور ہے۔ اسے ہی بیت المقدس کہا جاتا ہے اور یہ جو مسجدِ اقصیٰ ہے جس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ '' مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف خدا لے گیا'' تو یہاں روایات کی رو سے مسجدِ اقصیٰ سے مراد یہ ہیکلِ سلیمانی لیا جاتا ہے۔ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا' جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لیے صفیں بندھ گئیں۔ آپ نے دیکھا کہ سارا کچھ فزیکل (Physical) ہو رہا ہے' حضور ﷺ اپنے جسدِ مبارک کے ساتھ' فزیکلی (Physically) ' جسم کے ساتھ' ایک جانور پہ سوار ہو کر' ایک مقام میں پہنچے ہیں' جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے اور انہی روایات کی رو سے پیغمبر جو ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوئے' وہ کہتے ہیں کہ وہ سب وہاں موجود تھے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انسان! سوچیے کہ ان کے جمع ہونے کے لیے کتنی جگہ درکار ہے۔ وہ سب وہاں جمع تھے یعنی اگر یہ معنوی طور پر کوئی ایسی بات تھی تو پھر تو اس میں کوئی بھی مشکل نہیں پیدا ہوتی۔ ٹھیک ہے ساتھ ہی یہ کہیے کہ کوئی دنیا تھی تو پھر بھی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو جسمانی طور پہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے' براق کو باندھا جا رہا ہے اور میں ابھی عرض کرونگا' پتھر کے ساتھ باندھا جا رہا ہے۔

نبی اکرمﷺ کی امامت میں ہیکلِ سلیمانی کے اندر تمام انبیاء کرام نے نماز ادا کی

حضورﷺ اس معبد میں' اس ہیکل میں' داخل ہوتے ہیں۔ یہ ایک فزیکل (Physical) عمارت کا نام ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں' جو غور سے سننے کی ہیں۔ مجھ سے نہ سنیے عزیزانِ من! سوچیے کہ ساری دنیا میں یہ چیز ہم نے نشر کی ہوئی ہے' پھیلائی ہوئی ہے۔ ہزار برس سے ہم یہ تفاسیر دنیا کی زبانوں میں منتقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ ''آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لیے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لیے کون آگے بڑھتا ہے''۔ جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں کی صفیں بندھی ہیں۔ غور فرماتے چلے جائیے۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں پانی' دوسرے میں دودھ' تیسرے میں شراب تھی۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبریل نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔ نبوت کے منصب پہ سرفراز ہونے کے بارہ سال بعد جبریل نے مبارکباد دی۔ یہ وہی جبریل تھے جو بارہ سال تک خدا کی وحی حضورﷺ تک پہنچاتے رہے۔ انہوں نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔ پہلا مرحلہ یہاں ختم کرتے ہیں۔

نماز کے بعد سیڑھی کے ذریعے آسمانوں کے سفر کا آغاز ہوا

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریل اس کے ذریعے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ سیڑھی پیش کی گئی۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی نسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ہاں تو سیڑھی پیش کی۔ اس کے ذریعے جبریل آپ کو اوپر آسمانوں کی طرف لے گئے۔ اب آگے پھر آسمانوں کی بات شروع ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق اس آیت سے نہیں۔ یہ جو آیت ہمارے سامنے ہے' یہ مکہ سے بیت المقدس تک لے جانے کی آیت ہے۔ سو یہ حصہ یہاں تک ہے۔ آگے جو تفاصیل ہیں ان کا تو پوچھیے نہیں کہ کیا کچھ ان کے اندر ہے۔ بس پھر یہ چیزیں لے کر آپ جو اوپر ایک آسمان میں گئے۔ دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ آپﷺ نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ حضرت جبریل نے اندر سے پوچھا: ''کون ہے؟ آپﷺ نے بتایا۔ پھر انہوں نے اجازت دی۔ پھر آپ وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں فلاں پیغمبر کا مقام تھا۔ دوسرے میں گئے' وہاں فلاں کا مقام تھا۔ اس طرح سے وہ ایک ایک مختلف آسمانوں پر سے ہوتے ہوئے عرشِ معلیٰ تک جا پہنچے۔ وہاں سے پھر اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوئی اور راستے میں جہنم کے مناظر دیکھے۔ دوزخ میں دیکھا کہ کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کو اپنے بچے نہیں دیئے۔ پھر ایسے لوگ تھے جن کے پیٹ بے انتہا بڑے بڑے سانپوں سے بھرے ہوئے تھے یعنی یہ مختلف چیزیں اس میں دیکھی گئیں۔

Marfat.com

سدرۃ المنتہیٰ کے بعد خدا تعالیٰ سے ملاقات اور روزوں وغیرہ کا تحفہ

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچے۔ تو وہاں سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے پہنچے تو ایک ہموار بلند سطح پر بارگاہ جلال و جمال ذاتِ خداوندی کو سامنے پایا۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ اس میں سب سے بڑی چیز جو اعتراض کی ہے وہ کیا ہے؟ ہم کلامی کا شرف بخشا گیا۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد وہاں باتیں ہوئیں۔ ان میں کیا چیزیں تھیں: ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں اور شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔ ان چیزوں کے لیے یہ سارا کچھ ہوا جو حضور تشریف لے گئے۔ اس میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ واپسی پر نیچے اترے تو حضرتِ موسیٰ سے ملاقات ہوئی۔ خدا نے اپنے رسول پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ آپؐ وہاں سے یہ حکم لے کر نیچے اترے تو حضرتِ موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ میں وہی تقریر کرتا چلا جا رہا ہوں' جو نشر ہوئی ہوئی ہے' جس کے ترجمے اب دنیا کی زبانوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے روداد سن کر کہا: ''میں بنی اسرائیل کا تجربہ رکھتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی''۔ یعنی خدا نے اس پر پچاس فرض کیں' یہ رسولِ آخری زماںؐ اس حکم خداوندی کو لے کے آ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درمیان میں یہ کہا کہ ''مجھے اپنے ہاں کا پہلا تجربہ ہے کہ یہ نہیں پڑھی جا سکیں گی''۔ حکم دینے والا خدا' لے آنے والے رسول' بتانے والے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کہ ''یہ نہیں پڑھی جا سکیں گی''۔ اس حکم دینے والے کے متعلق کیا تصور ہوگا؟ یہاں تو یہ نظر آ رہا ہے کہ ایک خالص یہودی بول رہا ہے معاذ اللہ' معاذ اللہ کہ جس خدا سے تمہارا رسول جا کے ملا' ان کی یہ قوت ہے کہ وہ فریضہ دے چکے جو ناممکن العمل ہے معاذ اللہ' معاذ اللہ' صد ہزار بار معاذ اللہ اور اس یہودی نے' روایت دینے والے نے' ایک تصور آپ کے رسول کا یہ دے دیا کہ انہیں حضرتِ موسیٰؑ بچوں کی طرح پڑھا رہے ہیں کہ کیوں پڑھ رہے ہو۔ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ روایت کیسے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ کہاں سے آئی ہے اور اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ حضورؐ نے کہا ہو کہ ہم بہتر جانتے ہیں' یہ خدا نے دی ہیں' وہ بہتر جانتا ہے۔ میں بہتر جانتا ہوں۔ لیکن پھر وہی یہودی کی روایت ہے کہ انہوں (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے کہا کہ میں جانتا ہوں' نہیں پڑھی جائیں گی۔ کمی کے لیے عرض کیجیے۔ آپؐ گئے۔ عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پہنچے تو پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے وہی بات کہی کہ ''بابا! یہ بھی نہیں پڑھی جائیں گی' پھر جاؤ''۔ پھر گئے۔ پھر دس کم کر دیں۔ پھر آئے۔ پھر انہوں نے یہی کہا۔ پھر گئے۔ پھر دس کم کر دیں۔ آخری بار جب وہ دس آئیں' آپ پھر بھیجے گئے۔ ''بھیجے گئے''۔ وہ تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام آپ کو بار بار کہہ رہے تھے' تو وہاں اگر دس کے حساب سے جو کمی ہو رہی تھی اگر وہ حساب ہی رہتا تو وہ تو آخری دس ہی باقی رہ گئی تھیں تو اس میں اللہ تعالیٰ نے پانچ معاف کر دیں اور پانچ باقی رہ گئیں۔ پھر آئے تو حضرتِ

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام نے پھر یہی کہا کہ یہ پانچ بھی نہیں پڑھی جائیں گی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے تو بار بار جاتے شرم آتی ہے' میں اب نہیں جاتا''۔ اس طرح سے آپ کے ہاں پانچ نمازیں فرض ہوئی ہیں۔ بہرحال آپؐ تشریف لے آئے۔ یہ حصہ جو میں نے کہا ہے' وہ آگے کی آیات ہیں۔ ان میں یہ کچھ لائے ہوئے ہیں۔

یہاں تو اتنی سی بات ہی ہے کہ آپؐ مکہ سے بیت المقدس براق کے اوپر' جو ایک خچر کے برابر جانور تھا' تشریف لے گئے۔ وہاں جا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کی صف بستہ نماز ہوئی۔ آپ ﷺ نے امامت فرمائی۔ سیڑھی آئی۔ اس کے ذریعے آپ اوپر چلے گئے۔ یہ واقعہ ہیکلِ سلیمانی کے اندر ہوا۔ مسجدِ اقصیٰ کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے' یہ اس آیت کی تفسیر ہے کہ یہ مسجدِ اقصیٰ ہیکلِ سلیمانی ہے' جہاں آپ ﷺ تشریف لے گئے تھے اور وہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا' جو آپ نے سن لیا اور یہ بات آپ کی سمجھ میں اور ذہن میں بھی آ گئی ہوگی۔ اسے اچھی طرح سے ذہن میں رکھیے۔ پتہ نہیں دوبارہ وقت ملتا ہے یا نہیں۔ یہ رسول اللہؐ کے زمانے کی بات ہے۔ حضورؐ کے ساتھ یہ واقعہ ہو رہا ہے۔ ہیکلِ سلیمانی میں آپ تشریف لے گئے۔ وہاں یہ سب کچھ ہوا۔

بیت المقدس کے سلسلہ میں یہودیوں کا مطالبہ

مودودی صاحب کی یہی تقریر میں نے آپ کے سامنے سنائی۔ 1951 میں انہوں نے یہ تقریر کی تھی۔ اس کے بعد انہی کا پرچہ ترجمان القرآن ستمبر 1969ء آیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہودیوں نے وہاں بیت المقدس میں اپنا قبضہ جمایا' تو اس سلسلے میں یہ بات بہت زیادہ چھڑی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ اس کے اوپر ہماری ملکیت ہے اور وہ اس لیے ہے کہ یہ تو تمہارے رسول کے زمانے سے بہت پہلے' یہاں ہمارا ہیکل سلیمانی تھا' جس کو خود تمہارے قرآن نے مسجد اقصیٰ کہا ہے' ابھی میں عرض کرونگا کہ وہ مسجد اقصیٰ کب بنی تھی؟ اور کیوں اس کا نام پڑا تھا؟

مسجد اقصیٰ کے سلسلے میں مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین چپقلش کی حقیقت

یہودیوں نے کہا کہ ہمارے ہیکل' ہماری مسجد' اور بیت المقدس کو مسمار کر کے تم مسلمانوں نے یہ مسجدِ اقصیٰ بنائی تھی' تو تم یہ بتاؤ کہ ''جسے تمہارا خدا خود مسجد'' کہہ رہا ہے اور تمہارا قرآن اس کی شہادت دے رہا ہے کہ تم مسلمانوں نے یہ مسجدِ اقصیٰ بنائی تھی' بتاؤ کہ اصل ملکیت کس کی ہے؟ لہٰذا یہودیوں نے یہ شہادت پیش کی تھی' چونکہ یہ قصہ ملکیت کا چلا تھا کہ یہ کس کی ملکیت ہونی چاہیے؟ تو مسلمانوں نے کہا تھا کہ ''یہ ہمارا قبلۂ اول ہے'' اس لیے اسے مسلمانوں کی تولیت میں رہنا چاہیے۔ اس مسئلے یا اس مقدمے نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی تھی کہ ''اپنے اپنے Rights کے لیے دلائل پیش کرو''۔ تو مسلمانوں نے یہ کہا تھا کہ ''یہ ہمارا قبلۂ اول ہے''۔ تو اس پر یہودیوں نے کہا تھا کہ ''ہماری مسجد کو یا ہیکل کو' اگر تم اپنا قبلہ بنالو' تو کیا اس طرح وہ تمہاری ملکیت میں چلا جائے گا؟ گویا ہماری ملکیت چھن

Marfat.com

گئی؟ لہٰذا اگر اسی طرح تمہارے کعبہ کو کل ہم اپنا قبلہ بنالیں تو کیا تم اسے ہماری ملکیت میں دیدو گے؟'' یہ تھا اعتراض جو ان کی طرف سے آیا تھا۔ پھر یہودیوں کی یہ دلیل کہ تم ہماری اس مسجد کو' ہمارے اس ہیکل کو' خود Accept کیے ہوئے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ موجود تھا' وہاں آ کے حضورؐ نے آپ کی روایات کے مطابق اس میں نماز پڑھی ہے' قرآن نے اس کو آپ کی روایات کے مطابق مسجد اقصیٰ کہا ہے۔ پھر تم کیسے یہ کچھ کہہ سکتے ہو کہ یہ ہماری ملکیت ہے؟ لہٰذا سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ آپ کو پتہ ہے جواب کیا ملا؟ یہی ابھی ابھی جو آپ نے مودودی صاحب کی تفسیر سن لی ہے کہ رسول اللہؐ وہاں تشریف لے گئے اور وہاں ہیکلِ سلیمانی میں جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے' یہ نماز پڑھی گئی تھی۔

حضور ﷺ کی بعثت سے پانچ سو سال قبل ہیکل کی تباہی۔ مودودی صاحب کا اعتراف

ستمبر 1969 میں جب یہودیوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا تو مودودی صاحب نے کہا کہ یہودیوں کے معبد ہیکلِ سلیمانی کے مطابق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے 70ء میں' نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے بھی پانچ سو سال پہلے' حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے صرف 70 سال ہی بعد' ایک رومی جرنیل نے جب حملہ کیا ہے تو اس نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی' اسے ختم کر دیا تھا۔ قصہ یہ کہ یہاں 70ء میں یہودیوں کے ہیکل کا کوئی نام ونشان تک باقی نہیں تھا' کوئی مسجد نہیں تھی' کوئی ہیکل نہیں تھا' کوئی معبد نہیں تھا' ایک دیوار کہیں رہ گئی تھی' جسے یہ ''دیوارِ گریا'' (Wailling Wall) کہتے ہیں' یہ وہاں اس دیوار کے سامنے ہر سال اس کی یاد میں رویا کرتے تھے کہ یہاں ہمارا ایک ہیکل ہوتا تھا' یہاں ہماری مسجد ہوتی تھی۔ یہ چیز عیسائیوں کے خلاف تھی' اور اس سے پیشتر اس جگہ عیسائیوں نے اپنا گرجہ بنایا تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی وہاں ہوئی تھی۔ بہرحال یہودیوں کی کوئی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ تاریخ بتا رہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں' آپؐ سے پانچ سو سال پہلے' وہ سب ختم ہو چکے تھے۔ لیکن آپ کے ہاں تفاسیر میں جو چلا آ رہا ہے' وہ ابھی ابھی میں نے کہا ہے کہ ''مودودی صاحب فرما رہے ہیں کہ ہیکلِ سلیمانی میں جو مسجد اقصیٰ ہے' وہاں آپ نے جا کے نماز پڑھی''۔ اب مودودی صاحب کا اپنا بیان سن لیجیے کہ ''ہیکلِ سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے 70ء میں بالکل مسمار کر دیا تھا اور حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا' اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہیں تھا۔ یہاں کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے وہاں مسجدِ اقصیٰ وغیرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ہم مسلمانوں نے کسی معبد کو توڑ کر یہ مساجد بنائی تھیں''۔ یہ بات تو بعد کی رہی۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسری بات بھی مانی جارہی ہے۔

وہ بھی اور یہ بھی؟

جبکہ یہی صاحب 1951ء میں تقریر ❶ نشر کر رہے ہیں کہ ''قرآن کریم نے جسے مسجد اقصیٰ کہا ہے' وہ یہودیوں کا معبد ہے' جسے ہیکل سلیمانی کہا جاتا ہے۔ یہ رسول اللہؐ کے زمانے میں موجود تھا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں جا کے آپ نے نماز پڑھی بھی اور نماز پڑھائی بھی''۔ اس کے بعد یہودیوں نے کہا کہ ''حضورؐ کے زمانے میں تو تم تسلیم کرتے ہو کہ یہ معبد' یہ ہیکلِ سلیمانی' موجود تھا اور اس کے بعد تو یہ موجود نہیں رہا۔ اب اس کی بجائے وہاں مسجد اقصیٰ ہے' اور وہ مسلمانوں کی ہے۔ بتایئے کہ تمہاری شہادت کے مطابق' قرآن کی شہادت کے مطابق' تمہارے رسول کی شہادت کے مطابق' قرآنِ کریم کی تفسیروں کے مطابق' یہاں معبد' یا ہیکل نہیں تھا اور اگر تھا تو وہ کہاں گیا؟ پھر اس کی جگہ یہ مسجد کس نے بنائی؟ کیا تم مسجدوں کو توڑنے والے نہیں ہو؟ انہوں نے کہا: ''وہاں تو کوئی ہیکل ہی نہیں تھا' وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی' وہاں تو کھنڈر پڑے ہوئے تھے''۔ تو حضور کل تو آپ نے ریڈیو پر' ساری دنیا کو تقریر میں یہ کہا کہ ''وہاں معبد تھا' وہاں ہیکلِ سلیمانی موجود تھا اور اس میں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی''۔

ایک سوال

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہاں یہ کھنڈر تھے' معبد کوئی تھا ہی نہیں' تو پھر یہ تمہارے ہاں کا معراج کا سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے پھر قرآن کی وہ چیز جسے تم مسجدِ اقصیٰ کہتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ وہاں معبدِ سلیمانی تھا' یہ تو سارا واقعہ معراج ہی غلط ہو گیا۔ جب قرآن نازل ہوا ہے تو کیا آپ کے خدا کو بھی معاذ اللہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں تو اس قسم کا کوئی معبد تھا ہی نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ آپ کے رسولؐ تیرہ برس تک مکے اور اڑھائی برس تک مدینے میں اسی ہیکلِ سلیمانی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے' جہاں تم کہتے ہو کہ ہیکل ویکل کوئی تھا ہی نہیں۔ تو یہ کس طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے؟ سنتے جایئے عزیزانِ من! ایک اینٹ آپ ٹیڑھی رکھ دیجئے' تا ثریا می رود دیوار کج۔ آپ دیکھ رہے ہیں' کہ اس میں مسجدِ اقصیٰ کا ایک لفظ آیا تو روایات کی رو سے اس کی وہ تفسیر بیان ہوئی جس کی رو سے کہا کہ اس سے مراد یروشلم میں یہودیوں کا بیت المقدس ہے۔ کہاں معبد تھا جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے؟ یہ آ گئیں ساری تفاسیر۔ اب یہ تفاسیر رسول اللہ ﷺ کی بتائی جا رہی ہیں اور اس کے بعد آپ خود کہہ رہے ہیں کہ وہاں کوئی معبد نہیں تھا' وہ تو کھنڈرات تھے۔ آپ غور فرمایئے کہ روایات کی رو سے یوں قرآن کی تفسیر بیان ہو رہی ہے' یوں یہ حضرات اس تفسیر کو ساری دنیا کے اندر پھیلا رہے ہیں۔ خود ہی اس کی Contradiction ہو رہی ہے۔ آپ خود ہی یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ یہ ہمارے ہاں کے مفسرین ہیں!!

---

❶ یہ تقریر رسالہ ترجمان القرآن کی اگست 1951ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔

یہ ہیں وہ تفاسیر جو بارہ سو سال سے دنیا کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں

میں نے کہا ہے کہ ہزار بارہ سو برس سے آپ کی تمام تفاسیر' روایات کی رو سے' اس واقعہ سے بھری پڑی ہیں۔ اس واقعہ میں ساری بات یہ بیان کی گئی تھی کہ وہاں یہودیوں کا معبد' ہیکلِ سلیمانی تھا جسے مسجد اقصیٰ کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہاں پھر خود انہی کی زبانی آپ نے سن لیا کہ وہاں کوئی معبد نہ تھا۔ اس سے دس برس پہلے یہ حضرت ریڈیو کے اوپر ساری دنیا کو اعلان کر رہے ہیں کہ وہاں حضور ﷺ نے جا کے نماز پڑھی تھی۔ علاوہ ازیں یہ جو ہمارے متقدمین' تفاسیر والے گذرے ہیں' ان کی تحقیق بھی ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے گذارش کی ہے کہ طبری کی تفسیر سب سے پہلی تفسیر ہے جو آپ کے ہاں بعد کی ساری تفاسیر کی بنیاد ہے۔ وہ تفسیر چونکہ بڑی مفصل' ضخیم' طویل' ہے اس تفسیر کا ایک ملخص ''تفسیر ابن کثیر'' کے نام سے ہے اور یہ تفسیر بھی وہی طبری کی تفسیر ہے اور روایات بھی وہی ہیں۔ پھر یہ کہ یہی تفسیر پڑھائی بھی زیادہ جاتی ہے۔ بہر حال' اس قصہ معراج کی رو سے پہلے یہ عرض کیا تھا کہ براق کو حضورؐ نے وہاں باندھا تھا جہاں پہلے انبیاء باندھا کرتے تھے۔ باندھنے کی بات سے پہلے' اس تفسیر میں یہ ہے کہ بیت المقدس کی مسجد کے پاس' اُس دروازے پر پہنچے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ مسجد ہے جس کے دروازے ہیں جبکہ یہ جو ابھی ان کی تحقیق آئی ہے اس کے مطابق اور ساری دنیا کی تاریخ کے مطابق 70ء میں سارا قصہ ہی ختم ہو گیا ہوا تھا۔

حضرت جبریل نے پتھر کے اندر اپنی انگلی سے سوراخ کیا

بہر حال' اس مسجد کے پاس' اس دروازے پر پہنچے جسے بابِ محمد ﷺ کہا جاتا ہے۔ تو وہاں ایک پتھر تھا' جسے حضرتِ جبریل نے اپنی انگلی لگائی تو اس میں سوراخ ہو گیا۔ وہاں آپ نے براق کو باندھا اور مسجد میں چلے گئے۔ وہاں تمام انبیاء سابقہ نے حضور ﷺ کی امامت میں نماز پڑھی۔ بات تو وہی تھی جو انہوں نے بھی کہی تھی کہ وہاں آپ نے براق کو باندھا جہاں انبیاء باندھا کرتے تھے۔ انہوں نے اس میں یہ بات بتا دی کہ وہ پتھر کے ساتھ رسا بندھ ہی نہیں سکتا۔ بہت بڑا جو پتھر ہوا جسے چٹان کہتے ہیں' تو اس میں ایک اعتراض سا پڑتا تھا کہ یہاں اس کے اندر ایک چھید کی ضرورت تھی تو حضرتِ جبریل نے اس کے اندر اپنی انگلی سے یہ چھید کیا اور اس کے اندر آپؐ نے رسا ڈال کے براق کو باندھا۔ بات پھر وہی ہو گئی کہ سارا قصہ Physical چلا آ رہا ہے۔ وہ خچر جتنا ایک جانور تھا' اس کو لے گئے ہیں۔ اس کو باندھنے کے لیے رسا ہے' پھر باندھنے کے لیے کوئی جگہ چاہیے لیکن وہاں تو پتھر ہے۔ پتھر میں تو رسا بندھ نہیں سکتا۔ پتھر میں سوراخ ہونا چاہیے۔ وہ سارا کچھ Physical ہو رہا ہے۔ اور یہی چیزیں ہمارے ہاں صحابہ کے زمانے تک کی روائتیں ہیں کہ بعضوں نے اس واقعہ کو کہا تھا کہ ''یہ روحانی چیز تھی''۔ بعضوں نے کہا کہ ''یہ خواب تھا''۔ ان کے ہاں یہ روائتیں معتبر ترین اور صحیح ترین ہیں اور متواتر چلی آ رہی ہیں۔ چونکہ ان میں پتھر کا ذکر آیا اس لیے اس پتھر میں چھید بھی کیا گیا اور وہاں براق

Marfat.com

کو باندھا گیا۔ سوال پیدا ہوا کہ اس واقعہ کی کوئی شہادت بھی مل سکتی ہے کہ حضورؐ واقعی وہاں گئے۔ Physically وہاں جا کے نماز پڑھی۔ انبیاء کی امامت کرائی۔

واقعہ معراج کی شہادت میں روایات

تفسیر ابن کثیر میں یہ کہا گیا ہے کہ ابوسفیان' ہرقل کے پاس گیا۔ ابوسفیان ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ وہ عیسائیوں کے ایک بادشاہ کے پاس رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف مدد مانگنے کے لیے گیا تھا۔ وہ بازنطینی رومن ایمپائر (Byzantine Empire)[1] کے بازنطینی حصے کا سربراہ تھا۔ اس کا نام ہرقولیس (Hercules) یا ہرقل تھا۔ ابوسفیان اس کے ہاں مسلمانوں کے خلاف مدد مانگنے کے لیے گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ تمہارے پیغمبر کی بھی توہین کرتے ہیں (معاذ اللہ)۔ تو ابوسفیان نے رسول اللہ کے خلاف جو باتیں کہی تھیں وہ ابن کثیر کی روایت کے مطابق یہ ہیں کہ بادشاہ سلامت! میں ایک واقعہ بیان کروں جس سے آپ پر یہ بات کھل جائے گی کہ محمدؐ (معاذ اللہ) بڑے جھوٹے آدمی ہیں۔ ایک دن وہ کہنے لگا یعنی ابوسفیان نے ہرقل سے یہ بات کی کہ محمد ﷺ کہنے لگا کہ اس رات وہ مکے سے چلا اور آپ کی اس مسجد میں یعنی بیت المقدس کی مسجد قدس میں پہنچا اور واپس صبح سے پہلے مکہ پہنچ گیا۔ تو اس نے کہا کہ یہ شخص اس قسم کی جھوٹی باتیں (معاذ اللہ) کرتا رہتا ہے۔ یہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو گویا ابوسفیان نے ہرقل سے یہ کہا کہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''میں یہاں آیا تھا اور اس مسجد میں میں نے نماز پڑھی''۔ یہ بات بیت المقدس کا 'لاٹ پادری' قیصر روم کی اس مجلس میں' اس کے پاس بڑی عزت سے بیٹھا سنتا رہا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انہی رومیوں نے یہودیوں کے سارے معبد تباہ کیے' مسمار کیے' کھنڈرات میں تبدیل کر دیئے۔ اس کے بادشاہ کے پاس وہ لاٹ پادری بیٹھا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ پادری عیسائیوں کے ہوتے ہیں۔ بہرحال یہودی بڑی عزت سے بیٹھا تھا۔ یہودیوں کا 'لاٹ پادری' عیسائیوں کے بادشاہ ہرقل کے پاس عزت سے بیٹھا تھا!! کس قدر ان دونوں میں بغض' عداوت اور نفرت چلی آ رہی تھی' یہ تو یہودی کے سائے تک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال' یہ

---

1. Byzantine Empire is Arabic ***Rum***. The successor to the Roman Empire, dating from AD 330 when Constantine 1 rebuilt Byzantium, the Byzantine Empire and its culture, named it Constantinople, and made it the capital to the Roman Empire. It was also called the Eastern Empire, especially after 395, when Honorius became emperor in the east and Arcadius emperor in the west, thus making permanent the split in the Roman Empire. Although its extent varied through the centuries, the core of the empire was always the Balkan Peninsula and Asia Minor. The last Byzantine Emperor was Constantine XI Palaeologus, who reined from 1449 – 53. Constantinople fell to the Ottoman Turks in 1453, a defeat which marked the end of the empire (Reader's Digest, 1990, p. 227).

Marfat.com

بیٹھا تھا۔ فوراً ہی بول اٹھا کہ ''یہ بات بالکل سچ ہے''۔ آپ یہ سند ملاحظہ فرمائیے۔ ہماری کتب تفاسیر میں یہ سب سے معتبر ترین سند ہے کہ ایک لاٹ پادری نے بادشاہ سے 'قیصرِ روم سے' عیسائیوں کے بادشاہ ہرقل سے کہا کہ ''سچ ہے' مجھے اس رات کا علم ہے''۔

معراج کی رات ہیکل کا دروازہ بھی بند نہ ہو سکا

قیصر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور ادب سے پوچھا کہ جناب کو کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا: سنیئے میری عادت تھی اور یہ کام میں نے اپنے متعلق کر رکھا تھا کہ جب تک مسجد شریف کے تمام دروازے اپنے ہاتھ سے بند نہ کرلوں' سوتا نہ تھا۔ آخر میں' مَیں دروازے بند کیا کرتا تھا یعنی یہ Physical Mosque ہے۔ یعنی یہ مسجد ہے' اس کے دروازے ہیں۔ اس رات مَیں دروازے بند کرنے کو کھڑا ہوا۔ سب دروازے اچھی طرح بند کردیئے۔ لیکن ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا۔ میں نے ہر چند زور لگایا' لیکن کواڑ اپنی جگہ سے سرکا بھی نہیں۔ میں نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ وہ آئے۔ ہم نے ملکر طاقت لگائی۔ لیکن سب کے سب ناکام رہے۔ بس یہ معلوم ہو رہا تھا گویا ہم کسی پہاڑ کو' اس کی جگہ سے سرکانا چاہتے ہیں۔ اپنی مسجد کے دروازے کو بند کر رہے تھے۔ لیکن وہ کھسکا تک نہیں' ہلا بھی نہیں۔ میں نے بڑھئی بلوائے۔ انہوں نے دیکھا بھالا' ترکیبیں کیں' کوششیں کیں' لیکن وہ بھی ہار گئے اور کہنے لگے: صبح پر رکھیے۔ چنانچہ وہ دروازہ اس شب کو یونہی کھلا رہا۔ دونوں کواڑ یونہی کھلے رہے۔ صبح ہی میں اس دروازے کے پاس گیا' تو دیکھا اس کے پاس کونے میں جو چٹان پتھر کی تھی' اس میں ایک سوراخ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رات کو کسی نے کوئی جانور باندھا تھا۔ اس کا اثر اور نشان موجود تھے۔ پتھر پہ رات بھر کے نشان موجود تھے!! میں سمجھ گیا اور میں نے اسی وقت اپنی جماعت سے کہا کہ آج کی رات ہماری یہ مسجد' کسی نبی کے لیے کھلی رکھی گئی ہے اور اس نے یہاں ضرور نماز ادا کی ہے۔ لاٹ پادری نے اپنے بادشاہ سے کہا۔ اس نے ابوسفیان سے کہا: ''دیکھیں اور غور کریں کہ اس کی سچائی کی شہادت کہاں سے مل رہی ہے''۔ اور پھر اس کی سند ہمارے ہاں کے مفسرین نے' ابنِ کثیر جیسوں نے' اپنی کتابوں میں یہ ثابت کرنے کے لیے درج کی کہ حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ میں اس مسجد میں گیا تھا' یہ دیکھیے' اس کی سند یہ ہے۔

ہیکل یا مسجد کے وجود کے سلسلہ میں' یہ بھی ٹھیک اور وہ بھی ٹھیک

ملاحظہ فرمائیے: اس ''مسجد'' کے ''دروازے بند کرنے کی'' یہ سند یا اس مسجد کے سارے قصے کی سند' جو وہاں موجود ہی نہیں تھی' جو اس سے پانچ سو برس پہلے مسمار کی جا چکی تھی' سارے مؤرخین اور یہ صاحب خود' آج جس کو پیش کر رہے ہیں' وہ بتا رہے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں تو وہاں نہ کوئی مسجد تھی' نہ معبد تھا' نہ ہیکل تھا' کھنڈرات پڑے ہوئے تھے۔ یہ بھی ٹھیک' وہ بھی ٹھیک تو پھر درست کیا نہیں؟ درست یہ نہیں کہ اگر پرویز کمبخت ان چیزوں کو دہرادے' تو وہ منکرِ حدیث ہے۔ ماردو گولی اسے۔ عزیزانِ من! اسے جو جی میں آئے کہ دو۔ اس کا یہ ایمان تو محفوظ ہے کہ جس رسولﷺ پر ایمان لانے کے لیے خدا نے ہم سے کہا ہے' جس نے قرآن جیسی باعظمت کتاب دی

Marfat.com

ہے خدا کے لیے اُس سے اِس قسم کی باتیں منسوب نہ کرو۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ رسول ﷺ کی نہیں ہوسکتیں۔ اسلام کو یوں تو دنیا میں رسوانہ کرو۔ اس رسولؐ کے ناموس کا کچھ تو خیال کرو۔ جب تم یہ چیز دنیا کو کہتے ہو کہ بالیقین یہ چیز ہمارے رسولؐ نے فرمائی تھی، جس کی شہادت تمہیں کہیں اور سے نہیں مل رہی ہے تو اس کی شہادت اس قسم کے افسانوں سے دے رہے ہو اور وہ بھی ایک لاٹ پادری عیسائی یا یہودیوں کا 'لاٹ پادری' جو ہرقل کے دربار میں موجود ہے، وہ اُس مسجد کے متعلق کہہ رہا ہے جو تمہاری اپنی تحقیق کے مطابق وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے کہتے ہو کہ ہمارے رسول اللہ ﷺ نے آ کے ہم سے یہ بات کہی کہ میں نے اس مسجد میں نماز پڑھی۔

پرویز کا جرم

عزیزانِ من! یہ جرم ہے پرویز کا۔ اگر یہی جرم ہے کہ میں تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ میں یہ بات کہتا ہوں۔ مجھے اس جرم کا ہزار بار اعتراف ہے۔ مجھے تو خدا کے حضور جا کے اس کا جواب دینا ہے۔ مجھے تو اس ایمان کے مطابق اپنے رسول کا وہاں سامنا کرنا ہے۔ ہاں! مجھے حضور ﷺ کا سامنا کرنا ہے۔ مجھے اسکی کیا پرواہ کہ ان کے فتوے صادر ہوتے ہیں کہ یہ منکر ہے۔ ان کے فتوے سے اگر کوئی شخص کافر ہوتا تو آج زمین پہ کوئی مسلمان باقی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں کہ جس کے خلاف دوسرے فرقے نے کفر کا فتویٰ نہ لگایا ہوا ہو۔ لیکن میں عرض کر رہا ہوں کہ آپ دنیا میں یہ چیزیں پیش کر رہے ہیں۔ اور ان چیزوں کو پیش کرنے کے لیے آپ بڑے بڑے انگریزی دان لا رہے ہیں۔ ان کی خدماتِ جلیلہ گنا رہے ہیں کہ انہوں نے ان کو وہاں بطور حوالہ کوٹ (Quote) کیا ہے۔ یہ بے حد بلند ترین انگریزی زبان کے بڑے بڑے آپ کے ہاں کے مفکر اور فلاسفر اور عظیم لیڈر ہیں جو ان تقریبوں کے اندر شرکت کرنے کے لیے آتے ہیں اور ہزار برس سے اس چیز کو دنیا میں پھیلانے کے لیے آ رہے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی اصل حقیقت

عزیزانِ من! اس مسجدِ اقصیٰ کے متعلق، میں نے گذارش کی ہے کہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے اور اب تو اس کو تسلیم کرنے کے لیے یہ بھی مجبور ہو گئے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی۔ اقصیٰ کے معنی ہیں ''بہت دور''۔ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ یہ شب ہجرت کا بیان ہے۔ سورۃ النحل کی آخری آیت میں کہا گیا تھا کہ تمہارے خلاف یہ اس قسم کی جتنی سازشیں کر رہے ہیں، انہیں کرنے دو۔ ہم ان کی سازشوں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دینگے۔ لہٰذا کہا کہ ''تمہیں بتائیں کہ ہم نے کس طرح ان کی سازشوں کو ناکامی سے ہمکنار کیا ہے''۔

حضور ﷺ کے خلاف کفار کی سازش

سبحان اللہ! ان کی یہ سازش تھی کہ اُس رات، سارے قبیلوں کے نمائندے مل کر، راتوں رات، چوری چھپے جا کے، آپؐ کو قتل کر دیں

Marfat.com

اور ہم نے ان کی یہ تدبیر نا کام بنادی اور اس سے پیشتر ہی ان ﷺ کو مکہ سے نکال کے لے گئے۔ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ (17:1)۔ اس کی طرف لے گئے' اور وہاں ہم نے اپنی وہ نشانیاں دکھائیں جن کے وعدے مکے میں کیے جا رہے تھے کہ یہیں وہ غالب آ کے رہے گا۔ تمام دشمن مغلوب ہو جائیں گے' مکہ اور یہ بیت الحرم' مسجد الحرام' کعبہ پھر تمہاری تولیت کے اندر آئے گا۔ پھر ادیانِ غالب پہ تمہارا دین غالب آئے گا۔ پھر ساری دنیا میں خدا کی بات اونچی ہو گی تا کہ ہم تمہیں وہاں دکھائیں کہ دیکھو' کس طرح ایک ایک بات پوری ہوتی ہے۔ اس غرض کے لیے تمہیں یہاں سے نکال کے وہ خدا راتوں رات مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ مسجد اقصیٰ کیا ہے؟ مسجد اقصیٰ کے معنی ہیں: ''دور کی مسجد''۔ ❶

مدینہ کا ایک نام مسجد اقصیٰ بھی تھا

عزیزانِ من! آپ حیران ہونگے کہ خود ہماری تاریخوں کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ہے' انہی کی کتابوں کے اندر لکھا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں' ہجرت سے پہلے' مدینہ کا ایک نام ''مسجد اقصیٰ'' تھا۔ جنوری 1975ء کا طلوعِ اسلام کا پرچہ میرے پاس ہے۔ اس کے اندر ''مسجدِ اقصیٰ'' کے ہی نام سے میرا ایک مضمون ہے اور یہ تاریخی حوالے اس کے اندر موجود ہیں۔ یہ بہت معتبر تاریخ ہے۔ اس میں یہی لکھا ہے کہ اس سے پہلے مدینہ میں کتنی مسجدیں بن چکی تھیں' کہاں کہاں یہ اجتماعات ہوتے تھے۔ مسلمان تو جہاں دو تین بھی اکٹھے ہوں' وہیں ان کی سجدہ گاہ ہو جاتی ہے۔

ہجرت کا اصل مقصد

مدینہ کی حیثیت تو اب یہ ہو چکی تھی کہ مکہ میں حضور ﷺ کے ان ساتھیوں کے اوپر جو مظالم ہو رہے تھے تو انہوں نے دعوت دی تھی کہ آپ ﷺ یہاں تشریف لائیے۔ آپ یہاں محفوظ ہونگے۔ تو گویا' in fact' مدینے کے مسلمانوں کی حیثیت ایسی ہو گئی تھی کہ علی الرغم قریش کے وہ آپ ﷺ کو Invite کر رہے ہیں کہ آپ آئیے' یہاں مسلمان بھی موجود ہیں' مساکن بھی موجود ہیں' حفاظت کی جگہ بھی موجود ہے' مساجد بھی موجود ہیں' مسلمانوں کی جماعت بھی موجود ہے۔ تو آپؐ نے تو وہاں جانا ہی تھا جہاں خدا کے پیغام کی عملی تشکیل کے لیے فضا سازگار ہو۔ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99)۔ ''جب کہتا ہے مہاجر' کہ وہ چلا اپنے خدا کی طرف'' تو عزیزانِ من! خدا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ کہاں جاتا ہے وہ؟ جہاں خدا کے دین کے غالب آنے کے امکان زیادہ ہو جائیں۔ یعنی یہ عجیب چیز ہے اور ہاں! عجیب بات ہے کہ میں نے تو اب مفہوم القرآن میں' بلکہ اس سے بھی پہلے' جب یہ چیز دیکھی تھی کہ سورۃ بنی اسرائیل میں مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے تو یہ حضور ﷺ کی شب ہجرت کے واقعہ کا بیان ہے' اور اس سے مراد ''مدینہ'' ہے' مکہ سے مدینہ کی طرف جانا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عجیب بات ہے

---

❶ اسی طرح کی ایک اصطلاح ہے: مشرقِ اقصیٰ یعنی Far East۔ (پرویز' 1993' ص۔ 310)

Marfat.com

انسان ہمہ کل تو کسی وقت نہیں ہو سکتا' میرے سامنے یہ تاریخ نہیں تھی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو قرآن کریم میں' صرف قرآن میں' غور و تدبر کے بعد' ایک نتیجہ نکالا تھا کہ یہ شب ہجرت کا بیان ہے' وہ میں نے لکھ دیا تھا۔

نام کے اس سلسلہ میں بڑی تلاش اور کامیابی

لیکن میں مدینہ کے نام کے سلسلہ میں بڑی تلاش میں رہا کہ شاید کہیں سے میرے تدبرِ قرآن کو تصویب مل جائے۔ اس کے بہت عرصہ بعد میں نے مصر سے ایک قرآنِ کریم منگایا۔ اس میں اس کے حاشیے پہ یہ چیز لکھی ہوئی تھی کہ ''مسجد اقصیٰ سے مراد مدینۃ الیثرب ہے''۔ پوچھیے نہیں اس دن مجھے اس بات سے کس قدر خوشی ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا فضل ہے کہ ایک بات جو میں نے محض اپنی فکری بنیاد پہ لکھی تھی' اس کی ایک تائید ملی۔ پھر مجھے اس کی تلاش ہوئی کہ یہ انہوں نے کیسے لکھا۔ آپ حیران ہونگے کہ اس کے بعد مجھے یہ تاریخیں مل گئیں اور ان تاریخوں میں ایک چیز یہ مل گئی کہ مدینہ کا نام ''مسجدِ اقصیٰ'' تھا اور خود وہ خچر جس پہ سوار ہو کے حضورؐ نے یہ سفر مکے سے مدینے تک کیا تھا اس خچر کا نام ''اسریٰ'' رکھ دیا گیا تھا۔ حضورؐ نے اس خچر پہ کئی سفر کئے ہیں اور ہماری تاریخ میں اس کا نام یہ رکھا ہوا تھا۔ میں حیران ہوا کرتا تھا کہ اس کا نام یہ کیسے پڑ گیا۔ اب آ کے یہ عقدہ کھلا کہ یہ وہی خچر تھا جس پہ حضورؐ نے یہ سفرِ ہجرت کیا تھا۔ وہ ''مسجد اقصیٰ'' تو وہاں پہلے سے موجود تھی۔ یہ تو مدینے کا نام مسجد اقصیٰ تھا جیسے مسجد الحرام سے صرف کعبہ ہی مراد نہیں ہوتا' بعض اوقات اس سے پورا مکہ مراد ہوتا ہے۔ خود قرآن میں یہ ہے کہ انہوں نے تمہیں اور وہاں کے رہنے والوں کو مسجد الحرام سے نکال دیا اور جب وہ مدینے میں آئے تو اس سے مراد کعبہ کے رہنے والے نہیں تھے۔ کعبہ میں تو کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کا اندازِ بیان ہے۔ مدینے کا نام ''مسجد اقصیٰ'' تھا اور مسجد تو اب ہمارے ہاں چار دیواری کے اندر گھری ہوئی رہتی ہے' ورنہ مسجد تو حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ''کل روئے زمین کا تختہ' مسلمان کی مسجد ہے''۔ یہ جہاں بھی کھڑا ہو کے اپنے خدا کی اطاعت کرے گا' وہی جگہ مسجد کہلائے گی۔ یہ کسی عمارت کا نام نہیں ہے عزیزانِ من! یہ الگ بات ہے کہ اجتماع کے لیے عمارت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے مسجد صرف اس عمارت کو ہی نہیں کہتے بلکہ جس مقام پہ بھی خدا کے قوانین کی بات اونچی ہوگی' غالب آئے گی' اس کے لیے وہ سرزمین مسجد متصور ہوگی۔

مملکت اسلامیہ میں مسجد کا مقامِ بلند

عزیزانِ من! اسلامی نظامِ سلطنت میں جسے آپ پارلیمنٹ کی حد کہتے ہیں' وہ مسجد کے ہی مترادف ہوگی۔ آج بھی اگر آپ کے ہاں اسی انداز' اسی سنتِ رسول اللہ ﷺ اسی قرآنِ کریم کے مطابق' کوئی مملکت قائم ہوئی اور اس کے ہاں قوانین کے نافذ کرنے کا جو ادارہ ہوگا وہ ''مسجدِ کبریٰ'' کہلائے گی۔ عزیزانِ من! یہاں تو قرآن میں اصطلاح ہی کُبریٰ (53:18) دی ہے۔ دوسری اصطلاحیں مانگنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تمہیں کوئی دوسرا نام رکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج اسے اسمبلی حال کہتے ہیں۔ یہ مملکتِ اسلامیہ کی مسجدِ کبریٰ

Marfat.com

ہے۔ کیا بات ہے! مسلمان تو جہاں بھی خدا کے کلمے کو بلند کرتا ہے تو یہ حضور ﷺ کے ارشاد کی تکمیل ہے۔ ''ساری روئے زمین مسلمان کے لیے مسجد ہے''۔ اور یہ مسلمان کا فریضہ بھی بتایا کہا گیا ہے کہ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ دیکھو''پوری روئے زمین کے اوپر باطل کی کوئی سجدہ گاہ نہیں بنے گی۔ تمہاری ہی سجدہ گاہ اس پر ہونا چاہیے''۔ عزیزانِ من! اسلام کا منتہیٰ بھی یہی ہے کہ یہ سارا کرۂ ارض ساری مسجد ہے۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا(39:69)۔ یہ ساری زمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور پھر اس دن' مقامِ مسجد کی اہمیت اِس حدیثِ پاک کی روشنی میں سمجھ میں آ سکے گی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ہے تفاسیر کی رو سے' ہمارے قرآنِ کریم کی آیات کی تفسیر۔ قرآن کی اس طرح کی ایک تفسیر کا نمونہ تو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس سے اگلی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ پھر وہاں سے سیڑھی کے ذریعے خدا کے ہاں اوپر تشریف لے گئے۔ جب بھی اس کے متعلق اس طرح کہا جائے کہ ہمیں اس سے انکار ہے اس لیے کہ یہ غلط ہے۔ ان کے ہاں کے کسی عقیدے کے خلاف آپ کچھ بھی کہیے تو وہ کفر کا موجب ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ اسلام کے خلاف ہے' یہ قرآن کے خلاف ہے' آپ کے ہاں تو کفر وہ ہے جو اس فرقے کے کسی عقیدے کے خلاف کوئی انکار کیا ہے تو بس سیدھی سی بات ہے: ''یہ کافر ہو گیا ہے''۔ بہرحال' بات یہ ہو رہی تھی کہ حضور خدا کے ہاں تشریف لے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ اس Physical Body کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے پاس گئے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ دو خیال پائے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کچھ صحابہ ایسے تھے جن میں حضرتِ عائشہؓ بھی اور حضرتِ ابنِ عباسؓ بھی تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ بات خواب کی ہے۔ آپ ﷺ Physical Body کے ساتھ نہیں گئے۔ اس طرح انہوں نے تو ان روایات کو مسترد کر دیا۔ اب مانا یہی جاتا ہے کہ آپ ﷺ اس Physical Body کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ اب اگر اس واقعہ سے انکار کیجیے تو کہا یہ جاتا ہے کہ کیا خدا ایسا کرنے پہ قادر نہیں ہے؟ اعتراض یہ ہوتا ہے۔ جواز یہ ہے کہ کون کہتا ہے کہ خدا یہ کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ خدا کی قدرتِ کاملہ پر تو ہمارا ایمان ہے کہ وہ اس پوری کائنات کو نیست سے ہست میں' Nothingness سے Being میں' بغیر کسی میٹریل (Material) کے لے آیا۔ صاحب! اس سے بڑا اور معجزہ کیا ہو سکتا ہے! اس کے بعد یہ تو بڑی چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں کہ خدا اپنی مرضی سے کسی انسان کو کسی جگہ لے جائے۔ اعتراض جو پڑتا ہے' عزیزانِ من! غور سے سن رکھیے۔ شاید پھر بات کرنے کا نہ موقع ملے۔ Physical Body اس جسم کے ساتھ' حضور ﷺ کہیں تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں بتایا کہ ایک ہموار سطح ہے' وہاں خدا بیٹھے ہیں۔ تو گویا یہ ساری چیز Physical ہوئی جبھی تو خدا کو بھی کسی Physical جگہ Space کے اندر آپ نے محدود کیا ہے: یہ ہے اعتراض۔ خدا کہتا ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4)۔ تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے''۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ(50:16)۔ ''ہم تو ہر انسان کی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ(2:115)۔ ''جدھر بھی تم نگاہ اٹھاؤ گے' خدا وہاں موجود ہو گا''۔ خدا کا اگر یہ تصور آ جائے کہ وہ کسی خاص مقام میں' خاص جگہ کے اندر' بیٹھا ہے تو خدا

Marfat.com

کے متعلق یہ تصور خدا کا انکار ہے۔ یہ انکار ہے' اس تصور کا جو قرآن نے خدا کے متعلق دیا ہے۔ عزیزانِ من! اس طرح تو خدا کسی Space کے اندر محدود ہو گیا۔ جب آپ خدا کو یہ مانیں گے کہ وہ کسی Space میں محدود ہو کے بیٹھا ہوا ہے' تو یہ اس سارے تصور کے خلاف چلا جائے گا جو قرآن نے خدا کے متعلق پیش کیا ہے اور قرآن کی تعلیم کی پہلی عظمت یہ ہے کہ اس نے جو خدا کا تصور دیا ہے' وہ اتنا منزہ تصور ہے کہ دنیا کے کسی مذہب میں بھی یہ تصور نہیں ملتا۔ ہر قسم کی تفسیر سے پاکیزہ ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ (57:3)۔ جسے آپ ٹائم (Time) کہتے ہیں یہ ان حدود سے نکل گیا ہے۔ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (57:3)۔ جسے آپ Space کہتے ہیں' یہ اس کی حدود سے نکل گیا۔ Time & Space کی حدود سے ماورا' خدا کا تصور' صرف قرآن دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ تصور دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! یہ عظمت تھی اس تصورِ خدا کی جو قرآن نے پیش کیا۔ لیکن اگر ہم خدا کی اس قدرت کو ثابت کرنے کے لیے خدا کو مجسم طور پر کسی Space کے اندر محدود کر دیں' جہاں ایک شخص اپنے جسم کے ساتھ اس کو ملنے کے لیے جاتا ہے' تو ہم نے خدا کو Space کے اندر محدود کر دیا۔ یوں تو آپ یہاں میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہزار میل کے فاصلے پہ انسان سے باتیں کر سکتے ہیں لیکن جب مجھے خود بجسد عنصری' ملنے کے لیے جانا پڑے گا تو پھر اس شخص کو بھی تو کسی ایک جگہ کے اوپر آپ کو بٹھانا ہوگا کہ وہاں جا کے ملا جائے۔ عزیزانِ من! اس پر اعتراض یہ ہے۔ یہ خدا کی قدرتِ کاملہ پہ اعتراض نہیں ہے' لیکن آپ کو معلوم ہے کہ خدا کی قدرت کے متعلق ہمارے ہاں کیا کیا دلائل دیئے جاتے ہیں' چلیے' انہیں چھوڑیں۔ وہ تو میں پرانی باتیں کر رہا تھا۔

معراج کا اگلا حصہ

اب معراج کا اگلا حصہ لیجیے۔ کہا ہے کہ وہاں سے حضور ﷺ پھر آسمانوں پہ تشریف لے گئے۔ اس کی سند میں جشن ہوئے۔ ہمارے ہاں چراغاں کیا گیا۔ بیت المقدس کی مسجد کی سند تو آپ نے دیکھ لیا تھا کہاں سے ملی تھی؟ ''ہرقل کے دربار کے لاٹ پادری سے'' ملی تھی۔ اب اس کی سند نہیں مل رہی تھی کہ آسمانوں کے اوپر ایک انسان کیسے چلا گیا؟ جب وہ امریکن خلانورد' پہلی دفعہ چاند پہ پہنچے تو ہمارے ہاں نعرۂ تکبیر بلند ہو گیا۔ لیجیے صاحب! آؤ دیکھو' کہاں ہیں وہ معراج کا انکار کرنے والے اور اس کے بعد ان انکار کرنے والے لوگوں کے اوپر جو بوچھاڑ ہوئی تو بس پوچھو نہیں۔ کہا: کم بختو! امریکہ کے دو کفار کے متعلق تو تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ چاند تک پہنچ گئے' لیکن رسول اللہ جیسی ذاتِ اقدس کے متعلق انکار کہ وہ عرشِ معلیٰ پر نہیں جا سکتے۔ کیوں؟ یہ پوچھو ان کم بختوں سے۔ اس سے انہیں یہ سند مل گئی کہ یہ' دیکھو جناب' Physically ایک شخص ہے جو Physical Equipment کے ساتھ Physically کرہ کے اوپر جا کے پہنچے۔ انہ سند مل گئی کہ ''حضور ﷺ بجسدِ عنصری خدا کے پاس اُس عرش پہ گئے تھے''۔ عرش بھی ایک Physical کرہ ہے۔ خدا بھ

Marfat.com

Physically بیٹھا ہوا ہے' رسول اللہ ﷺ بھی تو Physically گئے ہیں۔ لائل پور' جس کا موجودہ نام فیصل آباد ہے' سے ایک ہفتہ وار اخبار المنبر شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم اگست 1969 کی ہفتہ وار اشاعت تھی۔ جب خلانوردوں کا یہ واقعہ ہوا تو اس کے متعلق اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ''بس یہی نہیں کہ اس میں شک وشبہ کا اظہار بھی غلط ہے' بلا شبہ دو امریکیوں نے چاند کی سطح پر چہل قدمی کی اور وہاں کی مٹی جھولیوں میں بھر کر واپس لوٹے''۔ اگر اسے بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ''بیسویں صدی کا کارنامہ اس لیے نہیں کہ جہاں تک کسی انسان کے چاند تک پہنچنے یا اصطلاحِ عام میں چاند کو مسخر کرنے کا تعلق ہے تو یہ ایسے کارنامے نہیں۔ وہ تو اس واقعہ سے چودہ سو سال پہلے انجام دیئے جا چکے۔ ایک مرتبہ تو ایک عظیم انسانؑ جو سید الرسل اور فخر اولادِ آدم بھی ہیں اور سلسلہ نبوت کی آخری کڑی بھی ہیں' آپ ﷺ نے اس زمین پر کھڑے خالق شمس وقمر کے اذن سے' اشارے سے' اس چاند کو دو ٹکڑے کر دیا تھا جس پر پہنچنے کے لیے ہزاروں برس سے انسانی ذہن بیتاب ہے۔ حضور سرورِ کونین ﷺ ہی کے وجودِ اقدس سے یہ عقدہ حل ہوا ہے کہ آپ بنفسِ نفیس اس خطہ ارضی سے' ایک برق رفتار سواری' براق' پر سوار ہو کر تمام ارضی کروں (Spheres) جن میں چاند' مریخ' زہرہ' عطارد اور دوسرے سیارے شامل ہیں' شمسی سیاروں ہی سے نہیں' افلاک کے ساتوں مدارج طے کرتے ہوئے' اس حریم قدس تک پہنچے' جہاں کسی مخلوق کی رسائی نہیں ہے۔ حضور خاتم النبیین علیہ تحیۃ والسلام سے متعلق ان دونوں عظیم تر اعجازی واقعات ہی کا اثر تھا کہ حکمائے اسلام نے اپنے پاؤں تلے کی زمین کے بارے میں معلومات وانکشافات پر ہی قناعت نہیں کی۔ انہوں نے ہیئتِ افلاک کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل کیں۔ رسدگاہیں تیار کیں وغیرہ وغیرہ'' اس چیز کی سند مل گئی۔ اب بتائیے! انہوں نے کہا کہ کیا اب اس پہ بھی ایمان نہیں لاؤ گے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اس چیز کا تعلق کسی طرح سے بھی حضورؐ کے اس واقعہ سے ہے کہ راکٹ میں بیٹھ کر دو خلاباز چاند کی سطح کے اوپر جا اترے؟ کہا کہ ہاں تعلق ہے۔ ''اس سے ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ بجسدِ عنصری عرش پہ تشریف لے گئے ہوں گے''۔

دنیائے علم ہمارے متعلق کیا سوچے گی

اب ذرا برادران عزیز سوچیے کہ دنیا کے سامنے جب آپ یہ باتیں پیش کریں گے تو میرے آپ کے متعلق دنیا کیا کہے گی؟ وہی جو پہلے کہہ رہی ہے۔ کیا وہ تھوڑا کم ہے جو کچھ اور زیادہ کہہ لے گی۔ ''جتھے ستیاناس او تھے سوا ستیاناس۔ اسیں تے عادی ہو چکے آں جتیاں کھان دے اور عادی بھی ہو چکے ہیگے آں''[1] کہ عزیزانِ من! ہم تو اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ جو جی میں آئے کہیے۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ یہ دلائل جو آپ دنیا کے سامنے دے رہے ہیں' ان کے بعد دنیا آپ کے اس رسولِ اکرمؐ کے متعلق' آپ کے قرآن کے متعلق' آپ کے

---

[1] جہاں ایک خرابی ہے وہاں سینکڑوں اور سہی۔ ہم تو جوتے کھانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہاں اور بھی عادی ہو چکے ہیں' خوگر ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

خدا کے متعلق کیا کہے گی؟ اور اس کے بعد آپ کو گلہ ہے کہ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب گزیدہ ہو رہا ہے۔ اس مذہب سے بھی اگر وہ نہ بھاگے تو ''فٹے منہ اوہدی تعلیم اتے''۔❶

عزیزانِ من! اس طالب علم (Student) کو آپ ابھی ابھی کلاس کے کمرے کے اندر نیوٹن (Newton:1642-1727) کا تصور Miscellaneous Universe آئن سٹائن (Einstein:1897-1955) کا فلسفہ Theory of Relativity پڑھا رہے ہوں کہ اتنی بلندیوں کے اوپر حصولِ علم کے لیے جا رہے تھے کہ پنتالیس ہی منٹ کے بعد گھنٹی بجتی ہے اور اس کے بعد اسلامیات آ جاتی ہے اور اس میں یہ چیزیں آپ کو پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ دوسرا پیریڈ ہوا۔ تیسرا پیریڈ تو میتھ (Mathematics) کا ہوا۔ کیا یہ طالب علم آپ کے ہاں کے اس دارالعلوم میں مزید علمِ ''دین'' حاصل کرنے کے لیے چلا جائے گا؟ یا اگر اس نے نماز پڑھنے کو روز جانا تھا تو کیا اس کے بجائے وہ کیفے ٹیریا میں چلا نہیں جائے گا؟ عزیزانِ من! یہ ہے وہ اسلام، غیروں کو تو چھوڑ دیجیے کہ وہ اس اسلام کے متعلق کیا کہتے ہیں، ان نوجوانوں کے متعلق پوچھیے کہ وہ انہیں کیا کہتے ہیں؟ پرویز کا جرم اتنا ہی ہے عزیزانِ من! کہ وہ ان نوجوانوں کو قرآنِ کریم کی تحقیق کی رو سے انسانی علم کی سطح کے مطابق قرآن کے حقائق سمجھاتا ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی چیز آتی ہے جسے حضورِ سرورِ کائناتؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ چیز اس بلند ترین شخصیت کی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ ہو سکتی ہے کہ جسے ہم عالم الناس مانتے ہیں صاحب! حضور ﷺ کی یہ مہمات نہیں ہیں، اس خدا کی نہیں ہو سکتیں جو کائنات کو وجود میں لایا ہے۔ یہ چیز حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب ہے۔ یہ لوگ اسے انکارِ حدیث کہتے ہیں۔ بات آج اتنی ہی ہوئی۔

عزیزانِ من! میں اب اس کے بعد اگلے درس میں یہ عرض کرونگا کہ یہ آیہ جلیلہ کیا ہے۔ جس میں کہا ہے کہ وہاں ہم نے رسول اللہؐ کو اپنی آیات الکبریٰ دکھانی تھیں۔ وہ آیاتِ کبریٰ کیا بیان فرمائی ہیں؟ یہ اتنا بڑا انقلاب تھا جس کی ابتدا پہلے مکہ سے ہوئی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپؐ کی 60% زندگی مکہ ہی میں گذر گئی۔ اب وہاں سے حضورؐ کو منتقل کر کے ایک دوسری پُر امید فضا میں لایا گیا ہے تا کہ وہاں ان نشانیوں کو دکھایا جائے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ محسوس طور پہ بتا دیا جائے کہ اب یہاں، وہی اسلام جو وہاں نظری طور پہ پیش کیا جا رہا تھا، اب اس کے عملاً پیش کرنے کا دور آ گیا ہے۔ تیرہ برس سے وہاں مکہ میں اور یہاں سات برس کے اندر مدینہ منورہ میں اس طرح سے وہ جو ایک ایک دانہ بویا، اسے سات سات سو دانے کی شکل میں فصل بن کے چھونا ہے، عزیزانِ من! اس کے صدقے میں، دنیائے فکر و نظر میں جہاں کہیں کسی حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے، وہ سب کا سب تحقیق کر کے دیکھ لیجیے گا، قرآن ہی کے کسی نہ کسی گوشے کی تفسیر ہوگی۔

---

❶ تو برا ہوا ان کو دی جانے والی تعلیم کا۔

Marfat.com

اس کا اقرار کوئی کرے یا نہ کرے وہ ہوگا اسی کی تفسیر۔ یہ کیا تھا؟ اس سات سال میں دنیا کے سامنے آیاتِ کبریٰ آئیں تھیں۔ شق القمر کا معجزہ تو کسی بھی صاحب نے نہ دیکھا' نہ سمجھا کہ وہ معجزہ کیا ہے؟ وہ معجزہ یہ ہے جو چودہ سو سال پیشتر اس نے یہ کہا کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا** (45:13)۔ یہ جنہیں تم آسمانی کرے (Heavenly Bodies) کہہ رہے ہو' اپنے آپ کو خاکی انسان کہہ رہے ہو' ہم نے تمہارے لیے ان کو قانون کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے۔ جاؤ اور ان کی تسخیر کرو۔ آدم کا یہ فریضہ ہے۔ چودہ سو سال پیشتر عزیزانِ من! معجزہ اسے کہتے ہیں۔ آج اگر دنیا میں تسخیرِ قمر ہوگی تو یہ وہی تسخیر ہوگی جو چودہ سو سال پہلے آدم کے متعلق قرآن نے کہا تھا لیکن یہاں بھی وہ' یہ چیز نہیں مانیں گے بلکہ وہ صرف یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب! یہ اگر یہاں سے راکٹ میں بیٹھ کے گئے تو ہمارے رسول بھی اس طرح سے وہاں چلے گئے۔ عزیزانِ من! آج اتنے میں ہی وقت ہوگیا' اللہ کرے وہ بات' جو میں کہنا چاہتا تھا' صاف ہوگئی ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

❀❀❀❀

قرآن فہمی کے سلسلے میں پرویز صاحب کا ارشاد

'' قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہو سکتا ہے، نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا قرآنی حقائق، بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ ھی حتی مطلع الفجر۔ '' [مفہوم القرآن، ص۔ ط۔ از علامہ پرویزؒ]

Marfat.com

تیسرا باب: سورة بنی اسرائیل (آیت 1 تا 5)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى
لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا
شَكُوْرًا ۝ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ
الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

عزیزانِ من! آج جون 1975 کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کے لیے سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہمارے سامنے آئی اور آج بھی ابتداً اسی کا کچھ حصہ پیشِ خدمت ہوگا۔ اس آیت میں جو کہا گیا ہے وہ یہی تھا کہ عام ترجمہ: ''کس قدر بابرکت ہے خدا کی وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کیطرف لے گئی جس کے ماحول کو ہم نے بڑا بابرکت بنایا ہے تاکہ وہ وہاں اپنی نشانیاں دکھائے''۔

شبِ معراج کے عقیدے کی حقیقت

میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے متعلق آج تک ہمارے ہاں یہی تصور چلا آ رہا ہے' یہی مانا جاتا ہے اور یہی عقیدہ ہے کہ یہ شبِ معراج کا بیان ہے اور اس بیان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حضور ﷺ مکہ سے بیت المقدس براق پر تشریف لے گئے۔ وہاں تمام انبیاء کرام جمع تھے اور حضور ﷺ نے ان کی جماعت کی امامت کرائی۔ پہلا حصہ تو یہ تھا۔ اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ وہاں ایک سیڑھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی اور اس پہ حضرتِ جبریل کے ہمراہ حضور ﷺ آسمانوں کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ عرشِ اعظم پر پہنچے' باری تعالیٰ سے ملاقات ہوئی' اس شرف سے نوازے گئے۔ وہاں سے پھر واپس تشریف لائے' پھر بیت المقدس میں اور وہاں سے پھر واپس مکہ تشریف لے آئے۔ یہ واقعہ شبِ معراج کا بیان کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ ہے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف جانا۔ اس کے متعلق تو پھر بھی یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ مسجدِ حرام سے مراد مکہ اور مسجدِ اقصیٰ سے مراد یروشلم میں یہودیوں کا ہیکلِ سلیمانی ہے۔ آپ وہاں تشریف لے گئے تھے اور دوسرے حصے میں اس زمین سے عرشِ اعظم تک خدا کے حضور جانے کی بات ہے اور یہ بھی مانا جاتا ہے گو کہ

شروع میں ہی کچھ حضرات کی روایات میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ سارا قصہ یا حضورؐ کے خواب کا تھا یا روحانی تھا لیکن ان چند کے علاوہ، متفقہ طور پہ یہی مانا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے اس جسدِ عنصری کے ساتھ، طبعی جسم کے ساتھ ہوا۔ اسی کے ساتھ آپ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ اسی کے ساتھ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے۔

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اعجاز کا تعلق ہے اس میں تو کسی قسم کا شک وشبہ ہی نہیں ہے کہ وہ جو جی چاہے، جس طرح جی چاہے، کرسکتا ہے اگرچہ اس نے اس کا وعدہ کیا ہے کہ وہ اب اس کائنات میں قوانین کے خلاف کچھ نہیں کرتا لیکن بہرحال ہمیں اسے تسلیم کرنے میں قطعاً تامل نہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ جو چیز اس میں قابلِ اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضور ﷺ اس جسدِ مبارک کے ساتھ آسمان پہ گئے اور وہاں خدا تعالیٰ سے اس طرح سے ملاقات ہوئی تو خدا کی طرف سے معجزہ یا قدرت تو رہی ایک طرف، اس سے ماننا یہ پڑے گا کہ خدا بھی کسی Space کے اندر، کسی مکان کے اندر، کسی جگہ کے اندر ہے، جہاں ایک شخص نے Physically اپنے جسم کے ساتھ، ملاقات کے لیے جانا ہے، تو یہ تصور خدا کے اس تصور کے خلاف ہے جو قرآن نے دیا ہے۔

خدا کی ذات مادی صفات سے ماوراء ہے

قرآن نے خدا کا یہ تصور دیا ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن اگر اسے کسی خاص Space کے اندر جسے مکان کہتے ہیں، جسے جگہ کہتے ہیں، ہم رکھ لیتے ہیں تو خدا کے متعلق یہ تصور اُس تصور کے خلاف ہے جو قرآن نے دیا ہے۔ اس لیے خدا کے متعلق یہ تصور غلط ہے۔ پہلی بات خدا کے اس غلط تصور کی یہ ہے کہ اس طرح وہ Time & Space کی حدود میں مقید ہے۔ Time کو زمان کہتے ہیں، جسے زمانہ کہا جاتا ہے اور Space کا ترجمہ مکان کیا جاتا ہے۔ یہ جسے آپ Matter کہتے ہیں، جسے آپ مادہ کہتے ہیں، اس کی Definition یہ ہے کہ وہ جگہ Space گھیرتا ہے یعنی وہ جگہ لیتا ہے۔ مادہ اپنی جگہ لیتا ہے اور ٹائم میں Exist کرتا ہے تو گویا جو چیز کسی Space کے اندر ہو اور ٹائم میں Exist کرے تو وہ میٹریل (Material) ہوتی ہے، وہ مادی ہوتی ہے تو خدا کے متعلق بھی اگر یہ تصور ہو جائے کہ وہ کسی خاص جگہ پہ ہے پھر وہ تو مادی انداز کا خدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کا تصور خدا کے متعلق بڑا ہی منزہ اور بڑا ہی مبرا ہے۔ اسی لیے وہ بار بار کہتا ہے: سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ (23:91;37:159)۔ یہ لوگ جو تصور خدا کے متعلق رکھتے ہیں، وہ اس سے بہت اونچا، بہت دور ہے۔ یہی بنیادی چیز تھی۔ ہر مذہب میں خدا کا تصور ایک محسوس پیکر کا تصور تھا جس کی رو سے خدا ایک خاص مقام میں تھا۔ جو محسوس پیکر ہوگا وہ تو پھر زمان میں تو ضرور Exist کرے گا۔ قرآن نے اس کی تردید کی ہے۔ اور خدا کا بڑا ہی منزہ اور بلند تصور دیا ہے جو Time & Space کی ان حدود سے ماوراء اور منزہ ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ایک انسان یا نبی اکرمؐ اس جسم کے ساتھ، کسی خاص مقام پہ گئے تھے جہاں خدا سے ملاقات ہوئی تھی تو خدا کے متعلق یہ ماننا ہوگا کہ وہ کسی خاص مقام پہ

Marfat.com

ہے اور یہی تصور دیا جاتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ خدا عرش کے اوپر ہے' وہاں بہت بڑا تخت ہے اور اس کے اوپر ایک کرسی ہے' خدا اس کے اوپر ہے۔ یہ تو وہی تصور ہے' جو باطل مذاہب کے اندر خدا کا تصور پایا جاتا تھا۔ قرآن کا دیا ہوا یہ تصور نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں کہ یہ واقعہ اس طرح سے نہیں کہ حضور ﷺ بجسدِ عنصری خدا کو ملنے کے لیے کہیں تشریف لے گئے ہوں۔ اس واقعہ کے خلاف اعتراض یہ ہے کہ اس سے خدا کو کسی ایک جگہ مقید' یا مقیم سمجھا جاتا ہے جو قرآنِ کریم کے دیئے گئے تصورِ خدا کے خلاف ہے' اعتراض یہ نہیں ہے کہ خدا ایسا کر نہیں سکتا۔

ہمارے ہاں بیان کی جانے والی سیرتِ رسول ﷺ

دوسری چیز جو مجھے آج آپ سے کہنی ہے' اسے بھی ذرا غور سے سن لیجیے۔ نبی کے متعلق' رسول اللہؐ کے متعلق' آپ جتنی باتیں' جتنے واقعات' جتنی سیرت ان حضرات سے سنیں گے اس میں یہ بتایا گیا ہوگا کہ ہر محیر العقول واقعہ جو حضورؐ سے سرزد ہوا' اتنا ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کیا وہ آپ کی اپنی طرف سے نہیں تھا' وہ خدا کی طرف سے تھا اور اس سے حضور ﷺ کی بڑی عظمت' رفعت' بلندی' شان میں مبالغہ کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم تو حضورؐ کی عظمت اور رفعت کو بلند کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی شان کو بالا کر رہے ہیں' مذہب میں تو چونکہ سوچ کو کوئی دخل نہیں ہوتا ورنہ اگر ذرا سی سوچ سے ہی کام لیا جائے تو آپ دیکھیے کہ بات کہاں آ جاتی ہے۔

خدا کی طرف سے ملنے والی وحی کی خصوصیات

جو وحی نبی کو خدا کی طرف سے ملتی تھی' اس میں تو خود خدا نے یہ کہہ دیا کہ اس میں نبی کی اپنی فکر کا' کاوش کا' محنت کا' صلاحیت کا' فراست کا' کوئی تعلق نہیں ہے۔ مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى (33:3)۔ وحی کی بنیادی Definition یہ ہے کہ اس میں انسانی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ ایک خالصتاً خارج سے ملنے والا علم ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے اس نبی کو دیا جاتا ہے اور وہ علم بھی یہ نہیں کہ اس کے Concepts یا تصورات یا تخیلات دیئے جاتے ہیں۔ اس کے تو الفاظ دیئے جاتے ہیں۔ تو اب اس میں جب خود خدا نے وحی کی یہ Definition کی اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی یہ کہا کہ اس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں تو یہ جو ہمارے سامنے وحی کا متن ہے جسے ہم قرآن کہتے ہیں تو اس میں جس قدر حقائق اور معارف ہیں (10:15)' جس قدر اس کے اندر حکم ہیں' باتیں ہیں' ان میں پھر نبی کا اپنا کوئی دخل نہ ہوا' کیونکہ وحی تو خدا کی طرف سے آئی ہے (10:15)۔ لہٰذا یہ تو خدا کی طرف سے ہوا۔ سو بات تو صرف اتنی سی ہی ہے کہ خدا نے ایک ہستی کو منتخب کیا۔ اس کے لیے اسے وحی دی۔ قرآن میں اگر کوئی چیز ہمیں ایسی ملتی ہے جو واقعی آنکھیں کھول دینے والی ہے' حقیقت کشا ہے' بڑی بلند ہے' جتنا جی چاہے اسے بلندی کے اوپر لے جائیے' رسول اللہؐ کی اپنی ذات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ وہ تو

Marfat.com

خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے الفاظ تک وہی ہیں جو حضور نے دوسروں تک پہنچا دیئے۔ تو یہاں تک تو یہ صورت ہوگئی کہ حضور ﷺ کی اپنی ذات کو وحی کا متن، جو وحی میں مندرج ہے، یا وحی خداوندی میں ہے اس کا کوئی کریڈٹ (Credit) نہیں جاتا۔ کریڈٹ (Credit) تو اتنا ہی ہے کہ رسول امین ہے۔ وہ اس وحی میں خیانت نہیں کرتا۔ جو خدا کی طرف سے ملا اس نے اسے دوسروں تک بعینہٖ پہنچا دیا۔

وحی کی روشنی میں رسول ﷺ خدا کی عظمت اور ہماری سوچ

اب اس کے بعد قرآن نے اسی لیے بار بار یہ کہا ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110)۔ اس سے تم کہہ دو کہ یہ جو وحی ہے وہ تو خدا کی طرف سے مجھے ملتی ہے۔ اس کے بعد میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اور یہاں سے رسول کے مقام کی عظمت شروع ہوتی ہے کہ ایک انسان ہوتے ہوئے وحیٔ خداوندی کی روشنی میں وہ اتنا عظیم انقلاب برپا کر جاتا ہے کہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ جو کچھ نبی کرتا ہے اس میں جس قدر تدابیر ہوتی ہیں وہ اس کی اپنی فہم و بصیرت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جس قدر اس میں پروگرام پاعمل ہوتا ہے وہ اس کی اپنی سیرت و کردار کی بناء پہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اختیار وارادہ سے یہ کچھ کرتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے یہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہ انسان کی حیثیت سے یہ کچھ کرتا ہے۔ اور اسی لیے کہا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)۔ ''اے انسانو! تمہارے لیے رسول کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے''۔ اگر یہ سب کچھ بھی رسول کا ایسا ہو کہ جو خدا کرائے وہ کرتا چلا جائے، جو خدا کہلوائے وہ کہتا چلا جائے، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ عزیزانِ من! معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ۔ اس کا کریڈٹ (Credit) رسول کو دیا جاتا ہے کہ جو خدا نے کہلوایا حضور نے کہہ دیا، جو اس نے کرایا وہ اس نے کر دیا۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ سب کچھ کر کے بھی خدا نے ہی دیا ہے۔ اگر ساری زندگی اس طرح سے گذرگئی، تو کہیے اس میں اس ذاتِ اقدس و اعظم کا جسے ہم رسول ﷺ کہتے ہیں اپنا کیا حصہ (Share) ہوا؟ اس میں تو رسول اللہ کی کوئی سیرت ہی نہیں آتی۔ پھر یہ تو وہی کچھ ہے کہ جو کچھ خدا کرا رہا ہے وہ اسے کرتا چلا جا رہا ہے: نہ اپنا اختیار، نہ اپنا ارادہ، نہ اپنی بصیرت، نہ اپنی فراست، نہ کوئی اپنی تدبیر، نہ کوئی اپنا کارنامہ، نہ کوئی اپنا لایا ہوا انقلاب۔

قرآن حکیم ہر لحاظ سے قدم قدم پر منفرد کلام ہے

غور فرمایا آپ نے کہ جس چیز کو حضور ﷺ کی اتنی بڑی عظمت کہہ کر بیان کیا جاتا ہے، اس میں تو حضور کا اپنا کوئی حصہ ہی نہیں رہتا۔ اسے پھر دہرا دوں کہ قرآنِ کریم وحی ہے، عظیم کتاب ہے، بے مثل کتاب ہے، اس کے عظیم و بے مثل ہونے میں حضورؐ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس میں نبی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ کلام اللہ ہے، یہ خدا کا دیا ہوا علم ہے اور اسی کے دیئے ہوئے الفاظ ہیں۔ قرآن کا یہ بھی اعجاز ہے۔ آپ اس کے الفاظ دیکھیے، اسکا اندازِ بیان لیجیے۔ یہ ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ قرآن کی کہی ہوئی باتیں ان دروس میں پہلے بھی آ چکی ہیں، آگے بھی آئیں گی۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی مثل دنیا کا کوئی انسان نہیں بنا سکتا اور اگر اس کے معارف، معانی اور حقائق اعجاز ہیں تو وہ بھی خدا کے دیئے ہوئے ہیں، رسول کا تو اس میں بھی کوئی حصہ نہیں۔

Marfat.com

وحی کے سلسلہ میں حضور ﷺ کے متعلق ایک وضع کردہ عقیدہ

پھر دہراؤں کہ اگر اس وحی کے بعد جو کچھ باقی ہے اس میں سے جتنا کچھ حضورؐ نے کیا ہے اگر اس کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہو کہ وہ جو کچھ آپؐ نے فرمایا وہ بھی خدا کی طرف سے وحی ہے تو اس کے لیے دوسرا عقیدہ وضع کیا کہ وحی وہی نہیں جو اس قرآن کے اندر ہے بلکہ ہر وہ لفظ جسے آپ نطقِ نبوی کہیں گے یعنی ساری زندگی رسول اللہ ﷺ نے جو بھی باتیں کیں وہ بھی خدا کی طرف سے وحی تھیں۔ اس طرح وحی کی دو قسمیں کر دی گئیں: ایک تو وہ جسے اس قرآن کے اندر کہا کہ "محفوظ ہوگئی" اور دوسرا حصہ قرآن سے باہر رہا۔ ابھی آپ اس تقسیم وحی کے چکر میں نہ پڑیے۔ یہ سوچیے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ جو باقی حصہ ہے وہ بھی وحیِ خداوندی ہے تو عزیزانِ من! نہ تو قرآن کے ان مندرجات میں جو حقائق و معارف ہیں ان میں رسول کا اپنا یعنی حضورؐ کی ذات کا محمدؐ کا اپنا کوئی حصہ ہوا اور نہ جو باقی زندگی میں جو کچھ حضورؐ نے ارشادات فرمائے اس میں کوئی اپنا حصہ ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ہمیں احادیث میں جن کو ہم تسلیم کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ ہی کی تھیں کچھ حقائق و معارف ملیں تو ان کا کریڈٹ بھی حضور ﷺ کو نہیں جائے گا۔ پھر تو جیسے قرآن کے حقائق ہیں اسی قسم کے احادیث کے اندر حقائق ہیں۔ تو ساری عمر میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کے متعلق ہم یہ کہہ سکیں کہ ہاں صاحب! کتنے بلند مرتبے کی بات حضور ﷺ نے کی۔ بات تو حضورؐ نے کی نہیں۔ بات تو وہ خدا کر رہا ہے۔

غور فرمایا آپ نے کہ جب مذہب کی سطح پہ سوچنا چھوڑ دیا جائے تو کس قسم کی چیزیں ظہور میں آتی ہیں۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ حدیثِ رسول اللہ ﷺ بھی وحی خداوندی ہے۔ اگر عقیدہ یہ ہے کہ وہ بھی سارا کچھ جو قرآنِ پاک میں نہیں ہے وحی خداوندی ہی تھا تو جیسے یہ قرآن حکیم حدیثِ رسول اللہ ﷺ نہیں ہو سکتا تو پھر جسے قرآن کہتے ہو وہ کیسے حدیثِ رسول اللہؐ ہو گیا؟ اور پھر آگے بڑھیے جہاں کہیں قرآن کی آیت لکھی ہوئی آئے گی اسے تو "قال اللہ تعالیٰ" کہا جائے گا اور جہاں کہیں حدیث آئے گی اسے "قال الرسول" کہا جائے گا تو اگر وہ سارا وحی ہے تو پھر وہ "قال الرسول" رسول کا قول کیسے ہوا؟ یہ تقسیم ہی غلط ہوگئی۔ سوچیے تو سہی منکرِ حدیث کس کو کہا جاتا ہے؟ آپ اس عقیدے کو کہیں گے کہ وہ یہ مانے کہ رسول کی کوئی حدیث ہوتی نہیں ہے۔ ساری عمر جو حضورؐ نے کہا وہ تو وحی خداوندی ہو گیا۔ یہ تو الفاظ تک کی بات تھی۔ جنہیں ہم حضورؐ کے ارشادات کہتے ہیں ان کے متعلق یہ بات ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا کوئی ایک لفظ ہی نہ رہا عزیزانِ من! اور پھر جتنا کچھ حضورؐ نے کر کے دکھایا اگر وہ بھی خدا کی طرف سے معجزات تھے تو معجزہ کا کریڈٹ (Credit) بھی رسول کو نہیں پہنچتا۔ وہ تو خود کر کے ہی نہیں دکھاتے۔ وہ تو خدا اس سے کرا دیتا ہے۔ ان معجزوں کو اگر دیکھا جائے تسلیم کیا جائے تو خدا نے حضورؐ سے یوں کہا کہ انگلی یوں کرو آپؐ نے کر دی خدا نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ انہوں نے کبھی کھڑے ہو کے سوچا ہی نہیں ہے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ ہم جو دنیا کے سامنے یہ بات کہتے ہیں کہ اس قرآن کی مثل ساری دنیا کے انسان مل

Marfat.com

کے بھی نہیں لا سکتے تو یہ اس دعوے کے ثبوت میں ہے کہ یہ انسانوں کا کلام نہیں ہے۔ یہ ہمارا ایک دعویٰ ہے' اور ہمارا دوسرا دعویٰ اور ایمان ہے کہ دنیا میں' کائناتِ انسانیہ میں' عظیم ترین انسانی شخصیت حضورِ نبی اکرمؐ کی تھی جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی' قصہ مختصر۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ نے کر کے دکھایا' وہ حضورؐ نے اپنی ذاتی' انسانی حیثیت سے کر کے دکھایا۔ وہ ساری سیرت رسول اللہؐ ہے۔ اس میں خدا کا کوئی ہاتھ نہیں' ورنہ حضورؐ کو کریڈٹ (Credit) نہیں جائے گا۔ ہم قرآن کے ساتھ سیرتِ رسول اللہ ﷺ کو بھی چیلنج کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں کہ کسی انسان یا انسانوں کے مجموعہ کا ملا ہوا اس قسم کا کلام لاؤ۔ اور کچھ نہیں تو فکری طور پر ہی لاؤ۔ تم اس کے مقابل میں نہیں لا سکتے۔ یہ ہے بات! اس سے ثابت ہوا کہ خدا کا کلام کتنا بڑا چیلنج ہے۔ اور اسی طرح ہم کہیں گے کہ اس قسم کی سیرت لاؤ جس قسم کی سیرت نبی اکرم ﷺ کی ہے۔ تم ایسی سیرت نہیں لا سکتے۔ کیا ایسی سیرت انسان کہیں سے لا سکتا ہے؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ ہم جب کہیں گے تم نہیں لا سکتے تو ہم کہیں گے کہ وحی کی روشنی کو' اس کے اتباع کو' چھوڑ کے تم انسانی فکر کے اعتبار سے کہو تو اس قسم کا کردار اور سیرت بھی تم نہیں پیدا کر کے دکھا سکتے۔

انسان اگر اتباعِ وحی کرتا ہوا خود اپنی صلاحیتوں کی رو سے یہ کچھ کرے گا تو پھر اس کی یہ سیرت بنے گی اور اسی لیے اس سیرت کو بھی دنیا کے سامنے چیلنج کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ یوں وہ سیرت سیرتِ رسول اللہؐ بنے گی' یوں وہ کردار کردارِ رسول اللہؐ ہوگا' یوں حضور ﷺ کی شخصیت کی یہ بلندی ہوگی۔ یہ ہوگا حضورؐ کا احترام۔ یہ حضور ﷺ کی صحیح رفعت ہوگی۔ وہ مقام ہوگا کہ ایک انسان ہوتے ہوئے وہ کچھ کر کے دکھا دیا کہ دوسرا انسان جب دیکھتا ہے تو اس کی زبان پہ تحسین و آفرین کے پھول آ جاتے ہیں۔ ''ایک انسان ہوتے ہوئے وہ یہ سب کچھ کر گیا''۔ یہ کارنامہ لائے گا اس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کے لیے عقیدت کے پھول۔ ورنہ اگر قدم قدم کے اوپر یہ مانا جائے کہ صاحب! اس میں تو اپنا کچھ حصہ ہی نہیں تھا تو کہاں سے آئیں گے تبریک و تہنیت کے پھول۔

حضور ﷺ کے ساتھ جنگوں کے سلسلہ میں غیر مسلموں کے تاثرات

میدانِ جنگ کی حکمتِ عملیوں کے بارے میں جو غیروں نے حضورؐ کی سیرتیں بڑی بڑی کتابوں میں لکھی ہیں' ان میں وہ ایک ایک قدم کے اوپر اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی جنگ کی Strategy اور طریقے لائقِ تحسین ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے جرنیل انگشت بدنداں ہیں کہ آپؐ نے کس طریق سے یہ جنگیں لڑی ہیں اور اگر ان سے کہہ دیا جائے کہ ''نہیں صاحب! یہ آپؐ نے تو اس میں کچھ نہیں کیا تھا' وہ تو خدا بتاتا جاتا تھا کہ یہاں میمنہ رکھو' یہاں میسرا رکھو' اب حملہ کر دو' اب پیچھے بھاگو' لوٹ جاؤ' اب صلح کر لو' اب نہ کرو' تو یہ جو سارا کچھ لکھا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ کچھ کر کے دکھایا' تو وہ تو ختم ہو جائے گا۔ تمدنی اور سیاسی زندگی کے اندر حضورؐ نے جو نظام قائم کر کے دکھایا' اسے دنیا آج تک مثالی مان رہی ہے۔ حضورؐ نے اپنی ذات میں قدم قدم کے اوپر جس کریکٹر کا ثبوت دیا ہے اسے

Marfat.com

دنیاوالے بے نظیر تسلیم کررہے ہیں اور یہ ہے وہ جس کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (94:4)۔ تیرے ذکر کو اتنی بلندیاں عطا کردیں۔ تو یہ حضور ﷺ کا ذکر ہوگا۔ ورنہ اگر یہ ہو کہ ''رسول ﷺ تو نے تو ساری زندگی میں کچھ کر کے دکھایا ہی نہیں ہے' ہم کراتے تھے اور تم کرتے چلے جاتے تھے' تو اس میں اگر کوئی رفعت ہوگی' وہ تو پھر خدا ہی کی ہوگی۔ قرآن کی ساری عظمت بھی خدا لے گیا اور یہ سارا کچھ جو حضورؐ نے کر کے دکھایا' وہ بھی خدا لے گیا''۔ اپنی طرف سے یہ کہتے ہیں کہ ہم تو حضورؐ کو بڑا بلند مقام عطا فرمارہے ہیں' کبھی نہیں سوچا جاتا کہ اس عقیدے کے ماتحت حضورؐ کی زندگی جو قرآن کہتا ہے کہ ''رسول کی زندگی تمہارے لیے نمونہ ہے'' وہ نمونہ کیسے بنے گی؟ حضورؐ نے جنگ فتح کی' یہ ہمارے لیے کیا نمونہ ہے یہ تو خدا نے فتح کرادی' آپ نے فتح کرلی۔ یعنی سوچیے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے' تو بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ وہ تو میں ان باتوں کے اوپر بعد میں آؤنگا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ اللہ نے کہا: ''اسے پھینک دو'' اور خدا نے اسے سانپ بنادیا اور پھر کہا کہ ''اپنی اصلی حالت پہ آؤ'' تو لاٹھی بن گئی تو اس سے لاٹھی کا مقام بلند ہوگیا' تو اس میں لاٹھی پھینکنے والے کا کیا شرف ہوا؟ اور اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ ''صاحبِ ضربِ کلیم نے جا کے خدا کی دی ہوئی ہدایت کی روشنی میں فرعون کا' ہامان کا اور ان کے جمود کا' اتنی بڑی مملکت کا' ان کے لشکروں کا ایسا مقابلہ کیا' اس اس قسم کی تدابیر کیں' اس اس قسم کے کردار کا وہاں ثبوت دیا' تو ان تمام کو قدم قدم پہ شکست دیتے ہوئے چلے گئے اور فاتح و منصور واپس آئے تو اس کا کریڈٹ تو صاحبِ ضربِ کلیم کو جاتا ہے۔

کائنات کے اس محیر العقول معجزہ کے سامنے ہر معجزہ ہیچ ہے

عزیزانِ من! میں نے کہا کہ اس کائنات کا عدم (Nothingness) سے وجود (Being)) میں آجانا' اتنا بڑا معجزہ ہے کہ اس کے بعد تو اس کے سامنے ہر معجزہ ہیچ ہو جاتا ہے۔ وجود میں آئی ہوئی چیزوں کے اندر کوئی تبدیلی پیدا کردینا' ٹھیک ہے' ہمارے جیسے لوگوں کے لیے کچھ محیر العقول ہو جاتا ہے۔ سوچنے والے کے لیے اس سے زیادہ محیر العقول شے ہی کوئی نہیں کہ دنیا بھر کے Scientists اتنے بڑے تحقیقات وانکشافات کے بعد Cause & Effect کا قانون دے کر چلے گئے کہ ہر Effect جو سامنے آتا ہے اس کا ایک Cause ہوتا ہے' ایک سبب ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ نتیجہ ہوتا ہے۔ پانی گرم ہوتا ہے تو آگ کی حرارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے' تو اس کاربن کی وجہ سے پہنچاتی ہے۔ کاربن جلتی ہے تو آکسیجن کی بنا پر جلتی ہے' جو موجود ہوتی ہے۔ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ سائنسدان ان تمام کو اس لیے پیچھے کی طرف لیے جاتے ہیں تاکہ وہ Cause & Effect معلوم ہوں جن کی بناء پر وہ نتائج نکلے' یہ معلوم ہو کہ اسباب (Causes) کیا ہیں اور ان کے Effects جنہیں معلول کہتے ہیں' کیا ہیں۔ Effects آپ یوں سمجھ لیجیے کہ جو نتیجہ برآمد ہو وہ Effects ہے۔ پہلے اس کے Causes معلوم نہیں تھے' اب سائنسدانوں نے معلوم

Marfat.com

کر لیے۔ سائنس کا انکشاف اتنا ہی ہے کہ اس کی مدد سے سائنسدان ان کے Causes کو Discover کرتا چلا جاتا ہے‘ ان پر پڑا ہوا پردہ اٹھاتا چلا جاتا ہے کہ اُس کا یہ Cause تھا‘ اس کا یہ Cause تھا‘ اور کرتے کرتے جب وہ آغازِ کائنات پر پہنچ جاتا ہے تو وہاں پہنچنے کے بعد بڑے سے بڑا سائنسدان (Scientist) بھی یہ کہہ کے بیٹھ جاتا ہے کہ یہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ چیزیں آئن سٹائن (Einstein 1879-1955) جیسے لوگ بھی کہتے ہیں کہ ”اس مقام پہ آئن سٹائن اور ایک ہل چلانے والا دہقان دونوں یکساں ہیں“۔ نہ وہ بتا سکتا ہے کہ عدم Nothingness سے یعنی جو چیز ہی موجود نہیں‘ کچھ بھی موجود نہیں‘ اس سے یہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور نہ یہ۔ اس کے جواب میں ہم بھی ایسے ہی دہقانی ہیں جیسے ایک کھیت کا دہقانی ہوتا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے‘ اسے معجزہ کہتے ہیں۔ تو جب ہم اس معجزے کو مانتے ہیں تو اس کے بعد جو چیزیں باقی ہیں‘ ان میں کونسا مظہر (Phenomenon) کارفرما ہے؟

سیرت نبوی ﷺ کی عظمت کا راز: وحی کا اتباع

ہاں! تو جس خدا نے Nothingness سے‘ عدم سے‘ پہاڑ بنا دیا‘ اس کے متعلق اگر خدا یہ کہہ دے کہ ہم اس پہاڑ کو دوسرے ہی دن دریا بنا دیں گے تو اس میں کونسی بات ایسی ہے جو ہم کہیں کہ نہیں‘ آپ نہیں کر سکتے۔ خدا کے معجزے سے تو انکار ہی نہیں ہو سکتا لیکن وہ تو خدا کا کریڈٹ ہوگا‘ اس کی قدرت کا کرشمہ ہوگا۔ خدا کی قدرت کو ہم تسلیم کریں گے کہ خدا ایسا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ نبی کے ہاتھوں سے یہ کچھ کراتا جائے اور کہے کہ ہم نے یہ کرایا‘ ہم نے یہ کرایا‘ اس پہ بھی ہم یہ کہیں گے کہ خدا ایسا ہے جو یہ کچھ کرا دیتا ہے۔ اس میں نبی کی عظمت نہیں آتی۔ رسول کی سیرت کی بلندی اس میں ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:11)۔ اے رسول! ان پر اس حقیقت کو واضح الفاظ میں واشگاف کر دو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ یہ ہے سیرت کی بلندی۔ یہ ہے وہ پروگرام کہ وحی آئے اور وہ بتمام وکمال‘ بعینہٖ اس وحی کو انسانوں تک پہنچا دے اور اس کے بعد کہے کہ لیجیے: ”میں بھی تمہاری صف میں کھڑا ہوں‘ اب دیکھیے کہ میں اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ اس وحی کی روشنی میں کچھ کر کے تمہیں دکھاتا ہوں اور تم دیکھو گے کہ وحی کی روشنی میں چلنے والا تمہارے جیسا ایک انسان کیا کچھ نہیں کر کے دکھا دیتا اور جب یہ تمہارے جیسا انسان یہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے تو تم بھی یہ کچھ کر کے دکھا سکتے ہو‘ قیامت تک انسان یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے“۔ یہ ہے نبیؐ کا کیریکٹر (Character) یہ ہے‘ حسین ترین نمونۂ عمل۔ پھر اتنے سے عرصے کے اندر جو کچھ کر کے دکھایا‘ وہ واقعی محیر العقول ہے‘ وہ واقعی بےنظیر ہے اور جس سیرت کا ثبوت دیا ہے‘ جس اخلاقِ عالیہ کا ثبوت دیا ہے‘ تاریخ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔

دنیائے انسانیت میں کیریکٹر کی بلند ترین خصوصیات کی حامل شخصیت

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (68:4)۔ تُو تو کیریکٹر کی بلندیوں

Marfat.com

کے اوپر ہے۔ تو حضور کا کیریکٹر تو اسی صورت میں بلندیوں پر ہوگا جب آپ اپنے اختیار وارادے سے' اپنے فیصلے سے' کچھ کریں۔ جس چیز میں آپ کا کوئی اختیار وارادہ ہی نہ ہو' وہ تو عزیزانِ من! محض مجبوری ہے۔ مقہوری ہے۔ مجبوری کی نہ نیکی' نیکی ہوتی ہے نہ مجبوری کی بُرائی' برائی ہوتی ہے۔ نیکی تو اس میں ہے کہ آپ جھوٹ بولنے کی استطاعت اور قدرت رکھتے ہوئے سچ بولیں۔ اس وقت آپ پر سو مصیبت آئیں آپ انہیں جھیل جائیں۔ اسے کردار کہیں گے اور اگر آپ میں جھوٹ بولنے کی ہی صلاحیت نہ ہو تو اس میں آپ کے کیریکٹر کی بلندی چہ معنی دارد۔ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ گائے کو بڑا کریڈٹ (Credit) جاتا ہے: اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا بھئی! کسی انسان کے متعلق تو یہ کریڈٹ (Credit) جاتا ہے کہ وہ عظیم انسان ہے۔ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا۔ یعنی اس کی جھوٹ بولنے کی استعداد واستطاعت تھی' اس کا اختیار وارادہ تھا' دوراہے پہ کھڑا ہو کے جی چاہتا تو جھوٹ بول کے اتنے فائدے اٹھاتا' جی چاہے تو سچ بول کے نقصانات برداشت کرتا۔ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا۔ یہ انسان کو کریڈٹ (Cerdit) جاتا ہے' گائے کو نہیں جاتا۔ بکری کا کوئی کریڈٹ (Credit) نہیں ہے کہ ساری عمر اس نے کسی کو ڈنک نہیں مارا۔ اس کو ڈنک ہی نہیں دیا گیا اور نہ ہی شیر کو اس بناء کے اوپر کہ صاحب! روز چیر پھاڑ کرتا ہے پھانسی دی جاسکتی ہے صاحب! وہ آپ چیر پھاڑ کرتا ہی نہیں ہے' نہ اس کا جرم' جرم ہے' نہ اس کا کوئی ثواب' ثواب ہے' اور معاذ اللہ کسی انسان کے متعلق بھی اگر یہی عقیدہ رکھ لیا جائے کہ نہ اپنے اختیار وارادہ سے سچ بولتا تھا' نہ اپنے اختیار وارادہ سے عمل کرتا تھا' نہ اپنے اختیار وارادہ سے اتنے بڑے صبر اور ہمت کے مقام آتے تھے تو ان میں وہ پورا اترتا تھا۔ آپ خود تو وہ کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔ خدا اس سے کراتا چلا جاتا تھا۔ یہ اس کی عظمت نہیں ہے۔ عظمت اسی کے اندر ہے کہ وہ ان حرکات کو جو انسان کو پستیوں میں پھینک دیتی ہیں' کرنے کا اختیار رکھنے کے باوجود' وہ ہر امتحان کے اوپر پورا اترتا ہے اور اقدارِ خداوندی کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اس کا یہ کریڈٹ (Credit) ہے۔ ٹھیک ہے کہ کسی کا کسی ایک مقام پر کریڈٹ (Credit) ہوتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی خوبی ہے' قربانی ہے یعنی کسی کی ساری زندگی خاص خشونت وہجو میں گذرے' لیکن کسی خاص مقام کے اوپر آکے اس قسم کے کردار کا ثبوت دیدے کہ آدمی عش عش کر اٹھے تو اس پہ آدمی کہہ دیتا ہے کہ صاحب! اس کا یہ ایک کام ایسا ہے' جو اس کے سارے نامۂ اعمال کو دھو گیا ہے' یہ کہا جاسکتا ہے۔

جس کی زندگی کو ہم شروع سے آخر تک دیکھیں کہ ہر قدم پر اس قسم کا محیر العقول کارنامہ وہ خود کر کے دکھادے تو آپ دیکھیے کہ اس کی زندگی کتنے اونچے مقام پہ پہنچ گئی ہے۔ محمد رسول اللہؐ یا محمد عربیؐ کی زندگی یہ تھی کہ ساری زندگی میں جہاں جہاں کسی امتحان کا مقام آیا ہے' جہاں دوراہا آیا ہے' وہاں اس بلندیٔ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کا ثبوت دیا ہے کہ ساری زندگی مسلسل ایک گوہرِ تابدار بن گئی ہے۔ اور یہ وہ زندگی ہے جس کے متعلق کہا کہ ''اے انسانو! یہ تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''۔ یہ ہے عظمتِ رسول اللہ ﷺ۔

Marfat.com

Cause اور Effect کا باہمی تعلق اور اسکی اہمیت

عزیزانِ من! یہیں یہ ایک نقطہ اور یاد کر لیجیے یا کہیں لکھ رکھیے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ کسی چیز کے کرنے والا ایک Cause ہوتا ہے، پھر اس کا Effect ہوتا ہے۔ اس کائنات کی جتنی مجبور چیزیں ہیں' ان میں بظاہر جو Cause ہے وہ بھی ایک جانور ہوتا ہے۔ مثلاً شیر نے بکری کو پھاڑ دیا۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ شیر اس عمل کا Cause ہے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھیں کہ شیر میں تو خود اس کی صلاحیت نہیں' نہ اس کے ارادے کو اس عمل میں دخل ہے' نہ وہ کہیں دور اہے پہ کھڑا ہے کہ جی چاہے تو پھاڑ دے' جی چاہے تو چھوڑ دے' اس میں تو وہ مجبور ہے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ اس عمل میں وہ شیر اس کا Cause نہیں بنتا۔ اس لیے اسے اس کا کریڈٹ (Credit) نہیں جاتا۔ تو جتنا کوئی شخص' کسی Effect کا Cause بنتا ہے اتنا ہی اس کا کیریکٹر بنتا ہے' اتنی ہی اعلیٰ اسکی سیرت مرتب ہوتی ہے۔ ہم مجرم کو مجرم بھی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اس جرم کا Cause ہوتا ہے۔ اسے غور سے سمجھیے' یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ انسان سے اپنی زندگی میں جو بھی کام سرزد ہوں' اس میں جتنے کاموں پر وہ خود Cause ہوگا' انہی سے اس کا نامۂ اعمال مرتب ہوگا۔ اور اگر وہ اچھے کاموں کا Cause ہے تو یہ وہ انسان ہوگا جسے ہم اچھا انسان' نیک انسان کہیں گے۔ یہ جتنا اس چیز کا Cause ارفع واعلیٰ ہوگا' اتنا ہی اس کا کیریکٹر اعلیٰ ہوگا۔ یہ ہوگا اس کا کریڈٹ۔ اگر کسی اور Cause کا یہ Effect ہوگا یعنی کسی دوسرے کے کرنے پہ یہ Effect ہوگا تو اس کا کریڈٹ اس کو نہیں جائے گا۔ یاد رکھیے کسی چیز کا Effect ہونا کریڈٹ ہی نہیں دیتا۔ صرف کسی چیز کا Cause ہونا ہی کریڈٹ دیتا ہے۔ یاد رکھیے کائنات کی جتنی مجبور چیزیں ہیں وہ کسی چیز کا Cause نہیں ہوتیں اس لیے انہیں کریڈٹ نہیں جاتا۔

انسان کی عظمت کا انحصار اس کے Cause کے پیدا کرنے میں ہے

انسان صاحب اختیار ہے۔ جتنی چیزیں وہ اپنے اختیار وارادہ سے کرتا ہے' وہ ان کا Cause ہوتا ہے اور اس سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں' وہ اس کے Effects ہوتے ہیں۔ تو اس طرح انسان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ کسی چیز کا کتنا Cause بنتا ہے۔ محکوم قوم' مغلوب قوم' ڈکٹیٹرز کے ماتحت قوم' ملوکیت کے ماتحت قوم' تو بیچاری Effect ہی Effect ہوتی ہے' Cause نہیں ہوتی۔ اس کی ذلت وپستی محکوم ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کھانا وہ اس سے بھی بہتر کھائے' جو یہ سب کچھ کرا رہا ہے۔ یہ محکوم محتاج اور غلام اپنے آقا کے احکام کے Effects ہوتے ہیں' آقا Cause ہوتا ہے۔ اس نے ان سے یہ کرایا۔ اس نے فلاں کام کرایا۔ آپ جو اپنے ملازم سے کہتے ہیں کہ جا کے یہ چٹھی ڈالو۔ جو چٹھی پہنچی ہے' یہ Effect ہے۔ اس کا Cause وہ آقا ہے۔ یہ غلام اس کا Cause نہیں ہے۔ غلام یا ملازم Cause نہیں بن رہا۔

ذات خداوندی کسی Cause کی Effect نہیں

یاد رکھیے زندگی میں جس قدر زیادہ ممکن ہو Cause بنیے۔ یہ انسانیت کا مقام ہوگا۔ اور کم از کم Effects بنیے' یہ محکومی کی دلیل ہوگی' یہ کوئی اور کر رہا ہوگا۔ خدا کی قدرتِ کاملہ یا خدا کا عظیم مقام یہ ہے کہ وہ خود کسی Cause کا Effect نہیں ہے۔ وہ تو ہر Effect کا Cause ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ Cause بنتا چلا جائے گا' اتنا ہی خدا کی صفت اس کے اندر آتی چلی جائے گی۔ خدا کے رنگ میں رنگتا چلا جائے گا۔ یہ مقام تو مقامِ خداوندی ہوگا کہ وہ کسی Cause کا Effect نہ ہو۔ اسی لیے اس کے لیے ہمارے ہاں مسبب الاسباب ایک قرآنی اصطلاح تھی جس کا مطلب ہے کہ جتنے Causes ہیں' ان تمام کا انتہائی Cause۔ خدا کسی Cause کا Effect نہیں۔ یہ ہے خدا کی ایک Definition اور خدا کے بندے وہ ہونگے جو دنیا میں کسی چیز کا جتنا زیادہ Cause ہونگے' اتنے ہی وہ خدا کے مقرب ہونگے' اتنے ہی وہ خدا کے بندے ہونگے' اتنا ہی خدا کا رنگ ان کے اندر آیا ہوا ہوگا۔ اس کے برعکس جتنا Effect ہوتے چلے جائیں اتنا ہی وہ کائنات کی مجبور چیزوں میں داخل ہو جائیں گے۔ وہ Things بن جائیں گے' انسان نہیں رہیں گے۔ تو خدا کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ وہ خدا اس لیے خدا ہے کہ وہ کسی اور Cause کا Effect نہیں ہے بلکہ وہ ہر Effect کا Cause ہے۔ یہ ہے خدا کی عظمت۔

موت کے وقت اطمینانِ قلب کے لیے Cause بطور زادِ راہ ہوگا

پھر سن لیجیے کہ انسان کی عظمت بھی اس میں ہے کہ وہ مرتے وقت بتا سکے کہ میں کتنے اچھے Effect کا Cause رہا ہوں۔ اور اگر یہ ہوا کہ میں کتنے Causes تھے جن کا Effect رہا ہوں' تو یہ تو دنیا کے اندر ذلیل ترین زندگی ہے۔ نبی' وحی کے معاملہ کے اندر Effect ہوتا ہے' Cause خدا ہوتا ہے۔ وہ کلام اللہ ہوتا ہے۔ جسے وہ دیتا ہے' وہ اسی کا کلام نہیں ہوتا' اس لیے وحی کے معاملے میں نبی Effect ہوتا ہے۔ اور اگر نبی کی ساری زندگی یہ مان لی جائے' جسے اپنی عقیدت مندی سے کہتے ہیں کہ بڑا اونچا مقام ہے۔ ''ہر لفظ خدا کی طرف سے بولتا ہے' ہر کام اس کی طرف سے ہوتا ہے''۔ یہ تو All Effect ہو گیا۔ وہ کسی بھی عمل کا Cause نہ رہا۔ اور اگر یہی چیز اسوہ حسنہ بنی ہے تو ہمارے لیے تو اور بھی دشواری ہو جائے گی کیونکہ عام انسانوں سے نہ خدا کہلواتا ہے' نہ کراتا ہے۔ آپ تو خود اس نے کچھ کرنا نہیں ہے۔ وہ تو رسول اللہؐ کی اس زندگی کے خلاف چلا جائے گا جس کا آپ کو تصور دیا گیا ہے۔ خدا آپ سے کچھ کراتا نہیں ہے تو پھر اس کے بعد کیا ہوا' بس یہ ہوا کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ نہ ہم خود کچھ کرتے ہیں' نہ خدا ہم سے کچھ کراتا ہے۔ اس کے متعلق تو کہا کہ وہ روٹھا ہوا ہے' اپنے مالک کو منا لو۔ ایک تصور کے بدلنے سے ہم کہاں سے کہاں پہنچے!

مذہب کے خود ساختہ تصورات کے تحت پیدا ہونے والے تصورات

عزیزانِ من! آج کی یہ دو چیزیں یاد رکھیے کہ مذہب کی دنیا اپنے رسول کو بزعمِ خویش جن عظمتوں کا مالک قرار دیتی ہے ذرا اس کا

Marfat.com

Analysis کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں رسول کی اپنی حیثیت' اپنی شخصیت' اپنی ذات' اپنا کردار' اپنی سیرت' اپنی بصیرت' کچھ بھی نہیں رہتی۔ وہ تو معاذ اللہ' معاذ اللہ ایک آلہ بن جاتا ہے۔ جو "خدا کہلائے کہتا ہے' جو کرائے کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے یہ وحی جو قرآن کے اندر ہے' وہی وحی ہے جو خدا نے دی اور اس رسول نے پہنچائی۔ اس حد تک تو رسول کی یہ پوزیشن تھی۔ اسی لیے جب ان مخالفین نے کہا: "آپ ہم سے مفاہمت کر لیجیے"۔ اب مفاہمت کی کیا شکل تھی؟ "یا تو اس قرآن کے بدلے میں دوسرا قرآن لے آیئے یا اسی میں کوئی تبدیلی ہی کر دیجیے"۔ تو آپ نے یہ فرمایا کہ "یہ تو میرے اختیار ہی کی بات نہیں ہے۔ جب قرآن میری اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہے' تو میں خود اس میں تبدیلی کس طرح سے کروں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اللّٰهُ ۔ میں بھی تمہاری طرح' انسانوں کی طرح' اسی کا اتباع کرتا ہوں"۔ یہی تو وہ اصل بات ہے کہ "میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے میں بھی نہیں بچ سکتا"۔ یہ ہے عظمتِ رسول۔ اور پھر اسی سے رسول اپنے ہر فیصلے' اپنے ہر عمل کی Responsibility قبول کرے گا' ذمہ داری قبول کرے گا۔ اور کہے گا کہ "میں نے یہ کیا ہے"۔ اگر اس کے برعکس شیطان کی مثال کے پیش نظر صورت یہ ہو جائے کہ جب اس سے کہا جائے کہ صاحب! یہ کیا کیا؟ تو جواب میں اس نے کہا تھا کہ "میں نے یہ کب کیا ہے' یہ تو خدا نے مجھ سے کرایا ہے"۔ دیکھتے ہیں! آپ تجزیے پہ تجزیہ کرتے چلے جایئے' کیا صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ "نہ سوچنے" کا نتیجہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غلط عقیدت مندیوں کا نتیجہ

مشہور ہے کہ روما کے اس بہت بڑے گرجے میں حضرت عیسیٰ کی ایک نہایت نادر تصویر تھی۔ ہر عقیدت مند جاتا اور اس کے نیچے اپنی عقیدت کی ایک موم بتی' ایک شمع روشن کر دیتا' خواہ وہ شمع کافوری ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس زمانے میں بجلیاں تو تھی نہیں۔ بہر حال ہر عقیدت مند ایک ایک موم بتی جلا آتا۔ آہستہ آہستہ ہوا یہ کہ عقیدت مندیوں کی ان موم بتیوں کے دھویں سے' وہ ساری تصویر ہی چیکٹ ہو کے رہ گئی۔ دھواں ہی دھواں رہ گیا۔ تصویر کا پتہ ہی نہیں چلا۔ یہ عقیدت مندیوں کے دھویں تصویروں کے ساتھ یہ کچھ کرتے ہیں' عقیدت نہیں۔ حضور ﷺ نے تو کہا ہے: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)۔ ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں' علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں' میرے پیچھے چلنے والے' میری سنت کے متبع' وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ لہٰذا عقیدت کی نہیں' دین میں بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقیدت کی شمعیں تو وہ ہیں کہ جن کا دھواں چیکٹ بن جاتا ہے۔ یہ تو بصیرت کی روشنی ہے جو اس تصویر کو جگمگا دیتی ہے۔ آپ سیرتِ رسول اللہ کا مطالعہ' اس کا مشاہدہ اور دنیا میں اس کی تبلیغ' بصیرت کی بنا پہ کیجیے' علیٰ وجہ البصیرت دنیا کو دکھایئے کہ دیکھیے ایک شخص' انسان ہوتے ہوئے اپنی طرف سے کیا کچھ کر کے دکھاتا ہے۔ یہ ہو گی حضور ﷺ کی صحیح عظمت۔ یہ ہو گا حضورؐ کا صحیح شرف و مجد۔ اور یہ ہے حضورؐ کا صحیح مقام۔

Marfat.com

یہ حضور ﷺ کے آسمانوں پر جانے کا نہیں بلکہ ہجرت کا واقعہ ہے

حضور ﷺ کی سیرتِ نبوی جو تمام انسانوں کے لیے اسوہ بنتی ہے' اسے ذہن میں رکھیے گا۔ اور جیسا میں نے کہیں کہا ہے' کہیں نوٹ بھی کر دیجیے گا۔ پتہ نہیں یہ مواقع پھر ملتے بھی ہیں یا نہیں۔ اب اس کی روشنی میں یہ آیت لیجیے: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ (17:1)۔ اگر یہ وہی واقعہ بیان کیا جاتا' تو اس میں آ جائے یہ بات' کہ خدا ان کو وہاں سے وہاں لے گیا' اور وہاں سے وہاں چلے گئے' واپس تشریف لے آئے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو ہجرت کا واقعہ ہے۔ ہر ایک نبی کی زندگی میں جو پروگرام ہوتا ہے' اس کا ایک لازمی حصہ ہجرت بھی دیکھا گیا ہے۔ نبی جس مقام میں پیدا ہوتا ہے' سب سے پہلے جو اس کے اپنے اقرب و جوار ہوتے ہیں' اقرب کے معنی رشتہ دار نہیں ہیں بلکہ وہ جو اس کے گرد و پیش ہوتے ہیں' قریبی ہوتے ہیں' ماحول میں ہوتے ہیں' وہ ان میں اپنی تبلیغ شروع کرتا ہے' نیچرلی (Naturally) شروع ہی وہاں سے کرنا چاہیے' قرآن نے خود جو اس تبلیغ کے مدارج دیئے ہیں' ان میں کہا ہے کہ پہلے جو اپنے عشیرات یعنی اہلِ خاندان ہیں' سب سے پہلے تو وہاں سے بات شروع کرو۔

تبلیغ ہمیشہ گھر سے شروع کرنی چاہیے

عزیزانِ من! جب بھی پروگرام کے مطابق بات شروع کی جائے گی' اپنے گھر سے شروع کی جائے گی۔ تبلیغ کرنی ہے' پہلے گھر سے کرو۔ اصلاح کرنی ہے' پہلے گھر سے کرو۔ رسول اللہؐ کے متعلق کہا ہے کہ وہ کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ (34:28) ہیں یعنی تمام لوگوں کو معاصی سے روکنے والے ہیں' حضور ﷺ کو تمام نوعِ انسان کی طرف خدا نے اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ حضورؐ کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ کے لیے تشریف لائے ہیں لیکن آغازِ کار اپنے اہلِ خاندان سے ہوتا ہے۔ "یہاں سے بات شروع کرو"۔ پھر کہا کہ "مکے والوں سے یہ بات کرو"۔ پھر کہا کہ "اس کے گرد و پیش کی بستیوں سے یہ بات کرو"۔ پھر کہا کہ "اہلِ کتاب کو بھی اس میں شامل کرو"۔ اس طرح یہ دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا' کافۃ للناس کے لیے ہے' وسیع ہوتا چلا گیا۔ اس دَور کی جو مہذب ترین مملکتیں تھیں' ان تک بھی حضورؐ نے یہ پیغام بھیج دیا۔ قیصر' شاہ روم کا لقب' کو بھی لکھ دیا اور کسریٰ' شاہِ ایران' کو بھی لکھ دیا کہ "تمہارے کسانوں' مزدوروں' غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ جو مظالم ہو رہے ہیں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم ان سے باز آ جاؤ۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ان کی ذمہ داری تمہارے اوپر عائد ہوگی اور تم سے ان کا کفارہ لیا جائے گا"۔ تو گویا ابتدائے کار نبی اپنے ہاں سے کرتا ہے۔ جب وہ یہاں دیکھ لیتا ہے کہ پوری تگ و تاز کے ساتھ جو کچھ یہاں کیا جانا ممکن تھا' وہ یہاں ہو چکا تو پھر انسانوں کو تربیت دے کر ساتھ ملاتا چلا جاتا ہے اور ایک جماعت کی تشکیل کرتا ہے۔ پہلا پروگرام یہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت

جب وہ دیکھتا ہے کہ اب جو باقی ہیں ان میں سر دست اس کی صلاحیت نہیں ہے اور میرے پاس وقت تھوڑا ہے تو وہ اپنے ان تربیت یافتہ رفقاء کو ساتھ لے کر، کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جو اس مشن کی کامیابی کے لیے زیادہ سازگار ہوتا ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر جب قرآنی مملکت قائم ہو جاتی ہے تو پھر باقی مقامات پر بھی جہاں جہاں اس پیغام کو ماننے والے ہوتے ہیں وہ اس نظام میں اس مملکت میں آ سکتے ہیں۔ اُس وقت وہ ایک اعلان کے تحت ہجرت کو دوسروں کے اوپر بھی فرض قرار دیدیتا ہے۔ پہلے فرض نہیں قرار دیتا۔ اور اگلا مقام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہجرت کو کفر اور ایمان کے مابین امتیاز قرار دیدیتا ہے کہ "اب اس کے باوجود جو شخص کفر کے ماحول میں زندہ رہنے پہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، پھر وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ جب ایسا ماحول موجود ہو گیا کہ جس میں آپ خدا کے بتائے ہوئے راستے پہ چل سکتے ہیں تو پھر اپنی کسی مصلحت یا مفاد کی خاطر ایسے ماحول میں رہنا کہ جہاں تمہیں غیر خداوندی نظام کے تابع زندگی بسر کرنی پڑے اس کے بارے میں کہدیا کہ یہ اسلام نہیں ہے۔ لیکن یہ اسوقت کہا گیا جب وہاں اس کا امکان پیدا ہو گیا بلکہ وہاں وہ چیز عملاً متشکل ہو گئی، پھر اس وقت ہجرت ہر ایک کے اوپر فرض قرار دے دی گئی۔ یہ ہوتی ہے ہجرت۔

سابقہ سورۃ کی آخری آیتوں میں کہا گیا تھا کہ یہ لوگ تمہارے خلاف بڑی بڑی سازشیں کرتے ہیں اور سازشوں میں یہ بھی ایک چیز تھی کہ اب ہر طرح کا حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا کہ یہ شخص تو اپنے اس مشن کی تبلیغ سے باز ہی نہیں آتا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس کے بعد معاذ اللہ اس کو ختم کر دیا جائے۔ اس مقام پہ جب کفار پہنچے ہیں تو انتہا ہو گئی۔ اب فیصلہ ہو گیا کہ اس مقام کو چھوڑ دینا چاہیے۔ یہی وہ چیز ہے کہ آپ وہاں مکے سے ہجرت کر کے مدینے کی طرف آ گئے۔ اسے کہا ہے: "مسجدِ اقصیٰ"۔ وہ بھی مسجد تھی یعنی وہ مقام، جہاں قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہوا جائے۔ یہ بھی ایک "دور کی جگہ" تھی۔ آج تو ہوائی جہازوں کے نزدیک کوئی جگہ بھی دُور نہیں رہی، ورنہ آپ دیکھیے گا مکہ سے مدینہ تک صحراؤں کے اندر اگر قریباً تین سو میل کا بھی فاصلہ ہے، تو اسے دُور کہا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب بنی امیہ کے زمانے میں عبدالملک نے یروشلم میں مسجد بنائی تو وہ عبدالملک والی یہ مسجدِ اقصیٰ ہے، یہ ہماری مسجد ہے۔ وہ یہودیوں والی بات نہیں بلکہ ہماری بنی ہوئی وہاں مسجد ہے اور وہ جو چٹان کے اوپر ایک قبہ بنایا ہوا ہے، یہ ایک بنی امیہ کے بادشاہ خلیفہ عبدالملک نے کوئی 74ھ میں بنایا تھا، رسول اللہ کی وفات کے اتنا عرصہ بعد بنایا تھا، اس کے اوپر Tablet لگی ہوئی ہے، تختی لگی ہوئی ہے جس میں سنِ تعمیر درج ہے۔ یہ عجیب بات تھی کہ بعد میں عباسیوں کے غالباً ہارون الرشید نے اس میں ترمیم کی تھی، نئے سرے سے کچھ مرمت کرائی تھی۔ اور اس میں اپنے نام کی ایک تختی بھی لگوائی تھی۔ عجیب چیز یہ ہے کہ معمار پہلی تختی اتارنا بھول گئے چنانچہ وہ پہلی تختی اب بھی وہاں لگی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے بھی اسے مسجدِ اقصیٰ اس لیے کہا تھا کہ یہ دمشق میں رہتے تھے۔ دمشق بنو امیہ کا دارالخلافہ تھا اور وہ دمشق سے بھی بہت دور مقام تھا۔ وہ مسلمانوں کے قبضہ میں بھی تھا۔

Marfat.com

چٹان کے اوپر نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی نگاہِ بصیرت

لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے سے' وہاں کوئی مسجد وغیرہ نہیں تھی۔ جبھی تو تاریخ میں آتا ہے کہ جب عیسائیوں کا گرجا دکھانے کے لیے آپ ؓ کو اس تک لے جایا گیا ہے تو وہاں نماز کا وقت ہو گیا۔ آپؓ نے کہا کہ ''میں نماز پڑھ لوں''۔ انہوں نے کہا کہ ''نماز پڑھ لیجیے یہ تو پاکیزہ جگہ ہے۔ میں کپڑا بچھا دیتا ہوں''۔ لیکن آپؓ نے یہ کہا کہ ''نہیں بھئی' یہاں نہیں۔ میں نے اگر یہاں ضرورتاً نماز پڑھی تو ہو سکتا ہے کہ میرے بعد آنے والے مسلمان اس کو اتنا مقدس بنائیں اور یہ کہیں کہ یہاں ایک دفعہ نماز پڑھی گئی ہے' یہ تمہارا گرجا مسجد ہوئی' اسے کہیں یہ مسجد نہ بنادیں' میں یہاں نماز نہیں پڑھتا' باہر نماز پڑھتا ہوں''۔ کیا بات تھی ان لوگوں کی! فاتح کی حیثیت سے اس میں کھڑے ہیں اور احتیاط کا یہ عالم ہے کہ نماز اندر نہیں پڑھی۔ کہنے لگے: باہر پڑھتا ہوں۔ کہنے لگے: کوئی بات نہیں' باہر بھی اللہ کی زمین پڑی ہوئی ہے۔ آپؓ نے باہر جا کر کھنڈر کے اوپر جو چٹان تھی جسے ''تبت الصخریٰ'' کہتے ہیں۔ باہر جا کے پتھر پہ نماز پڑھی۔ اس اعتبار سے وہ ایک یادگار بات بن گئی تھی اور اسی اعتبار سے انہوں نے بعد میں وہاں مسجد بھی بنائی' وہ قبہ بھی بنایا' اس پہ Tablet لگائی ہوئی ہے اور اس کا نام انہوں نے مسجدِ اقصیٰ رکھا تھا: دمشق سے دور' مدینہ سے دور' مکہ سے دور' دور کی مسجد۔

مدینہ کا ایک نام مسجدِ اقصیٰ بھی تھا

یہ جو قرآنِ کریم نے مسجدِ اقصیٰ کہا ہے یہ مدینہ ہے۔ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے مدینہ میں مسجدیں بھی موجود تھیں۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ ہماری تاریخ میں مدینہ کے بہت سے نام آتے ہیں۔ ان میں مدینہ کا ایک نام مسجدِ اقصیٰ ہے۔ ہماری تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ جیسے پورے مکہ کا نام مسجد الحرام ہے' بستی کا نام بھی وہ اسی نام سے پکارتے تھے' اسی طرح وہ مدینہ کا نام مسجدِ اقصیٰ کے اس نام سے پکارتے تھے' غالباً مکہ والے پکارتے ہوں گے کیوں کہ وہ دور تھی' تو آپ وہاں تشریف لے گئے' اور یہاں قرآن نے یہ کاہے کے لیے بتایا کہ اب وہاں جاؤ۔ کیوں؟ لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا (17:1)۔ لِنُرِيَهُ ایک چیز کو ''آنکھوں سے دکھا دینا' محسوس طور پر سامنے لے آنا'' مکہ کی زندگی میں آپؐ سے یہ ساری چیزیں تو کہی جا رہی تھیں کہ اتنا عظیم نظام قائم ہوگا' اتنی عظیم مملکت قائم ہوگی' اس طرح سے لوگ فوج در فوج اسلام کے حلقے میں شامل ہوں گے' مملکتیں اس سے تھرا اٹھیں گی' استبداد مٹ جائے گا۔ یہ ساری چیزیں جو مکہ میں کہی جا رہی تھیں' اب تمہیں آنکھوں سے دکھا دیا جائے کہ ایسا ہو جاتا ہے: لِنُرِيَهُ یہ تو یہاں کہا۔

یہی الفاظ ایک اور مقام پہ بھی آتے ہیں گو کہ Context دوسرا ہے اور وہ ہیں حضرتِ موسیٰؑ۔ فرعون بنی اسرائیل سے جو کچھ کرتا تھا اس کے متعلق حضرتِ موسیٰؑ سے یہ کہا گیا کہ اب اس کی سرکشی کا زمانہ ختم ہو جائے گا' بنی اسرائیل کو نجات ملے گی' انہیں بھی ملکِ عظیم عطا ہوگا' انہیں بھی مملکت ملے گی' انہیں بھی شان و شوکت اور ثروت ملے گی۔ وہ قوم محکوم' مغلوب' ذلیل شدہ' مصر کے اندر رہ رہی تھی۔

Marfat.com

فرعون جیسا بادشاہ، فرعونیت جس کی ضرب المثل ہے، اس کا حاکم تھا تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور کی چوٹیوں پہ گئے اور وہاں آپؑ کو یہ ارشادِ باری تعالیٰ ملا کہ اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی (20:24)۔ جاؤ فرعون کی طرف۔ وہ تو ساحل فراموش سیلاب بن رہا ہے، تباہیاں مچا رہا ہے، اپنے ظلم و استبداد میں بہت ہی آگے بڑھ چکا ہے، اس کی سرکشی حدود فراموش ہوگئی ہے۔ جاؤ اُس فرعون کو اس سے روکو۔ سوچیے تو سہی کس پوزیشن میں تھے حضرت موسیٰؑ؟ محکوم قوم کے ایک فرد، وہاں سے بزعمِ خویش ایسا جرم کر کے بھاگے ہوئے کہ اس کی سزا قتل تھی۔ وہاں پھر گئے ہی نہیں تھے، وہاں قوم اس طرح سے نرغے میں پھنسی ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ "جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے" اور اس سے کہو کہ ہوش میں آئے، ساحلوں کے اندر رہے" اور یہ اگر وہاں نہ مانے تو اس سے کہو کہ "بر سبیل تمدن میں بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں تاکہ انہیں تو خدا کے نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کے دن میسر آجائیں۔ یہ مقصد لے کے گئے۔ سیدھی سی بات تھی واقعی نظر آتا ہوگا کہ:

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابان نگر

فرعون کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابیوں کا ذکر اور حضور ﷺ کو فتح کی نوید

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ایک بکریاں چرانے والے اور یہ اتنا عظیم مشن؟ وہاں خدا نے یہ کہا ہے کہ "ہم نے تمہیں ایک کام کے لیے چن لیا ہے" (17:144)۔ یہ عجیب الفاظ ہیں۔ جب ہم وہاں آئیں گے تو وہاں عجیب بات نظر آئے گی کہ وہ انقلاب جو اس وقت کائنات میں پہلو بدل رہا تھا، اسے ہم تمہیں محسوس شکل میں دکھانا چاہتے ہیں، اس لیے وہاں کہا: لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى (20:23)۔ ہم تمہیں اپنی بلند نشانیاں محسوس شکل میں دکھائیں کہ ہمارے قوانین کے تابع جو نظام بنایا جائے یا جو زندگی اختیار کی جائے، اس میں کس قسم کا محیر العقول انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ یہ جو لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى (20:23) ہے۔ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے وہاں کہا تھا۔ یہاں یہ رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا ؕ (17:1)۔ دیکھتے ہیں کس طرح یہ بات Parallel چل رہی ہے۔ کس طرح یہ قصہ متوازی چل رہا ہے کہ حضورؐ سے بھی مکہ میں یہ کہا جا رہا ہے کہ "وہاں چلے جاؤ، ملتِ ابراہیمیؑ کا اتباع کرو"۔ جب انہوں نے اپنے شہر والوں سے، اپنی قوم سے یہ کہا تھا کہ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلَى اللّٰهِ (37:99) اور اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ (29:26)۔ ان سے بھی کہا گیا۔ وہاں حضرتِ ابراہیمؑ کے ضمن میں مہاجر کا لفظ ہے، کہ "جاؤ، اب ہجرت کر کے وہاں جاؤ"۔ یہ نقلِ مکانی نہیں ہے، یہ فرار نہیں ہے، یہ جان بچا کے بھاگنا نہیں ہے، یہ Escapism نہیں ہے یہ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا ؕ (17:1) کے لیے ہے: "وہ علامات جو ابھی تک پردۂ مستور میں تھیں، ان کے بے نقاب ہونے کا وقت آ گیا ہے، وہاں دیکھو یہ کس طرح کھل کے سامنے آتی ہیں"۔ اس سے یہ مقصد تھا۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ (17:1)۔ "وہ سنتا بھی تھا جو کچھ تم اپنے ذہن میں کہتے تھے کہ یہ کچھ کہا تو جا رہا ہے، پتہ نہیں ہماری زندگی میں ہوگا بھی یا نہیں ہوگا۔ وہ اس بات کو دیکھ بھی رہا تھا کہ کس طرح سے ہو رہا ہے"۔ خدا کے لیے تو ماضی، حال اور

Marfat.com

مستقبل کوئی شے نہیں ہیں۔ وہ تو انسانوں کے لیے ہیں۔ کہا کہ اُن نشانیوں کا محسوس شکل میں آنا تمہاری نگاہوں سے اوجھل تھا' جبکہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ لِنُرِيَهُ ۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی دکھا دیں جو ہم دیکھ رہے تھے''۔ میں نے عرض کیا ہے کہ بات حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں انہی الفاظ سے شروع ہوئی تھی۔ اب اسی ضمن میں سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہم نے ابھی دیکھی ہے جس میں کہا ہے کہ ہم تمہیں نشانیاں دکھائیں گے۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ' ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ میں موتیوں کی مالا کی طرح ربط ہے

دوسری آیت ہے: وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (17:2)۔ دیدۂ کور کو تو قرآن میں واقعی کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ بڑے خوش ہوتے ہیں کہ قرآن میں ربط نہیں ہے اور ان چیزوں کو پیش کرتے ہیں کہ ''لیجیے صاحب! پہلی آیت میں شبِ معراج کے واقعہ کا بیان ہو رہا ہے''۔ اگلی آیت میں ہے کہ وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ (17:2)۔ کہ ''لو جی حضرتِ موسیٰ کو کتاب دینے کا واقعہ آ رہا ہے''۔ اے حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں نہ دیکھنے والے:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

تیرے ان تاروں کے اندر یہ حسین موسیقی چھپی ہوئی ہے۔ انہیں ذرا ٹچ (Touch) کر کے دیکھ' بے نقاب ہو جائے گی۔ اس ساز کے اوپر جو تاریں ہوتی ہیں وہ تو واقعی بے ربط سی نظر آتی ہیں لیکن جب انہیں ترتیب کے ساتھ چھیڑا جائے تو ایسا ربط پیدا ہوتا ہے کہ عزیزانِ من! بس پوچھیے نہیں! قرآن کی یہی کیفیت ہے۔ یہاں یہ واقعہ بیان کیا۔ اب مزا آ گیا کہ واقعۂ ہجرت میں اور جہاں موسیٰ کو کتاب ملی تھی قرآن وہاں سے بات شروع کر رہا ہے۔ وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ (17:2)۔ داستانِ بنی اسرائیل یہاں سے شروع ہو جاتی ہے' قرآنِ کریم وہاں سے ابتداء کرتا ہے جہاں کتاب ملی تھی' کیونکہ وہاں کہا گیا تھا کہ ''ہم تمہیں اپنی یہ نشانیاں دکھائیں گے' جاؤ فرعون کی طرف''۔ یہ تھی وہ چیز کہ اس واقعۂ ہجرتِ رسول اللہؐ کے بعد کتابِ موسیٰ سے بات شروع کی ہے۔ ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی جیسے تمہیں کتاب دی ہے۔ یہ کتاب ہی کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ تھا کہ موسیٰ نے وہ کچھ کر دکھایا اور اب تم یہ کچھ کر کے دکھاؤ گے۔ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (17:2)۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کے راستہ میں وہ ایک قومی چیز تھی' راستہ کی کشاد کرنا تھا' راستہ دکھانا تھا۔ یہاں یہ ھدًی للناس ہے۔ یہ قرآن ہے۔ یہ قومی نہیں ہے۔ یہ نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ لیکن بات تو ''کتاب'' کے ملنے سے ہی شروع ہوتی ہے۔ ہوگا تو یہ سب کچھ کتاب ہی کے ذریعے۔ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی' یہ بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

Marfat.com

غلامی اور ملوکیت کا سب سے بڑا کارنامہ خود اعتمادی کو ختم کرنا ہے

کیا کہا تھا؟ کیا بات ہے! اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (17:2)۔ غلامی میں تمہاری ذہنیت یہ ہوگئی ہے کہ ایک ایک بات کے لیے دوسروں پہ بھروسہ کرتے ہو، دوسروں پہ اعتماد کرتے ہو، دوسروں کی رسیاں تھام کے کھڑے ہوتے ہو، تمہارے پاؤں میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہیں۔ محکومی میں خود اعتمادی چلی جاتی ہے عزیزانِ من! ملوکیت کا سب سے بڑا جو سحر ہوتا ہے، وہ یہ ہوتا ہے کہ "یہ انسانوں کے اندر سے خود اعتمادیت کو فنا کر دیتا ہے۔ وہ اس مقام پہ پہنچا دیتا ہے کہ "کچھ نئیں کر سکدے"❶۔ آپ کی قوم اس مقام پہ پہنچی ہوئی ہے: کچھ سوجھ نہیں رہا۔ تو پہلی تعلیم، پہلا سبق، پہلی تاکید جو قوم سے کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (17:2)۔ سارے بھروسوں کو چھوڑ دو، سارے اعتمادات کو چھوڑ دو، سارے سہاروں کو چھوڑ دو، یہ تمہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جتنا جتنا ان سہاروں کے اوپر بھروسہ کرتے چلے جاؤ گے، زنجیریں پختہ ہوتی چلی جائیں گی۔ توڑ دو ان زنجیروں کو۔ ہمارے قانون کے اوپر بھروسہ کرنا سیکھو، دیکھو کیا بنتا ہے۔ قرآن کا یہ "وَكِيْلًا" کا لفظ بھی کیا لفظ ہے عزیزانِ من! قوم کے دل میں پھر خود اعتمادی پیدا کر دیجیے۔ Self-confidence اس کے اندر پیدا کر دیجیے۔ یہ سب کچھ ہو کے رہے گا۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ کسی خارجی یا بیرونی طاقت کے اوپر بھروسہ کرنا محکومیت ہے۔ اپنے قوتِ بازو پہ بھروسہ کیجیے۔ اپنے اندر یہ تغیرِ ماہیت پیدا کیجیے کہ "ہم میں Self -Confidence create ہو گا، ہم کر سکتے ہیں اور کر کے دکھائیں گے"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی حالت

اگلی آیت میں کیا بات بتائی! کہنے لگے: تم تو پھر بھی بہر حال زندہ ہو۔ ایک علاقے میں گھرے ہوئے ہو۔ محکوم ہی سہی۔ ابھی تک تو زندہ انسانوں میں ہو۔ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ (17:3)۔ اس سلسلہ کی ابتداء وہاں سے ہوئی تھی، جہاں طوفان اس ساری بستی اور اس ساری قوم کو بہا کے لے گیا تھا۔ وہ تباہ ہوگئی تھی۔ کونسی قوم؟ کہا: وہ قوم نوحؑ تھی۔ کیا کیفیت تھی قوم نوح کی؟ کہا کہ قومِ نوحؑ کی کیفیت یہ تھی کہ جو حضرتِ نوح علیہ السلام پہ ایمان لائے تھے ان کے متعلق اعلانیہ کہتے تھے کہ "کمین لوگ" ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں، "ذلیل لوگ" ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں، "انہیں عقل نہیں، فکر نہیں۔ یہ احمق ہیں، جو تمہارے ساتھ ہیں۔" کہا: یہ تھا ان کی نفرت کا عالم! اور انہوں نے ان لوگوں کو یہاں تک پہنچا دیا ہوا تھا حالانکہ اپنی ہی قوم میں سے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ غلط نظاموں پر یہ جو اپنے آپ پہ یوں بھروسہ کیے ہوئے تھے، وہ تو ایک آن میں غرقِ دریا ہو گئے اور وہ لوگ جن کو یہ اس قدر محکوم و مظلوم و غریب و ناتواں و ضعیف و احمق سمجھا کرتے تھے، وہ بچ گئے اور ان بچے ہوؤں کی نسل سے تم اتنی بڑی قوم بن گئے ہو۔ جب یہ ہو سکتا ہے تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟

---

❶ اف ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

دیکھتے ہیں آپ کتنا ربط ہے قرآن میں! لیکن وہ ہوا کیسے تھا؟

زندگی کی کامیابی کا راز خدا کی عبدیت اور راہنمائی میں مضمر ہے

کہا: اس طرح سے ہوا تھا کہ اِنَّهٗ كَانَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا (17:3) ۔بس بات اتنی سی ہے کہ ''اس نے ہماری محکومیت اختیار کر لی' اس کی محنتیں بھرپور نتائج لے آئیں' پروگرام صرف اتنا ہی ہے'': عَبۡدًا شَكُوۡرًا (17:3) ۔دیکھتے ہیں آپ یہاں کیا کہا تھا۔ سُبۡحٰنَ الَّذِىۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا (17:1) ۔کہا تھا کہ یہ بھی عبد ہی ہے اور تم ایک عبد کا قصہ سن چکے ہو۔ وہ نوحؑ بھی عبد تھا۔ موسیٰ کو بھی دیکھ چکے ہو۔ وہ بھی عبد تھا۔ یہاں بھی عبد ہی کہا ہے۔تو کہا: ''یہ تو عبد موجود ہی ہیں' اب اس قوم کو قوم عابدین بنائیں'' ۔اس کی قوم کہتی ہے: وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) ۔وہ یہ کہتے ہیں ''لنا عابدین'' وہ ہمارے عابد ہیں۔ کرنا یہی ہے کہ وہ فرعون کی بجائے کہیں کہ یہ خدا کے عابد ہیں۔آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رو سے لفظِ عابد کے معنی کیا ہیں۔فرعون نے جب بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ قوم ہماری ''عابد'' ہے تو یہ تو کہیں بھی تاریخ میں نہیں آیا کہ بنی اسرائیل فرعون کی پرستش کرتے تھے' بالکل نہیں۔اور حضرتِ موسیٰؑ نے بھی تو فرعون سے جا کے یہی کہا تھا' جب وہاں جا کے کہا ہے کہ میں یہ پیغام لے کے آیا ہوں تو وہ سنتا رہا' سنتا رہا۔ کہنے لگا: موسیٰ کیا باتیں کر رہے ہو اور ہمارے سارے احسانات بھول گئے۔تم ایک محکوم قوم کے فرد تھے۔ہم نے تمہاری پرورش محلات میں کی۔تمہیں شاید ولی عہد تک بنا دیا۔یہاں شہزادوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔حکومت تمہاری چل رہی تھی۔تمہاری وجہ سے ہم نے تمہاری قوم کو اتنی مراعات بھی دیں۔تمہارے ساتھ ہم نے یہ کیا اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ احسان فراموش ہو۔ہمارے اتنے احسانات تمہیں یاد نہیں ہیں کہ ہم نے یہ کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے اور آج یہ کہنے کے لیے آئے ہو کہ ہمارا ہی تختہ الٹ دو گے۔اس کو پتہ نہیں تھا کہ وہ بات کس سے کر رہا ہے؟ وہ کلیم اللہ تھا۔باتوں کا بھی بادشاہ تھا۔یہ وہی ہے' جسے کہتے ہیں کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔خدا ان سے باتیں کر رہا ہے: كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا (4:164)۔ فرعون آپ سے باتیں کرتا تھا' وہ اس خدا سے باتیں کرتا تھا۔خیر' اس کو پتہ نہیں باتیں کس سے کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جی! سن لیا ہم نے' جناب کے احسانات کا۔مگر آپ کا جو سب سے بڑا احسان ہے وہ تو آپ نے گنایا ہی نہیں۔وہ میں گنا دیتا ہوں: عَبَّدْتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ (26:20)۔ ''کہ میری ذات پہ احسان کیا اور میری قوم کو غلام بنا لیا''۔ اب یہی لفظِ ''عبادت'' فرعون کہتا تھا: لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47)۔ان کی قوم ہماری ''عابد ہے''۔یہ ہے ''عابد'' اور یہ ہوتا ہے ''عبد''۔ یہاں سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں یہی کہا کہ ہم اپنے ''عبد'' کو مکے سے مدینے کی طرف لے گئے' یہی کہا ہے کہ نوحؑ ''عَبۡدًا شَكُوۡرًا'' تھا اور درمیان کی ساری بنی اسرائیل کی تاریخ یہاں چھوڑ دی۔

داستانِ بنی اسرائیل کا عروج وزوال

قرآن کریم میں بکثرت مقامات پر داستانِ بنی اسرائیل آئی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اگر کسی قوم کی ذلت' عروج اور پھر ذلت کی مسلسل داستانِ زوال آئی ہے تو وہ داستانِ بنی اسرائیل ہے۔ یہ داستان من حیث القوم آئی ہے اور ہمیں بار بار کہا گیا ہے کہ ''غور سے اس داستان کو پڑھو اس میں تمہارے لیے بڑے عبرت کے سامان ہیں''۔ ذلت ہے تو ایسی ذلت کہ فرعون جیسی قہرمانیت کی غلامی اور محتاجی۔ عروج ہے تو ایسا عروج کہ دنیا میں آج تک شوکتِ سلیمانی اور عصمتِ داؤدی تاریخ کے اوراق میں مشہور ہے۔ اتنی بڑی عظمت اور اس عظمت کے بعد پھر ذلت کی اتنی بڑی انتہا' بنی اسرائیل کی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں ملے گی۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَبَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61)۔ کوئی مکان نہیں' سلطنت تو ایک طرف رہی' مارے مارے پھر رہے ہیں' جہاں کہیں دنیا میں جا رہے ہیں وہاں ذلت اور مسکنت کا عذاب ان کے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ہے' ذلت کا عذاب!! کبھی کبھی اگر ان کو کوئی سہارا ملتا ہے تو۔ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:111) کا ہے۔ ''کوئی انسان خدا واسطے خیرات کی روٹی ان کی جھولی میں ڈال دے'' تو وہ بنی اسرائیل کی مملکت بن جاتی ہے۔ ورنہ ذلت ان کے پیچھے لگی ہے۔ تو یہ ہے بنی اسرائیل کی داستان۔ اسے قرآن نے اس طرح سے دہرایا ہے۔ یہیں سے وہ بات شروع کر دی کہ۔ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (17:4)۔ کہا: داستان کا ملخص یہ ہے کہ ہم نے ان سے کہا تھا کہ ''عبدِ شکور'' بن کے رہیے' چنانچہ جب تک وہ ''عبد'' بن کے رہے تو انہیں وہ عظمتیں اور وہ رفعتیں اور بلندیاں اور سرفرازیاں حاصل ہو گئیں۔ پھر کیا ہوا؟

فساد کا مفہوم

جب انہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی برتی: عُلُوًّا كَبِيْرًا (17:4)۔ دنیا میں فساد برپا کیا۔ ہم تو دنگا فساد ہی کو فساد کہتے ہیں' وہ اس لیے کہ غلط نظام' غلط مملکتوں اور غلط حکومتوں کی طرف سے جو فساد برپا ہوتا ہے اُس طرف تو وہ تمہاری نگاہ ہی نہیں جانے دیتے۔ آج تو فساد کے معنی سمٹ کے رہ گئے کہ ''یونہی سڑک پہ کھڑے ہوئے' دو چار آدمی آپس میں لٹھم لٹھا کچھ ہوئے تو اسے کہتے ہیں کہ فساد ہو گیا' دنگا ہو گیا''۔ یہ جو کچھ دوسرے کرتے ہیں یہ فساد ہوتا ہے۔ اس مفہوم اور تصور سے نہ تو یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ قلب ونگاہ کا فساد کیا ہوتا ہے؟ اور نہ یہ چیز کہ غلط نظام کا پیدا کردہ فساد کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا یہ تھا کہ ''تم دو دفعہ 'عبدِ شکور' بھی رہو گے' لیکن تم فساد بھی Create کرو گے' اس نظام کو اس حالت پہ نہیں رہنے دو گے۔ لفظی معانی یوں سمجھ لیجیے' اس کا مفہوم یوں سمجھ لیجیے کہ ''کسی شے کا اُس حالت پہ نہ رہنا' جس حالت پہ اسے رہنا چاہیے۔'' اسے فساد کہتے ہیں۔ تو کہا کہ ''ہم نے کہا کہ تم دو دفعہ ایسا کرو گے' اور دونوں دفعہ پھر صورت یہ ہو گی: ایک دفعہ تم دیکھو گے نتیجہ کیا ہو گا۔ پھر وہاں تمہاری باز آفرینی کا موقعہ آئے گا۔ تم خود وہاں تائب ہو جاؤ

Marfat.com

گے، ندامت ہوگی۔ وعدہ کرو گے کہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ پھر تمہیں وہ عروج حاصل ہو جائے گا۔ جب تک ویسا رہو گے پھر وہی رفعتیں ساتھ رہیں گی، پھر اگر وہی پہلے والی کیفیت تم نے پیدا کر لی تو پھر دوسری مرتبہ جب یہ کچھ ہوگا پھر تمہارے لیے باز آفرینی کا موقع نہیں ہوگا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو، یہود کو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، قرآن نے یہ کہا کہ یاد رکھو! اب تمہاری دوسری تباہی کے بعد پھر وقت آ گیا ہے کہ "اگر تم اس نظام کو اختیار کر لو جو جہاں یہ لوگ قائم کرتے ہیں، پھر تمہاری یہ ذلت مبدل با عروج ہو سکتی ہے" یہ وہاں کہا تھا۔

یہاں کہا کہ اس داستان کے دو ٹکڑے ہیں۔ انہیں یاد رکھو۔ دو مرتبہ یہ ایسا کریں گے۔ میں مختصر الفاظ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ دو مرتبہ ان کے ساتھ ہوا تھا، وہ ان کے فساد کے نتیجے میں ہوا تھا۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (17:5)۔ پہلی مرتبہ جب یہ ہوا تو نہایت جابر و قہار قسم کے لشکر تمہارے شہروں کے اندر، مکانوں کے اندر، آ گھسے اور انہوں نے تمہیں تلاش کر کے اذیتیں پہنچائیں۔ کتنا بڑا عذاب ہے!! جب اس قسم کی کوئی فوج یا قوم، شہروں یا بستیوں کے اندر آ جائے، گھروں کے اندر تک گھس جائے اور وہاں سے پھر تلاش کر کے عذاب دے!!!

1965ء کی جنگ کے شہیدوں کو لاکھوں سلام

عزیزانِ من! 1965ء کی جنگ میں ایک کمینے دشمن کی فوج کے بوٹوں کی آہٹ بس یوں کہیے کہ یہاں سنائی دے رہی تھی۔ باٹا پور کے پل کے اوپر تو میرے سامنے یہ آہٹیں آ رہی تھیں۔ خدا نے کہا تھا کہ قوموں کا عذاب یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے وحشی درندے جنہیں یا جنگلوں میں رہنا چاہیے یا چڑیا گھروں میں رہنا چاہیے، یا پنجروں کے اندر رہنا چاہیے، وہاں سے وہ چھوٹ کے انسانوں کی بستیوں میں داخل ہو جاتے ہیں، گھروں کے اندر تک پہنچ جاتے ہیں، ڈھونڈ ڈھونڈ کر، تلاش کر کر کے، پھر عذاب دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! خدا غریقِ رحمت کرے جنہوں نے پھر اس وقت اس ایک اتنے سے پل کے سامنے کھڑے ہو کر، ہماری بستیوں کو محفوظ رکھا، ہماری عصمتوں کو محفوظ رکھا، ہماری عزتوں کو محفوظ رکھا۔ ان کا ہماری قوم پر کتنا بڑا احسان تھا! قرآن نے یہ گنایا ہے کہ وہ یہ کچھ کرے گا۔

قوموں کی تقدیر اور عصمتوں کی حفاظت تغیرِ نفس پر موقوف ہے

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (17:6)۔ اس کے بعد بھی جب تم نے پھر اپنے اندر تغیرِ نفس پیدا کر لیا، تبدیلی پیدا کر لی، ہم نے پھر تمہیں ایک موقع دیدیا کہ کوئی بات نہیں، فضا تمہارے لیے سازگار اور تمہارے دشمنوں کے خلاف ہوگئی وہ عظمت پھر مل گئی: مال و دولت کی فراوانی، اولاد کی کثرت اور بھاری جتھہ اور تم سے کہہ دیا کہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (17:7)۔ جب تم نے قوانین خداوندی کے مطابق، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تو تمہاری حالت کس قدر خوشگوار ہوگئی اور وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (17:7)۔ جب تم نے اس کے خلاف ناہمواریوں کی راہ اختیار کر لی تو اس کا وبال بھی تمہارے اپنے ہی اوپر پڑا۔ یہ ہے ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل۔ اگر تم پھر وہی روش اختیار کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ وہی کچھ کریں

Marfat.com

گے۔ تم یہ کرو گے ہم بھی یہ کریں گے۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (17:7)۔ پھر جب دوسرا موقع آیا تا کہ وہ تمہیں ذلیل وخوار کریں اور ہیکل میں اس طرح جا گھسیں جس طرح پہلی مرتبہ بابلی وہاں جا گھسے تھے اور جو کچھ ان کے قابو میں آئے اسے تہس نہس کر کے رکھ دیں (17:104)۔

بنی اسرائیل کے متعلق تاریخی شہادت

یہ جو دو دفعہ کی چیز ہے' جی! تاریخ اس کی شاہد ہے۔ پہلی دفعہ تو یہ فلسطین میں تھے۔ بیت المقدس (Jerusalem) ان کا دارالخلافہ تھا۔ یوں سمجھ لیجیے بابل [1] (Bablylon) پاس ہی تھا۔ بابل [2] (Babylonia) کا ایک بادشاہ تھا بخت نصر [3] بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ قرآن کے الفاظ میں ''اصل تو فساد ہی ہوتا ہے جو انہوں نے بھی اپنے ہاں Create کیا تھا''۔ Disorder ہو گیا ہوا تھا۔ ملک کا پورے کا پورا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ پورا معاشرہ Disorder کی حالت میں تھا۔ Disorder بہت اچھا ترجمہ ہے فساد کا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ میں ''فساد جہاں بھی ہو' تو وہ پھر ظلم وستم کو تو آوازیں دے دے کر پکار لیتا ہے''۔ جھگڑ تو آتا ہی اسوقت ہے جب کہیں Vacuum ہوتا ہے۔ بگاڑ سے Vacuum پیدا ہوا تو ایک لشکرِ جرار لے کے بخت نصر (Nebuchadnezzar) آ گیا۔ یہ (غالباً) 599 قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ وہ آیا اور اس نے ان کے ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس قوم کی اتنی بڑی مرکزیت تھی۔ میں نے کہا ہے کہ یہ قوم عظیم قوم تھی: سلیمان اور داود کی شوکت لیے ہوئے تھی۔ وہ سارے یہودیوں کو قید کر کے لے گیا۔ وہاں یہ قریباً ایک سو سال اہل بابل کی غلامی میں رہے اور اپنی زبان تک بھول گئے۔ تین پشتیں قریباً سو سال میں ہو گئیں۔ جو ہیکل کے پریس وغیرہ ہوتے تھے وہ انہیں اس زمانے میں نبی کہتے تھے۔ ان کے مجموعہِ تورات میں ان کی حالت کے نوحے ہیں: بڑے درد انگیز' بہت سوزِ جگر والے۔ محکومی کے اندر اُن میں سے جو حساس لوگ تھے یہ ان کے نوحے تھے۔ تو اس کے بعد انہی کے نوحوں کا ہی غالباً یہ نتیجہ تھا یا اُن کے ان لوگوں

1. Babylon. It is a city in ancient Mesopotamia, some 88 kilometers (55 miles) south of modern Baghdad. Founded in the second millenium BC, it flourished as Hammurabi's capital. It was virtually destroyed by the Assyrians under Sennacherib (c. 689 BC), but rose again, achieving vast wealth as the capital of the neo-Babylonian empire. Nebuchadnezzar II rebuilt the city, and his Hanging Gardens were one of the Seven Wonders of the World. Babylon fell to Cyrus, the Great (538 BC) and became a minor centre of the Persian Empire (Reader's Digest, 1990, p. 121).
2. Babylonia. It is the Empire of Mesopotamia. Created in the second millenium BC, it rose to greatness under Hammurabi. It then fell to successive invaders, eventually to the Assyrians (c 722 BC). A native king established the Chaldean or neo-Babylonian Empire (c. 625 BC) and under Nebuchadnezzar II, this expanded to include all Mesopotamia and Palestine (538 BC) (Reader's Digest, 1990, p. 121).
3. Nebuchadnezzar II (C. 630 – 562 BC). He was Chaldean king of Babylon. He extended Chaldean power through out the old Assyrian Empire, sacking Jerusalem (586 BC), he deported its inhabitants to Babylon (Reader's Digest, 1990, p. 1030).

کا جو اس قدر اپنی قوم کے دردمند تھے غالباً انہی کے کہنے پر ایران میں اچھے بادشاہ پیدا ہو گئے۔ ایران پاس ہی تھا۔ ایک تو وہ خرس ہے جسے انہوں نے کیخسرو کہا۔ ایک دارا ہے جسے ہمارے ہاں اردو والے ایک ارض کا قشقا کہتے ہیں۔ بہر حال 'انہیں' یکے بعد دیگرے 'انہوں نے اپنی داستانِ الم و مظلومیت سنائی۔ ان کے دل میں رحم کا جذبہ بیدار ہوا تو وہ آئے۔ انہوں نے آ کے اہلِ بابل کو شکست دی' یہودیوں کو یہاں سے نکالا' اور ان کو لا کے پھر وہاں پہ بسانا شروع کیا۔

ایک صدی کے بعد پھر وہی ظلم وستم

پھر ہیکل کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ قریباً 514,15 قبل مسیح تک اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ اسی پچاسی سال یا نوے سال کا عرصہ گزرا۔ اندازاً اسے ایک صدی کہا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ یہودی پھر آ کر بیت المقدس (Jerusalem) میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے اسی طرح سے پھر عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ پھر اسی طرح سے انہوں نے فساد برپا کیا تو اس کے بعد ان کو پہلے تو تھوڑے تھوڑے' چھوٹے چھوٹے جھٹکے آئے۔ سکندرِ رومی (Alexandar the Great(356-323 B.c) نے 332 قبل مسیح میں حملہ کیا لیکن وہ کچھ ایسا زیادہ بڑا حملہ نہیں تھا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد 320 قبل مسیح میں بطلیموس (Ptolemy:c.367-284 B.C) نے مصر کے راستے' ان پر حملہ کیا۔ یہ رومن تھا۔ اس نے بھی تباہی مچائی۔ پھر 66 قبل مسیح میں رومی جرنیل نے بھی حملہ کیا۔ اس نے بھی کچھ تباہی مچائی تو قرآن کہتا ہے کہ ''چھوٹے چھوٹے جھٹکے آیا کرتے ہیں تا کہ تم سمجھ جاؤ''۔ جب یہ اس پہ بھی نہ سمجھے تو پھر حضرتِ عیسیٰ کے بعد 70ء میں رومی گورنر ٹائٹس آیا۔ اس نے آ کے پھر بخت نصر (Nebuchadnazzar11:c.630-562 B.C) کی طرح کیا۔ سارے بیت المقدس کو تباہ کیا۔ ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہودیوں کو قید کیا اور وہاں سے نکال دیا۔ ان یہودیوں کو پھر اس کے بعد وہ Home Land نصیب نہیں ہوا۔ یہ دوسری بار کی تباہی تھی۔ قرآن نے پہلے کو تو ''وعدا'' اولا [illegible] اسے تو ایسا وعدہ کہا ہے کہ ''پھر تمہیں وہ چیز نصیب نہ ہوئی''۔ یہ تھی بنی اسرائیل کی دوسری تباہی۔ یہ کہنے کے بعد کہا کہ بات یہاں سے شروع تھی کہ وَاٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ (17:2)۔ ہم نے موسیٰ کو بھی اسی طرح ضابطۂ حیات عطا کیا تھا اور ایک داستان بیان کرنے کے بعد کہا: اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَهۡدِیۡ لِلَّتِیۡ هِیَ اَقۡوَمُ (17:9)۔ اب صحیح روش قرآن کی رہنمائی ہی میں مل سکتی ہے اس لیے کہ قرآن کاروانِ انسانیت کو سفرِ زندگی میں وہ راہ دکھاتا ہے جس سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھی راہ اور کوئی نہیں۔ یہاں قرآن کی آمد کا ذکر ہے۔ وہاں ان کے فساد کی وجہ سے ان پہ آئی ہوئی تباہیوں کا ذکر ہے۔ اور یہاں ہے: وَیُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا کَبِیۡرًا (17:9)۔ اور ان لوگوں کو جو اس قرآن کی صداقتوں کو تسلیم [illegible] پروگرام پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں' خوش خبری دیتا ہے کہ انہیں' ان کے حسنِ عمل کا بہت بڑا اجر ملے گا۔ یہ جو نبی اکرمؐ کے ہاتھوں انقلاب آنے والا تھا' یہ وہاں سے شروع ہوا۔

Marfat.com

خدا کے وعدہ کے معنی قانونِ خداوندی کے مطابق ظہورِ نتائج کے ہوتے ہیں

یہ ہے عزیزانِ من! داستان بنی اسرائیل کی' ان ''آیات'' کی جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہ نبیؐ کے پروگرام کے اندر ایک مرحلے کی تبدیلی سے دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ مکہ کی زندگی کے بعد مدینے کی' جو یہ زندگی شروع ہوئی ہے' اس میں آپ دیکھیے گا کہ جتنی بشارتیں دی جاتی تھیں' وعدے دیئے جاتے تھے' وہ عملاً ایک ایک کر کے سامنے آ گئے۔ تو اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ وہ جو خدا کا وعدہ ہوتا ہے: وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (17:5)۔ وہ وعدہ تو پورا ہو کے رہا کرتا ہے۔ ان سے تباہی کی بات کی۔ وہ تنذیر تھی' ایک Warning تھی۔ وہ انہوں نے نہیں سنی۔ وہاں وعدہ کیا تھا کہ تباہ ہو جاؤ گے' وہ تباہ ہو گئے۔ وعدہ کے معنی قانونِ خداوندی کی رُو سے ''وہ کچھ ہو جانا جو اٹل ہے''۔ وہ ہو گیا۔ یہاں مومنین سے وعدہ کیا ہے کہ جس میں کہا ہے: وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ (17:9)۔ وہ مومنین کو خوش خبری دیتا ہے۔ وہ وعدہ پورا ہوا۔ اس لیے یہاں کہا ہے کہ ان کو کہو کہ ''عملِ صالحات کا اور ایمان کا نتیجہ بڑی خوشخبریاں ہوتی ہیں تو ایسی خوشخبریاں عزیزانِ من! انہیں نصیب ہوئیں۔ اور پھر جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ اس کے بعد ہم نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ لیکن ریل کے ڈبے کو انجن کا اتنے زور سے دھکا لگا ہوا تھا کہ وہ انجن کے بغیر بھی اپنے ہی مومنٹم (Momentum) سے چودہ سو سال تک چلا آ رہا ہے اگرچہ ہم نے اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ڈالی ہوئی ہیں اور اب تو دیواریں کھڑی کر دی ہیں صاحب کہ آگے ہی نہ چلے۔ تو یہ ہے عزیزانِ من! وہ داستان جو ہجرت کی رات سے یا ہجرت کے مرحلے سے شروع ہو رہی ہے اور آگے یوں چل رہا ہے کہ پہلے داستانِ بنی اسرائیل کو بطور تاریخی شہادت کے پیش کیا ہے اور پھر آپ دیکھیں کہ حضور ﷺ کے پروگرام کو آگے کس طرح سے پیش کیا ہے۔ اب وقت ہو گیا ہے۔ آج کا درس تو یوں کہیے کہ ہم ابھی سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدائی پانچ آیات ہی میں ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

وقت کی اہمیت

''زمانے کے تقاضے کچھ ایسی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ سست روی کے لیے اس دور میں کہیں گنجائش نہیں۔ اس تیز گامی کے دور میں اگر کوئی قوم یا جماعت پاؤں میں سے کانٹا نکالنے بھی رک گئی تو زمانے کا ریلہ اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔'' [بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۸ء ص......)

Marfat.com

چوتھا باب: **سورۃ بنی اسرائیل** (آیات 6 تا 15)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَ
جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ﴿٦﴾ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ
الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴿٧﴾
عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ﴿٨﴾ اِنَّ هٰذَا
الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا
كَبِيْرًا ﴿٩﴾ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٠﴾ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ
بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ
الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ
الْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿١٢﴾ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ
لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿١٣﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿١٤﴾
مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿١٥﴾

عزیزانِ من! آج جون 1975 کی 29 تاریخ ہے۔ درسِ قرآنِ کریم میں گذشتہ دو اتواروں سے ہم سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند ہی آیات پڑھ رہے اور بنی اسرائیل کی داستان میں، جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ تم پہ دو دفعہ تباہی آئے گی، میں نے ان تباہیوں کا ملخصاً ذکر کیا تھا۔ پہلی تباہی بابل (Babylonia) کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar 11 C. 630-562 B.C) کے ہاتھوں مصر کے زمانے میں آئی۔ اسے قریب سو سال کہیے یا اسی نوے سال کے درمیان کا عرصہ کہیے۔ وہ یہودیوں کو غلام بنا کر بابل (Babylon) لے گیا تھا۔ ان کی مرکزیت فنا ہوگئی تھی۔ ان کی زبان تک بدل گئی تھی۔ ان کے انبیاء کے صحف اس نے ضائع کر دیئے اور

Marfat.com

پھر اس کے بعد ایران کے شہنشاہ' جسے یونانی مؤرخ سائرس (Cyrus: 559-529. B.C)[1] یہودی خورس اور عرب کیخسرو' جسے ذوالقرنین بھی کہتے ہیں، نے پہلے ان کی مدد کی۔ انہیں بابل کی غلامی سے رہائی دلائی۔ پھر ان کے ٹیمپل (Tample) "ہیکلِ سلیمانی (Tample of Solomon) کی از سرِ نو تعمیر ہوئی' پھر یہ وہاں آ کے آباد ہوئے۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے تمام صحف کا نام تورات ہے

جسے اب تورات کہا جاتا ہے وہ اس کتاب کا نام نہیں جو حضرتِ موسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ تورات مجموعہ ہے' ان تمام صحف کا' ان تمام چھوٹی چھوٹی کتابوں کا' جو حضرتِ موسیٰ سے لیکر حضرتِ عیسیٰ سے پہلے تک کے انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں۔ ان تمام صحف کے مجموعے کو عہدِ عتیق یا Old Testament کہا جاتا ہے۔ وہ تورات نہیں ہے۔ وہ تو ان انبیاء کی طرف نازل کردہ صحف کا مجموعہ ہے اور اسی کو قرآن نے تورات کہہ کر پکارا ہے۔ باقی رہے ہر نبی پر نازل ہونے والے صحف جیسے صحفِ موسیٰ علیہ السلام' صحفِ ابراہیم علیہ السلام ان کا قرآنِ کریم نے الگ بھی ذکر کیا۔ وہ بھی ضائع ہو گئے تھے۔ انہیں انہوں نے از سرِ نو کیسے مرتب کیا؟ یہ ایک الگ داستان ہے اور (Original) انجیل تورات یا یہ مجموعے تو کہیں بھی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ عبرانی زبان میں بھی نہیں تھے۔

بنی اسرائیل کی تنزلی کی داستان

بہرحال یہ دوبارہ بسائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر اسی قسم کی سرکشیاں اختیار کیں تو پھر جسے قرآن نے دوسری تباہی کہا ہے' وہ آئی۔ درمیان میں چھوٹے چھوٹے حملے تو ان کے اوپر ہوتے ہی رہے لیکن پھر آخری بار 70ء میں ٹائٹس (Titus) نے' جو رومن کا گورنر تھا' حملہ کیا۔ اس نے تو پھر اس سارے یروشلم (Jerusalem) کو' ان کے ہیکل کو' ان کی آبادیوں کو' تباہ کر دیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ پھر یہ دوبارہ وہاں نہیں بس سکے۔ یہ اس کے دو ہزار سال بعد اب دوبارہ بسے ہیں۔ انہیں آوارہ یہودی (Wandering Jews) کہا کرتے تھے۔ The Wandering Jews ہی ان کا نام ہو گیا تھا۔ ان کا کہیں مسکن ہی نہیں تھا' ان کا کہیں بسیرا ہی نہیں تھا' اسی لیے تو قرآن نے کہا ہے: ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا (3:112)۔ یہ جہاں کہیں گئے' ذلت و مسکنت کی مار ان کے پیچھے سائے کی طرح لگی رہی۔ یہ ان کی داستان ہے اور حقیقت میں بڑی ہی عبرت آمیز داستان ہے' جس سے نظر آتا ہے کہ جب امتوں کا مرکز فنا ہو جاتا ہے' مرکز باقی نہیں رہتا' تو پھر اس انتشار میں ان کی کیفیت اُس جھاڑو کے تنکے کی سی ہو جاتی ہے جس کی رسی چھوٹ چکی

1. Cyrus (II), the Great, died in 529 BC. He was king of Persia (559 – 529 BC) and the founder of the Achaemenid Empire. Having seized the Empire of the Medes, he went on to conquer Lydia, the Ionian cities, and Babylon with its subject states in Syria. He was tolerant in religious matters permitting the worship of native gods, and allowing the Jews to return to Jerusalem (537). (Reader's Digest, 1990, p. 390).

Marfat.com

ہو۔ دو ہزار سال تک ان کی یہی کیفیت رہی۔ نزولِ قرآن کے وقت بھی ان کی یہی صورت تھی۔ پہلی تباہی کے بعد' قرآنِ کریم نے' سورۃ بنی اسرائیل کی چھٹی آیت' جو اس وقت میرے سامنے ہے' میں کہا: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (17:6)۔ تو دوبارہ تم آ کے بسے۔ پھر ہم نے تمہیں ساز گار فضا دی' پھر تمہارے عروقِ مردہ میں زندگی داخل کی۔ پھر تمہاری مدد کی۔ کچھ تمہاری دولت بھی بڑھی' کچھ تمہاری تعداد بھی بڑھی اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جو ہم نے کہا تھا کہ۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (17:7)۔ یہ قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک عظیم بنیادی اصول ہے کہ اگر تم نے ہم آہنگیاں پیدا کرنے والے کام' جنہیں حسنات کہا جاتا ہے' جس کا ترجمہ بھلائیاں کیا جاتا ہے' کیے' اگر تم نے ایسے کام کیے تو۔ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (17:6)۔ وہ خود تمہارے ہی بھلے کے لیے ہوگا' کسی دوسرے کے لیے نہیں اور اگر تم نے اس کے خلاف' جسے برائیاں کہا جاتا ہے' ناہمواریاں پیدا کرنے والے' تخریب پیدا کرنے والے کام کیے' فَلَهَا تو اس کا ایوارڈ (Award) تمہارے اپنے ہی اوپر آ کر پڑے گا۔ نہ کسی کے اچھے کام تمہیں فائدہ دیں گے' نہ تمہارے بُرے کام کسی اور پہ تباہی لائیں گے۔ یہ قرآن کا بنیادی اصول ہے۔ یہ مذاہب اور دین کے اندر متمیز کرنے کا ایک خط ہے۔

مذاہب کی صورت یہ ہے کہ ناہمواریاں پیدا کرنے والے' اس قسم کے کام' کرتے چلے جایئے۔ اس کے بعد زبان سے ''یا اللہ میری توبہ اور استغفار'' کے الفاظ کہتے جایئے' تو چلیے صاحب! وہ سب ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام مٹ جاتے ہیں اور دوسری طرف دوسروں کے نیکی کے کام کا ثواب' ایصالِ ثواب کے تصور سے' دوسروں تک پہنچ سکتا ہے۔ تو بس مٹ گئے برائیوں کے اثرات۔ یاد رکھیے یہ تصور (Concept) بالکل قرآن کے خلاف تصور ہے۔ صرف اپنے ہی کام کا انسانی ذات پر اثر مرتب ہوتا ہے یا ایک قوم کے اوپر اُسکی اپنی ہی نیکیاں ان کے کام آتی ہیں' کسی دوسرے کی نیکی کسی دوسرے کے کام نہیں آتی اور نہ ہی کسی دوسرے کے گناہ کی پاداش دوسرے کو مل سکتی ہے۔ یہ چیز بھی غلط تھی کہ بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد میں سے جنہوں نے سرکشیاں کیں' جرائم کیے' قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی' تو اس کی وجہ سے' ان کے گناہوں کی پاداش کی وجہ سے' اگلی قوم نسل در نسل دو ہزار سال تک تباہ و برباد ہوتی رہی۔ یہ ان کے گناہوں کی وجہ سے تھی۔ ان کے جرائم کی ابتداء تو انہی سے ہوگئی تھی۔ پہلی دفعہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) کے ہاتھوں تباہی ہوئی۔ آخری مرتبہ ٹائٹس (Titus) کے ہاتھوں تباہی ہوئی۔ وہ تباہی تو اس نسل کی' ان لوگوں کی' ان کے اپنے جرائم کی وجہ سے تھی۔ اس نسل کے بعد ان کی تباہی' ان کی اپنی سرکشیوں' معصیت کوشیوں اور جرائم کوشیوں کا نتیجہ تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے جرائم کا اثر دو ہزار سال تک باقی رہا۔

اپنی اپنی معصیت کوشیوں کا نتیجہ

یہ ٹھیک ہے کہ جب قوم کے اوپر تباہی آتی ہے' تو اس کی اگلی نسلیں تباہی کی حالت میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی حالت کو

Marfat.com

سنوار لیں تو ان کے بزرگوں کے جرائم کا کوئی اثر ان کے اوپر نہیں ہوتا۔ یہ اثرات جو نسل در نسل چلے آتے ہیں' یہ ان کی اپنی ہی معصیت کوشیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے کہی ہے۔ اب دوسرا یہ تھا۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (17:7)۔ یہ دوسری بار کی تباہی ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی بار کہا تھا کہ بڑی سخت تباہی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے اور قرآن نے بھی کہا ہے کہ وہ لوگ ان کی بستیوں میں داخل ہوئے' ان کو چن چن کے' تلاش کر کر کے' تباہ و برباد کیا' گھروں سے نکالا' گھروں کو مسمار کیا' بستیاں تباہ کیں' مرکزیت فنا کی' اور ان کو ڈھور ڈنگر کی طرح یہاں سے چلا کے لے گئے اور پھر یہ بسے نہیں ہیں۔ اب نزولِ قرآن کا زمانہ آ گیا۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ ابھی ان کی تباہی کو کوئی پانچ سو سال کا عرصہ ہی گذرا تھا' وہ 70ء کا ذکر ہے۔ یہ سمجھ لیجیے 570ء یا چھٹی صدی حضورؐ کا زمانہ ہے تو اس میں یہ کہا۔ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ (17:8)۔ اب پھر ایک موقع آ گیا ہے تاکہ تمہاری حالت پھر سنور جائے۔ اس سے پہلے ایک موقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت نے دیا تھا۔ ان کے زمانے میں بھی ان کی حالت کچھ ایسی اچھی نہیں تھی۔ یہ رو بہ زوال تھے۔ انہوں نے بھی انکو دعوت دی تھی کہ اگر تم دینِ حق کو پھر قبول کر لو تو تمہاری تباہی پھر مبدل بہ مرفع الحالی ہو سکتی ہے۔ پھر موقعہ دیا جاتا ہے تو انہوں نے بجائے اس کے کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں' الٹے ان کی جان ہی کے لاگو ہو گئے۔ اس سے بھی انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا' یہ موقعہ جو ان کے ہاتھ سے نکلا ہے تو اس کے بعد 70ء میں یعنی حضرت عیسیٰ کی بعثت کے 70 سال کے بعد یہ تباہی آئی ہے کیونکہ انہوں نے اس موقعہ کو گنوا دیا تھا۔

اب پھر پانچ سو سال کی دشت نوردی' صحرا پیمائی اور ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ اب پھر تمہارے پاس ایک موقعہ آیا ہے' اس سے فائدہ اٹھا لو۔ تمہاری یہ رسوائیاں' یہ تباہیاں' ختم ہو جائیں گی اور پھر یہ ہے کہ۔ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (17:8)۔ یہ چار لفظ بھی بڑے غور طلب ہیں۔ میں اکثر و بیشتر اس کو دہرائے چلا آ رہا ہوں کہ قانونِ مکافات (Law of Requital) یا جسے عام طور پر کسی کے جرائم کی سزا کہا جاتا ہے' وہ سزا نہیں ہوتی۔ وہ ان جرائم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ تو

(Natural consequence of action)

ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ابتداء Initiative انسان کی طرف سے ہوتا ہے' جہاں یہ دوراہے پہ کھڑا ہوتا ہے' خدا کا قانون آگے نہیں بڑھتا' وہ پیچھے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ یہ سیدھے راستے کے اوپر چل نکلتے ہیں' تو اس کے اچھے نتائج پیدا کرنے والا قانون ان کے پیچھے چلتا ہے۔ اس کی تقویت انکو حاصل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ غلط راستے کی طرف مڑ جاتے ہیں تو اس کا وہ قانونِ مکافات جو ان کے غلط اقدام کے نتائج پیدا کرنے والا ہوتا ہے' یہ ان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

Marfat.com

آغازِ کار انسان کی طرف سے ہی ہوگا۔ جیسا راستہ ویسا نتیجہ

خدا اتنی مطلق قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود پہل (Initiative) نہیں لیتا' یہ نہیں کرتا۔ کوئی سمجھنا چاہے تو میں یہ Inverted Commas میں کہوں گا کہ ''اس میں وہ مجبور ہوتا ہے' وہ پہل نہیں کرتا''۔ اس دوراہے کے اوپر انسان صاحب اختیار ہوتا ہے یہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے' جونسا یہ اختیار کرے گا اس کے پیچھے خدا کا اُس قسم کا قانون ساتھ چلنے پہ مجبور ہو جائے گا۔ قرآن عظیم حقیقیں بیان کرتا ہے صاحب! ہم جو ہر بات خدا کی طرف منسوب کر کے پہل (Initiative) اس کی طرف سے کراتے ہیں' قرآن کہتا ہے' یہ غلط ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے: **مَاقَدَّمَتْ لِغَدٍ** (59:18)۔ تم نے آنے والے کل (Tomorrow) کے لیے جو آج (Today) پیش کیا ہے' ہمارا قانون اس آج (Today) کے مطابق تمہارے کل (Tomorrow) کے لیے نتیجہ برآمد کر کے دکھا دے گا۔ ہم اس میں کچھ بھی تبدیلی نہیں کریں گے۔ ''جیسا تم کرو گے' ہمارا قانون اس کے مطابق نتیجہ پیدا کر دے گا''۔ اور پھر جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ جس قسم کا یہ قدم اٹھائے گا' اس قسم کا قانون اس کے پیچھے چلے گا اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی' یعنی ویسے تو انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس دفعہ صحیح راستے پہ چلا ہے آگے پھر کوئی اور دوراہا آ گیا' اسے اختیار ہے کہ یہ غلط راستے کی طرف مڑ جائے یا اگر جہاں سے غلط راستے پہ اس کا قدم پڑ گیا تھا تو اسے تو اختیار ہے کہ اگلے دوراہے پر ہی سہی وہ صحیح راستے کے اوپر آ جائے۔

خدا کا صحیح تصور

خدا نے یہ اپنے لیے رکھا ہی نہیں ہے کہ راستہ میں جی چاہے تو اپنا دوسرا قانون اس عمل کے پیچھے لگا دے۔ **لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (48:23)۔ ہمارے قانون میں تو تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہ تبدیلیاں انسان اپنے اقدام میں' اپنی روش میں کر سکتا ہے۔ **فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (35:43)۔ خدا کا یہ قانون اٹل ہے اس لیے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ''ہم جب جی چاہے' اپنا رخ موڑ لیں''۔ خدا تو اپنا رخ بھی نہیں موڑتا۔ عزیزانِ من! خدا کا یہ تصور آپ کو اور کہاں ملے گا!! دنیا کے کسی بھی مذہب میں یہ تصور نہیں مل سکتا۔ وہاں تو ہر بات خدا کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ یہاں اسلام کے نظام میں ابتدا ہی انسان سے ہوتی ہے' آغاز ہی اس سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہا کہ اب پھر ایک موقع آ گیا ہے۔ سارے دو لفظ ہیں۔ اگر اب پھر تم پلٹ گئے' ہم بھی پلٹ جائیں گے۔ اگر تم پلٹ گئے' ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ سیدھے راستے پہ چلو گے' ہمارا قانون سیدھے راستے پہ چلے گا۔ تم پلٹ جاؤ گے' یہ بھی پلٹ جائے گا۔ ہم پیچھے پیچھے چلیں گے۔ عربی زبان میں ذرا سا صیغے کو بدلنے سے بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے' لفظ ہی وہی استعمال کیا ہے:

تُو اگر دیگر شوی' او دیگر است

فقیر کی طرح بیٹھے ہوئے رونا روتے ہو: اگر تم دیگر ہو' تُو اگر دیگر شوی' او دیگر است۔ تم بدل جاؤ' وہ بدل جائے گا' تقدیر بدل

Marfat.com

جائے گی۔ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا (17:8)۔ اگر تم بدل گئے' پلٹ گئے تو یاد رکھو! ہم بھی پلٹ جائیں گے۔ ہمارا قانون پلٹ ہوگا۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر کہا کہ ''وہ راستہ آگے سے بند (Cul-de-sac) ہوجائے گا' زندگی کی دوڑ میں چل نہیں سکو گے۔ قرآن میں جنت اور جہنم تو بات ہی اتنی سی ہے کہ ''رُک جانا' آگے بڑھنے کی صلاحیتوں کا ختم ہوجانا'' جہنم ہے۔ اور ''ارتقائی مراحل طے کر کے آگے بڑھ جانا'' جنت ہے۔

یہ تو ابھی انسانی زندگی کے سفر کا آغاز ہے

انسانی ذات کی صورت میں انسان نے ابھی بڑے مزید ارتقائی منازل طے کرنا ہیں۔ مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ شروع ہوگا۔ ابھی تو یہاں بھی انسان کی زندگی محدود ہے۔ ابھی تو بات شروع ہوئی ہے' زندگی کا ابتدائی دور ہے جس میں اس کو ذات یا نفس یا خودی دی گئی ہے جو آگے چلتی ہے۔ اس سے پہلے کی مخلوق میں یہ بات نہیں تھی۔ بات یہ ہے کہ یہ انسانی ذات آگے چلے گی۔ یہ تو پہلی منزل ہے اور بالکل تیاریوں کی منزل ہے۔ اسے تو ''آگے بڑھنا ہے''۔ اسے ہی جنت کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے کے مزید راستے ہیں۔ تو وہاں کہا گیا ہے کہ ان کی پیشانی کا نور ان کے راستے روشن کیے چلا جائے گا۔ آگے چلنا ہی ہے تو راستے روشن ہونگے۔ جہاں رہنا ہی ہے' وہاں بیٹھنا ہی ہے' وہاں راستے روشن ہونے کا کیا سوال ہے؟ اور جہنم وہ ہے کہ جہاں یہ اب آگے چلنے کا سلسلہ رک جائے گا' انسان کی ذات مزید ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل نہیں رہے گی' رکاوٹ پیدا ہوجائے گی۔ اسی لیے جہنم کو جحیم کہا۔ جحیم کے تو معنی ہی ''رک جانا'' ہیں۔

جہانِ فردا میں انسانی قوتِ احساس کی کیفیت بدرجہ اتم ہوگی

یہاں قرآنِ کریم نے حصیرًا کہا ہے ''حصیر'' کے معنی بھی ''محصور ہوجانا'' ہیں جسے آپ روک کہتے ہیں۔ جس کے سامنے ''روک'' آجائے اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ ہے جہنم۔ جیسے لڑکا فیل ہوجاتا ہے' اگلی کلاس میں نہیں جاتا' رک گیا۔ وہ ''حصیر'' ہے' وہ ''جحیم'' ہے۔ بس یہاں اس مثال میں اتنا فرق ہے کہ یہاں بہرحال ابھی اس کو اس کا چانس ہوتا ہے کہ اس سال ''رک'' گیا ہے' اگلے سال پھر آگے چلا جائے گا۔ وہاں یہ چانس نہیں ہے۔ چانس صرف اسی دنیا کے اندر ہے' وہاں تو جو پروموٹ (Promote) ہوگیا ہے وہ اس سے اگلی کلاس میں جاسکتا ہے۔ وہاں' اگلی دنیا میں یہ بار بار نہیں ہوتا۔ یہ یہاں ہوسکتا۔ یہ دہرایا ہے قرآن نے کہ یہ چیز دوبارہ نہیں ہوسکتی۔ یہی تو وہ چیز ہے جس سے یہاں کی زندگی اتنی قیمتی ہوجاتی ہے۔ اگر اس میں بھی سیکولر نظام کے تابع یا مادی تصورِ زندگی کے تابع' ختم ہوجانا ہوتا ہے تو پھر وہ ''حصیر'' ہے۔ لیکن جب یہ صورت ہے کہ آگے چلنے کے دروازے بند ہونگے اور دوسرا چانس نہیں ملے گا' اس کے بعد تو آپ سوچیے کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ کتنا قیمتی ہے' تو پھر چانس دوسرا نہیں۔ اسے اس نے جہنم کہا۔ پھر ''یہ حصیر ہے''۔ یاد رکھو' پھر روک ہے' محصور ہوجاؤ گے' وہیں کھڑے ہوجاؤ گے اور پھر اسے عذابِ الیم کہا ہے۔ دل کا درد کہا' جگر کی سوزش کہا' یا گداز

Marfat.com

کہا۔ یہ وہ ہے کہ جس سے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑا رہنے سے فرق پڑے گا۔ یہ اس قدر جاں گداز اور اذیت ناک ہوگا کہ نگاہوں سے پردے اٹھ جائیں گے اور نظر آ جائے گا کہ یہ قیامت کیا برپا ہوئی مجھ پر صاحب! یہاں تو ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا' ٹھیک ہے آگے بڑھ کے آنکھوں پہ پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے' نگاہیں اتنی تیز ہو جائیں گی کہ وہ فولاد کی سلوں کے آر پار ہو کے وہاں کے ان حقائق کو دیکھ لیں گی کہ کیا گذری۔ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا (78:40)۔ پیٹے گا کہ کاش! میں ایک ذی احساس انسان ہونے کے بجائے' مٹی کا ایک تودہ ہوتا تو کیا اچھا تھا! دیکھ تو نہ سکتا اپنی اس حالت کو' محسوس تو نہ کر سکتا اپنی حالت کو کہ کس عذاب میں ہوں۔ اے کاش! میں مٹی کا تودہ ہوتا!! سوچیے عزیزانِ من! کہ یہ کیا چیز ہے؟ اپنی اس مجبوری کو تو دیکھیے کہ یہ ساری چیزیں بالکل آئینے کی طرح سامنے آ جائیں اور ان کے بدلنے پر پھر کوئی اختیار نہ ہو' ابدی جہنم ہو اور پھر وہاں کی کیفیت یہ ہو کہ وہاں پہ چیخ کے کہے کہ ''اے کاش! میں انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودہ ہوتا!'' یہ ہے وہ چیز جسے جہنم کہیں گے۔ کہا کہ بہرحال تم اگر پلٹ جاؤ گے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے' تو پھر جہنم ہے۔ جہاں راستے میں کوئی ''روک'' پیدا ہو جائے تو پھر کیا کیفیت ہوتی ہے؟ کیا اِس کا بھی کبھی سوچا؟ کیا کبھی سوچا کہ ہم کیا ہیں؟

ہمارے ہاں جہنم کا تصور

ہمارے سامنے تو جہنم کا بھی کچھ ایسا تصور دیا ہوا ہے کہ جیسے وہ پولیس والے مارا کرتے ہیں۔ دس بیس وہ ہوتے ہیں' اکیلا یہ مجرم ہوتا ہے۔ لٹکایا ہوا ہے وہاں! یہ اسی قسم کا کوئی تصور ہوتا ہے جہنم کا۔ قبر میں ہوتا کیا ہے؟ وہ مردہ اکیلا ہوتا ہے' جہاں سے بھاگنے کا راستہ بھی نہیں ہوتا۔ وہاں بھیج دیتے ہیں وہ فرشتے۔ تو یہ تصور بہرحال عوام کو سمجھانے کے لیے کہہ لیجیے کہ ان لوگوں نے یہ تصور پیدا کیا ہے۔ لیکن جب ذرا ذہنی سطح اونچی ہوتی ہے تو پھر اس تصور سے تو آدمی کچھ حاصل نہیں کرتا۔ تدبر یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے۔ کہا کہ ''اب پھر موقعہ آ گیا ہے''۔ اب آگے دیکھیے کہ کیا موقع آ گیا ہے؟

انسانی زندگی صلاحیتوں کے توازن کا نام ہے

کہا ہے: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ (17:9)۔ اب قرآن کا نزول ہو گیا ہے۔ یہ اس سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ یہاں ''اَقْوَمُ'' کا صیغہ آیا ہے: ''جس سے زیادہ متوازن' محکم' مضبوط' سیدھی راہ کوئی اور ہے ہی نہیں''۔ لو پھر ایک اور موقعہ آ گیا۔

''صراطِ مستقیم'' بھی وہیں اقوم سے ہے۔ ''قام'' کے معنی ہوتے ہیں ''کھڑا ہونا''۔ میں نے کہا تھا: ''کھڑا وہی ہو سکتا ہے جس کا توازن برقرار رہے''۔ پاؤں میں ذرا سی لغزش آئی' لڑکھڑا گیا' گر پڑا' چکر آ گیا' گر پڑا۔ اس میں ہوتا کیا ہے: ''توازن صحیح نہیں

Marfat.com

رہتا''۔ کوئی چیز کھڑی نہیں رہ سکتی اگر اسکا توازن ٹھیک نہ ہو۔ اس مادہ (Root) سے قرآن نے یہ سارے الفاظ لیے ہیں اور یہاں تو ''اقـــوم'' کہا ہے: زندگی کے اندر بہترین اعتدال اور توازن پیدا کرنے والا۔ انسانی صلاحیتوں کے اندر اگر توازن ہوتو اسکوطب کی اصطلاح میں بھی تندرستی ہی کہتے ہیں۔ صحت کی Definition ہی یہ ہے۔ پرانے دور میں طب کے اندر انسان میں چار خلطیں ہوتی تھیں۔ ان چار خلطوں کے اندر ''توازن'' یا ''اعتدال'' کا نام تندرستی تھا۔ اب آگے بڑھیے۔ سائیکالوجی (Psychology) کے اعتبار سے انسان کے اندر مختلف صلاحیتیں ہیں: غصہ بھی ہے اور ہمدردی کا جذبہ رحم بھی ہے، یعنی اس قسم کی صلاحیتیں انسان کے اندر ہیں۔ ان صلاحیتوں کے اندر ''توازن برقرار رکھنا'' انسان کی زندگی کی صحت ہے۔ جسم کی صحت نہیں۔ انسانی زندگی کی صحت توازن برقرار رہنا ہے۔ یہ کس طرح سے رہتا ہے؟ یہ جو اقدارِ خداوندی ہیں، جنہیں صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے، ان کی نمود اپنے اندر ہوتی جائے، اس سے انسانی زندگی کی صحت توازن بدوش رہتی ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا۔ خدا کی صفات مکمل ترین صفات کہلاتی ہیں۔ قرآن نے انہیں اسماالحسنیٰ کہا ہے، یعنی وہ صفات جن میں اعتدال وتوازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ ہے خدا۔ جتنا یہ توازن اور اعتدال انسانی صلاحیتوں کے اندر بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی قرآن کے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ اسے قربِ خداوندی حاصل ہوتا چلا جائے گا۔ خدا تو کہیں بیٹھا ہوا نہیں ہے کہ وہ جسمانی طور پر (Physically) اس کے قریب ہو جائے گا، یعنی جس قسم کی اس کی ذات کے اندر ان صفات کی نمود ہوگی، اس کی بھی یہ کیفیت ہوتی چلی جائے گی۔ یہ صبغۃ اللہ ہوگا۔ یہ خدا کا رنگ ہوگا جس سے زیادہ حسین رنگ کوئی نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے انسانی ذات کی صلاحیتوں میں یہ توازن اور اعتدال پیدا ہوسکتا ہے، یہ ہے **اَقْوَمُ**۔

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (17:9)۔ اور یہ یہیں ان کے لیے مژدۂ جاں فزا سنا دیتا ہے، خوشخبریاں دیتا ہے کہ جو اس کی صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں اور **يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ** (17:9)۔ صلاحیت بخش کام کرتے ہیں۔ اسی ''صلاحیت'' سے یہ الصّٰلِحٰت کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ہی ''ص ل ح'' ہے۔ ان کو آپ عملِ صالح کہتے ہیں۔ یہ وہی صاحبِ صلاحیت لوگ ہیں، وہ ایسے اعمال وافعال سرانجام دیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کو تقویت پہنچائیں اور پھر یہ اقدارِ خداوندی کے تابع ہیں، تو ان میں توازن پیدا کریں، اعتدال پیدا کریں۔ ان کو بھی ''اقـوم'' بناتے چلا جائیں، ان کے لیے اس امر کی خوشخبریاں ہیں۔ یہاں ان کے لیے **اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا** (17:9) کہا ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ انہیں بخشش کے طور پر یہ سب کچھ ملا ہے۔ کہا: یہ عدل ہے، یہ معاوضہ ہے، یہ نتیجہ ہے ان کے کاموں کا۔ یہ بخشش نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو زبانوں میں جو الفاظ رائج ہوجاتے ہیں، بڑے معنی خیز ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں لفظ ہی ''بخشی گئی'' کہتے ہیں۔ دعا ہی یہ ہوتی ہے: ''اللہ بخش دے''۔ خدا بخش، یعنی ہم بخشیش فی سبیل اللہ ہیں۔ ہم ایسے گداگر واقع ہوئے ہیں کہ یہاں کی ساری زندگی بھی بخشش میں ہی گذر جاتی ہے صاحب! ''آٹا بھی منگ کے کھان ڈے

Marfat.com

ہوئے نیں''❶۔ایک بار بخشش بند ہو جاتی ہے تو پوچھو نہیں یہاں قیامت آ جاتی ہے اور پھر کیفیت یہ کہ مرنے کے بعد جنت بھی ''بخش دے'' صاحب! دیکھ لیا آپ نے کہ ہم لفظوں پہ کبھی غور نہیں کرتے۔ ہم میں سے ہر ایک یہی دعا مانگتا ہے۔''بخشش'' کی دعا مانگتا ہے: ''یااللہ بخش دے''۔قرآنِ کریم کہتا ہے۔ اَجْـرًا کَبِیْـرًا (17:9) ۔وہاں تو محنت کی مزدوری ملتی ہے ۔ جنت کے متعلق بِـمَـا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (6:128) ۔ ہی آیا ہے: ''جو کچھ تم نے کیا تھا' بس اس کا نتیجہ تمہارے سامنے مرتب ہو کے آ گیا''۔اس کا کرم اتنا ہی ہے کہ۔ لَا یُضِیْـعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (9:120)۔وہ کسی کا اجر ضائع نہیں ہونے دیتا' غلط معاشرے میں تو یہ ہوتا ہے کہ محنتوں کے اجر ضائع ہو جاتے ہیں۔ بلا محنت کے' بخشش کے طور پر' عطیات ملتے ہیں۔ یہ غلط موازنہ ہو گیا۔ صحیح یہ ہوا کہ جہاں نہ کسی کو بے گناہ پکڑا جائے' نہ بخشش کے طور پہ یونہی کچھ ملے' ہر ایک کو اس کے کام کا صحیح نتیجہ مل جائے' محنت کی صحیح مزدوری مل جائے۔ یہ ہے خدا کا نظام۔ اِنَّ الَّـذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (17:10)۔اور جو زندگی کو پھر اسی دنیا کی زندگی سمجھ لیتے ہیں' آگے بڑھنے کے لیے کچھ نہیں کرتے' مستقبل کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے' صرف طبعی زندگی کو منتہیٰ سمجھتے ہیں۔ان کے لیے دردناک تباہی کا عذاب ہے۔اگر طالبعلم نے فیصلہ کر لیا کہ میں نے آگے پڑھنا ہی نہیں ہے' اس کے بعد اب جو جی میں آئے سال بھر کر لیجیے کہ ''بچہ بیٹھا کرو' کسی وقت تو دہرایا کرو' کوئی ہوم ورک کیا کرو''۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نہیں صاحب! میں نے تو آگے پڑھنا ہی نہیں ہے' تو یہ ہے جسے سیکولرزم (Secularism) کہتے ہیں۔

سیکولرزم نظریے کا ماحصل

یہ نظریہ ہے کہ ''آگے پڑھنا ہی نہیں ہے''۔سیکولرزم (Secularism) والے کہتے ہیں: ''زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' آگے کچھ ہے ہی نہیں''۔آپ اس کو دل سے لیجیے اور اس کے بعد پھر راوی عیش لکھتا ہے: ''جو جی میں آئے کرتے چلے جایئے''۔سیدھی سی بات ہے کہ یہ بچہ جس نے خود ہی طے کر لیا ہے کہ میں نے آگے پڑھنا ہی نہیں ہے۔تو ٹھیک ہے اب وہ اپنا سارا وقت کھیل کود میں گذارے۔اس نظریے کو سیکولرزم کہتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ایک قوم تو وہ ہے جو اعلانیہ یہ کہتی ہے: ''ہاں زندگی' اسی دنیا کی زندگی ہے''۔اسے آپ کفر کہتے ہیں۔جیسے آپ کے ہاں روس یا چین ہے۔دوسرے وہ ممالک بھی ہیں جن میں ہم شامل ہیں۔وَمِـنَ النَّاسِ مَـنْ یَّـقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (2:8)۔ زبان سے یہ کہتے رہیں گے کہ ہاں ہاں صاحب! ٹھیک ہے ہم پڑھیں گے' لکھیں گے' پاس کیوں نہیں ہونا ہے' میں نے تو یہ بننا ہے' میں نے وہ بننا ہے۔لیکن وَمَـاهُـمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (2:8)۔ دل میں اس نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ ٹھیک ہے: نہیں پڑھیں گے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) ۔ یہ بچے دھوکہ دیتے ہیں

❶ ہم تو آٹا بھی بخشیش کا ہی کھاتے ہیں۔

ماں باپ کو بھی، گھر والوں کو بھی۔ فیصلہ یہ کیا ہے کہ پڑھنا نہیں ہے۔ زبان سے کہتا ہے کہ "نہیں صاحب! ٹھیک ہے، پڑھیں گے، صاحب! ٹھیک ہے"۔ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (17:10)۔ ان کے لیے بڑا دردآمیز عذاب ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد جو ندامت ہوتی ہے وہ بھی تو ہے۔ زبان سے کہتا چلا جائے، اس کے بعد یہ ہے کہ صاحب! بالکل جھوٹ بولتا تھا، دھوکہ دیتا تھا۔ اس کے لیے عذابِ الیم ہے۔ کہا: اب یہ فیصلہ ہے۔ یہاں عذابِ الیم، بڑا دردناک عذاب، بڑا نقصانِ عظیم ہے۔ آگے ایک بڑی عجیب بات آ گئی۔ کونسی بات عجیب نہیں آتی؟ اس پہ کھڑے ہو کے سوچیے تو عجیب بات نظر آتی ہے۔ ہر شخص اپنا نفع چاہتا ہے۔ کوئی شخص اپنا نقصان نہیں چاہتا۔ ہر شخص سے مراد ہے وہ جو صاحبِ عقل و ہوش ہے، کیونکہ پاگل کے متعلق تو ہمارے ہاں Definition یہ ہے: "اوئے پاگل ہو گیا ہے، اپنا نفع نقصان بھی نہیں سوچ رہا"۔ یہی ہے پاگل کی Definition: "اپنا نفع نقصان نہیں سوچتا"۔ بات تو یہ روزمرہ کی ہے، ہم صبح سے شام تک سو بار یہ بات کہتے ہیں۔

کبھی سوچا بھی ہے نفع کس کو کہتے ہیں؟ نقصان کس کو کہتے ہیں؟ ہمارے ہاں تو نفع نقصان کا معیار یہ ہے کہ جس بات میں ہمیں دنیاوی مفاد حاصل ہو جائیں، وہ ہوا نفع، جس میں ہمیں یہ نہ حاصل ہوں وہ ہوا ہمارا نقصان۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر سخت بھوک کے عالم میں آپ کے سامنے پلاؤ کا، نہایت اعلیٰ درجے کا پکا ہوا، رکاب آ جائے۔ آپ لپک کے اس کی طرف جائیں گے، لقمہ اٹھائیں گے۔ اگر کان میں کسی نے کہہ دیا کہ "اس کے اندر غلطی سے نمک کی جگہ سنکھیا پڑا ہوا ہے" تو کیا آپ کبھی وہ لقمہ منہ میں لے جائیں گے؟ بھوکے مر جائیں گے، اسے نہیں کھائیں گے۔ دیکھا آپ نے معیار کیا ہوا؟ بھوک کے مقابلے میں آپ کی زندگی آپ کو زیادہ عزیز ہے۔ آپ نے بھوک کی جو تکلیف تھی اسے برداشت کر لیا، یہ نقصان اٹھا لیا۔ جان کو محفوظ کرنے کا جو نفع تھا وہ نہیں جانے دیا۔ جو اس کو کھا لے گا فوری طور پہ تو اس کی بھوک ختم ہو جائے گی لیکن مستقبل یعنی کل (Tomorrow) نہیں آئے گا، جان کی ہلاکت ہو جائے گی۔ ہوا ناں نقصان۔ تو یہ کیا ہوا؟ مفادِ عاجلہ Immediate Gain تو اسے فوراً حاصل ہو گیا۔ اس کے کھانے سے فوری فائدہ تو ہو گیا کہ بھوک کے عذاب سے بچ گیا۔ وہاں لانگ ٹائم (Long Time) کا جو تصور تھا، جسے ہم کہتے ہیں کہ تھوڑا سا آگے دیکھنے والی بات ہے، وہ ختم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا اس میں کتنا نقصان ہوا؟ جان ہی نہ رہی۔ قرآن نے کہا ہے: جب انسان اپنے پیمانے سے نفع اور نقصان کو ماپتا ہے تو اس کی صورت اس شخص کی ہو جاتی ہے جسے پلاؤ کے اندر پڑے ہوئے نمک اور سنکھیے کا علم نہ ہو۔ جسے یہ علم نہیں ہو گا آپ دیکھتے ہیں کہ فوراً لپکے گا اور فوراً کھا لے گا۔ جسے یہ حقیقی علم نہ ہو کہ "کس چیز میں نفع ہے اور کس چیز میں نقصان ہے" وہ انسان ہمیشہ پیش پا افتادہ نفع (Immediate Gain) کے پیچھے لپکتا ہے، فوری حاصل ہو جانے والے نفع کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کی نگاہ ذرا دور نہیں جاتی۔ "وہ آج کی سوچتا ہے، کل کی نہیں سوچتا"۔ کہا: انسان کو اگر اس کی اپنی حالت پہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهٗ بِالْخَيْرِ (17:11)۔ وہ مستقبل کے منافع کو چھوڑ کر، فوری حاصل ہونے والا نفع جو اس

کے ذہن میں ہوتا ہے' کی طرف لپکتا ہے' خواہ وہ درحقیقت اس کے لیے کتنا ہی نقصان رساں کیوں نہ ہو۔ اس کی آنکھ یہ نہیں دیکھتی ہے۔

یہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ کہا: وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا (17:11)۔ بڑا ہی عجلت پسند واقع ہوا ہے' Immediate Gain چاہتا ہے' شباشب ملینئر ❶ (Millionnaire) بننا چاہتا ہے۔ معاشرے کی تباہی اسی سے آتی ہے۔ یہ ہماری مملکت' ہمارا معاشرہ گھٹنے بھی نہیں چلا۔ قومی زندگی میں پچیس سال' اٹھائیس سال' تیس سال کا عرصہ آنکھ جھپکنے کا عرصہ ہوتا ہے۔ قوموں اور مملکتوں کی زندگی تو صدیوں سے ماپی جاتی ہے۔ یہ کیا ہوا ہے یہاں؟ ہر شخص نے یہ کوشش کی کہ عجولا۔ فوری مفاد حاصل ہو جائے۔ لوٹ میں یہ جاتا ہے۔ محنت کرنی ہی نہیں پڑتی۔ فوراً سب مال آ جاتا ہے۔ لوٹ اور ڈاکے کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں۔ Crude Form تو اس کی یہ ہوتی ہے کہ سڑک کے اوپر چلتی ہوئی بس کو پستولوں سے روک لیا' چلتے ہوئے راہگیر کو روک لیا۔ وہ اکیلا ہوا' آپ چار ہوئے' چھین لیا سب کچھ۔ بڑے پیمانے پہ یہ تجارت اور یہ سوداگریاں! ان سب میں یہی سارا کچھ ہوتا ہے۔ یہی ہو رہا ہوتا ہے: ہر دوکاندار گاہک کو لوٹتا ہے۔ یہ جو اس طرح کا بیوپار ہے' یہ جو اس طرح کی دوکانداری ہے' کتنے دن پنپتی ہے پھر؟ اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ صاحب! قیمت تو اس کی دس روپے تھی اور اس شخص نے ہمیں دھوکہ دے کے پندرہ چارج کر لیے' وہاں دس میں ملتی ہے' کبھی آپ دوسری بار اس دوکان پہ بھی جائیں گے؟ ایک دفعہ تو اس نے جلد بازی میں دوہرا لے لیا' کما لیا۔ یہ جو اس نے آپ کو دھوکہ دے کے دوہرا کمایا ہے' وہ شرکو دعوت دے رہا ہے۔ خیر' ہندو کہا کرتا تھا: ''مہاراج! روپے کا بیوپار ہے جی''۔ پتہ نہیں آپ لوگوں نے وہ ہندو' دیکھے ہیں یا نہیں۔ ہماری نئی نسل نے تو دیکھے ہی نہیں ہیں وہ ہندو' ''روپے دا بپار ہے' سنیا اے ناں تسیں وی'' ❷ انہوں نے وہ لکھ کر لگا رکھا ہوتا ہے: ''ہمارا کاروبار زیادہ بکری' تھوڑے نفع سے ہے''۔ یہ چیز لانگ ٹرم (long term) تھی۔ ہندو کی یہ صورت نہیں ہوا کرتی تھی کہ آج وہ لاکھوں میں کھیل رہا ہے اور کل ہی دیوالیہ ہو گیا۔ کبھی شاذ و نادر اس قسم کے ہوا کرتے تھے۔ وہاں تو یہ پیش پا افتادہ مثالیں آپ کو دی ہیں۔ پہلے کی زندگی میں یہ ہوتا ہے۔ جب بھی قومیں محنت کے پروگرام کی اپنی لانگ ٹرم پالیسیوں کو چھوڑ کے Immediate Gain کی طرف آ جاتی ہیں' حاصل تو وہ کر لیتی ہیں' لیکن ان کی زندگی' ان کی عمر کم روزہ ہوتی ہے۔

پیش پا افتادہ یا مفادِ عاجلہ کا نتیجہ

کہا کہ جب انسان کو اپنی حالت پہ چھوڑ دیا جائے تو یہ پیش پا افتادہ یا عاجلہ مفاد کی طرف لپکتا ہے' خواہ آخر میں چل کے اس کے لیے وہ کتنا ہی زہر آلود کیوں نہ ثابت ہو' اس کی نگاہ اس پہ نہیں جاتی۔ قرآن نے کہا یہ تھا کہ یاد رکھو! یہ چیز کہیں بہتر ہے: مَا يَنفَعُ النَّاسَ (13:17)۔ کہ جس میں پوری نوعِ انسانی کا بھلا ہو۔ وہ تجارت باقی رہنے والی ہے' ہر فرد اپنے ہی فائدے کے پیچھے نہ لپک جائے۔ اسے

---

❶ لاکھ پتی

❷ ہمارا بیوپار۔ کاروبار۔ روپے کا ہے۔ آپ نے بھی یہ سنا ہے نا!

Marfat.com

دیکھے کہ جو الناس کے لیے منفعت بخش ہوگی یہ بھی اُس میں شامل ہو۔ اس بات کو سمجھنے میں ذرا وقت زیادہ لگے گا۔ اس نے کہا ہے: انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس کو اس کی اپنی ہی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے نقصان کو اس طرح سے گھر دعوت دے دے کے بلاتا ہے جیسا کہ اس کو اپنی منفعت کو یا فائدے کو بلانا چاہیے تھا۔ لیکن یہ سارے پاگل تو نہیں ہو گئے' یہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے فائدے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ بیٹھا ہوا ناصح' مشفق ہے۔ اسے دیکھو۔ اور وہ جو اس کے ساتھ ٹکریں مار رہا ہوتا ہے' اسے دیکھو کہ وہ اس کے ساتھ کیا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کو سمجھا رہا ہوتا ہے کہ حقیقت میں تمہارا فائدہ کس بات میں ہے۔ یہ رسول آتے تھے اور آ کے قوموں سے کہتے تھے: ہم تمہارے بھلے کی کہہ رہے ہیں۔ تو یہ سمجھاتے کیا تھے؟ وہ پاگل تو نہیں ہوتے۔ ادھر ان کے مقابلے میں انہوں نے یہ پیمانہ اپنا رکھا ہوا تھا کہ'' ذرا سا جھوٹ بولیے ہزار روپیہ رشوت کا جیب میں آ جاتا ہے۔ چھ مہینے کی تنخواہ ہوتی ہے۔ ذرا سا دیانت دار بنیے اور پھر اس کے بعد دیکھیے اس تنخواہ میں کتنے دن گذارہ ہوتا ہے۔ پھر کیجیے فاقے اور دیکھ لیجیے ایماندار بننے کا نتیجہ''۔

قرآن حکیم کے نزدیک عقلِ انسانی کے نفع و نقصان کے پیمانے

قرآن نے معیار یہ دیا ہے کہ ٹھیک ہے' تھوڑے دنوں کے لیے فاقہ کر لو۔ کسان کے گھر میں اگر بیج (Seed) کے لیے ایک ہی بوری گیہوں کی رکھی ہے' وہ اس نے سنبھال کے رکھی ہوئی ہے اور بونے کا وقت آ جائے' گھر میں آٹے کی کمی ہو۔ مفادِ عاجلہ تو یہ ہے کہ وہ بوری کو مشین پہ لے جائے' پسوا کے لے آئے۔ رات کو ہی پراٹھے پکنے لگ جائیں۔ اس وقت تو یہ ٹھیک ہے' لیکن جب وہ فصل پکنے کا زمانہ آئے گا' تو اس کے پاس کیا ہوگا؟ اس نے تو بویا ہی کچھ نہیں تھا۔ ایمان بالآخرت یہ ہے کہ اس وقت ان تکلیفوں کو برداشت کر لے۔ بیج کو جا کے بو دے' چھ مہینے مشقتیں تو اٹھائے گا اور چھ مہینے کے بعد جو منفعت ہوگی' آپ دیکھیں گے کہ وہ کیا ہے صاحب۔ اگر پیمانہ یہی ہو کہ بھوک نہیں رہنی چاہیے' روٹی رات کو پکنی چاہیے۔ اور دوسرا اس کے اوپر یہ ایمان ہو کہ ''نہیں صاحب! میں بھوکا رہ لوں گا' میں ناجائز طریقے پہ ایک لقمہ بھی نہیں لونگا' بچے بھوکے مرتے ہیں' میری حالت خستہ ہے ٹھیک ہے دیانتداری سے کاروبار کرونگا' نقصان کیوں نہ اٹھاؤں''۔ آپ دیکھتے ہیں کہ باقی محلے کے بازار کے دوکاندار آپس میں بیٹھے ہوئے ہنستے ہیں: ''پاگل ہو گیا ہے' دیکھیں گے کاروبار چلا لے گا''۔ یہ جو قرآن نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ۔ يَسْتَهْزِؤُنَ (15:11)۔ یہ ادھر جا کے جماعتِ مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں' یہی تو وہ مذاق ہوتا ہے جو ہمارے ہاں روز اڑتا ہے: ''پاگل ہو رہا ہے' کہتا ہے دیانتدار ہو کے کاروبار کرونگا''۔ ادھر اس نظام کے تحت ایک پوری ایسی جماعت اٹھ رہی ہوگی جو ان کو کہہ رہی ہے کہ ''تم جو اس طرح روزمرہ کی منفعت پوشیاں حاصل کرتے ہو' ہم تو یہ نہیں کریں گے۔ بھوکے مر جائیں گے۔ بال بچوں پہ مشکل آ جائے گی۔ مشکلیں برداشت کریں گے''۔ کتنی مشکلیں برداشت کریں گے؟ کہا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ (2:155)۔ فصلیں تباہ

Marfat.com

ہوجائیں گی۔ بھوک آجائے گی' جانیں تک دینی پڑ جائیں گی' لیکن اصول نہیں چھوڑیں گے۔ يَسْتَهْـزِءُوْنَ (15:11). وہ کہتا ہے کہ یہ جو منافق ہیں وہ ادھر جاتے ہیں تو اِن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دیکھا: وہ کیا آوازیں دے رہے ہیں؟ ''دیکھو' ہم کتنی خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں''۔ یہ کہتے ہیں شکریہ۔ ہماری کیفیت تو یہ ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔ ہم نے طے کرلیا ہوا ہے' ہم اپنے نفع نقصان کی بات جانتے ہیں' ہم نے اپنے آپ کو اس نصب العین کے لیے وقف کر دیا ہوا ہے۔ ''آتی ہیں مشکلیں' ٹھیک ہے آنے دیجیے۔ جو کام ہوتا ہے' ہونے دیجیے۔ ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا''۔ وہ اس بات کا مذاق اڑاتے ہیں: يَسْتَهْـزِءُوْنَ (15:11)۔ قرآن کہتا ہے۔ اِلَّا كَانُوْا بِـهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (15:11)۔ وہ ہنس رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارا قانون ان کا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے: ''دیکھو کل ان کے ساتھ کیا ہوگا''۔ یہ تو عام جماعت مؤمنین کی کیفیت تھی۔ وہ یہ کچھ کرتے تھے۔

آپ سوچیے: ان مومنین کا سب سے بڑا امام جو اِن کا سربراہ تھا' وہ اس عمل کے اندر' ان کا نبی ہوتا تھا' جس میں آپ کہتے ہیں کہ قدم قدم پہ نقصان ہوتا تھا وہ کس قدر جذب ہوتا تھا اپنے اس اصول پرستی اور اقدار کی پابندی کے اوپر! کتنے بڑے بڑے نقصان اٹھا رہا ہوتا تھا!! آپ نے کبھی اس پہ سوچا ہے جو قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں: اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (68:51)۔ ''پاگل ہوگیا ہے''۔ تو یہ اس کا پاگل پن کیا تھا؟ پاگل پن یہی تھا کہ ''دنیا کے معیاروں کے مطابق' ان عقل مندوں کے مطابق' جس چیز میں نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے' یہ اس میں اپنا فائدہ ہی فائدہ دیکھتا تھا''۔ ہم جو کہتے ہیں اپنا نفع نقصان نہیں سوچتا تھا۔ وہ اس پیمانے پہ اس کے کاروبار کے اوپر ہنستے تھے' کہتے تھے: لَمَجْنُوْنٌ (68:51)۔ یوں تو ان کو پتہ تھا کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ عقلمند یہی تھا۔ اپنے مقدمات کے فیصلے اس سے کراتے تھے۔ اپنے اختلافات میں اس سے مشورے لیتے تھے۔ جھگڑا ہوجاتا تھا' تو اس سے کہتے تھے: تم نمٹاؤ۔ عقل کی تو کیفیت یہ تھی کہ یوں مانتے تھے۔ یہ انہوں نے کیا کہا؟ کہ یہ پاگل ہے؟ دیوانگی یہ نہیں تھی کہ وہ سچ مچ Mental Case ہوگیا تھا۔ ان کا پیمانہ (Measure) یہ تھا کہ جس کے مطابق وہ سمجھتے تھے کہ اس کو کیا ہوگیا ہے۔ ہم کہتے ہیں: ہم سارے ملک کی مملکت تمہیں دیتے ہیں۔ ساری دنیا کی دولت تمہیں دیتے ہیں۔ بہترین چیزوں کا انتخاب کرلو' وہ ہم تمہیں دیتے ہیں مگر یہ چار لفظ جو تم کہتے ہو کہ یہ مٹی کے بت ہیں' یہ کسی کام نہیں آتے' یہ کہنا چھوڑ دو۔ ''یہ کہنا چھوڑ دو' کیا ہوتا ہے؟ وہ سب چیزوں پر لات مارتا ہے۔ بھوکا رہتا ہے۔ گالیاں کھاتا ہے۔ پتھر کھاتا' لہولہان ہوجاتا ہے۔ بیاسی جنگیں لڑتا ہے۔ لیکن پروگرام کو' اپنی منزل کو نہیں بھولتا۔ یہ اسے نہیں چھوڑتا۔ بتائیے اسے پاگل نہیں کہیں گے تو وہ اور کیا کہیں گے؟ قرآن کہتا ہے کہ ''ہاں یہ دیوانگی وہ دیوانگی ہے جس پہ ہزار فرزانگیاں قربان ہوجائیں''۔ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (۱۳۵:۶) تم دیکھو گے انجام کار کون پاگل تھا؟ کون عقلمند تھا؟ کہ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ (17:11)۔ مستقبل کی زندگی سے انکار' اور صرف دنیا کی طبعی زندگی کو مآل سمجھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا نصب العین' مفادِ عاجلہ کا حصول رہ جاتا ہے۔ وہ انہیں جلدی جلدی سمیٹنے کی فکر کرتا ہے (21:37)۔ حرص و ہوس سے اس کی نگاہوں پر اس قدر دبیز پردے

Marfat.com

پڑ جاتے ہیں کہ وہ اپنے حقیقی نفع ونقصان کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ وہ خیر اور شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ وہ نقصان رساں باتوں کو بھی اسی طرح دعوت دیتا ہے جس طرح منفعت بخش امور کو۔

حقیقی نفع اور نقصان کا معیار مقرر کرنا انسانی عقل کے بس کی بات ہی نہیں

اس لیے عزیزانِ من! حقیقی نفع اور نقصان کا فیصلہ انسان خود اپنے معیاروں (Measures) کے مطابق نہیں کر سکتا۔ یہ صرف اپنی طبعی اور جسمانی زندگی کے مفاد کو مفاد سمجھے گا' اس کے نقصان کو نقصان سمجھے گا۔ قرآن اس کی حقیقی زندگی کے فائدے کی بات کرے گا اور نقصان کی بات بتائے گا۔ یہ صرف خدا کی وحی بتا سکتی ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے اور پھر یقین کرنے کا نتیجہ آخر کار فائدہ کی شکل میں ہی ہوگا جبکہ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔ کیا مثالیں دے رہا ہے! کس کس سطح پہ بات سمجھاتا ہے! رات کی تاریکی ہے انسان گھبرا جاتا ہے۔ وہ جسے ہمارے شاعر مریضِ شبِ ہجر کہتے ہیں کہ سحر ہی نہیں ہونے کو آتی' ابھی کتنی دیر ہے اس رات میں۔ رات کی تاریکی میں گھبراتا ہے۔ لیکن ایک وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے' زندگی میں انسان پر تاریکیاں آتی ہی ہیں۔ لیکن ذرا دیکھو تو سہی رات اور دن کی گردش! جسے یہ یقین ہے کہ اس رات کے بعد صبح ہوگی وہ رات کی تاریکی میں مضطرب اور بے قرار نہیں ہوگا۔ اسے یقین ہے کہ صبح ہوگی۔ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ (17:12)۔ اور جس کی نگاہ حقیقت پر ہوتی ہے' اسے ایمان بالآخرت ہوتا ہے۔ شام کی تاریکی کے وقت سے ہی اسے یہ ایمان ہے کہ صبح ہونی ہے اور اس ایمان کو ہی ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے مستقبل پر یقین۔ آپ سوچتے ہیں کہ یہ کس طرح سمجھا رہا ہے' اس انسان کو جو یہ کہہ رہا ہوتا ہے:

شب ہجراں کے جاگنے والو
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی؟

لیکن جسے یہ یقین ہے کہ سحر ہو کے رہے گی' تو وہ تو صرف یہ کہتا تھا کہ یہ محض رات کی تاریکیاں تھیں۔ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً (17:12)۔ یہ بھی تم نے ایک نشانی دیکھی۔ تاریکی یہ تھی لیکن اس تاریکی کے بعد دیکھتے ہو کس طرح سے افق پہ آفتاب ابھرتا ہے' تو ساری دنیا جگمگ جگمگ کرنے لگ جاتی ہے! یہ ہے آخرت پہ ایمان! اور یہ ہے وہ کہ جس کا آخرت پہ ایمان ہوتا ہے' وہ یہ بات جانتا ہے۔ جب پوری رات کی تاریکیاں اسے ڈراتی ہیں تو وہ یقیناً یہ کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں:

ہے افق سے ایک سنگِ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانندِ آئینہ بکھر جائے گی رات

Marfat.com

قرآنی اقدار سے جہالت اور مصائب و آلام کی تمام تاریکیاں چھٹ جائیں گی

عزیزانِ من! اُسے یقین ہوتا ہے کہ سحر ہو کے رہے گی۔ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ (17:12)۔ وہ اسے آیات کہتا ہے۔ کہتا ہے: سمجھنے کے لیے دیکھو تو سہی' رات کی تاریکی سرمدی نہیں ❶ ہوتی۔ دن نے چڑھنا ہوتا ہے۔ یہ ہے ایمان بالآخرت' عزیزانِ من! تاریکی سے گھبراؤ نہیں' صبح ہو کے رہے گی۔ لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (17:12) دن چڑھے گا تو یہ رات کی تاریکی چھٹ جائے گی۔ رات کی یہ تاریکی اور دن کی یہ روشنی' یہ گردشِ لیل النہار کا ہے کے لیے ہے؟ کہا: یہ بھی تمہارے فائدہ ہی کے لیے ہے۔ اس سے تم اپنا سارا حساب وکتاب رکھتے ہو۔ کیلنڈر بناتے ہو' دن اور رات پورا ہو جاتا ہے تو کہتے ہو ایک دن ہو گیا' یہ ایک ڈیٹ (Date) ختم ہو گئی۔ اس سے حساب رکھتے ہو۔ سارا زندگی کا کاروبار اس حساب کے اوپر چلتا ہے۔ تو یہ حساب اسی طرح سے ہی ہوتا ہے۔ اگر سرمدی طور پر دن ہی دن رہے' تو پھر تمہارے حساب کرنے کے پیمانے ہی ختم ہو جائیں۔ اس میں تمہارا ایک فائدہ ہوتا ہے۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:4-5)۔ یاد رکھو' تکلیف کے بعد ہی آسانی ہوتی ہے جو حقیقت میں آسائش بہم پہنچاتی ہے۔ گھبراؤ نہیں' ہمارے غیر متبدل قانون پر نگاہ رکھو کہ رات ہوئی ہے دن ضرور چڑھے گا۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے۔ اس سے تم دن گنتے ہو' حساب رکھتے ہو۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (17:12)۔ کہا: دیکھا کہ ہم نے کتنا بڑا اہم مسئلہ' خیر اور شر کا' نفع اور نقصان کا' عاجلہ مفاد کا اور مستقبل کے خیر کا' کتنا اہم مسئلہ تھا' حل کر دیا۔

ہم نے تو کبھی غور نہیں کیا۔ اس مسئلے کا فلاسفرز سے پوچھیے: وائٹ ہیڈ (White-head) سے بھی بہت پہلے' بلکہ اس کے وقت سے بہت ہی پہلے۔ پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ Evil کسے کہتے ہیں؟ Evil کیا ہوتا ہے؟ خیر کسے کہتے ہیں؟ شر کیا ہوتا ہے؟ نفع کسے کہتے ہیں؟ نقصان کیا ہوتا ہے؟ اس فلسفے کی تاریخ تو ہمارے سامنے ہے لیکن آج تک نفع وضرر کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا' نہ ہی یہ کسی فیصلہ نامی چیز پہ پہنچ سکے۔ ان کے ہاں اضافی یا Relative کا تصور تو ہے۔ ماپنے کا پیمانہ رکھ کر نفع ونقصان کا حساب کرتے ہیں۔ جیسے ایک چیز پر دوکاندار کی لاگت دس روپے آتی ہے' وہ بارہ روپے میں بیچے گا تو کہے گا کہ نفع ہوا۔ اگر آٹھ میں بیچے گا تو کہے گا کہ نقصان ہوا۔ یہ نفع ونقصان تو اضافی ہے' پیمانہ بدل جائے گا تو نفع ونقصان بدل جائے گا۔ اس میں کئی اور ❷ Factors آجائیں گے۔ عام طور پر کہتے ہیں کہ ''مندہ آنے والا ہے۔'' اگر یہ معلوم ہو جائے یا یہ معلوم ہو جائے کہ اگلے سال اس پہ ٹیکس لگنے والا ہے' تو دس روپے کی چیز پانچ روپے میں بیچ دے گا۔ کہے گا اس میں بھی فائدہ ہوا۔ یہ تصور Relative کہلاتے ہیں۔ نفع نقصان کے یا Relative یا اضافی پیمانے فلاسفروں یا مفکروں کی سمجھ میں آئے ہیں۔ مطلق خیر (Absolute Good) مطلق شر (Absolute Evil)' ہر حال میں نفع بخش' ہر حال میں نقصان دہ' اسے مطلق کہتے ہیں۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مطلق خیر اور مطلق شر کیا ہے۔ فکرِ انسانی عاجز ہے'

---

❶ دائمی ❷ عوامل

Marfat.com

فلسفہ فکر انداز ہے۔ آج بھی یہ مفکرین اور فلاسفر اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پہ پہلا مفکر کھڑا تھا۔ خیر و شر کا مسئلہ نفع و نقصان کا مسئلہ لانیخل لگ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہیں خیر اور شر۔ اور وہ تو ایک فقرے میں سمجھا دیتا ہے۔

اسے کہیں لکھ لیجیے گا: خیر کسے کہتے ہیں؟ اور نفع یا نقصان کیا ہوتا ہے؟ قرآن نے پیمانے دیئے ہیں، جنہیں اقدار (Values) کہا جاتا ہے۔ اقدار کے معنی پیمانے ہیں۔ یہ قدر کی جمع ہے۔ قدر کے معنی پیمانہ (Measure) ہی ہے، جنہیں Values کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ Value ہی ہے جس سے آپ نفع و نقصان ماپتے ہیں۔ قرآن نے اسے ''قدر'' کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ''ہم نے مستقل اقدار (Permanent Values) دی ہیں۔ اس قدر کے مطابق جو کام ہوگا وہ مطلق خیر ہوگا، جو اس کے خلاف ہوگا، وہ مطلق شر ہوگا''۔ یہ ہے ماپنے کا پیمانہ۔ اسے پھر یاد رکھیے: قدر کے معنی ہی پیمانے (Measure) کے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے اس کے متعلق کہا: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (97:1)۔ ہم نے اس قرآن کو اُس وقت جبکہ ساری دنیا وحی کی روشنی سے محروم ہو کر تیرہ و تار ہو چکی تھی، نئے اقدار اور نئے پیمانے دے کر نازل کیا۔ لہٰذا جس رات میں اُس کے نزول کا آغاز ہوا، وہ ایک جہانِ نو کی رات تھی۔

سود و زیاں کے پیمانے کی تلاش

اس وقت دنیا میں تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں۔ دنیا میں کیا تاریکیاں تھیں؟ اقدار نہیں ملتی تھیں۔ قدر کا پیمانہ برائے نفع و نقصان نہیں ملتا تھا۔ اس تاریکی میں انسانیت ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی، راستہ نہیں ملتا تھا۔ سارا فلسفہ تاریکی میں، رات کی تاریکی میں، چلا جا رہا ہے عزیزانِ من! فکر انسانی کو راستہ نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی یہ کیفیت ہے جو قرآن نے کہا ہے: كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا (2:20)۔ تو ذرا سی کہیں آگ روشن ہوتی ہے، تھوڑی سی جگنو کی سی چمک ہوتی ہے۔ جسے بجلی کی چشمک کہتے ہیں۔ اس میں یہ دو قدم تک چلتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چشمک گم ہو جاتی ہے پھر اسی اندھیرے کے اندر۔ فکرِ انسانی کے فلسفے کی پوری تاریخ یہی ہے۔ یہ تاریخ انہی تاریکیوں کے اندر سفر کرتی دکھائی دے گی۔ کیا تاریکیاں ہیں اس کی! کیا ہے وہ ظلمت جس کے اندر یہ انسان چلا جا رہا ہے؟ ماپنے کا قدر یا پیمانہ نہیں مل رہا عزیزانِ من! کسی فلاسفر سے ایک آیت دے کے پوچھیے: کانپ اٹھے گا کہ کیا کہہ گیا ہے قرآن! ان کی ساری تلاش اسی پیمانہ کی ہے۔ مستقل پیمانہ جس کی رو سے ماپا جائے کہ نفع کسے کہتے ہیں، نقصان کسے کہتے ہیں؟ وہ تمام تصورات Relative یا اضافی نہیں۔ وہ مطلق (Absolute) ہیں۔ ہر آن میں وہ مستقل اقدار ہیں۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (97:1)۔ یہ یہی مستقل قدریں تھیں جو قرآن کریم نے دیں۔ یہی وہ وحی ہے جو اللہ نے اس رات نازل کی جو جہانِ نو کے نمود کی رات تھی۔ یہ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (97:3) ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک رات جو اس تیرہ و تار زمانے کے ہزارہا مہینوں سے بہتر اور افضل ہے، جس میں یہ دنیا وحی کی روشنی سے محروم تھی۔

Marfat.com

رات کی تاریکی چھٹ گئی اور نورِ آفتاب جگمگا اٹھا

فلسفہ کے ہزار مہینے کی کشمکش ایک طرف' رات کی تاریکیوں کے بعد ہمیں پیمانے دیدیئے۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (97:5)۔ پیمانے دیدیئے۔ دن ہی دن ہوگیا۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69)۔ زمین اس نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اس نے ماپنے کے پیمانے دیئے' تو ''جو کام اس کی دی ہوئی اقدار کے مطابق ہے' وہ خیر ہے''۔ ہوسکتا ہے کہ ان سے آپ کو Immediate نقصان❶ ہو۔ وہ Immediate نقصان کس کا ہوگا؟ یہ جسمِ انسانی کا نقصان ہوگا۔ یہ Physical Life کا نقصان ہوگا' یہ صرف طبعی زندگی کا نقصان ہوگا۔ حقیقی فائدہ کس چیز کا ہوا ہے؟ اس نقصان کا کہ جس نے اس جسم کی موت کے بعد بھی آگے چلنا ہے۔ اسے قرآن اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (18:46) کہتا ہے۔ ''وہ صالح اعمال' وہ صلاحیتیں پیدا کرنے والے کام' جو باقی رہنے والے ہیں''۔ یہ باقی تو سب کچھ ختم ہوجانے والا ہے۔ اس سے تمہیں کتنا بڑا فائدہ ہوگیا۔ تمہیں طبعی زندگی کا کتنے دنوں کا فائدہ تھا؟ جتنا جی چاہے اپنی عمر لمبی کرلیجیے۔ یہ تو ختم ہوگی۔ جب یہ ختم ہوگی تو اس کے ساتھ اس کے سارے فائدے ہی ختم ہوجائیں گے۔ اتنا بڑا فائدہ اٹھاکے' جو اتنا بڑا اعلیٰ درجے کا سوٹ بنوایا تھا' جس کی سلائی بھی رینکن (Rankine) نے ہزار روپیہ لے لی تھی۔ آخری دم کے بعد یعنی مرنے کے بعد بھی پہلی چیز یہاں یہ ہوتی ہے کہ وہ کپڑے ہی اتار لیتے ہیں' یہ سارا پہنا ہوا زیور بھی اتار لیتے ہیں' یہ اس طبعی زندگی کے آپ کے جتنے بھی مفاد تھے' یہ محلات جو آپ نے بنالیے' یہ موٹریں جو آپ نے خرید لیں' یہ دولت کے انبار جو آپ نے جمع کرلیے' یہ سب یہیں رہ جاتے ہیں۔

نفع نقصان سمجھنا چاہتے ہو' ٹھیک ہے تو سنو! جس دن بھی یہ دم برابر ہوجاتا ہے' مرجاتے ہو' اس دن تم دیکھتے ہو کیا ہوتا ہے؟ جسے تم ''میرا'' کہتے تھے' وہ سارا یہیں رہ جاتا ہے۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى (6:95)۔ اور تنہا تمہاری ذات ہے جو ہمارے ہاں آجاتی ہے' تو اگر اس میں کچھ اچھے اچھے زیور' عمدہ عمدہ کپڑے' عمدہ دولت اس کے پاس ہوگی وہ تو لے کے آگے چلی جائے گی۔ یہ جتنا کچھ تھا وہ سارے کا سارا عارضی تھا' وقتی تھا' ہنگامی تھا' یہاں ختم ہوجائے گا۔ ٹھنڈے دل سے کسی وقت بھی انسان سوچے تو یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ اس کے لیے کسی سقراط (Socrates: 469-399 B.C.) کے دماغ کی ضرورت ہو۔

جہانِ فردا کا سرمایۂ حیات

ہر شخص کو پتہ ہے۔ روز اپنے ہاتھوں سے مردہ نہلاتا ہے۔ خدا سے تم کوئی کفن دیدو تو وہ کفن کے ساتھ جاتا ہے' نہ دو تو اس پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ اس کے بعد وہ یہ کہے کہ ستیاناس تمہارا! میرے ٹرنک بھرے ہوئے رکھے ہوئے ہیں اور مجھے تم قبر میں ننگ دھڑنگ بھیج رہے ہو۔ ''او ایک چادر تو دیدو'' اس بیچارے پہ تو وہ بھی نہیں' وہ بھی تمہاری ہی دی ہوئی ہوتی ہے۔ ''دیدو خدا تمہارا بھلا کرے''۔ اور جو چیز آگے جارہی ہوتی ہے وہ اس کی ذات' اس کا نفس ہوتا ہے۔ اس کے تن پہ تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ قرآن

---

❶ فوری

Marfat.com

کہتا ہے: دیکھا عاجلہ (Immediate) ختم ہوگیا۔ اس طرح وہ ہمارے لیے ہر شے کو بڑی وضاحت اور واضح تر انداز میں بیان کرتا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ وقتی طور پر جو تکلیف آتی ہے' جو نقصان ہوتا ہے' اس پہ چیخنے لگ جاتے ہو۔ تمہاری نگاہ اس پہ نہیں ہوتی کہ اس رات کی تاریکی کے بعد دن چڑھے گا۔ وہ ہے آخرت پہ یقین۔ اور یہ کہنے کے بعد کہ یہ جتنی چیزیں تم یہاں ''میری کہتے ہو'' کہا کہ وہ یہیں رہ جانے والی ہیں۔ وہ عاجلہ ہیں۔ آگے کیا بڑھے گا؟ ربط دیکھتے چلے جایئے عزیزانِ من! بنی اسرائیل کا قصہ چلا آ رہا ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ اب وہ قرآن آ گیا ہے جس کے ساتھ اگر متمسک ہو جاؤ گے تو پھر تمہاری زندگی میں اس تمسک کے ساتھ تبدیلی آ جائے گی۔ یقیناً ابتدا میں تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ ہر کسان کو' جو جا کے اپنا دانہ بوتا ہے' محنت کرنا پڑتی ہے' مسلسل محنت کرنا پڑتی ہے اور جو کسان پسوا لیتا ہے اس کو تو کچھ بھی محنت نہیں کرنا پڑتی۔ کہا: محنت کرنا پڑے گی' اس محنت سے گھبرا نہ جانا۔ یہ رات کی تاریکی ہے' دن ضرور چڑھے گا۔ یہ جتنے عارضی' ہنگامی نقصانات تم دیکھتے ہو' یہ جتنی تکلیفیں دیکھتے ہو' یہ سب طبعی زندگی (Physical life) کی ہیں۔ جو حقیقی زندگی ہے اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ یہ سب کچھ یہاں رہ جائے گا اور اس کے بعد کہا: وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (17:13)۔ اس سے پہلے میں نے بڑی تشریح سے یہ آیت بیان کی تھی۔ کہا تھا کہ جسے اعمال نامہ کہتے ہیں' سمجھانے کی بات یہ ہے کہ جب ہمارے ہاں حفاظت کے ابھی سامان نہیں ہوتے تھے تو وہ دستاویزات (Documents) اچھی اچھی جتنی بھی قیمتی چیزیں ہوتی تھیں' ان کو لپیٹ لیا جاتا تھا۔ یہ سب چیزیں لپیٹی ہوئی ہوتی تھیں۔

ظہورِ نتائج کا وقت

وہ کہتا ہے یہ سب کچھ یہاں رہ جائے گا۔ تم آؤ گے تو ایک گول سی چیز تمہارے ساتھ ضرور ہوگی' جو تمہارے گلے میں پڑی ہوئی ہوگی۔ وہ کیا ہوگی؟ کہا: تمہارا اعمال نامہ ہوگا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ہاتھوں میں پکڑ کے لے آؤ گے۔ بے بسی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ گلے میں طوق باندھ کے لٹکایا ہوا ہوگا۔ جب تم آؤ گے' وہ ساتھ آ جائے گا۔ ٹھیک ہے جی' لپٹا ہوا ہوگا ناں۔ لپٹا رہنے دیجیے۔ کہنے لگے: ''نہیں' جسے تم قیامت کہتے ہو' پتہ ہے وہ کیا ہوتا ہے؟ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا (17:13)۔ قیامت میں اور کچھ نہیں ہوگا۔ ہوگا یہی کہ تم نے یہاں جو لپٹا کے رکھا ہے تا کہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہے کہ اس دستاویز میں کیا لکھا ہے' یہ کاریگری تم نے کی تھی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ یہ لپٹا کے میں نے کیا رکھا ہے۔ کہا: گھر والوں سے بھی تم نے اس کو اوجھل ہی رکھا تھا' لوگوں کی نگاہوں سے لپٹائے ہوئے رکھا تھا۔ ''بس اتنی سی بات ہے کہ یہاں اس لپٹے ہوئے کو کھول دیا جائے''۔ یہ ہے وہ قیامت جو تم پہ گذرے گی۔ جیسا میں نے اس دن کہا تھا عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے: يَتَعَارَفُونَ (10:45)۔ جن جن لوگوں سے تمہارا معاملہ پڑا تھا' وہ سب وہاں موجود ہونگے' ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے اور ان کے درمیان تمہارے وہ معاملے ہونگے جو تم نے ان سے خفیہ کیے تھے' جھوٹ بولے تھے' فریب دیئے تھے' بڑے ہمدرد اور غمگسار بنے ہوئے تھے' بڑے ناصح اور مشفق بنے ہوئے تھے' بڑے مقدس اور پرہیزگار بنے ہوئے تھے۔ اس دنیا میں تمہاری یہ کیفیت تھی۔ اس لپٹے ہوئے اعمال نامے میں' یہ سب چیزیں موجود

Marfat.com

ہوگی۔ یہ سب بھی موجود ہونگے اوران کی موجودگی میں اس لپٹے ہوئے اعمال نامے کوکھولا جائے گا۔

سب سے بڑا جہنم

عزیزانِ من! میں نے اس دن بھی یہ کہا تھا کہ کم ازکم میرے احساس کے نزدیک تو اس سے بڑا جہنم اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ یہ انسان کتنا معتبر بنا ہوا ہے۔ کیا مجال کہ کسی کی ساری زندگی میں اس کا ایک جھوٹ بھی باہر آ جائے' ایک فریب بھی طشت ازبام ہو جائے جو اس نے ان کو دیا تھا جن کا یہ اتنا ہمدرد اور غمگسار بنا ہوا ہے۔ ان میں اگر یہ بات ایک دفعہ بھی کھل جائے تو ساری عمر آدمی منہ نہیں دکھا سکتا۔ سارے موجود ہوں اور یہ 'بھگتا ہوا' سامنے کھل جائے۔ اور اس سلسلہ میں وہاں یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ وہاں یہ ہو اور کوئی دوسرا پڑھنا شروع کردے' تم کہو کہ جی نہیں صاحب! یہ ہمارا لکھا ہوا نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے: وہاں اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ (17:14)۔ تم سے کہا جائے گا کہ ہاں! اسے تم خود ہی پڑھ کے ان کو سناؤ۔ توبہ توبہ توبہ!!! اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (85:12)۔ جو اس نے کہا کہ ہماری گرفت تو ہڈیاں توڑ دیا کرتی ہے۔ یاد رکھو! اتنی سختی سے پکڑا جاتا ہے۔ اتنی سختی سے پکڑا ہوا ہے' کوئی اور ساتھ نہیں' اکیلا اعمال نامہ ساتھ ہے۔ وہاں سارے سامنے ہیں' وہاں یہ اعمالنامہ کھول دیا جاتا ہے۔ کھول کے کہا جاتا ہے کہ ''خود پڑھ' خود پڑھ۔'' پڑھ لیا جی؟ فیصلہ کوئی دوسرا ہی سنانے والا ہو' تو اس کے خلاف کچھ Protest کریں۔ میں نے کہا ہے: ''لکھا گیا تھا' جو میں نے پڑھا ہے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں تھا' اس کا یہ مقصد نہیں تھا' یہ کچھ نہیں ہے''۔ کہا: یہ بات نہیں۔ پڑھ بھی خود: كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14)۔ آپ ہی حساب کر اور آپ ہی فیصلہ کرلے۔ عزیزانِ من! اس سے زیادہ عدل اور انصاف پر مبنی کوئی اور فیصلہ بھی ہوسکتا ہے! وہ تو شاعری کا ہی ہے' جب وہ کہتا تھا کہ:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق

تو ہمہ بر عقیدہ کہ دونوں دائیں بائیں کندھوں پہ فرشتے ہوتے ہیں ''کراماً کاتبین'' جو لکھتے جاتے ہیں تو:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

وہ کہتا ہے: ''آؤ میاں غالب![1] آیئے تشریف لایئے اور اپنی دستاویز خود کھولیے' دیکھیے تو سہی کہ یہ آپ کی لکھی ہوئی ہے یا کسی اور کی۔ کہ ''جی ہے تو میری لکھی ہوئی''۔ تو اس کو خود ہی پڑھیے۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14)۔ آج نہ کسی اور گواہ کی ضرورت ہے' نہ کسی اور منصف کی ضرورت۔ اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ اور آپ ہی بتادے کہ تیرے ساتھ اب کیا کیا جائے؟ خود اپنا حساب آپ کرلے۔ برادران عزیز! میں نے اس دن یہ بات کہی تھی اور وہ بڑی گہری بات ہے۔ آج کا سائیکالوجسٹ ہی اس کو Appreciate کرسکتا ہے کہ قرآن یہ کیا بات کہہ گیا ہے۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14)۔ یعنی ''تیرا نفس' تیرے خلاف' آج خود اپنا حساب کرے گا''

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869ء)

Marfat.com

انسانی نفس کی دو سطحیں

یہ تیرا نفس کیا چیز ہے جو تیرے خلاف کرے گا؟ یہ کس کے خلاف کرے گا؟ ''تیرا نفس تیرے خلاف''۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ چودہ سو برس پیشتر تو یہ بات دنیا میں بھی کہیں نہیں آئی تھی۔ یہ تو اس حال کی' ہمارے دور کی سائیکالوجی نے' یہ تحقیق کیا ہے کہ ''انسان کے اندر دو نفس نہیں بلکہ ایک ہی نفس ہوتا ہے۔ البتہ اس نفس (Self) کی دو سطحیں (Levels) ہوتی ہیں۔ ایک Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) ہوتا ہے۔ یہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور دوسرا Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) ہوتا ہے۔ یہ سارا کچھ جو ہم Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) کے ذریعے کر رہے ہوتے ہیں: ''فریب دیا' جھوٹ بولا وغیرہ'' اس کے جو نتائج ہوتے ہیں' جو Consequences ہوتے ہیں' جو چھپائی ہوئی ہماری باتیں ہوتی ہیں' وہ جو نیچے ایک تہ خانہ ہے' نیچے وہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کہتے ہیں' یہ Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) اس Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے ذریعے سے انہیں چھپاتا چلا جاتا ہے' وہ جو قرآن نے کہا تھا **وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ** (2:9)۔ سمجھتے یہ ہیں کہ ہم لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ اپنے اس Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں۔ دراصل حقیقی طور پر نیچے والا چور' Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) تو گھر کے اندر بیٹھا ہوتا ہے۔ ان ماہرین نفسیات کی اصطلاح میں یہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) 9/10 (nine tenth) ہوتا ہے اور اوپر Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) تو سارا 1/10 حصہ ہوتا ہے۔ وہ چور یعنی' وہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) سارا کچھ اپنے اندر چھپاتا چلا جاتا ہے: یہ جھوٹ بولا' یہ فریب دیا' یہ اس نے دھوکہ دیا' یہ کچھ اس نے کیا۔ یہ سارے اعتراف وہاں ہوتے ہیں۔ یہ چیز ہمارے دور میں Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی اصطلاح سے آئی ہے جس کے تحت وہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) یہ سب کچھ ''چھپاتا'' ہے' Conceal کرتا ہے۔ ابھی یہ لوگ یہاں تک ہی پہنچے ہیں۔ اس چھپانے سے بہت سی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن کی کوئی تشخیص نہیں ہو سکتی۔ طبی جسم والے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض کا سب ٹھیک ہے۔ مریض کہتا ہے: ''تم کہتے ہو سب ٹھیک ہے اور میری کیفیت یہ ہے کہ دن بدن ڈوبتا چلا جاتا ہوں۔'' لیکن اتا پتا اس کو بھی نہیں کہ ''مجھے کیا بیماری ہے؟'' مریض کہتا ہے کہ اسے بھی معلوم نہیں کہ مجھے بیماری کیا ہے کہ ''جی مجھے پتہ تے نئیں ہیگا' پر کچھ ہو ریا اے''❶۔ اور ڈاکٹر بھی اس سے پوچھتا ہے کہ ''بتاؤ تو سہی' تمہیں کیا ہوتا ہے؟'' مریض کہتا ہے: ''جی پتہ نئیں ڈاکٹر صاحب!❷ مینوں تے بس بیٹھیاں بیٹھیاں کچھ ہو جاندا ہیگا اے''❸۔

❶ مجھے بھی معلوم تو نہیں ہے لیکن کچھ ''ہو'' ضرور رہا ہے۔

❷ جی ڈاکٹر صاحب! مجھے پتہ نہیں چل رہا۔

❸ مجھے تو بس بیٹھے بیٹھے ہی کچھ ''ہونے'' لگتا ہے۔

انسان کے اندر کی دنیا کے تاثرات کا نتیجہ

یہ جو ''کچھ ہوتا ہے'' یہ ہے وہ جو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کر رہا ہوتا ہے۔ آج یہ اصطلاح نکلی ہے کہ'' ہے کوئی بات آج ہونے کو''۔ کیسے کہہ رہے ہو؟ وہ کہتا ہے: ''جی بہت چاہتا ہے رونے کو''۔ اگر رونے کا Cause موجود ہو' رونے کی وجہ معلوم ہو' تو پھر وہ تکلیف آسان ہو جاتی ہے۔ رونے کی وجہ یا (Cause) دور کر دیجیے' تکلیف دور ہو جائے گی۔ اور اگر یہ صورت ہو کہ اس کی وجہ تو آپ کو معلوم نہیں ہے مگر رونے کو جی چاہتا ہے۔ آپ اس کا کیا علاج کریں گے؟ یہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے اندر کے تاثرات ہوتے ہیں۔ وہ ''خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں' مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے''۔ تسکینِ خاطر Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) کی ہو رہی ہے۔ وہ ''جو دل بیٹھا جا رہا ہے'' وہ تو دراصل جو اندر چھپائے ہوئے راز ہوتے ہیں' یہ ان کا کارنامہ ہوتا ہے۔ یہاں تک آپ کی یہ موجودہ سائیکالوجی پہنچ چکی ہے۔ یہ Psycho Analysts نفسیاتی تجزیہ نگار کرتے ہی اتنا ہیں کہ ایک طریق' جو انہوں نے ایجاد کیا ہے' کے ذریعے وہ Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) کو نشہ پلائے بغیر ماؤف کرتے ہیں اور پھر اس کے Unconsious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) سے وہ اس قسم کے انداز کی باتیں کرتے ہیں کہ وہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) اپنا کوئی بھید زبان پہ لے آئے۔ یہ علاج بڑا دقت طلب اور طویل المعیاد ہوتا ہے۔ وہ ایک چھپی ہوئی بات کہ ''جس پہ رونے کو بہت جی چاہتا ہے'' اور جس کا اوپر کے شوروم' Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) کو پتہ ہی نہیں ہوتا' وہ اس پھانس کو جو اندر چھپی ہوتی ہے' کسی طرح سے اوپر لے آتے ہیں' زبان پہ لے آتا ہے۔ بس زبان پہ وہ بات آئی تو Cause وجہ معلوم ہو گیا۔ اسے بتائیں یا نہ بتائیں' مگر بات وہ کر دیتے ہیں کہ اس شخص کو یا اس مریض کو اس کے خلاف یہ حسد کی پھانس ہے۔ اس کے متعلق یہ چیز دور کر دیجیے۔ جب وہ دور ہو جاتی ہے تو وہ مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں دو نفس جسے انہوں نے کہا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اس دن ہو گا یہ کہ یہ جو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے اندر لپٹا ہوا' یہ سارا کچھ Scrolled Form (لپٹی حالت) میں ہے' وہ سارے کا سارا اوپر لے آئیں گے۔ Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) اور Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے اندر جو آپس کی جنگ اس وقت ہو گی وہ یہ ہے کہ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا (17:14)۔ تیرا Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) آج تیرے شعورِ نفس کے ساتھ' تیرے Conscious Mind کے خلاف آمادۂ جنگ ہو گا اور اس کے خلاف ہر بات کھول کے رکھ دے گا۔

قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ قرآن نے اپنا یہ دعویٰ یونہی نہیں کر دیا تھا کہ' جاؤ ساری دنیا کے مفکرین کو بلا کے لے آؤ اور ان سے کہو کہ اس کی ایک سورۃ کے مطابق سورۃ بنا کے لے آؤ''۔ چودہ سو سال پہلے کی یہ بات' آج کے مفکرین کو Feel ہو سکتی ہے۔ یہ دو لفظ

Marfat.com

ان کی بدولت آج سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ مفسرین نے یہ تفسیر کی ہے کہ یہ ''انسان کا نفس' تیرے خلاف گواہیاں دے گا''۔ او کس کے خلاف گواہی دے گا ؟ یہ تو ایک ہی ہے۔ آج انہوں نے بتایا ہے کہ ''یہ لپٹا ہوا' کھلتا کیسے ہے؟ یہ نفس کے تجزیہ نگار (Psycho-analysts) کھولتے ہیں۔ یہ ان کی اصطلاحیں ہیں۔ یہ جسے Dual Personality (دوہری شخصیت) کہتے ہیں' یہ دو نفس ہیں۔ ان کے لیے یہ کہتے ہیں کہ Unconscious mind displays the secrets of the conscious mind یہ ہے وہ سارا Psycho-analysis (نفساتی تجزیہ)۔ تو یہ تو اتنے لمبے لمبے عمل (Process) کے بعد کہیں ایک آدھ چیز باہر لاتے ہیں اور اگر یہ سارے کا سارا Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) اُبھارے اور وہ Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) کے سامنے ہو۔ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) یہ کچھ ابھار کر سامنے لانے کا عمل کرنا شروع کرے تو پھر کیا ہوگا؟ اس میں وہ دو Justificatory Reasons (وجوہاتِ جواز) دیتا ہے: میری ضرورت اس سے زیادہ ہے۔ اس نے اتنا کچھ رکھا ہوا ہے۔ یہ یوں ہے صاحب! Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) یہ کچھ کرتا ہے کہ یہ تاثرات وہ اندر رکھا کرتا ہے' وہ یہ کہتا ہے: ''اسے یہ کہہ کے تُو نے دھوکہ دیا تھا' اصل میں بات درمیان میں یہ تھی۔ باہر سے تو کوئی گواہ آیا نہیں ہے انکار کیسے کر جائے گا؟ یہ ہے۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14)۔ یہاں ''علیہ'' آیا ہے ''علی'' عربی زبان میں ''اس مخالفت'' کے لیے آتا ہے اور ''ل'' فائدے کے لیے آتا ہے۔ اس لیے یہاں ''علیہ'' کا مطلب ہے۔ تیرے خلاف' تیرا Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ)' تیرے شعور کے خلاف' اٹھ کے حساب کر دے گا۔ خود ''حساب کر لو ہم کچھ نہیں کہتے''۔

مومن کے نفس شعوری اور غیر شعوری میں تضاد نہیں ہوتا

لہٰذا مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (17:15)۔ جو بھی صحیح راستہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی ہی اس ذات کے لیے' اس نفس کے لیے ہی صحیح راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ اس کے اندر' نفسِ شعوری اور غیر شعوری کے اندر' تضاد نہیں واقع ہوتا۔ دونوں میں Contradiction نہیں ہوتی بلکہ دونوں ہی دوست ہوتے ہیں۔ یہ لِنَفْسِهٖ ہے۔ اور وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (17:15)۔ اور ''اگر تو یہ غلط راستے اختیار کرتا ہے''۔ وہی ''علیہا'' یہاں آ گیا۔ دیکھیے وہی ''علی'' آ گیا۔ وہ اس کے خلاف کر رہا ہوتا ہے' کہیں باہر کی کسی دنیا کی بات نہیں۔ اپنے ہی اندر یہ سارا کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اور پھر وہ جو آیتیں پیش کر دیتے ہیں کہ صاحب! خدا ہی گمراہ کرتا ہے' خدا ہی ہدایت دیتا ہے۔ کہا: مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ (17:15)۔ جو بھی صحیح راستہ اختیار کرتا ہے' اپنے ہی نفس کے لیے ہے۔ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (17:15)۔ جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے' اپنا ہی نقصان کرتا ہے صاحب! اور اسے یاد رکھیے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (17:15)۔ ہمارا قانون یہ ہے: ''کوئی بوجھ اٹھانے

Marfat.com

والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا''۔ اس کا لاشعوری نفس (Unconscious Mind) اس کے شعوری نفس (Conscious Mind) میں آ کے گواہیاں دے گا۔ وہ تو دونوں اپنے ہی ہیں کوئی غیر تو اس میں ہے ہی نہیں۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یہ سب پروہتوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں

عزیزانِ من! یہ ساری باتیں پروہتوں کی بنائی ہوئی ہیں کہ وہ مرنے کے بعد جو ہوتا ہے کہ یہ ''تو میت دا حصہ ہے۔ اے قبرستان دا حصہ ہے۔ اے باقی مردے دا حصہ ہے''❶۔ تو قرآن کہتا ہے کہ ''پہلے حصے لگا کے دو' تو وہ لیجاتے ہیں''۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ''ہم پوسٹ ماسٹر ہیں' یہ پارسل پہنچائیں گے۔ کہنے لگا: ''ایہہ وی اپنے گھر لے جاندے نیں''❷۔ پتہ نہیں ابھی بھی یہ حصے لگتے ہیں یا نہیں۔ ہماری تو زندگی میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ اس طرح سے یہ حصے لگتے تھے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (17:15)۔ عزیزانِ من! یہ ساری چیزیں لکھ کے لگا رکھیں: ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔ اور پھر یہ بھی بات نہیں ہے کہ ہم یہ کچھ بتاتے نہیں ہیں اور بغیر بتائے ہوئے ہی' ''ماری ٹری جاندے آں ساریاں نوں''❸۔ یہ بالکل نہیں ہوتا۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (17:15)۔ کبھی کسی کو ہم تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ ان کے اندر پیغام پہنچانے والا نہ آ جائے اور بتا نہ دے کہ یہ راستہ اِدھر جاتا ہے' یہ راستہ اُدھر جاتا ہے۔ یہ تو ظلم ہوتا ہے کہ ہم یہ نہ بتاتے کہ تمہارے صحیح نفس کے فائدے کی چیز کیا ہے؟ نقصان کی چیز کیا ہے؟ ہم پلاؤ میں سنکھیا ڈال کے چھوڑ دیتے' بتانے والا کوئی نہ ہوتا اور اسے تم کھا کے ہلاک ہو جاتے اور ہم یہ کہتے کہ یہ تمہارا اپنا ہی کرتا دھرتا ہے۔ وہ کہتا کہ میرا اپنا کرتا دھرتا کیا ہے؟ مجھے کس نے بتایا تھا کہ اس کے اندر ہلاکت انگیزی ہے؟ کہتا ہے: پہلے ہم بتانے والے بھیجتے ہیں' یہ بتاتے ہیں کہ یہ سنکھیے والا پلاؤ ہے تمہیں باورچی نے بتایا ہے۔ کہ یہ حرام کی کمائی کا پلاؤ ہے یہ اس سے زیادہ ہلاکت انگیز ہے جو سنکھیا والا ہے۔ اس سنکھیا والے پلاؤ کا مداوا تو پھر بھی شاید کوئی ڈاکٹر کر لے۔ وقت کے اوپر آ جائے تو معدے کو خالی کرا دے۔ یہ جو تم نے کر دیا یہ تو نفسِ غیر شعوری (Unconscious Mind) کی تہوں میں چلا گیا۔ وہاں سے نہیں نکلے گا۔ یہ بتا کے کہا کہ یہ انجام ہوتا ہے اس کا۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 15 تک آ گئے۔ یہ ''ذاتی'' چیز تھی۔ یہ ''ذات'' (Self) کی چیز تھی۔ اب اس کے بعد ایک اجتماعی چیز آئے گی۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

❶۔ یہ اتنا حصہ مسجد کا ہے' یہ اتنا قبرستان کا ہے اور یہ باقی حصہ مردے کا ہے۔

❷۔ یہ بھی اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ کسی دوسرے کو نہیں دیتے۔

❸۔ سب کو مارتے چلے جاتے ہیں' تباہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

Marfat.com

پانچواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 16 تا 22)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا
فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ﴿١٦﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ ٱلْقُرُونِ مِنۢ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ
بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِۦ خَبِيرًۢا بَصِيرًا ﴿١٧﴾ مَّن كَانَ يُرِيدُ ٱلْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُۥ فِيهَا مَا نَشَآءُ
لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُۥ جَهَنَّمَ يَصْلَىٰهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ﴿١٨﴾ وَمَنْ أَرَادَ ٱلْءَاخِرَةَ وَسَعَىٰ
لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُو۟لَٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا ﴿١٩﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هَٰٓؤُلَآءِ وَهَٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ
رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ﴿٢٠﴾ ٱنظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْءَاخِرَةُ
أَكْبَرُ دَرَجَٰتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ﴿٢١﴾ لَّا تَجْعَلْ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا ﴿٢٢﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1975 کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 16 سے ہو رہا ہے 17:16۔ سابقہ آیت میں یہ چیز کہی گئی تھی کہ ہم یونہی کسی قوم کی تباہی نہیں لے آتے۔ پہلے اسے وارن (Warn) کرنے کے لیے اس کی طرف ہمارے پیغام رساں آتے ہیں۔ وہ پہلے انہیں اس کی تنبیہ کرتے ہیں' اس سے آگاہ کرتے ہیں کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوگا اور جب اس کے باوجود وہ اپنی اس روش کو نہیں چھوڑتے تو پھر ان کی تباہی آتی ہے۔ اب اس سے اگلی آیت ہے۔ وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا (17:16)۔ آپ نے اکثر و بیشتر مجھ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ یہ جو ہم قرآن سے اتنا دور ہٹ رہے ہیں بلکہ بسا اوقات خلافِ قرآن تصورات ہمارے ذہن میں آ رہے ہیں اور یہ جو مروجہ عقائد وغیرہ ہیں' اس کی بیشتر وجہ قرآن کے ان ترجموں پر مبنی ہے۔ میری اس بات پر آپ کو حیرت تو یقیناً ہوگی کہ یہ کیا چیز ہے جو میں بتاتا ہوں لیکن جب میں ترجمہ پیش کرتا ہوں تو واقعی بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ ٹھیک کہتا تھا اقبالؒ نے کہ

منزلِ مقصود قرآن دیگر است

قرآنِ حکیم کے موجودہ تراجم کا نتیجہ

مسلمان تو موجود ہے لیکن اس کے عقائد' مسالک' اس کا یہ موجودہ مذہب کچھ مختلف ہے۔ قرآن کی منزل بھی مختلف ہے' مقصود بھی مختلف ہے۔ اب اسی آیت کے ترجمے کو دیکھیے۔ آپ قرآن کا کوئی نسخہ اٹھا لیجیے گا۔ ترجمہ اس میں یہ ملے گا اور بغیر اس کے کہ میں اس

Marfat.com

میں خود کوئی تبصرہ کروں آپ اپنے ذہن میں خود فیصلہ کیجیے گا کہ اس ترجمے سے آپ کس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں؟ خدا کے متعلق آپ کا کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ اس آیت کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ''جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی قوم کو تباہ کر دیں تو اس قوم کا جو عیش پرست طبقہ ہوتا ہے' دوسروں کی کمائی پر زندگیاں بسر کرنے والا' یہی اکابر مُتْـرَفِيهَا ہوتے ہیں' سب سے بڑے مجرم جو اس قوم کے ہیں تو ہم ان کی طرف حکم بھیجتے ہیں اور وہ اپنے فسق و فجور میں بڑھ جاتے ہیں اور جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو پھر ہمارا عذاب ان پر برحق ہو جاتا ہے اور ہم انہیں تباہ کر دیتے ہیں''۔ یعنی ہم انہیں حکم دیتے ہیں اور وہ فسق و فجور میں بڑھ جاتے ہیں' فسق و فجور میں بڑھ جاتے ہیں تو پھر یہ بات ثبت ہو جاتی ہے کہ یہ واقعی اس قابل ہیں کہ ان کو تباہ کر دیا جائے اور پھر انہیں تباہ کر دیا جاتا ہے۔ آپ قرآن کا کوئی نسخہ اٹھا کے دیکھ لیجیے' اس میں آپ کو یہی ترجمہ ملے گا۔ کیا اس پہ کسی تبصرہ کی ضرورت ہے؟ جب ہم کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں' پہلے تو یہی دیکھ لیجیے کہ ہم کرتے کیا ہیں؟ وہ جو ان کے مجرمین ہوتے ہیں' ان کی طرف حکم بھیج دیتے ہیں اور وہ فسق و فجور میں بڑھ جاتے ہیں' تو ہم کہتے ہیں کہ دیکھ لیجیے صاحب! اب ثابت ہو گیا کہ واقعی ایسے ہیں اور ہم انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

یہ ہے عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے ترجموں کی صورتِ حال۔ میں تو ابتدا ہی سے یہ چیز کہتا چلا آ رہا ہوں کہ دیکھیے! قرآنِ مجید کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ مفہوم بھی آپ خود نہیں بیان کریں گے کہ جیسے جی میں آئے آپ نے مفہوم بیان کر دیا۔ آپ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ قرآن خود اپنا مفہوم آپ متعین کرتا ہے۔ اِس کے لیے ہوتا یہ ہے کہ آپ قرآنِ کریم کی پوری تعلیم پر نگاہ رکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس نے کہا تھا کہ ہم تصریفِ آیات سے اپنا مفہوم واضح کرتے ہیں' ایک بات مختلف مقامات پر ہم نے کہی ہوتی ہے' وہ مختلف مقامات آپ کی نگاہ کے سامنے ہوں تو اس سے ہر آیت کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ تو یہ ہے وہ طریقہ جس سے قرآن سمجھ میں آ سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب لسانِ عربیٍ مبین کے اندر ہے۔ اسے محاورۂ عرب کے مطابق دیکھنا اور سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی بدلتی رہتی ہیں

نزولِ قرآن کے وقت عرب جو زبان بولتے تھے وہ عربیٍ مبین تھی۔ یہ عربیٍ مبین عام طور پر حجاز کے خطے کی عربی کو کہتے تھے۔ یہ واضح عربی زبان تھی۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں جو مفہوم اس سے لیا جاتا تھا' اسی مفہوم سے قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ زبانوں پر جب زمانے گذرتے ہیں تو ان پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ قرآنِ کریم کی یہی عربی قرآن کی حفاظت کا ایک اعجاز ہے۔ یہ سن کر آپ حیران ہونگے کہ مراکش سے لے کر سعودی عرب تک آ جایئے۔ شام تک جتنے علاقے عربی سپیکنگ (Speaking) ہیں' ان سب کی زبان عربی ہے

Marfat.com

لیکن ایک علاقے کی عربی جو وہ بولتے ہیں' دوسرے علاقے سے نہیں ملتی' جیسے ہمارے ہاں یہ پنجابی ہے۔ آپ زبان دیکھ لیجیے کہ ضلع اور ضلع میں پنجابی کا فرق پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اتنا فرق پیدا ہوتا ہے کہ وہ ملتان والوں کی پنجابی اور ''لاہوریاں دی پنجابی''[1] آپ دیکھیں کہ زبان میں کتنا فرق پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ اسی پنجابی کو وارث شاہ کے زمانے کی پنجابی سے کتنا اختلاف ہے۔ آج کی پنجابی اور اس کی پنجابی کی شرحیں لکھنی پڑتی ہیں تاکہ بات سمجھ میں آسکے۔ زمانے کا زبانوں کے اوپر اثر پڑتا ہے۔ دلی کے زمانے کی اردو دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ مختلف ادوار میں زبان کیا سے کیا بنتی چلی جارہی ہے۔ آج وہی اردو آپ دیکھیے اس کے معنی کیا ہیں؟ یہ عربی زبان جو ان مختلف علاقوں کے اندر بولی جاتی ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوجاتی ہے اور ہم لوگ جو عربی سپیکنگ (Speaking) نہیں ہیں جب وہ عربی بولتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس لحاظ سے کونسی زبان ہے؟

زبان کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اعجاز

لیکن یہاں قرآن کے اعجاز کی ایک چیز بڑی اہم ہے۔ ان سب کے ہاں جو تحریری زبان ہے وہ ابھی ایک ہی ہے۔ ان کے ہاں جو کتابیں' ایک مراکشی لکھے گا اور ایک سعودی عرب والا لکھے گا' ان کی زبان وہی عربی زبان ہے اور یہ وہ زبان ہے جس انداز سے قرآن کی زبان آتی ہے۔ تحریری زبان اور تدریس کی زبان ان سب کے ہاں ایک ہی ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ وہاں وہ مراکش کا مصنف لکھے یا سعودی عربیہ کا مصنف لکھے' وہ جو کتاب لکھے گا تمام عربی جاننے والے اسے پڑھیں گے اور ہم بھی اس کتاب کو سمجھیں گے۔ وہ وہی عربی ہے جو تحریری عربی ہے' جو کتابی عربی ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ تصنیفی عربی ہے' لیکن اس کے معانی وقت کے ساتھ بدلتے رہے۔ تو یہ زبان کے اوپر اتنا اثر پڑتا ہے۔ قرآنِ کریم کو جو اس نے کہا ہے کہ یہ عربیِ مبین کے اندر ہے تو وہ عربیٔ مبین سامنے ہونی چاہیے جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں استعمال ہوتی تھی' اس سے وہ معانی لینے چاہئیں جو اس کے الفاظ کے معانی اس وقت کے عرب لیتے تھے۔

قرآنِ حکیم میں موضوعات کی تکرار کی وجہ

قرآن کریم نے اپنے ہر مقام کی تشریح' صراحت' وضاحت' اور تفسیر تصریفِ آیات کے ذریعہ سے خود کردی ہے۔ وہ مختلف مقامات میں ایک ہی موضوع کو بار بار لاتا ہے۔ وہ اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔ سطح بین سمجھتے ہیں کہ اس میں تکرار ہے اور یہ ایک ہی بات ہے جو یہاں بھی کہی ہے اور وہاں بھی کہی ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ اصل کیا ہے۔ سطح سے نیچے جائیے تو یہ تکرار نہیں ہے' یہ تو ایک ایک بات کی وضاحت ہورہی ہوتی ہے' ذرا ذرا سا یہ فرق' جہاں جہاں اس نے بیان کیا ہے' اُسے سامنے لے آئیے' ہر آیت کا

[1] اہل لاہور کی پنجابی زبان

Marfat.com

مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز میں عرض کر دوں کہ میں محض عقیدتاً نہیں کہہ رہا۔ اب تو میری زندگی کا ذاتی تجربہ یہ ہے اور اسی بناء پہ میں نے یہ ساری کتابیں لکھی ہیں: لغات القرآن دیکھیے' مفہوم القرآن دیکھیے' دوسری کتابیں بھی جن میں میں نے قرآن کریم کا یہ کچھ لکھا ہے۔ وہ بھی دیکھیے۔ قرآن کریم کا انداز تصریف آیات ہے' اس سے بات سمجھ میں آتی ہے' واضح ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں جو عربی زبان کے نیچے اردو کے لفظ لکھتے چلے جاتا ہے' اس سے قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا بلکہ اس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ان تراجم کا نتیجہ

یہ جتنے اعتراضات عام طور پہ قرآنِ کریم پر کیے جاتے ہیں وہ انہی تراجم کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ ترجمہ جس کے سامنے ہوگا خواہ وہ ہمارے ہاں کا کوئی بھی نوجوان ہو۔ یہ نہیں ہے کہ وہ خدا نکردہ ملحد اور بے دین ہو جائے گا۔ یہ ترجمہ وہ پڑھے یا یہ ترجمہ اس کو سنائیے۔ وہ کیا کہے گا؟ وہ یہی کہے گا کہ خدا کیا کہتا ہے؟ تصریفِ آیات کا انداز' عزیزانِ من! قرآن کے سمجھنے کا انداز ہے۔ اور میں نے قرآنِ پاک کو سمجھنے کا یہی انداز اختیار کیا ہے۔ تیس چالیس سال کی محنت کے بعد یہ چیزیں سمجھ میں آئیں اور میں اسی انداز سے سمجھا ہوں۔ اسی سے سمجھاتا ہوں۔ اسی انداز سے لکھتا ہوں۔ یہ جو کچھ قرآن کے سلسلہ میں مَیں نے لکھا ہے' اسی انداز سے سمجھ کر لکھا ہے۔

قرآن کے اندر ایک لفظ ''اَمَـرْنَـا'' ہے' جس کا ترجمہ یہ کر دیتے ہیں کہ ہم حکم بھیجتے ہیں۔ یہ ترجمہ اس عربیٌ مبین کے خلاف ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ عرب اسے کس طرح بولتے ہیں۔ یہ جو ''اَرَدْنَــــا'' (17:16) ہے کہ ہم ارادہ کرتے ہیں' اسی طرح یہ جو ''نُهْلِکَ'' (17:16) ہے کہ ہم ہلاک کر دیں تو آپ عربیٌ مبین میں دیکھیے کہ اس کے کیا معانی ہیں۔ قرآن کا یہ ایک انداز ہے۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان

مثلاً آپ یہ اندازِ بیان دیکھیے' ہم جو یہ بات کہیں کہ ''اس نے آگ میں انگلی ڈالی اور اپنی انگلی جلا لی۔'' یا ''اس نے آگ میں انگلی ڈالی' آگ نے اس کی انگلی جلا دی۔'' ٹھیک ہے' اسے یوں بھی کہیں گے کہ ''اگر تم نے انگلی آگ میں ڈالی' تو انگلی جل جائے گی۔'' ٹھیک ہے اور اگر خدا یہ بات کہے کہ ''جو آگ میں انگلی ڈالے گا' ہم اس کی انگلی جلا دیں گے''۔ تو بات ایک ہی ہے۔ اب اگر یہ کہنے والا خدا کو حق سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ جو آگ میں حرارت ہے اس کی وجہ سے انگلی جلتی ہے۔ یہ حرارت اس کی عطا کردہ ہے' یہ اس کا ایک قانون ہے اور اس کے بعد جب میں بیان کرونگا تو میں یہ کہوں گا کہ ''اگر آگ میں انگلی ڈالو گے تو خدا کے قانون کیمطابق وہ انگلی جل جائے گی۔'' اب کسی کو بھی کہیے کہ اس پر کوئی اعتراض ہے۔ قانون یہ ہے کہ آگ کے اندر کوئی چیز ڈالی جائے گی' تو وہ جل جائے گی۔ یہ قانون ہے۔ ہم اسے قانونِ خداوندی کہیں گے۔ قانون تو سارے ہی خداوندی ہیں' نہ تو یہ قانون آگ کا اپنا بنایا ہوا ہے' نہ کسی

Marfat.com

سائنسدان (Scientist) کا بنایا ہوا ہے۔ سب سے پہلے جب کسی نے آگ کو دیکھا ہے تو اس نے دیکھا ہے کہ اس کے اندر یہ حرارت کا قانون موجود تھا تو یہ جو چیز ہے یہ اس کا قانون ہے۔ ٹھیک ہے' اسے قانونِ فطرت (Law of Nature) کہہ دیجئے' قانونِ خداوندی کہہ دیجئے تو ہم یہ کہیں گے کہ خدا کے قانون کے مطابق ایسا ہو جائے گا' خدا اس چیز کو یہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! اگر یہ کرو گے تو ہم یہ کر دیں گے۔ اسے یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم یہ کر دیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اگر ایسا کرو گے تو قانونِ خداوندی کی رو سے ایسا ہو جائے گا۔

لفظ اَمَرْنَا کا مفہوم

یہاں لفظ'' اَمَرْنَا '' (17:16) ہے جو اس آیت میں آیا ہے۔ اس کے معنی عربیٔ مبین سے پوچھیے۔ عربوں سے پوچھیے کہ وہ عربی مبین میں ''امرنا'' کے کیا معنی لیتے تھے؟ کس کس انداز میں' کس کس معانی میں ایک لفظ کے کس قدر معانی ان کے ہاں ہوتے تھے؟ ان میں سے آپ کو دیکھنا ہوگا کہ وہ کونسا معنی ہے جو یہاں آئے گا۔ ''امرنا'' کے معنی ہوتے تھے: ''کسی چیز کو اور کثرت سے کرتے چلے جانا''۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قومیں غلط نظام اختیار کرتی ہیں۔ یہاں **مُتْرَفِيْهَا** معلول (Effect) ہے اور اس میں وہ لوگ ہوتے ہیں ''جو دوسروں کی کمائی پر' ان کا استحصال کر کے' ان کی Exploitation سے' دوسروں کی محنت پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔'' اس طرح دُوسروں کی محنت پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والا' اس لفظ کے بنیادی معانی ہیں۔ قرآنِ پاک نے ایسے لوگوں کو مترفین کہا ہے۔

زورِ دروں کی بنا پر تباہی کی جانب بڑھتے جانا

قرآن کہتا ہے کہ یہ اس معاشرے کے' اس قوم کے' اس نظام کے مجرم ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں وارننگ (Warning) دیئے جاتے ہیں' ان سے کہے چلے جاتے ہیں لیکن وہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی اس سابقہ روش میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح آگے ہی آگے بڑھنے پہ جب وہ مقام آتا ہے کہ وہ اب بالکل تباہی پہ پہنچتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ دیکھیں کہ اس کی وجہ سے ہم کتنے تباہی کے قریب پہنچ رہے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے مومنٹم (Momentum) کے زور سے وہ اور زیادہ اس میں بڑھے جاتے ہیں۔ یہ ہیں ''امرنا'' لفظ کے معنی یعنی ''کسی شے میں اور زیادہ کثرت و تیزی سے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا''! یعنی بجائے اس کے وہ وہاں پہ دیکھ کے رک جائیں کہ کس قدر تباہی آ رہی ہے' ایسے مقام پہ پہنچ کے رک جانا تو یوں نظر آتا ہے جیسے وہ قوم بے بس ہو جاتی ہے' یعنی وہ قوم دیکھ رہی ہوتی ہے کہ ہم تباہی کی طرف جا رہے ہیں' لیکن اس مقام پہ رک جانے میں بے بسی ہوتی ہے۔ یہی کچھ آپ کو بھی اس کا تجربہ ہے۔ قوموں پر کچھ بے بسی کا سا عالم ہو جاتا ہے کہ دیکھ رہے ہیں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ کسی سے بھی پوچھو کہ صاحب! پھر کیا کیا جائے۔ وہ یہی کہتا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ سمجھ

Marfat.com

میں نہیں آتا۔ ہر نیا دن پہلے سے زیادہ ان چیزوں میں بڑھا ہوا ہوتا ہے جو اس کی تباہی کا موجب بنتی ہیں۔ یہ قوموں کا ایک عجیب حال ہے۔(16:37-38)

جیسے میں نے کہا ہے کہ اس مظہر (Phenomenon) کا مومنٹم (Momentum) ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کو سٹارٹ (Start) کیا جاتا ہے تو اس کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے لیکن جب وہ چل پڑتی ہے تو وہ خود اپنے زورِ دروں سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی یہ کچھ رفتار موٹر چلانے والے مکینک تو جانتے ہیں۔ اگر کوئی پہاڑ کی چوٹی سے پتھر لڑھکائے تو شروع میں آپ دیکھیں گے کہ یونہی سرکتا ہوا جائے اور اس کے بعد کوئی خارج کی قوت (External Force) سوائے زمین کی کششِ ثقل (Gravitational Pull) کے اس کو زور لگا کے نیچے نہیں لا رہی ہوگی، وہ اپنے زورِ دروں سے اور تیزی سے بڑھتا چلا جائے گا۔ انسانی کردار کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کوئی ایک عادت، ابتدا میں آپ دیکھیے گا، بڑی معمولی سی ہوتی ہے اور وہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، بڑھتی چلی جاتی ہے، تا آنکہ وہ وقت ایسا آجاتا ہے کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ اتنی زیادہ خرابی پیدا ہوگئی۔ یہ موجب ہے اس صورتِ حال کا۔ پھر اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ وہ یہ چھوڑ نہیں سکتا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ وہ خود ہی تو اس کا اپنا زورِ دروں ہوتا ہے۔ وہ چیز اتنا زیادہ مومنٹم Gather کر لیتی ہے، Gain کر لیتی ہے کہ اس میں بڑی شدت (Intensity) آجاتی ہے، یہ جو اپنے ہی مومنٹم سے کسی چیز میں اتنی شدت کا آجانا ہے کہ وہ چیز تیزی سے، شدت سے، کثرت سے، وہی کچھ آپ خود ہی کرنے لگ جائے یہ ''امرنا'' ہے۔ قرآن میں بھوک کو بھی خدا کا عذاب بتایا ہے۔ مفلسی کو اس نے اس کا غضب بتایا ہے۔ یہ بھی اس نے کہا ہے کہ قوموں میں افلاس اور محکومی و محتاجی سے بھی ان میں نقائص اور عیوب پیدا ہوتے ہیں، جرائم پیدا ہوتے ہیں اور پھر وہ جرائم بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ بالکل صحیح بات ہے۔

دولت کی فراوانی کی تباہ کاریاں

مفلسی سے، غریبی سے، ناداری سے، بھوک سے، بھی انسان کا اخلاق بگڑتا ہے۔ ان سے جرائم پیدا ہوتے ہیں لیکن جب دولت کی کثرت آجاتی ہے، دولت کی فراوانیاں آجاتی ہیں تو ان چیزوں سے بھی اخلاق بگڑتے ہیں۔ مفلسی کی تباہیاں تو ذرا دیر میں جا کے آتی ہیں۔ یہ جو زر کی، مال و دولت کی، سامانِ زندگی کی کثرت اور افراط ہوتی ہے، اس کی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ وہ تباہیاں آتی ہیں جو بڑی عالمگیر ہوتی ہیں۔ بڑی تیزی سے آتی ہیں۔ اب یہ جو میں نے کہا ہے، اسے دوسرے مقامات میں دیکھیے تو بات واضح ہوتی ہے۔ سوال تو یہاں یہ تھا کہ اَمَــرْنَــا کے کیا معنی ہیں؟ دراصل ''مترفین'' میں جو زیادہ زراندوزی کی، زیادہ مال اکٹھا کرنے کی، زیادہ لوٹ کھسوٹ کرنے کی، عادت ہوتی ہے، وہ ان میں اور بڑھ جاتی ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ قوم میں نیشنل ویلتھ (National Wealth) زیادہ ہورہی ہے، قومی دولت زیادہ ہورہی ہے، افراطِ زر بڑھا ہے۔ بظاہر نظر آرہا ہے کہ ہاں صاحب! کل تک یہاں جھونپڑیاں تھیں، آج

دیکھیے جدھر نگاہ دوڑائیے' محلات نظر آتے ہیں' کوٹھیاں نظر آتی ہیں صاحب! ان سڑکوں پر کبھی پندرہ بیس سال پیشتر خال خال کہیں موٹر نظر آتی تھی' آج کیفیت یہ ہے کہ سڑک کا کراس (Cross) کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ بظاہر کس قدر دولت کی افراط نظر آتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے' بھوک بھی ہمارا عذاب ہے لیکن وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58)۔ محتاجی اور غریبی سے پیدا ہونے والے عیوب تو آپ نے دیکھے۔ تاریخ میں دیکھیے کتنی ایسی قومیں تھیں جو تباہ ہوئیں۔ اس لیے کہ ان میں اتنی کثرت سے دولت آ گئی کہ دولت کی کثرت کی وجہ سے وہ پانی بجائے اس کے کہ دریا کے ساحلوں میں بہے' سیلاب بن گیا۔ دولت اور رزق کی فراوانیوں کو اگر اقدارِ خداوندی کے ساحلوں کے اندر رکھا جائے تو یہ حیات بخش ہوتی ہیں لیکن اگر یہ ان ساحلوں کو توڑ دے تو یہ کثرت' وہی کثرت ہوتی ہے جب پانی کی کثرت سے سیلاب بنتا ہے۔ سیلاب کسے کہتے ہیں؟ پانی کی کثرت ہوتی ہے' وہ بند توڑ دیتا ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58)۔ کتنی قومیں تباہ ہوئیں' بھوک کی وجہ سے نہیں' بلکہ معیشت کی فراوانی کی وجہ سے۔ یہ جو ان کے ہاں دولت کی کثرت آئی اور انہوں نے اس دولت کو پابندِ ساحل نہ رکھا تو اس کی وجہ سے ہلاکت ہوئی۔ کیا انداز ہے! فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ (28:58)۔ یہ دیکھو ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کس طرح سے نوحہ خواں ہیں! ان کی ایک ایک اینٹ کے اوپر ان کی تباہی کی داستان لکھی گئی ہے کہ یہ بھوک کی وجہ سے تباہ نہیں ہوئے تھے' دولت کی کثرت کی وجہ سے تباہ ہوئے تھے۔ اور یہ تو ہے قوم کی کیفیت۔

دولت مند اکثر بیمار ہوتے ہیں

آپ افراد کو دیکھیے۔ جتنی بیماریاں دولت مندوں کو لگی ہوئی ہوتی ہیں' بھوکے کو تو اتنی بیماری نہیں ہوتی۔ قوموں کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ہلاکت اس افراط سے ہوتی ہے۔ اب دونوں کو ملا لیجیے' بات صاف ہو جاتی ہے۔ یہ جو ''اردنا'' ہے کہ ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہم ہلاک کریں گے' یہ وہی بات ہے جو میں نے کہا تھا کہ یہ ہے قرآن کا بتانے کا انداز کہ جب دولت کی کثرت ہو جاتی ہے' یہ شدت اختیار کر لیتے ہیں تو اُن مترفین کو باوجودیکہ ہم اس کے نتائج سے انہیں آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں اس کے لیے جیسا کہ میں نے پچھلی آیت میں یہ کہا تھا: حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (17:15)۔ وہ رسول آ کے کیا کرتے تھے؟ انہیں کہتے یہ تھے کہ یہ جو روش تم نے اختیار کی ہے کہ سلب ونہب سے' استحصال (Exploitation) کے ذریعے سے' تمہارا ایک طبقہ اس قدر دولت سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ مترفین کا لفظ یاد رکھیے گا۔ دوسرے کی کمائی پر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے والے تو وہ رسول آ کے یہ وارننگ دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی روش سے باز نہیں آتے تھے تو کیفیت یہ ہو جاتی تھی کہ اس تنذیر' اس وارننگ' اس آگہی کے باوجود' وہ اپنے اس عملِ سلب ونہب میں اور زیادہ تیز ہو جاتے تھے۔ بجھنے سے پہلے دیا جیسے تیزی سے جلتا ہے' جسے آپ چراغِ سحری کہتے ہیں' وہ دولت سمیٹنے کے لیے اپنے اطراف میں اور زیادہ بڑھ جاتے تھے اور اس وارننگ (Warning) کے باوجود اور زیادہ اپنی زراندوزی کے اندر بڑھ جاتے تھے اور پھر جب ان کی یہ حالت ہو جاتی تھی تو ہمارے قانون کے مطابق وہ تباہ ہو جاتے تھے۔ اب فرمائیے' اس کے اندر کوئی الجھاؤ' کسی قسم کی ذہن

Marfat.com

میں کوئی کشمکش، کسی قسم کا کوئی شک وشبہ آیا؟ کہا کہ نہیں۔ اس کے ثبوت میں اس نے تاریخ کی شہادت پیش کر دی اور یہ کوئی بڑی لمبی چوڑی تاریخیں نہیں ہیں یہ تو آپ ایک ایک کر کے دیکھیے۔ دنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

دنیا بھر کی تاریخ اس کی گواہ ہے

وہ کہتا ہے کہ آپ اس زمانے کے رومن ایمپائر (Roman Empire) کی دولت کی، تعیش کے سامان کی، اور اتراف کی کثرت ہے، وہ دیکھیے۔ کس طرح سے بیان کرتا چلا جاتا ہے اور ایک ایک سطر، ایک ایک پیرے کے بعد لکھتا جاتا ہے کہ یہ چیزیں ان کی تباہی کا موجب بنیں۔ یہ چیزیں ان کی تباہی کا موجب بنیں۔ تاریخ عالم دیکھ لیجیے Historian is History of the World میں آپ دیکھیے انہوں نے مختلف قوموں کا جو نقشہ کھینچا ہے، ہر قوم کی تباہی آپ دیکھیں گے۔ وہ تباہی سے پہلے وہ مقام لاتے ہیں جس میں وہ سامانِ تعیش جو دوسروں کی محنت سے، دوسروں کو Expolit کر کے، حاصل کیا ہوتا ہے، انتہا تک پہنچا ہوتا ہے۔ جب وہاں تک پہنچتا ہے تو پھر وہ دریا سیلاب بن جاتا ہے اور اس طرح سے ان کی تباہیاں آ جاتی ہیں۔ یہ ہے انداز قوموں کی تباہی و بربادی کا۔ رسول آتے ہیں، آگاہ کرتے ہیں۔ اس پہ بھی وہ باز نہیں آتے بلکہ اپنی اُسی روش میں اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہا کہ کچھ تو وہ ضد کے مارے بھی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ چڑ کے بھی یہ کہتے ہیں۔ کچھ اس لیے بھی کہ وہ تکذیب کرتے ہیں کہ ہاں صاحب! یونہی آ کے کہتے ہیں: ''تباہ ہو جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے۔ ہم نے سارے تباہی اور بربادی کے راستے بند کر دیے ہیں''۔

برطانیہ کی زبوں حالی کی مثال

قرآن یہ کہتا ہے کہ پھر تباہیاں ان ان راستوں سے آتی ہیں مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ (16:26)۔ کہ جو ان کے شعور میں بھی بات نہیں ہوتی کہ تباہی آئی کہاں سے ہے۔ آج تک یہ برطانیہ والے سر جوڑ کے بیٹھے ہوئے ہیں کہ جن کی ایمپائر (Empire) پہ کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، وہ [1] دوسری عالمی جنگ (W.W.11:1939-1945) کے بعد تو، گو کہ [2] پہلی عالمی جنگ (W.W.1:1914-1918) کے بعد وہ تھرڈ ریٹ (Third Rate) ہوگئی تھی، دوسری جنگ کے بعد تو زندہ قوموں میں ان کا شمار ہی نہیں

1. World War I is a war fought from 1939 to 1945, in which Great Britain, France, the then USSR, the United States and other allies defeated Germany, Italy, and Japan. It is also called "Second World War" (Reader's Digest, 1990, p. 1726).
2. World War I is a war fought from 1914 to 1918, in which Great Britain (UK), France, the then Russia, Belgium, Italy, Japan, the United States, and other allies defeated Germany, Austeria, Hungry, Turkey, and Balgaria. It is also called "First World War or Great War" (Reader's Digest, 1990, p. 1726).

رہا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ سچ کہا تھا قرآن نے کہ کَیۡفَ لَا یَشۡعُرُوۡنَ تدبر کی فسوں سازی سے' جو اقبال'' کہتا ہے' وہ اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں' قائم نہیں رکھ سکے۔ ان کی بنیاد کے اندر خرابی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ رسولوں کے آنے کے باوجود' انہیں آگاہ کرنے کے باوجود' وہ جو مترفین کا طبقہ ہے' بجائے اس کے کہ کھڑا ہو جائے' رک جائے' اپنی روش میں پیچھے لوٹ آئے وہ اور تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ جتنی تیزی سے آگے بڑھتا ہے' اتنی ہی تیزی سے وہ تباہی کے جہنم کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہاڑی کی چوٹی سے لڑھکنے والے پتھر کی طرح' اپنے ہی مومنٹم[1] (Momentum) سے اس کے اندر تیزی آتی چلی جاتی ہے اور اس طرح ہمارے غیر متبدل قانون کے مطابق وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا (17:16)۔ یہ ہے وہ کیفیت جیسے کسی کے اوپر روڈ رولر (Road Roller) چلا دیا گیا ہو۔ پھر اس قوم کے اوپر اس قسم کی تباہیاں آجاتی ہیں۔

قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل اصول

پھر وہ چیز آئی ہے کہ تاریخ جس کی شہادت دیتی ہے: وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ (17:17)۔ نوح کے زمانے سے ہم نے اس قرآن میں داستانیں بیان کرنا شروع کی ہیں۔ قومِ نوح کے بعد جتنی قومیں آئیں' انہیں دیکھو! ہر قوم کی ہلاکت' اس کا انجام' اس کی تباہی' ہمارے اس دعویٰ کی شہادت دے گی کہ وہ قومیں غلط راستے پہ پڑیں۔ ہماری طرف سے پیغمبر آتے رہے' انہیں وارن (Warn) کرتے رہے' وہ غلط راستے میں اور آگے بڑھتی چلی گئیں اور اتنا آگے بڑھیں کہ پھر ان کے بس کی بات ہی نہ رہی:

نہ باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

پھر کیفیت یہ ہوگئی۔ تو ایسے عالم میں ان کی تباہی کے لیے قرآن نے کہا: فَحَقَّ عَلَيۡهَا الۡقَوۡلُ (17:16)۔ وہ یہ ہے ''اَلۡقَوۡلُ'' قرآنِ کریم کا یا الوعدہ ہے خدا کا۔ یہ لفظ ہمیشہ اس کے قانون کے لیے استعمال ہوتا ہے: پھر ہمارا قول ثابت ہوگیا۔ ہمارے قانون کی رو سے' پھر وہ اس کی مستوجب ہوگئیں کہ وہ تباہ ہو جائیں۔ یہ خدا کا قانون ہے' جس قانون میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

لوٹ مار ختم ہونے کے بعد محنت کی بجائے بھیک مانگنے کی عادت

قوموں کی تباہی بَطِرَتۡ مَعِيۡشَتَهَا (28:58) سے آتی ہے۔ یہ وہ اقوام ہوتی ہیں کہ جنہیں سامانِ زیست کی بڑی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ جیسا میں نے ابھی کہا ہے' ان قوموں میں تباہی زیادہ آتی ہے' جن میں سلب ونہب سے' Exploitation سے حاصل کردہ دولت' افراطِ زر' افراطِ رزق' سامانِ زیست' سامانِ تعیش میں اتنی کثرت آجاتی ہے کہ پھر اس قوم کے اس طبقے کے اندر محنت کرنے کی عادت ہی نہیں رہتی۔ پھر وہ محنت کرنے سے جی چراتے ہیں۔ قوم ہی لوٹ کے اندر مصروف ہو جاتی ہے' لوٹ

---

[1] Momentum: is Impetus or force gained through movement or progression.

گھسوٹ میں لذت لینے لگ جاتی ہیں۔ لوٹ ختم ہوتی ہے تو بھیک مانگنے لگ جاتی ہے۔ محنت پھر بھی نہیں کرتی۔ یہ ہے قوموں کی تباہی کا وہ قانون جس کے مطابق یہ برباد ہوئیں۔

دنیائے عرب میں ہی قرآن کا نزول کیوں؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم میں انہی انبیاء کرام کا ذکر آ رہا ہے جو اس علاقے میں آئے جسے ہم سامی[1] النسل کا علاقہ (Area of Semitic Race) کہتے ہیں: یہی بابل، فلسطین، شام، مصر، عراق، عرب۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باقی ساری دنیا کے متعلق قرآن نے کچھ نہیں کہا کہ آیا ان میں کوئی پیغمبر آتے رہے یا کہ نہیں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی قوم نہیں کہ جس کی طرف ہم نے پیغمبر نہ بھیجے ہوں۔ کہا یہ ہے کہ قرآن میں انہی کا تذکرہ آ رہا ہے جن سے یہ لوگ خود متعارف ہیں اور مانوس ہیں۔ جب ہم کسی قوم کا قرآن میں ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ انہیں جانتے ہیں۔ ہم بھی اگر اپنے ہاں عام لوگوں کو سمجھائیں گے تو مثلاً دلی والوں سے کہیں گے کہ دیکھو! مغلیہ دور کے بادشاہوں (Kings of Moghal Period) کا کیا حال ہوا؟ اس قوم کی کیا کیفیت ہوئی؟ تو یہ بات انہیں بڑی جلدی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

اب عربوں کے ہاں یہ قرآن نازل ہوا اور عرب قوم اول تو قوم ہی ایسی تھی کہ جس میں علم نہیں تھا، اگر وہاں کچھ لکھنے پڑھنے تک کا علم بھی ہوتا تو ان سے یہ کہا جاتا کہ دیکھو کنفیوشس (Confucius-C. 551-479 BC) کے زمانے میں چین کی قوم کی کیا حالت ہوئی، تو اس وقت وہ اس طرح سے انگشت بدنداں دیکھتے کہ آپ یہ کیا الفاظ بول رہے ہیں، یہ کنفیوشس کون تھا اور یہ چین کی قوم کونسی تھی جو تباہ ہوئی، برباد ہوئی۔ بات ہی نہیں سمجھ میں آ سکتی۔ ''کھے جنوں اسیں کینے ہیگے اں''[2] بات تو وہ کرنی چاہیے کہ بات کرے اور دل میں اتر جائے۔ وہ جو کہتا ہے کہ جاؤ اپنے شاہراہِ اعظم کے اوپر جہاں تمہارے قافلے جاتے ہیں اور راستے میں ان بستیوں کو دیکھو: وہ صبح شام ان بستیوں میں پھرتے تھے، اور ظاہر ہے کہ جب تو میں ان بستیوں میں پھریں جن کے کھنڈرات ان کے راستے میں پڑتے ہوں تو راستے میں پڑنے والے گاؤں، دریا، جھیلیں، درخت، کھنڈرات، کے متعلق ہر چلنے والے کو پتہ ہوگا اور وہ تو جاتے ہی اسی طرف تھے

1. Semitic designates a subfamily of the Arab-Asiatic family of languages including Arabic, Hebrew, Ethiopic, Akkadian, and Aramaic. It also pertains to any of the people who speak a semitic language; especially the Jewish people. And Semite (also Shemite) is a member of a people of Caucasian stock comprising chiefly Jews and Arabs but in ancient times also including Babylonians, Assyrians, Phoenicians, and others of the eastern Mediterranean area (Reader's Digest, 1990, p. 1389).

2. جسے ہم پنجابی میں کہتے ہیں کہ کیا خاک ان کی سمجھ میں یہ بات آتی؟

Marfat.com

پیدل جاتے تھے‘ قافلے کے ذریعے سے جاتے تھے‘ اور جب وہ قافلوں کے ذریعے آتے تھے تو واپس آ کر ان کی داستانیں سناتے تھے۔ اس طرح ان کے متعلق ذکر آنا چاہیے تھا کہ تم نے قومِ عاد کی بستیاں دیکھیں‘ ثمود کی دیکھیں‘ تم ان کی داستانیں بھی پڑھ چکے ہو۔ ان میں جتنا حصہ افسانے کا ہوتا تھا‘ قرآن اُس اتنے حصے کی تصحیح کر دیتا تھا۔ باقی بات ان کی سمجھ میں آ جاتی تھی بلکہ ان کو بتانے کی بات صرف یہی رہتی تھی کہ تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ وہ تباہ و برباد ہوئیں۔ تمہیں یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ برباد کیوں ہوئیں؟ یہ ہم بتاتے ہیں۔ تو جب یہ بتایا گیا‘ بربادی کے آثار تو ان کے سامنے تھے۔ وہ کھنڈرات وغیرہ یا کہانیاں یا وہ مشہور افسانے تو قوم کے اندر موجود تھے۔ ”کیوں کہنے والی بات“ صرف باقی تھی۔ تو قرآن ”کیوں“ (Why of it) بتاتا چلا گیا اور وہ تاریخ کی کتاب تو نہیں کہ آپ کو ہسٹری آف دی ورلڈ (History of the World) بتا رہا ہے۔ اس نے تو یہ بتانا ہے کہ یہ ایسا کیوں ہوا۔ جن اقوام‘ جن انبیاء‘ جن ممالک‘ جن بستیوں سے‘ وہ عرب پہلے سے متعارف بلکہ مانوس تھے انہی کی بات ان کے سامنے کرنی چاہیے تھی کیونکہ یہ اولین مخاطب قوم تھی۔ اب جب کہ یہ پیغام عالمگیر (Universal) ہو گا تو ہسٹری آف دی ورلڈ (History of the World) کا ایک حصہ یہ علاقہ بھی ہو جائے گا جس سے متعلق قرآن نے یہ باتیں کہیں۔ اب اس جگہ ہمارا فریضہ یہ ہو گا کہ دنیا کی تاریخ میں جتنا حصہ یہاں کے متعلق آیا ہے‘ وہ دیکھیں کہ قرآن کس طرح اس کے متعلق ایک ایک لفظ صحیح کہتا ہے۔ عرب کے نزولِ قرآن کے اُس زمانے میں ابھی تاریخی طور پر اتنی تحقیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ ان اقوام کے متعلق کچھ بتائیں‘ انہیں بہت سی چیزوں کا علم بھی نہیں تھا۔ اس لیے قرآن نے انہی قریبی‘ مانوس بستیوں کا ذکر کیا۔

قرآنی حقائق کے متعلق موجودہ تحقیق

انہی کے متعلق قرآن نے رسول اللہؐ سے کہا ہے کہ ہم وحی کے ذریعے یہ باتیں بتا رہے ہیں۔ وہ جو باتیں وحی کے ذریعے بتائی گئیں تھیں اب آ کر اُس کے بعد اس چودہ سو سال میں تاریخ کی تحقیق جو ہوئی ہے تو اس سے قرآن کی ایک ایک بات صحیح ثابت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ زمین کے نیچے دبے ہوئے کھنڈرات بھی‘ جنہیں اثریات کہتے ہیں‘ آرکیالوجی (Archaeology) کی رو سے کھدائیاں ہونے کے بعد ان کے اندر سے جو Tablets [1] نکلی ہیں‘ وہ قرآن کی آیات کی شہادت دیتی ہیں‘ جو اس وقت کسی کے سامنے نہیں تھیں اور قرآن جو کہہ رہا تھا کہ یہ ٹھیک بات ہے‘ تمہارے علم میں یہ بات نہیں‘ یہ تو رسول کے علم میں بھی بات نہیں ہو سکتی تھی‘ ہم نے یہ بات وحی کے ذریعے سے اسے بتائی ہے اور جب ہماری ان نشانیوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھیں گے تو تم دیکھو گے کہ ہر اٹھنے والا پردہ پکار کر کہے گا کہ اِنَّـهُ الْحَقُّ (41:53)۔ قرآن نے جو کہا تھا ”واقعی ایک حقیقت ثابتہ تھی۔“

---

[1] تختیاں

Marfat.com

فرعون کی لاش ممی کی شکل میں آج بھی محفوظ ہے

کیا کوئی شخص بھی چودہ سو سال پہلے یہ کہہ سکتا تھا' جب قرآن نے اس فرعون [1] (Pharaoh) سے کہا ہے کہ تو اس سمندر کے اندر ڈوب کے مرگیا ہے لیکن ہم نے تیری لاش کو محفوظ رکھا کہ آنے والوں کے لیے یہ آیۂ عبرت بنے؟ اس زمانے میں دنیا کا کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ یہ تو ہماری اس صدی کی ابتداء کی بات ہے کہ وہاں کی ممیاں Mummies سامنے آئیں۔ اب ان کے متعلق تحقیق ہوئی۔ اس تحقیق کے بعد اب یہ اس نتیجے پہ پہنچے کہ یہ فرعون کی لاش ہے۔ یہ فرعون حضرتِ موسیٰ کی تکذیب کرتا تھا' یہ ان مصری لوگوں کی تاریخ ہے' یہ ہماری تاریخ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے یہ متعین کیا ہے کہ یہ اس فرعون کا لاشہ (Dead Body) ہے جو غرق ہو کے مرا تھا۔ غرق ہو کے مرنے کے آثار اس کے چہرے کے اوپر موجود ہیں: اس کے چہرے کا کچھ حصہ مچھلیوں نے کاٹا اور کچھ جانوروں نے اس کے وجود کو کسی قدر کاٹا' حالانکہ وہ شہنشاہ تھا۔ وہ ممی موجود ہے۔ تاریخ موجود ہے۔ میں نے تو یہ ایک بات مثال کے طور پہ کہی ہے کہ قرآنِ کریم نے انہی اقوام یا انہی انبیاء کا ذکر کیوں کیا ہے جو وہاں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ذکر اس لیے نہیں کیا کہ باقی اقوام میں انبیاء گذرے ہی نہیں تھے بلکہ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ انہیں یہ بتائے کہ جو قومیں اس قسم کی روش اختیار کریں گی ان کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ وہ عرب یہ بات انہی قوموں کی نسبت سے سمجھ سکتے تھے' جن سے وہ واقف تھے' جن کی کہانیاں ان کے اندر تھیں' جن کے کھنڈرات وہ روزانہ دیکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے پوچھا ہی نہیں ہے کہ صاحب! عاد قوم کونسی تھی اور ثمود کونسی قوم تھی۔ قرآن نے جو کچھ بیان کیا'' اب اس کا اطلاق' اس کی Application' دنیا کی تاریخ پہ آپ کرتے چلے جایئے۔ اس کے نتائج سامنے آتے چلے جائیں گے جو قرآن کی صداقت کا ثبوت ہونگے۔

آخر کار قرآن کی تمام تاریخی شہادتیں سچ ثابت ہونگی

جو کلیے قرآن نے بیان کیے ہیں' ساری دنیا کی تاریخ ان کا ثبوت بتائے گی۔ قومِ ثمود کے متعلق اگر اس نے کہا کہ جب وہ Exploitation میں انتہا تک پہنچ گئے تو یوں تباہی ہوئی۔ روما کے متعلق وہ بات بتا رہا ہے صاحب! ایران کی ہسٹری کے متعلق یہی کہا

---

[1] ۔فرعون کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔ یہ قدیم شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا آمن رع (سورج کا دیوتا) تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا لقب فاراع یعنی سورج کا دیوتا کا اوتار قرار دیا پا گیا۔ قریب تین ہزار سال (ق۔م) سے لے کر سکندر کے زمانہ تک فراعنہ کے قریباً تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ ان کا سب سے آخری خاندان اہل فارس کا تھا جسے سکندر نے 332 ق۔م میں شکست دی تھی۔ حضرتِ یوسف کے زمانہ میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسرِ حکومت تھا۔ یہ تھا چرواہے بادشاہ۔ قیاس یہ ہے کہ دراصل عرب قبائل ہی کی ایک شاخ تھی۔ انہیں عمالقہ کہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ کے زمانہ میں بھی یہی خاندان مصر پر حکمران تھا۔ لیکن بعض علمائے آثارِ قدیمۂ مصریات کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کے ابتدائی زمانے کے فرعون کا نام ریمیسس ثانی (Rameses11) تھا۔ اور خروج کے وقت کا بادشاہ' اس کا بیٹا منفتاح (Menneptah) تھا۔ فرعون' استبداد ملوکیت کا مجسمہ ہے۔

جائے گا۔ بازنطینی کا تو میں نے کہا ہی ہے۔ روم کی ہسٹری کے متعلق بھی یہی انجام بتایا ہے۔ یونان کی ہسٹری کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا۔ قرآن تو کہتا ہی یہ ہے کہ کَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ (17:17)۔ ان سے کہا: دیکھو کہ نوح اور اس کے بعد کی قومیں کس طرح سے ہلاک ہوئی ہیں۔ یہ پہلا کلیہ بیان کیا ہے۔ پہلی آیت میں کہا کہ رسول آ کے آگاہ کرتے تھے۔ درمیان میں کہا کہ پھر یہ قانون تھا۔ انہوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کی' تباہ ہوئے۔ ان سے کہا کہ دیکھو قومِ نوح اور ان کے بعد کی قومیں جن کے کھنڈرات تمہارے سامنے ہیں' ان میں سے ایک ایک قوم اس قانون کے ماتحت تباہ ہوئی تھی۔ اب آگے یہ بات بتادی کہ یہ کیوں تباہ ہوئی تھیں؟ وہ جو قرآن نے ''اَرَدْنَا'' اور نُهۡلِكَ کہا تھا: ''ہم ارادہ کرتے ہیں' ہم تباہ کرتے ہیں'' تو وہ یہی تھا کہ اقوام کی تباہی کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جب وہ آرام پسند' محنت کیے بغیر زیادہ سے زیادہ مال و دولت حاصل کرنے کی آرزومند' عیش پرست اور سرمایہ دارانہ ذہنیت (Capitalistic Mentality) کی حامل ہو جاتی ہیں اور اس طرح اُس صحیح روش کو چھوڑ کر' جو ان کے سامنے واضح طور پر آ چکی ہوتی ہے' غلط راستوں کو اختیار کر لیتی ہیں۔ تو وہ تباہی کی مستوجب ہو جاتی ہیں۔ اور پھر انہیں اس طرح ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا (17:17)۔ بات صاف ہوگئی یعنی اس طرح تیرے نشوونما دینے والے کا قانون' اپنے بندوں کے' اقوام کے' جرائم سے اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔ اس کا قانون سب کچھ دیکھتا ہے۔ کسی کا کوئی عمل اس کے قانون کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ ہاں اس طرح وہ اپنے بندوں کے جرائم سے واقف ہے۔ یہ ہے بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ۔

ایک قوم دوسری قوم کو اپنی حفاظت کی خاطر دبا کر رکھتی ہے

خدا یونہی کسی کو تباہ نہیں کر دیتا۔ وہ تو کوئی برابر کی ٹکر کا ہو تو اس کے لیے تو یہ چیز ہوتی ہے کہ یہ میرے اوپر چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کل کو مجھے کہیں دبا نہ لے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے' یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی جرم ہوتا ہے۔ قومیں اپنی حفاظت کے لیے دوسری کمزور قوموں کو دبا لیتی ہیں۔ جو پاورز (Powers) کا حامل ہوتا ہے' اس کے ساتھ یونہی ٹکر لے لیتی ہیں' یہ جیسے بگ پاورز (Big Powers) آپس میں کر رہی ہیں۔ وہ یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی پاور (Power) کو' کسی خاص طور پہ کوئی چڑ یا ضد ہے یا ان کے خلاف انہیں کوئی شکایت ہے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ چیز یہ ہے کہ وہ دیکھتی ہیں کہ یہ برابر کے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ایک دن ہمیں تباہ کر دیں گے۔ اس لیے ان سے ٹکر لے لیتی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے۔ کہا: عِبَادِهٖ (17:17)۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ مقابل کا ایک خدا تھا' اس سے ہم نے ٹکر لینی تھی کہ کل کو ڈر ہے کہ کہیں ہماری خدائی نہ چھین لے۔ یہ تو سارے کے سارے ہمارے بندے تھے۔ ان سے ڈر کر ہم نے یہ کچھ نہیں کیا کہ کہیں کل کو یہ ہمارے مقابلے میں آ کے ہمارا ہی گلا نہ دبا دیں۔ یہ سوال ہی نہیں تھا۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا (17:17)۔ کہا کہ یہ جو ہم کہہ دیتے تھے کہ یہ تم جو کچھ کر رہے ہو' اس کے نتیجہ میں تم تباہ

Marfat.com

ہو جاؤ گے۔ لہٰذا اگر یہ پوچھا جائے کہ خدا یہ کیسے کہہ دیتا تھا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ کہا: وہ اس طرح سے کہہ دیتا تھا کہ وہ اپنے بندوں کے اعمال کے نتائج سے باخبر ہے۔ باخبر ہی نہیں' وہ تو بصیر بھی ہے' وہ تو آنکھوں سے یہ دیکھ رہا تھا تو کہا کہ "بتاؤ تو سہی کہ جو آنکھوں سے دیکھ رہا ہو کہ تو یہاں جہنم میں گر رہا ہے تو وہ کہہ دے گا کہ ہاں کہ یہ تباہ ہو گیا"۔ اس لیے کہا: كَفٰى (17:17)۔ یہی شہادت کافی ہے۔ برادرانِ عزیز! ہمارے لیے نہ تو کمیشن مقرر کرنے کی ضرورت تھی' نہ کمیٹی بٹھانے کی' نہ تحقیقات کرنے کی۔ كَفٰى (17:17)۔ خدا اس چیز سے باخبر تھا۔ وہی اس کی شہادت اس کے لیے کافی تھی۔

اعمال کا نتیجہ تو جانور کی دم کی طرح پیچھے چپکا ہوا ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کا ایک ایک لفظ ایسا ہی ہے کہ اس پہ کھڑے ہونا چاہیے۔ یہاں ہے: بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ (17:17)۔ کیا بات ہے! اس "ذنب" کے عام معنی ہوتے ہیں: "یہ کسی مویشی کی دُم جو پیچھے لگی ہوتی ہے' اسے ذنب کہا جاتا ہے"۔ اب یہ کہیں گے کہ اس کے معنی کیا لیں گے؟ عربوں کے ہاں دیکھیے' جو چیز کسی کے پیچھے لگی ہوئی ہو' جو اس کے ساتھ پیچھے چپکی ہوئی ہو' جو ایسے ہو کہ جہاں جائے ساتھ جائے' وہ ذنب ہے۔ بات قرآن نے جو بات کہنی تھی' اُسے بڑے عمدہ طریقے سے کہا۔ ہر عمل پہلے سرزد ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ اس کے ساتھ میں پیچھے آتا ہے۔ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18)۔ یہ اس نے اعمال کے نتائج کے متعلق کہا ہے کہ تم آج (Today) کھڑے ہو کے سوچو کہ کل (Tomorrow) جو چڑھنے والا سورج ہے' اس کے لیے کیا کیا ہوا ہے۔ یعنی تمہارا اپنا کل جو آنے والا ہے' اس کی بابت آج یہ بات سوچو کہ آج تم نے اپنے کل کے لیے کیا کیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس طرح وہ Future بتا رہا ہے کہ جو تمہارا آج' امروز (Today) ہے یہ Present ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ یہ بڑی خوشحالی میں گذر رہا ہے' آپ آج بڑے مزے میں ہیں۔ ٹھیک ہے۔ دیکھو یہ کہ یہ جو آج کر رہے ہو' اس کے پیچھے جو کل (Tomorrow)' وہ چلا آ رہا ہے' اس کے لیے بھی تم نے کچھ کیا ہے۔

عمل کا نتیجہ ہمیشہ بعد میں نکلتا ہے

اس عمل کا جو نتیجہ ہے' یہ اس عمل کا فطری نتیجہ' (Natural Consequence) ہے۔ یہ ہمیشہ اس عمل کے بعد آتا ہے۔ یہ جو بعد میں آنے والی چیز ہے' وہ پیچھے لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اس طرح پیچھے چپکی ہوئی ہوتی ہے کہ کہیں وہ کٹ کے گرے نہیں۔ اب جہاں جی چاہے یہ چلا جائے' جاؤ تو کہاں جاتے ہو' وہ تو تمہارے پیچھے چپکی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے وہ "اعمال کے نتائج کو ذنب کہتے تھے۔" یہ وہی لفظ ہے جس کا ہم ترجمہ گناہ کر دیتے ہیں۔ انسان کے یہ تباہ کن اعمال جن کا نتیجہ بعد میں برآمد ہونا ہو اور وہ ایسے ہوں کہ یہ جہاں جائے وہ اس کے پیچھے چپکے ہوئے ہوں' اسے کسی طرح بھی نہ چھوڑیں' اسے وہ "ذنب" کہتے تھے۔ قرآن میں "ذنوب عبادہ"

Marfat.com

آیا ہے۔ فرق یہ تھا کہ وہ صرف ان کے آج کو دیکھتے تھے اور ہم اس ''دم'' کو دیکھتے تھے جو ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ یہ انہیں نظر نہیں آتی تھی کہ وہ پیچھے لگی ہوئی تھی۔ انہیں تو صرف اعمال نظر آتے تھے کہ ان کے پاس بڑی دولت ہے' بڑی کثرت ہے' ان کے ہاں Wealth of the Nation ہے' قوم بڑی ترقی کر رہی ہے' بڑی خوشحال ہے' دیکھیے ایک بستی بسی ہوئی ہے۔ یہ سارا کچھ وہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ کچھ دیکھتے تھے اور خدا یہ دیکھ رہا تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے کیا چلا آ رہا ہے' یہ اسے نہیں دیکھ رہے تھے۔

رسول بھیجے جاتے تھے کہ ان کو آگاہ کر دیں' وارننگ (Warning) دیدیں کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے لیکن وہ یہاں صرف اپنا حال (Present) دیکھ رہے تھے۔ کہتا ہے کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا (17:17)۔ وہ اس سے باخبر ہی نہیں تھے صرف سامنے والی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور یہ نگاہ تو جانور یا مویشی کے سر پہ' ماتھے کے اگلے حصے پہ' ہوتی ہے۔ وہ جو پیچھے دم چپکی ہوتی ہے' وہ اسے نہیں دیکھ سکتے۔ کہا کہ ہمارے لیے اس کا دیکھنا قطعاً مشکل نہیں ہے اور نہ ہی اس کے اعمال کے (نتائج) Consequences بتانا مشکل ہے۔ اگر کوئی اس چیز سے باخبر ہے کہ جو یہ کر رہا ہے' اس عمل کے پیچھے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا تو پھر اس کے کہنے کے لیے یہ کافی آسان ہے کہ یہ کرو گے تو یہ ہو جائے گا۔ تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اگر ہم نے پہلے سے یہ کہہ دیا کہ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58)۔ ان کے ہاں کثرتِ دولت ہے' جو ساحل ناآشنا ہے۔ جب پانی اچھل کے باہر آ جایا کرتا ہے اور سیلاب بنتا ہے تو یاد رکھو! سیلاب تباہ کر دیا کرتا ہے۔ تمہاری نگاہ صرف اس دریا پہ تھی۔ ہماری نگاہ ان ساحلوں پر تھی جو ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ ہم اس سے باخبر تھے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایسا ہو رہا ہے تو کیا ہمارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ ہم کہہ دیں کہ یہ سیلاب بنے گا' تمہاری بستیوں کو ڈبو کے رکھ دے گا۔ ابھی اسی وقت اونچے اونچے بند بنا لو' اپنی دولت کو ساحلوں میں رکھ کر' اس سے وہی کام لو جو دریا کے پانی کو ساحلوں میں بند کر کے لیتے ہو۔ ورنہ: وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا (17:17)۔ تیرا نشوونما دینے والا اپنے بندوں کے جرائم سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

سوال یہ پیدا ہوا کہ صاحب! یہ ٹھیک ہے' آپ تباہیاں کہہ رہے ہیں' تو یہ جتنی قومیں فسق و فجور میں مبتلا ہیں' خلاف ورزیاں کرتی ہیں' جرائم کرتی ہیں' ہم دیکھتے ہیں کہ ان کو دولت' عظمت' ثروت' قوت' اتنی فراوانی حاصل ہوئے چلی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس یہ جتنے لوگ دیانتداری سے' ایمانداری سے' سچائی سے' اور عزت سے' کام کرنے والے ہیں' وہ پیچھے رہتے ہیں' وہ تو مصیبت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان فسق و فجور والوں کو یہ کچھ کیوں ملتا چلا جاتا ہے۔ اور آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے احکام کی یہ اس قدر

Marfat.com

نافرمانبرداری کرتے ہیں اور اس کے باوجود آپ دیکھیے کہ یہ کتنا پنپتے جاتے ہیں۔ انہیں یہ سب کچھ مل رہا ہے۔ یہاں سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟ آپ دیکھیے کہ قرآن کا انداز کیا ہے۔ ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا۔ خدا کے دل میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ تو قرآن کا دینے والا ہے۔ اس کے ہاں تو ہمارے دل میں جو خیال پیدا ہونے والا ہے، اسے Anticipate کرنا نہیں کہتے۔ وہ تو بصیر ہے، وہ تو جانتا ہے، وہ تو خود کہتا ہے کہ ہم دل میں چھپے ہوئے رازوں تک سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کچھ کہنے پر سطح بیں نگاہوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر یہ اتنی دولت کیوں ملتی ہے؟

یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے لیکن کیسے؟

اس نے کہا کہ اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ یہ کچھ بھی کوئی خلاف قانون نہیں ہو رہا۔ ایسا بھی نہیں ہو رہا کہ ہم بے خبر ہیں۔ یوں بھی نہیں ہے کہ ہمارے علی الرغم ہم تو ان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہیں کہ پنپتے چلے جاتے ہیں۔ کہتا ہے: بات یہ نہیں ہے، وہ بھی قانون کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ بھی قانون ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے؟ یہ ہیں وہ مقامات عزیزانِ من! جو خصوصیت سے قابلِ غور ہیں۔ یہ آیتیں اگرچہ پہلے بھی آئی ہیں جہاں قرآن کی عظمت ابھر کر، نکھر کر، سامنے آجاتی ہے۔ آپ کو مذہب کی دنیا کے اندر یہ چیزیں کبھی بھی نہیں ملیں گی۔ یہ قرآن ہی کے اندر آپ کو ملیں گی۔

یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ بھی ہمارے قانون کے مطابق ہے۔ اس قانون کی دو شقیں ہیں: ایک قانون تو Laws of Nature ہے۔ اسے آپ قانونِ طبعی بھی کہتے ہیں۔ یہ Physical Laws ہیں، یہ نیچر کے قوانین ہیں۔ ان کا تعلق زمین میں پیدا کرنے کی صلاحیت سے، اس میں محنت کرنے سے ہے تاکہ وقت کے اوپر فصل بوئی جائے، اچھا دانہ ڈالا جائے، پانی وقت پہ دیا جائے، اس کی حفاظت کی جائے، سورج کی حرارت پہنچنے سے ہے۔ انسان یہ ساری چیزیں محنت سے کرتا چلا جائے، ان قوانین کے تابع کرتا چلا جائے، فصل اگے گی، ایک ایک دانہ بقول اس کے محاورے کے سات سات سو دانہ دے گا، کوٹھیاں بھریں گی۔ اس قانون کی کارفرمائی میں مومن اور کافر کا کوئی سوال نہیں ہے۔ کوئی انسان بھی جو یہ کرے گا، اس کا نتیجہ اسی انداز میں نکل آئے گا۔ اپنے آپ کو خدا کا مقرب کہنے والا زمیندار، کاشتکار، گھر میں بیٹھا ہوا اگر سارا دن تسبیح کرتا رہ جائے، مصلیٰ بچھا کے نمازیں پڑھتا رہے، اپنے کھیت میں نہیں جائے، فصل نہیں بوئے تو اس کے ہاں تو ایک دانہ سات سو دانے کیا ایک دانہ بھی نہیں لائے گا۔ اس سارے کچھ سے جو وہ کر رہا ہے، قانون طبعی کبھی اپنے رخ کو اس طرف نہیں موڑے گا۔ یہ قانونِ طبعی کبھی اپنا رخ نہیں چھوڑے گا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (48:23) ہی نہیں بلکہ تَحْوِيْلًا (35:43) بھی ہے۔ وہ اپنا رخ موڑ کے اس کی طرف نہیں آئے گا کہ کوئی بات نہیں اس نے ہل نہیں چلایا، فصل نہیں بوئی ہے، وہاں کھیت ویسے ہی چھوڑ دیا، تو یہ اللہ کا نام لیتا رہے، اللہ اللہ کرتا رہا ہے، صبح سے شام تک اس کو 'ھو الرازق

Marfat.com

ھو الرازق ' بھی کہتا رہا' تو اس لیے' جب فصل کٹے گی کہ بھئی ہمارا بندہ تھا وہ اللہ اس کے گھر میں بوریاں بھیج دے گا۔نہیں۔قطعاً نہیں۔اس سے تو وہ کافر بہتر تھا کہ جو خدا کا نام نہیں لیتا تھا' خدا کا منکر تھا لیکن اس نے خدا کے قانونِ طبعی (Physical Laws) کے مطابق کام کیا اور رزق کی جھولیاں بھریں۔اُس منکر کی یہ چیز مذہب کے معیار پر کہی جاتی ہے۔وہ کہتا ہے: ہمارے ہاں یہ سوال نہیں کہ یہ صبح سے شام تک ہمارا نام لیتا تھا' یہ صرف نام لینے والے کی بنا پہ رزق کی جھولیاں نہیں بھر سکتا۔اگر یہ صورت ہوتی تو یہ بھیک منگا نہ ہوتا کیونکہ اللہ کا جتنا نام یہ بھکاری فقیر لیتا ہے' اتنا تو دنیا میں زاہد بھی نہیں لیتا ہوگا۔وہ صبح اٹھتے ہی کہتا ہے: ''دے جا اللہ کے نام' دیدے اللہ کے نام' دے جا اللہ کے نام پہ' یا اللہ بھیج' یا اللہ دے''۔وہ یہ سب کچھ کرتا رہتا ہے جی! اتنی لمبی' اتنی بڑی تسبیح تو کوئی بڑے سے بڑا ولی اللہ بھی نہیں پھیرتا جتنی تسبیح یہ سارا دن پھیرتا ہے' اسے صرف صبح سے شام تک بھیک ملتی ہے اور وہ بھی اسی وقت جب کسی کے دل میں رحم کا جذبہ آ جائے۔اس کے مقابلے میں جو صبح اٹھ کے' منہ ہاتھ دھو کے' کام پہ چلا جاتا ہے۔کام کر کے آتا ہے۔وہ Sure ہوتا ہے کہ رات کو اس کو یہ ملے گا۔وہ کسان اس تسبیح کرنے والے سے علی الرغم' جا کے اپنی فصل بوتا ہے۔اس کو یہ سارا کچھ ملتا ہے۔یہ کبھی نہیں ہوتا کہ خدا یہ کہے کہ یہ تو ہمیں مانتا ہی نہیں ہے' اس کی کھیتی میں دانے کیوں پیدا ہوں۔تو یہ صرف اللہ کرنے' تسبیح پھیرنے کی بات نہیں ہے۔یہ قانونِ طبعی ہے جو کارفرما ہے۔اس میں جو انسان یہ کچھ کرے گا اس کو یہ مل جائے گا۔اس میں مومن اور کافر کا سوال نہیں۔ یہ سوال آگے جا کے آتا ہے جب اس محنت کے ''ماحصل'' کے خرچ کی بات آتی ہے۔

یہ راہنمائی صرف اور صرف قرآن حکیم میں ہی محفوظ ہے

بہر حال میں نے بھی اپنی استعداد کے مطابق ساری دنیا کے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ساری دنیا کے قریباً قریباً مذاہب کی جو کتابیں ہاتھ آ سکی ہیں' میں نے وہ ساری پڑھ ڈالی ہوئی ہیں۔مذہب کی دنیا میں آپ کو یہ چیز کہیں نہیں ملے گی۔فرمانِ خداوندی ہے کہ ہم کسی کی محنت میں امتیاز نہیں کیا کرتے۔ یہاں کافر اور مومن کا سوال نہیں۔یہاں خدا کو نہ ماننے والے اور ماننے والے کا سوال نہیں ہے۔ہمارے ہاں' ہمیں نہ ماننے والا' اگر ان قوانین کی اتباع میں یہ کچھ کرے گا' ہم اس کو بھی دیں گے' ہمیں ماننے والا' اگر یہ کچھ طبعی قوانین کے مطابق نہیں کرے گا تو ہم اسے نہیں دیں گے۔کسی انسان کو بھی یہ راہنمائی قرآن کے علاوہ کہیں نہیں ملے گی۔ ہے ناں آپ کے جی کو لگتی ہوئی بات! اور مشاہدہ بھی اس کی تائید کر رہا ہے۔

طبعی قوانین ہر فرد کے لیے یکساں ہیں

کہا کہ یہ جو سوال تمہارے دل میں پیدا ہوا کہ یہ جو خدا کو نہیں مانتے تھے' اس کے قوانین کو نہیں مانتے تھے' اس کی اقدار کی پامالی کرتے تھے' اس کی اصول شکنی کرتے تھے' یہ قومیں' یہاں کیوں نہ تباہ ہوئیں؟ ان کی معیشت کیوں بڑھتی گئی؟ انہیں یہاں دولت

کیوں ملتی چلی گئی؟ یہ ان کے ہاں کیا بات ہوئی کہ وہ تباہ و برباد نہ ہوسکیں؟ کہا: ''اس کی ایک وجہ ہے۔'' آپ بظاہر یہی دیکھیں گے کہ اس میں کوئی ربط نظر نہیں آ رہا۔ ہم ''اردنا'' یا ''امرنا'' یا ''نھلک'' جیسے آنے والے الفاظ کی آیات کا ترجمہ کچھ یوں کر دیتے ہیں کہ ہر بستی میں ہلاکت سے پہلے ہم رسول بھیجتے ہیں۔ پھر ہلاکت کا ارادہ کرتے ہیں۔ ان ترجموں کی رو سے تو ہم یہ کچھ کر دیتے ہیں لیکن نہیں سوچتے کہ صحیح بات کیا ہوئی، اصل معاملہ کیا تھا۔ مثلاً مترفین جیسا گروہ ہے، اس نے قومِ نوح کے ساتھ کیا کیا ہے۔ یہ سب الجھنیں ان ترجموں کی وجہ سے ذہنوں میں پیدا ہو کر عملی دنیا میں آتی ہیں۔

قانونِ فطرت کا ہی دوسرا نام مشیتِ خداوندی یا خدا کا ارادہ ہے

اب آگے یہ آ گیا: **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ** (17:18)۔ ہمارا قانونِ فطرت یہ ہے کہ جو بھی طبعی قوانین (Physical Laws) کے تابع Immediate Gain چاہتا ہے، اپنی محنت کا ماحصل اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے، ہم اس کو اس کے مطابق دیتے ہیں، یہ ہماری مشیت ہے، یہ ہمارا ارادہ ہے۔ وہ جو کہا تھا کہ ایسا ہو تو یہی مشیتِ خداوندی ہے۔ اس کے لیے ہم ارادہ کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ قانونِ فطرت کو کیسے ارادے سے بدلا ہے۔ یہی ہمارا قانونِ مشیت ہے۔ جب قرآن قانونِ مشیت کہتا ہے تو وہ قانونِ فطرت کا ہی دوسرا نام ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نام ''خدا کا ارادہ'' ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اس کارگہ حیات کی طبعی دنیا (Physical World) میں قانونِ فطرت Law of Nature ہی ہے جو لاگو (Implement) تھے۔ وہاں یہی صورت ہے کہ جو شیر کی سی قوت رکھتا ہے وہ بکری کو پھاڑ دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں ایک دوسرا قانون بھی نافذ العمل ہے جو وحی کے ذریعہ ملا ہے۔

انسانوں کے لیے خدا کا دوسرا قانون وحی کی عطا کردہ اقدار ہیں

وحی کے ذریعے جو خدا کی طرف سے اقدار ملی ہیں، یہ خدا کا دوسرا قانون ہے۔ یہ فطرت میں آپ کو نہیں ملے گا، یہ ایک دوسرا Set of Laws ہے، یہ ایک دوسرا ضابطہ قوانین (Code of Life) ہے جو انسانوں کی دنیا کے اندر نافذ العمل ہوتا ہے اور اسے وحی کے رو سے ملی ہوئی اقدار کہتے ہیں۔ فطرت کے قوانین طبعی دنیا (Physical World) میں لاگو ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جو بھی Immediate Gain چاہتا ہے، کہ ہمیں فوراً یہ چیز حاصل ہو جائے، ہم اسے دے دیتے ہیں۔ یہ **يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا** (17:18) ہے۔ جو جتنی تیزی سے محنت کرتا ہے، اور اس کے مطابق وہ لینا چاہتا ہے، ہم اُسے اتنی ہی تیزی سے وہ کچھ دیتے ہیں۔ یہ تو Immediate Gain حاصل ہو گیا اور آگے کیا ہوا؟

جہاں بینی کے بجائے خود بینی کا انجام

اس کے لیے کہا: **ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا** (17:18)۔ اس کے بعد اگر وہ جسے ہماری بتائی ہوئی

Marfat.com

اقدار کے مطابق آپ خدا ماننا کہتے ہیں' وہ اس دولت کو جو' یوں حاصل ہوئی ہے' وہ اسے ہماری بتائی ہوئی اقدار کے مطابق استعمال نہیں کرتا' ان اقدار سے سرکشی برتتا ہے' یہاں ہمارے ارادے اور ہماری مشیت کے مطابق نہیں چلتا ہے' یہاں وہ اپنا ارادہ اور اپنی مشیت برتتا ہے' اپنے قوانین برتتا ہے' صرف اپنا مفاد دیکھتا ہے' تو پھر اس کا نتیجہ تباہی کا جہنم ہوتا ہے کہ جس میں جب وہ جاتا ہے تو اس جہنم کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پھر اُسے ساری دنیا میں دھتکارا جاتا ہے' اُسے کوئی اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ عزیزانِ من! یہ ہے تباہ شدہ قوموں کے لیے جہنم: دنیا میں اس قوم کی کوئی عزت نہیں کرتا' وہ ہر طرف سے دھتکارا ہوا اور پھٹکارا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ (17:19)۔ کیا بات کہی ہے یہ! اور جو اس کے مقابلے میں چاہتا ہے کہ یہ کچھ ملنا چاہیے' اس کے لیے کیا کیا شرطیں لگائی چلی جا رہی ہیں!! ایسی کوشش کرنا جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اور مستقل اقدار پر یقین کامل رکھنا۔

جنتِ ابدی کا راز ابدی اصولوں کی اتباع میں ہی مضمر ہے

لیکن اس کے بعد وہ ''ذنب'' والی بات پیچھے سے آ رہی ہے جس کو اب یہاں آ کے لفظ ''آخرت'' کہا۔ وہ مستقبل کو بھی سامنے رکھتا ہے کہ دولت تو حاصل ہو۔ اس طرح دولت حاصل ہونے کے بعد کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟ اگر اس کے اندر یہ سرکشی اختیار کر لی تو اس کا انجام تباہی ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ دولت' جو انہیں حاصل ہوئی ہے' اسے نظامِ خداوندی کے تابع استعمال کیا گیا ہے تو اس کی خوشگواریاں جنتِ ابدی کی صورت میں ہوتی ہیں جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آیا کرتی۔

ہر آنے والا لمحہ اور ہر آنے والا وقت گذرے ہوئے وقت کی آخرت ہے

جو اس کے ساتھ " اَرَادَ الْاٰخِرَةَ " چاہتا ہے' جو آخرت کا ارادہ بھی چاہتا ہے' مستقبل کا ارادہ بھی چاہتا ہے۔ وہ آخرت جو صرف مرنے کے بعد کی نہیں ہے' وہ مرنے کے بعد کی آخرت تو برحق ہے' کیونکہ زندگی یہاں ختم نہیں ہوتی' لیکن جب اس کو یہ کہا تھا کہ سوچو' تم نے اپنے ''کل'' کے لیے کیا بھیجا ہے۔ وہ قوموں کا کل' افراد کا کل' ان قوموں کے آج اور ان افراد کے آج کا دوسرا سانس ہے۔ یہ ان کا کل' ان کا Future ہے۔ انسانوں کا ''کل'' ان کے مرنے کے بعد کی زندگی بھی ان کا ''کل'' ہے۔ یہ سارا ''کل'' ان کا Future ہے۔ ان سب کے لیے قرآن میں ''آخرت'' کا لفظ آتا ہے۔ جو بھی یہ ''کل'' دیکھنا چاہتا ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نگاہ ''آخرت'' پہ بھی ہو۔ یہ ''کل'' اس کی ''آخرت'' ہے۔ تو اس طرح سے جو دولت حاصل ہوتی ہے' وہ صرف قانونِ فطرت کے مطابق کام کرنے سے حاصل ہوگی۔ اسے پھر یاد رکھیے کہ وہ دولت قانونِ فطرت کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ جو ان قوانین کا اتباع نہیں کرے گا' انہیں وہ دولت حاصل ہی نہیں ہوگی۔ یہ دولت تو صرف ان قوانین کے مطابق کام کرنے سے حاصل ہوگی۔

Marfat.com

مومن اور کافر میں فرق؟

اب بات آئے گی کہ حاصل شدہ دولت کا استعمال کیسے کرتا ہے؟ یہاں مومن اور کافر کا فرق آ گیا۔ جو " اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ " چاہتا ہے' یعنی مستقبل کے لیے چاہتا ہے کہ وہ بھی سنورے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح سے سنورے؟ کیا بیٹھ جائے پھر تسبیح لے کے؟ کہا: سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا (17:19)۔ جس قسم کی کوشش اس کے لیے ضروری ہے وہ اس قسم کی کوشش کرے۔ کوشش کرنا یہاں بھی شرط ہو گئی۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (17:19)۔ اب یہاں فرق آیا: وہ کافر تھا' وہ خدا کی اقدار کو نہیں مانتا۔ یہ مومن ہے اور خدا کی اقدار کی صداقتوں کو مانتا ہے۔ فَاُولٰٓـئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (17:19)۔ یہ وہ ہیں کہ جن کی کوششیں بھرپور نتائج برآمد کرتی ہیں: عَجَّلْنَا (17:19)۔ انہیں قریبی مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی آخرت یعنی مستقبل بھی سنورتا ہے۔ یہ ایک دوسری Category ہو گئی۔ اب یہ اس کا جتنا بھی مفہوم میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے یہ اس کی ایک آیت کی بات نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی بیسیوں آیات ہیں جن میں یہی چیز اس نے بار بار دہرا کر کہی ہے۔ اس طرح انسانوں کی تین Categories ہو جاتی ہیں: (1) جو صرف مفادِ عاجلہ (Immediate Gain) قوانینِ فطرت کے مطابق حاصل کریں: (2) جو قوانینِ فطرت کے مطابق حاصل شدہ دولت کو' خدا کی اقدار کے مطابق خرچ کریں: اور (3) جو قوانینِ فطرت کے مطابق فطرت کی قوتوں کی تسخیر ہی نہ کریں۔ ہر ایک Category کی تفصیل درج ذیل ہے:

مفادِ عاجلہ کا نتیجہ ہی تباہی ہے

جو صرف اسی دنیا کا مفاد (Gain) چاہتا ہے' وہ فطرت کے قوانین کے مطابق کام کرتا ہے لیکن کام کے ماحصل میں اقدارِ خداوندی کو سامنے نہیں رکھتا۔ تو اسے یہاں کی سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا (2:200)۔ جو اپنے سامنے زندگی کا مقصد ہی یہ رکھتا ہے کہ بس اس دنیا کی جو کچھ دولت' مال اور سارا رزق ہے وہ اسے یہیں حاصل ہوں (2:200)۔ اور بس۔ اس سے زیادہ نہ وہ مانتا ہے اور نہ اس سے زیادہ کی فکر کرتا ہے۔ اب یہاں وہ بات آ گئی کہ اسے ہم وہ کچھ دے دیتے ہیں۔ لیکن وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200)۔ مستقبل میں پھر اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں وہاں جو کہا تھا کہ "مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ" تو یہاں اس نے وضاحت سے یہ نہیں کہا تھا کہ مستقبل کے ماننے والوں کا یہ جو حال ہے یا یہ جو Present ہے یا یہ جو ان کا مفادِ عاجلہ ہے وہ بھی ان کو اسی طرح سے مل جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مفادِ آخرت بھی ملتے ہیں۔ یہاں کہا: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (2:201)۔ یہ دوسری کیٹگری (Category) ان لوگوں کی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ یہاں بھی یہ جو حال ہے یا یہ جو Present یا جو مفادِ عاجلہ ہے' یہ سب خوشگواریاں حاصل ہوں اور

Marfat.com

مستقبل کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ہم تباہیوں سے بچیں: اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا (2:202)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو ان کی محنتوں کا بھرپور نتیجہ اس کے مطابق ملتا ہے۔ اس طرح ان کی یہ دنیا بھی خوشگوار اور مستقبل اور آخرت بھی ان کی شاداب اور پائندہ رہتی ہے۔ اس طرح انسانوں کی تین کیٹگری (Categories) ہو جاتی ہیں۔

انسانوں میں تین قسم کی کیٹگری (Categories) ہوتی ہیں

ہاں تو انسانوں کی تین Categories ہو گئیں جو قرآنِ کریم نے گنا دی ہیں۔ ایک تو اُن لوگوں کی کیٹگری ہو گئی جو صرف قوانینِ طبعی (Physical Laws) کے تابع یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق یہ سب کچھ لانا چاہتے ہیں۔ اس کیٹگری (Category) میں ایمان اور کفر کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ جیسے ہمیں دھوکہ دیدیتی ہیں' یورپ کی اقوام یا اور دوسری اقوام' جو اقدارِ خداوندی کو تو نہیں مانتیں لیکن صرف قوانینِ طبعی کے تابع دولت وقوت میں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک کیٹگری ان کی یہ ہو گئی۔ انہی کے متعلق یہ اعتراض ہوا کرتا ہے کہ آپ دیکھیے انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا۔ کتنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ چند صدیوں سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔

صدیوں سے یورپ کی حالت پہلی کیٹگری کی تھی

یہی چند صدیوں پہلے کی بات ہے جب انہوں نے قوانینِ فطرت کا اتباع نہیں کیا تھا تو ساری دنیا میں مفلس ترین' غریب ترین' تباہیوں والا یہی یورپ کا علاقہ ہوتا تھا۔ جب انہوں نے قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کو پہلے معلوم کیا' Discover کیا' پھر ان کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر (Harness) کیا' (Conquer) کیا' تو سارے مفادِ عاجلہ (Immediate Gains) انہیں حاصل ہوتے گئے۔ قرآن نے تو آدم کی پہلی بنیادی شرط یہ قرار دی ہے کہ ہم نے اس کے لیے اس کائنات کی ساری قوتوں کو مسخر کر دیا تو اس طرح جب انہوں نے ان قوتوں کو مسخر کیا ہے تو یہ سارے مفادِ عاجلہ ان کو حاصل ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ان کا مستقبل کتنا تاریک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اول تو ان قوموں کا اسی دنیا کا مستقبل دیکھتے چلے جائیے' میں نے ابھی ابھی آپ سے کہا کہ دو جنگوں سے پہلے کی حالت لیجیے۔ ان میں سے بعض اقوام کی جو کیفیت ان جنگوں سے پہلے کی ہے' وہ دیکھیے اور اس کے بعد دیکھیے کہ آج ان اقوام کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہیں نظر آ رہا ہے۔ پہلی کیٹگری کا یہ حال ہے۔ ان کا مطمعِ نگاہ یہ ہے کہ یہ یہاں کا سارا کچھ انہیں حاصل ہو جائے۔ ان کا مستقبل تباہ حال ہے۔ یہ صرف اقدارِ خداوندی کو اپنے سامنے نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔

دوسری کیٹگری (Category)

دوسری کیٹگری یہ ہے کہ یہ سارا کچھ مفادِ عاجلہ حاصل ہو جائے اور مستقبل بھی درخشندہ رہے: اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی

اَلْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ تو اس کے لیے یہ فطرت کی قوتوں کو مسخر (Conquer) کرے اور قوانینِ خداوندی' جو اقدارِ خداوندی کہلاتی ہیں' جو وحی کے ذریعے ملی ہوئی ہیں' جواب قرآنِ کریم میں موجود ہیں' ان کے مطابق ان فطرت کی قوتوں کو صرف کرے' ان کا حال بھی خوشگوار اور ان کا مستقبل بھی خوشگوار و تابندہ۔

تیسری کیٹگری

تیسری کیٹگری (Category) ان لوگوں اور اقوام کی ہے جو نہ تو قوانینِ فطرت کے مطابق ان قوتوں کو مسخر کرے' نہ ہی ان کے مطابق کام کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ ان قوتوں کو مسخر ہی نہ کریں گے' تو ان کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ کس طرح ان کو استعمال کرتے ہیں وہ تو ان تمام آسائشوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ تیسری کیٹگری ہوتی ہے۔ یہ کیٹگری مذہب پرست قوموں کی ہے۔ ان کا وطیرۂ زندگی یہ ہوتا ہے: یا اللہ دیدے' مولا دے' دے اللہ دے ناں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ رازق ہے لیکن بیٹھے ہیں تسبیحیاں پھیر رہے ہیں' قوانینِ فطرت کو Neglect کیا ہوا ہے' نظر انداز کیا ہوا ہے۔ انہیں کہیں سے نہیں ملتا۔ یہ وہی ہیں جو بظاہر آپ کو بڑے بڑے متوکل علی اللہ نظر آتے ہیں۔ ہیں ناں خدا پہ توکل کیے ہوئے؟ سوچیے کیا توکل علی اللہ یہی ہے؟ یہ فریبِ نفس ہے۔

فطرت کے قوانین کو نظر انداز کرنا بذاتِ خود جرم ہے

یہ جتنے بھی ''حضرت صاحبان'' ہوتے ہیں اور یہ جتنے بھی ان کے عقیدت مند ہیں' جو انہیں جا جا کے دیتے ہیں' ذرا ان کا راستہ بند کر دیجیے پھر ان سے پوچھیے کہ صاحب! لنگر تو ایک طرف رہا کیا انہیں کہیں سے گھر کے لیے بھی روٹی ملتی ہے؟ اس طرح انہیں روٹی ملنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ فطرت کے قوانین کو نظر انداز کر کے' فطرت کے ماحصل کو حاصل کرنے کی توقع کرنا' خود خلافِ فطرت ہے اور خلافِ حکمِ خداوندی ہے عزیزانِ من! دوسرے کمائیں اور یہ عقیدت مندی سے لا کے دیتے جائیں اور کہیں یہ کہ ''صاحب! دیکھیے کتنا کچھ اللہ کے ہاں سے مل رہا ہے۔'' یہ سب کچھ چہ معنی دارد؟ ٹھیک ہے' یہ ''حضرت صاحبان'' کوئی محنت نہیں کرتے' کہیں مزدوری نہیں کرتے۔ آپ دیکھیے کہ کتنا لنگر ہے جو چل رہا ہے۔ آپ سوچیے یہ کہاں سے چل رہا ہے' انہیں چھپر پھاڑ کے کہیں سے نہیں مل رہا' یہ دوسروں کی کمائی ہے۔ یہ ہے ان کی تیسری کیٹگری' جن کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ وہ ہیں: خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ (22:11)۔ جن کی دنیا بھی تباہ اور آخرت بھی۔ قرآنِ کریم نے واضح طور پہ یہ کہہ دیا کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)۔ جو اِس جہاں کا اندھا ہے وہ آخرت کا بھی اندھا ہوگا۔ تو تین چیزیں آ گئیں۔ ایک وہ قومیں کہ جن کی دنیا درخشندہ ہوگی لیکن ان کی آخرت تاریک رہے گی۔ دوسری وہ کہ جن کی یہ دنیا بھی درخشندہ اور آخرت بھی درخشندہ ہے' یہ مومن کی جماعت کہلائے گی اور تیسری کیٹگری ان لوگوں کی یا ان اقوام کی کہ جن کی یہ دنیا بھی تاریک اور آخرت بھی تاریک۔ یہ مذہب پرست اقوام ہوتی ہیں جن کی یہ

Marfat.com

کیفیت ہوتی ہے۔عزیزانِ من! یہ ہیں تین Categories۔اور پھر انہی آیات کی طرف آ جایئے' یہاں قرآنِ پاک نے کہا ہے کہ جو مفادِ عاجلہ (Immediate Gains) مانگتا ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر ہم اسے وہ دے دیتے ہیں۔ سنیئے عزیزانِ من! کس انداز میں قرآن یہ بات کہتا ہے۔ یہ خدا ہونا زیب ہی اسے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ تمہارے ذہن کی تنگ نظریاں ہیں کہ مفادِ عاجلہ (Immediate Gain) مانگنے والوں کے بارے میں کہتے ہو کہ یہ کافر ہے' یہ ہندو ہے اور یہ سکھ ہے یہ مجھے یعنی خدا کو گالیاں دیتا ہے اور خدا پھر بھی دیئے چلا جا رہا ہے۔ یہ کیا بات ہے؟

کائنات کی یہ نعمتیں

کہتا ہے: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (17:20)۔ یہ جو سامانِ نشوونما تھا' یہ جو سامانِ زندگی تھا' یہ جو ہم نے زمین میں خزانے رکھ دیئے' سورج بنا دیا' ہوائیں چلا دیں' پانی بنا دیا' انہی سے یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔ فَبِهَا۔ تو دوسری چیز یہ ہے کہ انسان صرف محنت کرتا ہے۔ یہ سارے کا سارا' جو کچھ ہم نے دیا ہے' قرآنِ کریم اسے عطائے رب کہتا ہے۔ وہ تو تم نے مومن اور کافر کی تفریق پیدا کی۔ ہم نے تو یہ ساری بخشش کی چیزیں اس زمانے میں پیدا کی تھیں جب مومن اور کافر تو ایک طرف رہا' ہم نے تو ابھی کوئی انسان بھی پیدا نہیں کیا تھا۔ انسان کو تو ہم بعد میں لائے ہیں۔ یہ سامان تو اس کے لیے ہم نے پہلے سے بھیج دیا تھا۔

عطائے رب کے لیے رحمِ مادر میں بچے کی نشوونما کی مثال

عزیزانِ من! کیا بات ہے عطائے رب کی۔ یہ سب سامانِ نشوونما' سامانِ زندگی رکھنے کے بعد ہم نے یہ مخلوق پیدا کی۔ یہاں اس کے لیے ہم نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ آج بھی سلسلۂ نشوونما یہی ہے۔ مثلاً بچہ دنیا میں بعد میں آتا ہے' اس کے لیے سامانِ رزق' اس کی ماں کے رزق کے سرچشموں میں' اس کی پیدائش سے پہلے پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس وقت سے بہت پہلے جب پہلی سانس کے بعد بچے کو اس کی پہلی طلب ہوتی ہے۔ پتہ نہیں صاحب! ہم تو فطرت کے قانون کے اوپر انگشت بدنداں ہیں کہ رحمِ مادر میں اس بچے کو کیسے سامانِ رزق مل رہا ہوتا ہے۔ اس کی ساری نشوونما' وہ تمام فزیکل عناصر (Physical Elements)' یہ گوشت اور پوست' یہ ہڈیاں' یہ کیلشم' یہ جو بھی بعد میں بچے یا انسان کے اندر ہوتا ہے' یہ تمام عناصر' یہ ان میں کی ہر چیز' اس بچے کے اندر ہوتی ہے۔ اسی سے تو وہ بچہ نشوونما پا رہا ہوتا ہے اور وہ تمام اس قدر سیلڈ (Sealed) ہوتا ہے کہ قرآن نے کہا ہے: تین تہوں کے اندر وہ بچہ سانس لے رہا ہے' دل دھڑک رہا ہے۔ اب تو اس دل کے دھڑکنے کی آواز کمرے میں آ جاتی ہے' وہ جوان کے ہاں بچے کو دیکھنے کے نئے آلات آئے ہیں' ان کے ذریعے بچے کی سانس کی آواز باہر آ رہی ہوتی ہے۔ وہ بچہ اندر نشوونما پا رہا ہوتا ہے' اس کی ہر چیز کی نشوونما ہو رہی ہوتی ہے۔ کیا قانون ہے! لیکن جونہی وہ اس دنیا میں آتا ہے' جہاں خدا نے یہ قوانینِ فطرت مقرر کیے ہیں' پہلے ہی سانس کے بعد'

Marfat.com

پہلی چیز تو اس کو آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے' جو اس ہوا سے اس نے لینی ہوتی ہے' یہ آکسیجن ہوا میں پہلے سے ہی موجود ہے۔ مگر وہاں رحم مادر میں پوچھیے تو سہی یہ آکسیجن کہاں سے مل رہی ہوتی ہے۔ اس دنیا میں آنے کے بعد آکسیجن اگر دو سانس میں نہ ملے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ تو رحم مادر میں مہینوں سانس لے رہا ہوتا ہے صاحب! باہر آنے کے بعد جو بچے بعض اوقات پیدا ہونے کے بعد ایک سانس لی' دوسرے میں کیا ہوا صاحب؟ ہارٹ فیل ہو گیا' دل بند ہو گیا۔ کیا ہوا جی؟ آکسیجن نہیں ملی۔

خدائے رحیم وکریم خالق ہی نہیں' رزاق بھی ہے

اب پیدائش کے بعد آکسیجن بچے کو فطرت کے قانون کے مطابق ملے گی اور اس کے بعد اسے جو پہلی بھوک لگی تو پھر خدا نے اس کے لیے پہلے سے سامان پیدا کر دیا۔ یہ اُسے کس نے سکھایا ہے کہ اب تو نے ''وہاں سے'' اپنا رزق حاصل کرنا ہے۔ اس کا تصور رحم مادر کے اندر اُس کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ جو اس نے کہا ہے کہ ہم خالق ہی نہیں' ہم رازق بھی ہیں اور کہا کہ خدا ہونا سجتا ہی اس کو ہے کہ پیدا کرے تو پیدا کرنے سے پہلے سامانِ رزق دے' ورنہ پیدا کر دیئے جائیں اور جو سامانِ رزق ہے وہ اس کو نہ دیا جائے' تو کیا ہو؟ کہنے لگے: کیا یہ تخلیق ہے؟ یہ تو ظلم ہے۔ زندگی کا دار و مدار ہوا پہ' آکسیجن پہ ہو اور آکسیجن اس فضا کے اندر دی نہ جائے اور انسانوں کو پیدا کر دیا جائے تو کیا یہ ظلم نہیں؟ یہ آکسیجن تو فطرت کے قانون کے مطابق اس بچے کی پہلی مانگ (Demand) ہے۔ اور ابھی پیدائش کے وقت ہی بچہ نہ تو ہندو ہوتا ہے' نہ مسلمان ہوتا ہے اور اس مرحلے سے پہلے تو اس کا سوال ہی نہیں تھا کہ آیا وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو۔

عطائے رب میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں

یہاں تو پھر بھی بچے کی پیدائش کے بعد بہرحال ہم نے اس کے کان میں اذان دی تھی۔ وہاں رحم مادر میں تو اذان بھی ابھی نہیں دی ہوئی ہوتی۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے تو کوئی انسان بھی ابھی پیدا نہیں کیا تھا مگر اس کے لیے سامانِ زیست پہلے بھیجا تھا۔ مِنْ عَطَـآءِ رَبِّکَ (17:20)۔ کہا: کیا خیال ہے' ایسے خدا کو تم رازق اور رب کہو گے کہ عطا تو وہ اس طرح سے بخشش کے طور پہ دے' پہلے سے پیدا کی ہوئی اشیاء سے' بلا مزد و معاوضہ دے۔ اور اگر ایسا ہو کہ یہ پیدا کرے اور اس کے بعد پھر اس کے سامنے بند لگا دے کہ ''نہیں بھئی! جو ہمیں مانے گا اُسے تو ملے گا' جو ہمیں نہیں مانے گا اُسے ہم کیوں دیں گے؟'' تو صورتِ حال کیا ہوتی؟ دنیا میں تو ہوتا ہی یہی ہے پھر اس کی نشوونما کیسے ہوتی؟ ''جو کسی کو نہیں مانتا' اس کو کچھ نہیں ملے گا''۔ یہ انسان کہتا ہے اور کہتا ہے کہ ''یہ ہونا چاہیے۔'' اگر یہ ہونا چاہیے تو کیسے وہ جو رحمِ مادر کے اندر بچہ تھا اس کے متعلق فرما دیجیے کہ اس کی نشوونما کیسے ہوتی؟ کہا: رب ہونا اسی کو زیب دیتا ہے۔ وہ ''رَبِّکَ'' ہے عزیزانِ من! قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ (17:20)۔ جو بھی انسان ہے اور فطرت کے قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے وہ مومنین کی جماعت ہو یا وہ کافرین کی جماعت ہو كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ (17:20)۔ ان دونوں کو ہم ان

Marfat.com

کی کوشش کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں 'نمد' ہم کے لیے آیا ہے' ہم بڑھاتے چلے جاتے ہیں' ہم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔تم تو واقعی یہ نہیں کرو گے' تمہاری تنگ نظریاں (Narrow-mindedness) یہ نہیں کریں گی۔کہیں گی کہ یہ ہمارا نیشنل (National) نہیں ہے' اس لیے اس کو یہ کچھ نہیں ملے گا۔کہا: ہمارا نیشنل تو ہر سانس لینے والا ہے: کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (17:20)۔ جو بھی اس کے مطابق کوشش کرتا ہے' ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ہم اس کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں' ہمارے قانون کی تائید اس کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ (17:20)۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ یہ متاع رَبِّکَ ہے' یہ عطائے رب تھی' یہ رَبِّکَ ہے۔یہ تم سب کا نشوونما دینے والا ہے۔یہ ربوبیت کی جتنی چیزیں بطورِ عطیہ ملی ہوئی ہیں' یہ تمام انہیں دے کر ہم انہیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔کہا: سوچو تو سہی: مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا (17:20)۔ کہ وہ چیزیں بلا مزد و معاوضہ' ربوبیتِ عالمینی کے لیے' تمام انسانوں کے لیے' ملتی ہیں۔ان کے آگے پھاٹک لگادینا' محظوراً کر دینا کہ ''نہیں صاحب! ہمارا نام لینے والا تو جاسکے گا' جو ہمارا نام نہ لینے والا ہے' اس پر یہ پھاٹک بند ہوگا''۔کیا کبھی خدا کی ربوبیت اس سے برحق ثابت ہوگی؟ کہا: وہ تمہاری تنگ نظریاں ہیں' ہماری نہیں۔خدا نے اپنی عطا کردہ نعمتوں' پر سامانِ پرورش پر' کوئی احاطہ بندی (حَظر) نہیں کر رکھی۔اسے تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت عامہ کے لیے کھلا رکھا ہے۔کہا: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا (17:20)۔ ''رب ہونا جنوں کیندے اں' اونوں سجدا ای نئیں ہیگا''۔ ❶ جو چیزیں بطورِ عطا کے اُس نے دے دی ہیں' جو سامانِ زیست اس نے دے دیا ہے' اس کے آگے پھاٹک لگادینا کہ ''نہیں' تمہارا ہل ❷ اس سے آگے نہیں جاسکتا'' کیا یہ چیز اسے ربِ کائنات بنادے گی؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ان چیزوں پر تو انسان نے لکیریں کھینچی ہوئی ہیں۔'' کہے جی میرے بچے نئیں پلدے ہیگے۔ تے تیرے بچیاں دی ذمہ داری میں لئی ہیگی کہ نئیں پلدے؟ لگے ہوئے نے اے بند سارے''۔ ❸ یہ تمام تنگ نظریاں انسانوں کی پیدا کی ہوئی ہیں۔اس نے تو کائنات کے دسترخوان پر سب کے لیے سامانِ نشوونما سجا رکھا ہے۔

ربوبیتِ عالمینی کے آگے پھاٹک نہیں لگائے جاسکتے

آج اس دنیا میں سارے بند عطائے رب پر ہی لگے ہوئے ہیں۔اس دنیا کا سارا فساد یہی ہے کہ جو چیز عطائے رب تھی' اس پہ بند لگادیا جائے۔یہ چیز شاید کوئی ظالم سوتیلی ماں ہی کرے کہ سوتیلے بچے کو تو دودھ نہ دے' اپنے ہی بچے کو دودھ دے۔یہ ربوبیت نہیں ہے۔

❶ جسے ''رب ہونا'' کہتے ہیں' وہ کچھ تو اسے جچتا ہی نہیں ہے۔ ❷ فصل کاشت کرنے کے لیے زمین تیار کرنے کا ایک اوزار۔

❸ کہتا ہے کہ جی! میرے بچوں کی پرورش نہیں ہو رہی۔جواب ملتا ہے کہ کیا تمہارے بچوں کی پرورش کا میں ذمہ دار ہوں؟ نہیں' میں نہیں ہوں۔اس طرح یہ سارے بند لگے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

خدائے کریم کے نزدیک تو کوئی سوتیلا نہیں ہے۔ اس نے دونوں کو اپنے بندے کہا تھا' اور کہا تھا کہ ہم بڑھاتے چلے جاتے ہیں' اگر ہم پھاٹک لگاتے تو یہ ربوبیت کے منافی ہوتا لیکن: اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (17:21) ۔ یہ جو طبعی قوانین کے مطابق کچھ حاصل کرنے کا حصہ ہے' اس کے لیے کہا: دیکھو کس طرح سے بعض قومیں دوسری قوموں سے آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ اس میں تم دیکھو گے کہ سوال مومن اور کافر کا نہیں ہے' سوال اس کا ہے کہ کس قوم نے قوانینِ فطرت کی اطاعت کی اور ان قوانین کے مطابق آگے بڑھی۔ بات بڑی گہری ہے۔ انہوں نے بھی تو قانونِ خداوندی کی اطاعت کی تھی۔ فطرت کے قوانین کی اطاعت بھی تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ وہ قانونِ فطرت کونسے کسی بت کے بنائے ہوئے ہیں۔ دیکھو تو سہی کہ کس طرح ایک گروہ اِن قوانینِ فطرت کے مطابق کام کر کے' دوسرے سے آگے بڑھتا جاتا ہے کیونکہ ہم نے ان قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کے آگے پھاٹک نہیں لگایا ہوا۔

حقیقی کبریائی مستقل اقدار کی پیروی میں ملے گی

لیکن عزیزانِ من! وہ ایک بات اور کہتا ہے کہ یاد رکھو! وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (17:21)۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ وسائلِ رزق اور سامانِ زیست کے حصول میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب مستقبل کے متعلق سوال آئے گا کہ اس ماحصل کو استعمال کیسے کرنا ہے تو وہاں پھر یہ مومن اور کافر کی تمیز پیدا ہوگی۔ تم دیکھو کہ مستقبل کے درجات کسے حاصل ہیں اور اصل بات یہی ہے۔ یہاں قرآنِ کریم نے ''اکبر'' کہا ہے۔ تم دنیا میں دولت کے زور پر قوت حاصل کر کے کبریائی حاصل کر لیتے ہو لیکن صحیح ''کبریائی'' جو ہے اس کے لیے یہاں لفظ ہی ''ک ب ر'' آیا ہے۔ یہ جو صحیح کبریائی حاصل ہوگی' یہ اسی قوم کو حاصل ہوگی جو قوانینِ فطرت کی رو سے ان چیزوں کو حاصل کرے اور پھر ہمارے مقرر کردہ اقدار اور اصول اور قوانین کے مطابق انہیں استعمال کرے۔ اس سے انہیں قوت حاصل ہوگی' اس سے غلبہ' اقتدار اس کے معنی کر لیجیے' حاصل ہوگا۔ اسے کہیں گے یہ دیکھو! یہ اکبر ہے' ان سب سے بڑھا ہوا ہوگا اور درحقیقت یہی وہ فضیلت ہے جو فضیلت کہلانے کی مستحق ہے۔ یہاں آ کے مومن اور کافر کا فرق پڑے گا۔ اس سے پہلے جب قوانینِ فطرت کے مطابق رزق کمانے' کام کرنے' سعی و عمل کرنے کی بات تھی' اس میں فرق نہیں پڑے گا۔ ''اکبر درجٰت'' ان کے مدارج ہیں جو قوانینِ فطرت کے مطابق کام کر کے ماحصل کو اقدارِ خداوندی کے مطابق کام میں لاتے ہیں۔

متکبر کا مفہوم

یہاں اس آیت میں ''اکبر'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ بڑی گہری چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو تکبر کا لفظ ہمیشہ بُرے معنوں کے اندر استعمال

Marfat.com

ہوتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ العنکبوت میں قرآنِ پاک نے قارون[1] فرعون اور ہامان[2] کے بارے میں کہا کہ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ (29:39)۔ وہ اپنی اُس سرکشی سے باز نہ آئے جسے انہوں نے ملک میں عام کر رکھا تھا۔ لیکن آپ' عزیزانِ من! سوچتے نہیں ہیں کہ خدا نے تو اپنا نام ''اَلْمُتَكَبِّرُ'' (59:23) رکھا ہوا ہے اور یہ چیز سورۃ حشر میں ہے۔ اگر ''تکبر'' اتنی ہی بُری چیز ہوتی تو کیا وہ اپنے آپ کو متکبر کہتا؟ ''متکبر'' ہونا اگر اتنی بُری بات ہوتا تو خدا اپنی یہ صفت کیوں رکھتا۔ تو تمہارے اپنے اندر بھی پیدا ہونی چاہیے کیونکہ یہ بھی تو صفتِ خداوندی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس میں کیا چیز بُری ہے؟ اسے قرآن میں دیکھیے۔ میں جب اس موضوع پہ آؤنگا' تو بتاؤنگا کہ قرآن نے اس استکبار کو جو غیر الحق ہے' اسے بُرا کہا ہے۔ لہٰذا یہ استکبار بُری چیز ہے۔ یہی فرعون' قارون اور ہامان میں تھا۔ اس لیے اسے سرکشی سے تعبیر کیا۔ یہ بُری چیز ہے۔ کبریائی کی تمنا کرنا' اس کی آرزو کرنا' اس کے حصول کے لیے کوشش کرنا بُری چیز نہیں ہے۔ یہ تو خدا کی صفت ہے' ہونی چاہیے۔ یہ اس کے بندوں کا بھی حق ہے۔ جو چیز معیوب ہے: ''وہ ہے الحق کے بغیر جو تم کبار حاصل کرتے ہو

[1] قارون فسادِ سرمایہ داری کا مظہر تھا۔ تورات نے (گنتی 16:1-4) اسے قرح کہا یعنی قرح بن ظہار بن قیات بن لادی۔ یہودیوں کا مشہور مورخ جوزیفس (Josephus) اپنی تاریخ Antiquity of the Jews کے حصہ 4' باب 2' فصل نمبر 2' اُسے ''عبرانیوں کے مشاہیر'' میں شمار کرتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ چونکہ دین اسلام کی زد براہِ راست سرمایہ داری پر پڑتی ہے' وہ اس دعوتِ حق و صداقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس لیے قارون کو نظام سرمایہ داری' کے نمائندہ کی حیثیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ پرستی کی ذہنیت کا غماز ہے جس میں وہ سمجھتا ہے کہ ''میں جو کچھ کماتا ہوں وہ میری اپنی ہنرمندی اور چابکدستی کا نتیجہ ہے' اس لیے وہ میری واحد ملکیت ہے جس میں کسی اور کا حق اور حصہ نہیں۔ میں جتنا جی چاہے جمع کروں' اور اُسے جس طرح سے جی چاہے صرف کروں۔'' اس ذہنیت میں دوسروں کی محنت کا استیصال کر کے سرمایہ (Capital) اکٹھا کیا جاتا ہے۔ سرکشی اور بغاوت کی جاتی ہے۔ دولت اور قوت کا غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے قارون کو قرآن کریم میں مفسد کہا گیا ہے۔ یہ سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا پیکر ہے اور ہمیشہ فرعون (جو استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ ہے) اور ہامان (جو پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ ہے) کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ آسمانی انقلاب' انسانیت کو ان تینوں بلاؤں سے نجات دلانے کے لیے آتا ہے۔ اس کا انجام تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

[2] ہامان مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ ہے۔ جہاں فرعون بادشاہی کرتا ہے یہ ''خدائی'' کرتا ہے۔ مصر میں آمن رع (سورج کا دیوتا) سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اس مندر کا پجاری' شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتا تھا۔ آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اول کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا بھی افسر تھا۔ مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کے پاس تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اُس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام مندروں کے پجاریوں کا افسرِ اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے مندر کے قبضہ میں تمام مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا۔ یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاہن (Head Priest) کی وجاہت۔ یہی آمن' قرآن کریم کا ہامان ہے۔ جس طرح قرآن کریم نے فرعونِ موسیٰ کا نام نہیں دیا' اس کے معروف لقب سے پکارا' اُسی طرح آمن کا بھی نام نہیں لکھا بلکہ اس کا ذکر بھی اس کے لقب سے ہی کیا ہے۔ قرآن کی آیات 40:37-38 کے مطابق فرعون نے ہامان کو محکمہ تعمیرات اور نظامِ روحانیت کے سب سے بڑے رکن کی حیثیت سے پکارا ہے کہ اس کے لیے ایک مینارہ تعمیر کراؤ۔ فرعون' قارون اور ہامان مل کر کام کرتے ہیں۔

Marfat.com

جسے تم کبریائی کہتے ہو' جسے تم اقتدار کہتے ہو۔'' یہ معیوب ہے۔ اس لیے کہ اس میں الحق نہیں ہے۔ مگر یہ جو جماعتِ مومنین' فطرت کی قوتوں کی تسخیر (Harnessing) حاصل کرنے کے بعد' انہیں خدا کے تابع' خدا کے قوانین کے مطابق استعمال میں لاتی ہے ان کے ہاں اکبر درجت ہیں' ان کے مدارج کے اندر کبریائی ہوتی ہے' وہ انتہا تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے' اسی لیے یہ چیز ہمارے ہاں کہی گئی ہے کہ یہ جو تمہیں کبریائی حاصل ہوگئی ہے بھئی اس کا پانچ وقت اعلان کرو' یہی ہے جو کم از کم ہمارے ہاں شعار چلا آ رہا ہے۔ یہ ہے اذان میں جو اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ پوچھو کہ اکبر کسے کہتے ہیں؟ وہاں اعلان کرو' اللہ اکبر'' کہ یہ'' اکبر'' والی بات جو ہے یہ' ہمیں ملی ہوئی ہے' لیکن یہ اکبریت وہ ہے جو اسے حاصل ہے جس نے خدا کے قوانین کے مطابق اپنی سعی و عمل سے حاصل کی ہوئی ہے۔

کبریائی اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے

ہماری کبریائی خدا کے قوانین کے تابع ہے (24:55)۔ اکبر وہی ہے جو اپنی زندگی خدا کے قوانینِ فطرت اور اقدارِ خداوندی کے تابع گذارتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ہمارے مدارج کو'' اکبر'' کہا ہے لیکن'' اللہ اکبر'' وہی خدا کی ذات ہے۔ یوں جماعتِ مومنین کی کبریائی ہمارے اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہے۔ یہ استخلاف فی الارض (24:55) ہے جو قرآن نے اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ بتایا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ استخلاف فی الارض' وہی کبریائی ہے جو اس دنیا کے اندر حاصل ہوتی ہے' اور یہاں'' اکبر'' دَرَجٰتٍ کو کہا ہے۔ قرآن نے تو مومن کے متعلق کہا ہے کہ وہ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:136) ہے۔ وہ اَلۡعَلِيۡمُ الۡكَبِيۡرُ ہے۔ یہ العلیم ہونا بھی خدا کی صفت ہے۔ تو یہ ہم یہاں نماز میں سجدے کے دوران پھر الاعلیٰ کا اعلان کرتے ہیں: سُبۡحٰنَ رَبِّيَ الۡاَعۡلٰى ۔ اس میں اَلۡاَعۡلٰى وہی خدا کی ذات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس معنی کے اندر'' ال'' تم جہاں لاؤ گے' اس سے مراد ہم ہی ہیں لیکن ہماری عطا کردہ نعماء سے' ہمارے قانون کے مطابق عملی زندگی میں کام کرنے سے' اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔ اعلیٰ کے معنی بھی غلبہ ہونا ہوتا ہے اس سے تم اعلیٰ مرتبہ پاؤ گے' اس سے تمہیں اقوامِ عالم پر غلبہ حاصل ہوگا۔ یہ وہی ہے جسے آپ علی المرتبت کہتے ہیں۔ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (3:138)۔ اگر تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو یہ چیزیں بھی حاصل ہونگی۔ وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ تَفۡضِيۡلًا (17:21)۔ جس قوم کو یوں مستقبل کی خوشگواریاں حاصل ہو جائیں' اس کے درجات بلند ہیں اور اسی کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے ایک بات اصولاً یاد رکھو اور وہ یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے سب کچھ حاصل کرو۔ وہاں سے' حاصل کرنے کے بعد لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (17:22)۔ کوئی اور الٰہ تجویز نہ کر لینا' یہ نہ کرنا کہ طبعی زندگی میں تو قوانینِ فطرت کے مطابق چلو لیکن تمدنی زندگی (Social Life) کو اپنے خود ساختہ قوانین (Man- Made Laws) کے تابع رکھو۔ یہ قطعاً نہ کرنا۔ کیا بات ہے قرآن کی! بس اتنی سی بات ہے کہ ایک تو یہ کہ خدا کا ہی انکار نہ کر دینا۔ کہنے لگا کہ یہ' ہمیں پتہ ہے یہ مسلمان کتنا بھی گیا گذرا کیوں نہ ہو' خدا کا انکار نہیں کرتا۔

کوئی دوسرا الہ نہیں بنالینا چاہیے

لیکن جس بات سے اسے روکا ہے وہ یہ ہے کہ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا (17:22)۔ اس کو بھی الہ پکارتے پکارتے اور دوسرا الہ نہ تجویز کر لینا۔ قرآنِ کریم میں بہت سے مقامات ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84) یاد رکھو! خارجی کائنات میں بھی صاحبِ اقتدار وہی ہے' تمہاری اپنی زندگی کے اندر بھی صاحبِ اقتدار اسی کو ہونا چاہیے۔ یہ نہ کرو کہ وہاں تو صاحبِ اقتدار یہ مان لو کہ فطرت کی قوتیں واقعی خدا کی عطا کی ہوئی ہیں' اسی کے قوانین کے تابع حاصل ہوتی ہیں اور جب تم اپنی ارض کی زندگی میں آؤ' جب اپنی معیشت کی زندگی میں آؤ' جب تمدنی زندگی کے اندر آؤ' تو یہاں دوسرے الہ مقرر کر لو۔ اور یوں کرو کہ یہاں قوانین ساز اور ہیں' یہاں حکمران اور ہیں' اور اس ''اور'' میں آپ کو معلوم ہے کون کون شامل ہیں؟ قرآن نے کہا ہے کہ تم نے اس کی حالت پر بھی غور کیا: مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (25:43)۔ جو اپنے ہی جذبات اور خواہشات اور فیصلوں کو اپنا الہ بنالیتا ہے۔ تو جو خارج میں ہم نے الہ بنا رکھے ہیں وہ تو ایک طرف رہے' وہ تو شرک الگ رہا۔ اگر آپ خدا کو مانتے ہوئے' فیصلے اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں اور اپنے ارادوں کے مطابق' اپنی خواہشات کے مطابق خواہ اس کا نام آپ جمہوریت (Democracy) ہی کیوں نہ رکھ لیں' کرتے ہیں تو یہ تو اِلٰهًا اٰخَرَ (17:22) بن گئے۔ اس لیے اپنی تمدنی دنیا میں' اپنی خواہشات' اپنے ارادوں' اور اپنے ہی نظامِ زندگی (Man- made System of Life) میں اپنا دوسرا الہ نہ بنالینا۔

فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو اپنی خواہشات کے تابع صرف کرنے کا نتیجہ جہنم ہوگا

کہا: بس ایک ہی بات ہے' جس سے محتاط رہنا۔ یہ سب کچھ ہم نے بتا دیا۔ فطرت کی قوتوں کے مطابق کام کرنے سے یہ سب کچھ حاصل ہو گیا۔ وہ بھی حاصل ہوگا یہ بھی حاصل ہوگا۔ بس اتنی سی بات ہی تم نے کرنی ہے کہ جو الہ تم خارجی کائنات میں مانتے ہو اس کے ساتھ کوئی اور الہ نہ بنالینا۔ اگر یہ کیا تو شرک کے مرتکب ہو جاؤ گے۔ وہاں کہا تھا' اگر صرف فطرت کی قوتوں کو حاصل کر کے اپنی مرضی کے مطابق ان فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو صرف کرتے ہیں' تو وہ جہنم ہے۔ اسے مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (17:18)۔ کہا جس میں وہ بدحال اور دھتکارے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور اگر ایسا کرو گے فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (17:22)۔ تم مصافِ زندگی میں دھتکارے ہوئے انسانوں کی طرح ذلت و خواری کے ساتھ' دوسروں سے پیچھے رہ جاؤ گے۔ تو پھر یہی حشر تمہارا ہو جائے گا جو ان کا حشر ہوا جو ہم نے بتایا ہے۔ اب تمہارا مسلمان کہلانا اور مردم شماری کے رجسٹر میں ایسا لکھانا' اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ جونہی تم نے خارجی کائنات کے الہ سے ماورا (Extra) اپنی انسانی زندگی میں اِلٰهًا اٰخَرَ (17:22) دوسرا الہ اختیار کیا' اپنی ارضی زندگی میں' اپنی تمدنی زندگی میں' اپنی انسانی زندگی میں' قدرت کے قوانین کو الہ سرے سے مانا ہی نہیں یا اگر اس کو ''یا اللہ یا اللہ'' بھی کہتے رہے اور اس کے ساتھ

Marfat.com

دوسرا الٰہ بھی تم نے مان لیا تو پھر سماوی اور ارضی' خارجی اور انسانی دونوں کے لیے جہنم ہے' جہنم الگ الگ نہیں ہے۔ جنت کے لیے تو اس نے جمع کے صیغے استعمال کیے ہیں جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کہا ہے۔ جنت کے لیے جمع کی شکل میں بہتر صیغے استعمال کیے ہیں۔ لیکن جہنم کے لیے واحد کا صیغہ ہے۔

لفظ خذلا اور مخذول کا مفہوم

پھر یاد رکھو اس جہنم کے اندرونی کیفیت ہے جسے مَذْمُوْمًا وَ مَخْذُوْلًا (17:22) ۔ کی کیفیت کہا ہے۔ بلکہ یہاں ''خذلا'' کہا ہوا ہے۔ کیا بات ہے ''خذلا'' کی! یہ جو بھیڑ بکری اپنے گلے سے بچھڑ جائیں اور ویرانوں کے اندر' بیابانوں میں الگ ہو کر چلی جائیں اور وہاں بھیڑیئے ہوں' یہ ان کی جو اس طرح کی کیفیت ہوتی ہے' یہ مخذول کی کیفیت ہوتی ہے۔ کہا کہ اگر یہ کرلو گے تو پھر ان سے' جن کے ساتھ رہنے سے' ان خطرات سے تم محفوظ رہ سکتے ہو' بچھڑ جاؤ گے پھر ہر بھیڑیا تمہیں اچک کر لے جائے گا۔ کہو پھر کیا رہی تمہاری قدر و قیمت!

جماعتی زندگی کی ایک خوبصورت قرآنی مثال

قرآن نے جماعتی زندگی کی عجیب چیز کہی ہے۔ یہ عزیزانِ من! اس بھیڑ کی اپنی قوت تو اس وقت بھی اتنی ہی ہوتی ہے جب یہ گلے کے اندر ہوتی ہے۔ یعنی یہ نہیں ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے اندر بجلی کی تاریں ہوتی ہیں جب ان سے انہیں کنیکٹ (Connect) کیا جائے تو آخری بھیڑ کے اندر پاور آ گئی۔ جب یہ الگ الگ ہوتی ہیں تو ہر بھیڑ کے اندر اتنی ہی طاقت ہوتی ہے۔ اس وقت' جب کہ وہ اکٹھی ہوں کوئی بھیڑیا ادھر رخ کرنے کی جرأت نہیں کرتا' یہاں جب وہ اکٹھی ہوں وہ محفوظ ہوتی ہیں۔ یہی اپنی انہی توانائیوں کو لیے ہوئے' جو پہلے حاصل تھیں۔ جب اس جماعتی زندگی سے الگ ہو جاتی ہے تو پھر ہر جھپٹا مارنے والا انہیں جھپٹ کے لے جاتا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن نے اسی لیے کہا تھا کہ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (2:43) قوانین کے سامنے جھکنے والے کے ساتھ رہ کے جھکو۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (9:119) ۔ صادقین کی جماعت کے ساتھ رہو۔ الگ رہے تو پھر مَخْذُوْلًا(17:22) بن جاؤ گے' ہاں مخذول بن جاؤ گے۔ اور پھر یہ کہا کہ لَا تَجْعَلْ (17:22) اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ایک خدا کے اقتدار و قانون میں کسی اور کے اقتدار و قانون کو شامل نہ کرو۔ پہلے کہا تھا کہ خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ ملانا۔ پھر کہا: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (17:23)۔ تم قوانین خداوندی کے علاوہ کسی کی اطاعت نہ کرو۔ اس کے سوا کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہ کرو۔ محکومیت (Sovereignty) صرف اس کے قوانین کی اختیار کرو۔ اسے اور اس کی متعدد مقتضیات کو ہم آئندہ لیں گے۔ عزیزانِ من! سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 22 تک ہم آ گئے' 23 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

Marfat.com

چھٹا باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 23 تا 28)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ
اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝23 وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝24 رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ
اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝25 وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ
السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝26 اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ
كَفُوْرًا ۝27 وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝28

عزیزانِ من! آج جولائی 1975 کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 23 سے ہو رہا ہے۔ (17:23)۔

سابقہ آیت کا نقطہ ماسکہ یہ تھا کہ وَمَا كَانَ عَطَاۗءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20)۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کی پرورش کے لیے جو سامانِ زیست بطورِ عطیہ دیا ہے، جس کی اس نے کوئی قیمت نہیں لی، اس پر تم بند نہ لگاؤ، اسے محظور نہ کرو، اسے محصور نہ کرو، اسے بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنے دو تا کہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے سکے۔ عطائے رب پر بند لگانے کو اس نے خدا کا شریک قرار دینا کہا ہے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہم نے پیدا کیا۔ ہم ہی اس کے مالک ہیں اور مالک کی حیثیت سے ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ یہ ساری مخلوق کے فائدے کے لیے کھلا رہے گا۔ اب اگر کوئی شخص، کوئی گروہ، کوئی قوم اس پہ بند لگا کے یہ کہتی ہے کہ نہیں اس کے اتنے حصہ کے ہم مالک ہیں تو یہ تو ملکیت میں خدا کا شریک ہوتا ہے۔ اسے اس نے شرک قرار دیا ہے۔ عام لوگ ان چیزوں کو یونہی Lightly لے کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور اصل تو یہ ہے کہ ہم نے دین کو کبھی Seriously لیا ہی نہیں ہے۔ اب تو اکثریت ان کی ہے، جو اس دین کی طرف سے بیزار ہو چکے ہیں اور جو کچھ دلچسپی بھی رکھتے ہیں، ان کی صورت دین کی نہیں ہے صرف مذہب سے دلچسپی کی صورت ہے۔

اہلِ مذہب تو ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی عائد ہی نہیں کرتے

عزیزانِ من! مذہب کا تو فتویٰ ہی یہ ہے کہ ان وسائلِ رزق کی ذاتی ملکیت ہے۔ مگر خدا کہتا ہے کہ ان وسائلِ رزق پر کوئی حد

Marfat.com

نہیں لگائی جاسکتی۔ وہ کہتا ہے کہ نوعِ انسان کے فائدے کے لیے ان وسائلِ رزق کو ہم نے بلا حدود و قیود چھوڑ دیا ہے۔ ان کی حد بندی کردینا' ان پہ پھاٹک لگا دینا' شرک ہے۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ ان سارے کے سارے وسائلِ رزق کو جتنا جی چاہے کوئی انہیں اپنی ملکیت میں لے' ان کی ملکیت کے اوپر کوئی پابندی عائد کردینا خلاف اسلام ہے۔ کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ کیا ان مسائل پہ بھی کبھی کوئی Discussion ہوئی ہے' کوئی بحث ہوئی ہے' کوئی فتویٰ لگا ہے۔ قطعاً نہیں۔

عقائد اور توحید کی باتوں پر شرک کی روز فتاوے بازیاں ہوتی ہیں: رسول اللہ ﷺ بشر تھے یا نور تھے' اس پر فتاوے لگ رہے ہیں۔ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا نیچی آواز سے' اس پر فتوے لگ رہے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے وسائلِ رزق کی ذاتی ملکیت پہ بھی کوئی فتویٰ ملتے دیکھا ہے؟ یا اس کے متعلق بھی بحث ہوتے دیکھا ہے کہ وسائل رزق پر ذاتی ملکیت کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے اور یہ آپ کا مذہب کیا کہہ رہا ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں' جو قرآن بتاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مذہبی طبقہ کسی کو قرآن کی طرف آنے نہیں دیتا ہے۔ آپ کا مذہب پیدا ہی اس دور میں ہوا ہے' جب پورے کا پورا نظامِ جاگیرداری' نظامِ ملوکیت اور نظام سرمایہ داری قوم پر مسلط ہوگیا ہوا تھا۔ قوم کو قرآن کی تعلیم سے بیگانہ رکھنے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ مذہب کے نام پہ اس قوم کو ہر غیر قرآنی چیز دیئے چلے جائیں جو انہیں سوٹ (Suit) کر رہی ہے۔

قرآن کو سمجھنے کی بجائے ناظرہ پڑھ لینا بھی کارِ ثواب ہے

یہ وہی چیزیں ہیں' جو مذہب کے نام پہ دی جارہی ہیں اور اس کے لیے کیا یہ گیا کہ اسی نظامِ ملوکیت و جاگیرداری و سرمایہ داری کے مطابق قرآن کی تفاسیر مرتب کر کے ان تفسیروں کو عام کیا جائے۔ یہ تفاسیر بھی ان کے لیے کہ جو کچھ تھوڑا بہت ترجمہ قرآن اپنی زبان میں پڑھ لیں' ورنہ یہ عقیدہ عام کردیا جائے کہ قرآنِ کریم کو بغیر سمجھنے کے' اسی طرح سے ناظرہ پڑھتے چلے جانے سے' بڑا ثواب ہوتا ہے' یعنی کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کے ترجمے کے چار فقرے پڑھنے سے بھی ثواب ہوتا ہے۔ نہیں' قطعاً نہیں۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ الف لام میم بغیر سمجھے ہوئے کہنے سے تیس نیکیوں کا ثواب ہو جاتا ہے۔ یہاں آپ کو الجھا کے رکھ دیا گیا ہے' ورنہ قرآن نہ تو معاذ اللہ کوئی مبہم کتاب ہے' نہ کوئی ایسی مشکل کتاب ہے کہ اپنے مضامین کو' اپنے حقائق کو' وہ خود واضح نہ کرے۔ لیکن یہ تو آپ کے خلاف سازش ہوئی ہے' یہ تو ہمارے خلاف' قرآن کے خلاف' ایک بڑی گہری سازش ہے۔ کیسے واضح الفاظ میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ: وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20)۔ تیرے نشوونما دینے والے کا عطا فرمودہ سامانِ رزق ان سب کے لیے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے۔ اُس کے راستے میں کسی کے لیے بند نہیں لگائے جاتے۔ اور اس کے بعد کہا: لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (17:22)۔ خدا کے ساتھ اور معبود نہ بنادو' اور الٰہ نہ بنادو' اس کے اور مالک نہ Create کرو' ایسا کرو گے تو پھر یہ وہ نظام ہوگا کہ جس میں تم ذلیل و خوار ہو کے بیٹھ

Marfat.com

جاؤ۔ یہ تھا اسلام۔ اب اس نظام کو کبھی ہم چین کی طرف اور کبھی روس کی طرف تلاش کرتے پھر رہے ہیں صاحب! کبھی دین کے حصے بخرے کیے جا رہے ہیں کہ اسلام ہمارا دین ہے' سوشلزم ہماری معیشت ہے' جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ یہ وعظ کہہ کے بتاتا ہے کہ اسلام وہ دین ہے جو آپ کو مسجد میں ملا' ٹھیک ہے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

شرک سے پاک معیشت ہی دین ہے

یہ دین وہ نہیں ہے کہ جس کے لیے ہمیں الگ سے کوئی اور نظام تلاش کرنا پڑے گا جس میں طے کیا جائے کہ پھر ہماری معیشت کیا ہے' ہماری سیاست کیا کچھ ہے' یہ تو مذہب ہوگیا۔ جو ملا نے کہہ دیا' وہ تو مذہب ہوگیا۔ جبکہ آپ کے ہاں توحید ہی تو اسلام کی بنیاد ہے یہ صرف اور صرف ایک الہ کو ماننا ہے۔ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا (17:22)۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنی طبعی زندگی میں اور تمدنی زندگی میں صرف ایک خدا کے اقتدار و قانون کو تسلیم کرو۔ اس کے ساتھ کسی اور کے اقتدار کو شامل نہ کرو۔ اگر اپنی طبعی زندگی اور تمدنی زندگی میں کسی اور کے قانون کو شامل کرلیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مصاف زندگی میں' دھتکارے ہوئے انسانوں کی طرح' ذلت و خواری کے ساتھ دوسروں سے پیچھے رہ جاؤ گے۔ الہ یہ ہے کہ هُوَ الَّذِىۡ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ (43:84)۔ جو الہ' جو صاحب اقتدار' تم اپنی خارجی کائنات میں مانتے ہو' اسے اپنی معیشت کی دنیا میں کیوں الہ نہیں مانتے۔ تو الہ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ جو ''چیزیں خالصتاً اس کی ملکیت ہیں اور اس نے عطیۂ نوع انسانی کو دی ہیں' ان پر ذاتی ملکیت کی حد بندی کردی جائے۔ یہ ہے الہ حقیقی کے ساتھ اور الہ تجویز کر لینا۔'' کہا: ایسا نہ کرنا۔ وَقَضٰى رَبُّكَ (17:23)۔ اب یہاں اگلی آیت آ گئی۔ کہا کہ ہمارا یہ حکم ہے' ہمارا یہ فیصلہ ہے۔ دیکھا! یہاں رب کا لفظ آ گیا ہے۔ سوال ملوکیت کا چلا آ رہا ہے۔ یہاں صفتِ ربوبیت آ گئی۔ یہاں کہا ہے کہ خدا کی ربوبیتِ عالمینی کا تقاضا یہ تھا۔ اس کے لیے ''قضیٰ'' کا لفظ آیا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ!

اسلام کے مقابلے میں اسلام

اس خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ: اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (17:23)۔ صرف اسی کے احکام کی اطاعت کرو اور اس کا حکم یہ ہے کہ یہ ''محظور نہیں ہونی چاہیے' اس پہ حد بندی نہیں لگ سکتی۔ یہ ہے عبادتِ خداوندی عزیزانِ من! مذہب کی دنیا میں کبھی آپ نے اس کو عبادت کے نام سے بھی سنا ہے۔ اس کی لکھی گئی تفسیروں میں عبادت کا ترجمہ ''پرستش'' کیا گیا' اور انگریزی میں Worship کر دیا گیا ہے۔ پرستش کے معنی نماز پڑھ لینا' پوجا پاٹ کر لینا ہوا۔ اس تصور کے مطابق یہ ہوا کہ پرستش تو خدا کی کرو اور یہ جو آپ کے معاشی' اقتصادی مسائل ہیں' ان کے لیے دوسرے گوشے تلاش کرو۔ جو خدا کی پرستش کرنے والے ہیں' وہ خدا کے ان عطیات کو جتنا جی چاہے اپنے تصرف میں لاتے چلے جائیں' ان پر ان عطیات کے تصرف میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ دیکھیں کہ یہ چیزیں تصور سے کس قدر

Marfat.com

الٹی ہوگئی ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ اس پہ حد بندی کرنا شرک ہے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ تمام ذاتی ملکیت ہیں' اس ملکیت پہ کسی قسم کی حد بندی کرنا خلافِ اسلام ہے۔ اس خدا کا حکم یہ ہے' اس کا فیصلہ یہ ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ "اس کے سوا کسی اور کی بات مت مانو"۔ یہ ہے وہ بات جو اس نے کہی ہوئی ہے۔ ربوبیت کا یہ تقاضا ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رزق کو' کچھ محنت کر کے حاصل کرنا ہوگا۔ اگلی بات یہ آ گئی کہ ٹھیک ہے جی! اس پہ تو حد بندی نہیں ہے' اسے کھلا چھوڑ دیا۔ پھر کیا جس کا جتنا جی چاہے وہ اس میں سے حاصل کر لے' اور وہ جو اس نے اس میں سے حاصل کر لیا وہ تو اس کا ہو گیا؟ کہا کہ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے کہا یہ تھا کہ ہم نے اس رزق کو لِلْاَنَامِ (55:10) پیدا کیا ہے۔ تمہاری ضروریات پوری کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس میں سے تم محنت کر کے اپنی ضرورت کے بقدر لے سکتے ہو۔ کھلا چھوڑنے کا مقصد بھی تو بتا دیا کہ آپ کسی کو محروم نہیں کر سکتے۔ آپ یہ نہیں کر سکتے کہ ضرورت سے زائد لے کر اس کو اپنی کوٹھیوں میں بند کر دو۔ یہ تو پھر محظور ہو گیا۔ یہ تو شرک ہے۔ یہ تو حد بندی ہو گئی۔ یہ تو زمین کے باہر بھی حد بندی ہو گئی۔ یہ تو یوں ہوا کہ اسے کھلا چھوڑ دیا اس کے بعد جتنا جی چاہے اس میں سے نکال نکال کے لاتے چلے گئے۔ یہ تو پھر وہ ذاتی ملکیت میں آ گیا۔ یہ تو "محظور" ہو گیا۔ یہ تو پھر یوں ہوا کہ اس کے راستے میں دوسروں کے لیے بند لگا دیئے گئے۔

قرآنی معاشرے میں کسی سٹیج پر بھی ذاتی ملکیت نہیں

حکمِ خداوندی تو یہ ہے کہ کسی سٹیج پہ بھی ذاتی ملکیت کا سوال نہیں ہے' یہاں تو ضرورت پوری کرنے کا سوال ہے۔ محنت سے حاصل کرو' اور محنت کے ماحصل کو ضرورت کے مطابق استعمال کرو۔ سوال پیدا ہوا کہ صاحب! پھر جو لوگ محنت کر سکنے کے قابل نہیں ہیں تو ان کی ضرورت کے مطابق' ان کی محنت کے ماحصل میں تو کمی آ گئی۔ ان وسائلِ رزق پر' خدا کی زمین پر' نہ بھی لکیریں کھینچیں تو بھی محنت نہ کرنے کے قابل لوگوں کی ضرورت کی یہ کمی کیسے پوری ہو؟ اب یہاں آیا اگلا قدم۔

ہر شخص کی ضروریات کس طرح پوری ہونگی؟

یہاں بات یہ ہو رہی تھی کہ محنت اور کاوش سے جو حاصل کیا جائے گا' اس سے تو محنت کرنے والا اپنی ضرورت کے مطابق لے لیگا اور جو محنت کرنے کے قابل نہیں ہوگا اس کی ضرورت پورے کرنے میں کمی آ جائے گی' حتیٰ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس قدر معذور ہو جائے کہ محنت کر ہی نہ سکے تو وہ اپنی ضروریات پوری کرنے سے محروم رہ جائے گا' تو اس طرح معذور ہو گئے یا کسی وجہ سے کام کرنے کے لیے مجبور ہو گئے' محروم ہو گئے یا ان کی کمانے کی استعداد (Earning Capacity) میں کمی رہ گئی تو ان کے لیے کیا کیا جائے؟ قرآنِ کریم نے اس کے لیے تقسیمِ رزق کا ایک نظام دیا ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ محنت کر سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ پیدا کرتا چلا جائے۔ تو اس طرح اس نے جو کچھ پیدا کر لیا' تو کیا اب وہ یہ کہے گا کہ چونکہ یہ محنت میری ہے اس لیے اس پہ میری ملکیت ہو گئی؟ قرآنِ کریم کہتا

Marfat.com

ہے کہ نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ جو محنت کرنے کے قابل نہ رہے یا زیادہ محنت نہ کر سکے تو اس کی ضرورت پوری کرنے میں کمی رہ جائے گی۔ کہا: اس کے لیے ایک نظام ہے اور اس نظام کی ابتداء کے لیے کہا کہ اس نظام کی ابتداء تم اپنے گھر سے کرتے ہو۔ اب بھی گھر سے اس کی ابتداء کرو' اور اس کی مثال دینی شروع کی: آپ دیکھیے کہ یہ بات جو ہے کہ جو کبھی محنت کر سکتا تھا' اب محنت کرنے کے قابل نہیں رہا یا وہ تھوڑی محنت کرنے کے قابل رہا ہے' کمزوری آ گئی' ضعف آ گیا' بڑھاپا آ گیا' اپنی محنت سے اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا' تو کیا اس کو فاقے مرنے دیا جائے؟ کہا: نہیں' یہ بات غلط ہے' نظام کی ابتداء اپنے گھر سے کرو۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17:23)۔ سب سے پہلی' سب سے قریب تر مثال ماں باپ کی مثال ہے۔ ایسی مثال ہے کہ اس کے لیے انکار ہی نہ کیا جا سکے۔ کہا جا رہا ہے کہ اپنے دن یاد رکھو کہ جب تم محنت کرنے کے قطعاً قابل ہی نہیں تھے تو یہ ماں باپ کیا کرتے تھے۔ محنت کر کے کماتے تھے تو کیا کمانے کے بعد یہ کہہ دیتے تھے کہ صاحب! جو محنت نہیں کرتا ہے' جو کماتا نہیں ہے اس کا اس میں کیا حق ہے؟ مگر ایسا نہیں تھا۔ یہ سب سے پہلے تمہاری پرورش کرتے تھے۔ خود کما کے لاتے تھے۔ جو کمانے کے قابل نہیں تھا اس کی پرورش کرتے تھے۔ یہ ہے اصول تمہارے ہاں۔ اسی اصول کے تابع تم زندہ رہے تھے۔ اسی کے تابع اتنے جوان ہوئے۔ اسی کے تابع محنت کرنے کے قابل ہوئے ہو۔ اس نظام کے صدقے میں تم بڑے ہوئے ہو۔ یہ طریق تمہارے سامنے ہے۔ تو اس اصول کو آگے بڑھاؤ۔ اگر آج وہ' جس نے اتنی محنت کی' اپنی ضرورت سے زائد ہی نہیں' اپنی ضرورت کو کاٹ کے' اس کی ضرورت پوری کی جو محنت کے قابل نہیں تھا یعنی بچہ' آج اگر مرورِ زمانہ سے' عمر کے تقاضے سے' معاملہ الجھ سا گیا ہے تو اب یہ بچہ محنت کے قابل ہو گیا اور اب وہ محنت کرنے کے قابل بنانے والا' خود محنت کے قابل نہیں رہا۔ بات تو وہی ہوئی: اُس وقت تو تم اس کی محنت کی کمائی میں اپنا حق سمجھتے تھے: ''ابا جی! یہ ہم کو دیدیجیے' ابا جی! مجھے یہ چاہیے' ابا جی! میری یہ کیفیت ہے۔'' پلہ پکڑ لیتے تھے مگر ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی تو دہائی مچا دیتے تھے۔ آج ان کی یہ کیفیت ہوگئی ہے۔ ان کی محنت' ان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی۔ اب تم اس کو پورا کرو۔ نظام یہ ہو گیا کہ جو ''محنت کرنے کے قابل ہے' زیادہ سے زیادہ محنت کر کے' زیادہ سے زیادہ کما کے' لائے۔ اپنی بھی ضرورت پوری کرے اور وہ جنکی ضرورت انکی محنت پوری نہیں کر رہی ہے' ان کی جو کمی آ گئی ہے' وہ اس کو پورا کر دے۔''

یہ نظام گھر سے شروع کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ تو ایسا ہی کرتے تھے۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17:23)۔ پہلے تو ہمارے ہاں ''احسان'' کا ترجمہ یہ آ گیا کہ ''احسان کا بدلہ احسان ہے''، یعنی ان پر احسان دھرو تو سوال یہ ہے کہ جب تم محنت کے قابل نہیں تھے اور یہ تمہاری ضرورت پوری کیا کرتے تھے تو کیا تم پہ یہ احسان ڈھایا کرتے تھے؟ اگر کبھی کوئی باپ اپنے سرکش بیٹے کو بھی یہ کہہ دیتا ہے کہ ''تم اتنے سے تھے۔ دیکھو میں نے کس طرح سے تمہاری پرورش کی۔ اپنا پیٹ کاٹا۔ تمہاری ضرورت کو پورا کیا۔'' وہ کہتا ہے کہ ''کیا تم نے مجھ پہ کوئی احسان کیا۔'' ہمارے ہاں تو روز مرہ کی یہ گفتگو ہے۔ یہاں لفظ احسان آ گیا۔ احسان کرو' احسان کرو اور پھر احسان کا بدلہ دو۔ تو

Marfat.com

احسان وہ ہے ہی نہیں جناب! دوسری آیت موجود ہے۔ هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ (55:60)۔ چل بھئی، قرآن کا ایک اور فقرہ آ گیا: ''احسان دھرو ان کے سر پہ۔ اب ہوا یہ کہ احسان کا بدلہ مانگو' ان کی پرورش کرو اور پھر بانٹ چھانٹ کے رکھو کہ بڈھے نے کتنا پیسہ جمع کر رکھا ہے تو اس سے کہو کہ ابا! یہ زندگی میں ہی میرے نام لکھ جاؤ۔ مرنے کے بعد تو یہ بٹ جائے گا۔ خدمت تو میں تمہاری کرتا ہوں' اب یہ پیسہ میرے نام لکھ جاؤ۔ احسان جو ہوا!

توازن کو بحال کرنا یعنی حسن کا بحال کرنا احسان کہلاتا ہے

دیکھا احسان کے غلط مفہوم اور ترجمے نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ تم پہ تو کوئی احسان نہیں ہو رہا تھا وہ تو تمہاری ضرورت ہی پوری ہو رہی تھی۔ احسان کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ''جو کسی میں کمی رہ جائے' وہ پوری کر دی جائے''۔ اس کے معنی ہیں: ''توازن برقرار رکھنا''۔ توازن اس وقت بگڑتا ہے' جب کوئی چیز کہیں زائد ہو جائے یا کہیں کم ہو جائے۔ کہا کہ ''اسے پورا کرو۔ تمہارے ماں باپ کی زندگی کا توازن بگڑ گیا ہے' ان کا حسن باقی نہیں رہا''۔ ہاں میرے بھائیو! محتاج باپ کا گھر میں حسن باقی نہیں رہتا۔ وہ بڈھا سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہو جاتا ہے۔ ''ڈیوڑھی اچ اوہدی منجی ڈھا دیندے ہیگے۔ ہر لنگدا' اوندا' جاندا' کہندا اے ہر ویلے کھنگدا رہندا اے''۔ ● اسکا حسن باقی نہیں رہتا' اس کے توازن میں کمی آ جاتی ہے۔ جب تک تمہارے توازن میں کمی رہی ہے' جب تک تم اس قابل نہیں ہوئے کہ خود اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو جاؤ' وہ تمہاری کمی کو دور کر کے' تم میں توازن پیدا کرنے میں لگا رہا۔ متوازن شخصیت کی تو پہلی مثال یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو جائے۔ پاؤں ذرا لڑکھڑا جائے تو گر سکتا ہے۔ ''کیا ہوا؟'' پاؤں اونچا نیچا ہو گیا۔ اونچا نیچا! توازن بگڑ گیا۔ جب تک وہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوتا' وہ تمہاری کمیوں کو پورا کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ملازم بھی کہیں ہو جاتا ہے' تنخواہ کم ہوتی ہے' دیانتدار آدمی ہے' بال بچے زیادہ ہیں' وہ گاؤں سے دانے' گیہوں' گڑ' جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بھیجتا چلا جاتا ہے۔ ''منڈے دی تنخواہ تھوڑی ہیگی اے تے شہر دا خرچ بہتا ہیگا اے۔ اے ایس طراں پورا کری جا ریا اے''۔ ● کوئی احسان نہیں جتا رہا۔ کمی پوری کر رہا ہے' حسن برقرار رکھ رہا ہے' توازن پورا کر رہا ہے۔ اور یہاں وہ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (17:23) ہے۔ احسان کا لفظ بتا رہا ہے کہ کمی پوری کرو۔ دیکھا! قرآن کس طرح سے نظام سمجھا رہا ہے۔ ہے کوئی جو اس سے انکار کر سکے کہ جب بچہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں تھا تو اس کی ضرورت تم پوری کرتے تھے' اپنا پیٹ کاٹ کے کرتے تھے؟ جب وہ محنت کے قابل نہیں رہا یا اس کی محنت اس کی اپنی ضرورت پوری نہیں کرتی تو اس کی کمی کو پورا کرتے چلے جاؤ۔ دیکھا ایک خوبصورت نظام کس طرح قائم ہوتا ہے!

● اس کی چارپائی باہر والے کمرے میں رکھ دیتے ہیں۔ ہر آنے جانے والا یہی کہتا ہے کہ ''یہ ہر وقت کھانستا رہتا ہے۔''

● ایک تو بچے کی تنخواہ کم ہے اور دوسرا یہ کہ شہر کا خرچ زیادہ ہے اور وہ اس طرح اسے پورا کیے جا رہا ہے۔

احسان نہ تو بطور بوجھ ہے نہ بطور خیرات بلکہ یہ تو حسن کی بحالی کا نام ہے

وسائلِ رزق پر حد بندی نہیں۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ ''زیادہ سے زیادہ محنت کر کے' زیادہ سے زیادہ کماؤ' اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد پھر جن کی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں' اس محنت سے ان کی کمی کو پورا کرو۔'' اجتماعی حیثیت سے یہ نظام اختیار کر دیا جائے اور کرنا ہی چاہیے۔ آگے بڑھ کے اجتماعی حیثیت سے اس کو ہی قرآن کا معاشی نظام کہتے ہیں۔ بات تو سیدھی سی ہے' آپ کے مارکس (Marx:1818-83) اور لینن (Lenin: 1870-1924) کے ہاں اور کون سے فلسفے ڈھونڈنے ہیں' وہ گھر سے بات شروع کرتا ہے۔ ❶ احسان کا خیال تک پیدا نہ ہو۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو کسی کو کچھ دینے کے بعد پھر احسان جتاتے ہیں' اذیت پہنچاتے ہیں' اپنا سارا کیا کرایا غارت کر دیتے ہیں۔ کہا: اس سے تو بہتر تھا کہ تم اس سے یونہی سلام کر کے کہ ''نہیں بھئی' بابا! مجھ میں توفیق نہیں'' چلے جاتے۔ یہ اس سے کہیں بہتر تھا۔ ایسا کرنے سے اُسے صرف طبعی بھوک کی تکلیف ہوتی۔ یہ جو تم نے اس کو جتا کے اذیت پہنچائی ہے' اس کے احترامِ آدمیت کے اوپر زد پہنچائی ہے' یہ اس اذیت سے کہیں زیادہ شدید اور تکلیف دہ ہے۔ نہیں دے سکتے' یا نہیں دینا چاہتے تھے' اس کو اذیت تو نہ پہنچاتے۔ آگے ابھی لفظ آ جاتے ہیں: ''اس نے تم سے خیرات تو نہیں مانگی' بھیک تو تم سے نہیں مانگ رہا۔ اپنا حق مانگ رہا ہے۔'' بچہ جب بھوک کے لیے چیختا ہے تو ماں سے اپنا حق مانگتا ہے۔

یہ قرآن کریم عظیم کتاب ہے' عظیم نظام دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ''وہ اپنا حق مانگتا ہے۔'' احسان کا مفہوم واضح ہو گیا۔ لیکن ہمارے ہاں تو احسان کہتے ہی وہاں ہیں جہاں کوئی بطورِ حق نہ مانگے' آپ اسے بطور خیرات کے دیں۔ جسے آپ خیرات کے طور پر دینے کا کہتے ہیں' یہ بدترین تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس سے دینے والے اور لینے والے دونوں کی تذلیل ہو جاتی ہے۔ تذلیل اس معنی میں کہ دینے والے کے دل کے اندر ایک فخر پیدا ہو جاتا ہے: ''یہ میرا محتاج ہے' میں نے اسے دے دیا ہے''۔ اس کے اندر ہر وقت ایک نفسیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور لینے والے میں تو بہر حال جو تذلیل پیدا ہوتی ہے ہمارے ہاں موجود ہے۔ اور اگر وہ بطورِ حق کچھ لیتا ہے' تو نہ دینے والے کے دل کے اندر کسی قسم کا جذبۂ تفاخر پیدا ہوتا ہے' نہ لینے والے کے دل میں کوئی کمپلیکس (Complex) پیدا ہوتا ہے۔ دونوں کا شرفِ انسانیت برقرار رہتا ہے' دونوں کا توازن قائم رہتا ہے۔ اب اگر بطور حق دیا جائے تو آیئے وہاں سے دیکھیں جہاں سے وہ بات شروع کی۔ اس نے کہا کہ احسان کے طور پہ جو ہمارے آپ کے ذہنوں کے اندر ہے وہ یوں ہوگا' کہ معذور باپ کو' بوڑھے ماں باپ کو یوں دیا جائے گا' اس کی مثالیں تو ہم روز دیکھتے ہیں۔ پھر جو جذبہ بطورِ خیرات دینے کا تھا وہ ابھرتا ہے۔ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا (17:23)۔

---

❶ اس تفصیل کے لیے دیکھیے ادارہ طلوع اسلام گلبرگ لاہور کی شائع کردہ کتاب: ''مطالب الفرقان فی دروس القرآن۔ سورہ النحل۔'' چوتھا باب' ص ص 79 تا 82

Marfat.com

احسان کے طور پہ دینے کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں: ''خیرات کے طور پہ ان کو کچھ دو گے''۔ ایسا کرنے سے وہ تمہاری نگاہوں میں ذلیل ہو جائیں گے۔ بڑھاپے میں یہ ہوتا ہے کہ وہ محنت کرنے کے قابل نہیں رہتا' اس کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں' اعصاب کی کمزوری کی بناء پہ وہ بچپن کی سی کچھ حرکتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

انسان کا بچپن اور ماں کی مامتا کا اظہار

عزیزانِ من! تم بھی بچپن میں' بچپن کی سی ہی حرکتیں کیا کرتے تھے: ''اماں کاں۔ہاں' کا کا کاں۔اماں ہاں کاں' ہاں بچہ کاں' ہاں بچہ کاں''۔ پچاس دفعہ وہ'' کاں'' کہے' پچاس دفعہ یہ ماں'' کاں'' ہی کہتی ہے صاحب! وہ اس کو جھڑکتی نہیں ہے' ڈانتی نہیں ہے: '' کی کاں کاں لائی ہوئی ہیگی اے''۔● اس کے برعکس وہ مسکراتی ہے' ہنستی ہے صاحب! جتنا زیادہ وہ توتلا پن سے بولتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ توتلی بنی چلی جاتی ہے: ''او میرا چاند' اج ماں کینا سکھیا ہیگا: خیر نال نیازاں ونڈ دی اے اس دن''۔● یہی بات اگر وہ بوڑھا باپ کر دیتا ہے تو تم اس کو ڈانٹ دیتے ہو: ''اوسن لیا اے ابا جی! کی ہر ویلے ایہہ کچھ کردے رہندے ہیگے او''۔● اِس زمانے میں ہر شخص ابا جی سے یہی کہتا ہے لیکن اُس زمانے میں یہ نہیں کہتا تھا' جب ابا جی اس کے لیے ابھی بینک کے مینیجر (Manager) تھے کہ جو ضرورت تھی ابا جی سے پوری کرنی ہوتی تھی۔ اب جب اس ابا جی کی یہ حالت ہوگئی ہے تو اس کی ہر حرکت تمہیں قابلِ نفرت نظر آتی ہے۔ اب تو اس سلسلے میں بات یوں نظر آ رہی ہے جیسے کہ کوئی کچھ وعظ کی سی بات کہتا ہے کہ'' ماں باپ کا احترام کیا کرو۔ ان کی عزت کیا کرو۔ ماں باپ کو یہ نہ کیا جائے''۔ یہ سب کچھ وہ وعظ کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی سب جگہ یہی ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ تمام امور و آداب قرآنی نظام کے بڑے اہم پرزے ہیں' بطور وعظ نہیں ہیں۔

یہ تمام باتیں بطور وعظ نہیں بلکہ یہ قرآنی نظام کے پرزے ہیں' پہلو ہیں

عزیزانِ من! قرآن یہ کچھ وعظ کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا۔ یہ نظام کے اندر ایک پرزہ (Cog) کی حیثیت سے کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ والدین وہ سب کچھ اپنے حق کے طور پر لیتے ہیں' تم سے خیرات کے طور پر نہیں مانگتے۔ اس طرح سے بھکاریوں کو' گداگروں کو ڈانٹا کرتے ہیں۔ جو حق کے طور پہ کچھ لینے کے لیے آتا ہو' اس کے ساتھ یہ کچھ نہیں کیا کرتے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کے الفاظ

● یہ کیا کائیں کائیں لگا رکھی ہے۔

● اے میرے لختِ جگر! آج تو نے'' ماں'' کہنا سیکھا ہے۔ اس دن وہ خیر و عافیت سے نذر و نیاز دیتی ہے۔

● اے ابا جی! یہ سن لیا ہم نے کیا ہر وقت یہ کچھ کہتے رہتے ہو۔

Marfat.com

میں اور جو کچھ ہو رہا ہے' اس میں کتنا فرق پیدا ہو گیا۔ "ایسا مت کہو تم بھی ایسا کیا کرتے تھے' یہ اگر اس وقت تمہیں اٹھا کے کوڑے کرکٹ پہ دے مارتے' تو کیا پھر تم آج یہ کچھ کرنے اور کہنے کے قابل ہو جاتے؟"

تَنۡهَرۡهُمَا (17:23)۔ عجیب لفظ ہے' جو قرآنِ کریم نے یہاں استعمال کیا ہے۔ کہا: اگر وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کبھی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو اس جذبے کے ماتحت کہ وہ تمہاری خدمت کے محتاج ہو گئے ہیں۔ ان کی کچھ ضرورتیں پوری کر دو' یہی ان کا جذبہ ہے۔ اگر وہ باپ الگ ہو' اپنا کھاتا پیتا ہو' سب کچھ اُس کے پاس ہو' پھر تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تم اس کو ڈانٹو' اس کو جھڑکو۔ آج تم یہ کچھ اس لیے کرتے ہو کہ تمہارا آستاں استادہ ❶ ہو گیا ہے۔ وہ تو ایسے وقت میں بھی تمہیں برداشت کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہاں بچہ ٹھیک ہی کہتا ہے "میں اج محتاج جو تہاڈا ہو گیا"۔ ❷ اگر محتاج نہ ہوتا تو یہ کچھ بالکل نہ ہوتا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ آج اس زمانے میں اس سے ایسا ہی پیار کرو جیسا وہ تمہیں پیار کیا کرتا تھا' اسے سختی سے جواب مت دو کہ اس کے شرفِ انسانیت کو ٹھیس لگ جائے گی کہ "ہاں بچہ میں آج اس حالت میں اس قابل ہو گیا ہوں۔ ٹھیک ہے بیٹا جو جی چاہے کہہ لو"۔

عزیزانِ من! بنیادی نقطہ یہ یاد رکھیے کہ قرآن کی تعلیم کا ماحصل' منتہٰی' یہ ہے کہ یہ سارا کچھ وہ نظام دیتا ہے۔ یہ ہے کہ "احترامِ آدمیت کو ٹھیس نہ لگے"۔ وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70)۔ ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم بنایا ہے۔ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے اس کے احترامِ آدمیت کو ٹھیس لگ جائے۔ بس یہ ہے جی آپ کے ہاں کی ساری قرآنی تعلیم کا منتہٰی! قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ہم تو ہر انسان کے متعلق یہی کچھ کہتے ہیں۔ اس لیے ہم تو تمہارے گھر سے ہی بات شروع کر دیتے ہیں کہ بالکل ان کو سختی سے مت ڈانٹا کرو۔ وَلَا تَنۡهَرۡهُمَا (17:23) ۔ یہ جو صبح کو گھر کا کوڑا کرکٹ' صاف کر کے جس جگہ پھینک دیتے ہیں اس کو "مُنۡهَرِ" کہتے ہیں۔ یہ والدین تو تمہارے گھر کی ایک حسین ترین شے تھی۔ کیا یہ اس قابل ہیں کہ انہیں کوڑا کرکٹ کے مقام پر جا کے ڈال دیا جائے؟ ایسے مت کہو' ایسے مت کرو۔ وَقُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا (17:23)۔ انہیں حقارت آمیز باتیں مت کہو۔ نہ ہی ان سے سختی اور درشتی سے کلام کرو۔ ان سے عزت اور ادب سے بات کرو اور کشادہ نگہی سے پیش آؤ۔ یہی تو ہے۔ وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70)۔ ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم بنایا۔ قرآنِ کریم "کریما" کا یہ لفظ وہیں سے لایا ہے۔ کہا: یہ تو انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم تھا چہ جائیکہ باپ ہونے کی حیثیت سے تو اور بھی واجب التکریم ہو گیا۔ اس نے تمہارے ساتھ "احسانات" کیے ہوئے ہیں' تمہاری پرورش کی ہے۔ تمہاری کمیوں کو دور کیا ہے۔ قُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا (17:23)۔ اس کا کرو ترجمہ کیا ہے؟ ۔ یہ ہے کہ وہ بات کرو جس سے اس کی تکریم انسانیت قائم رہے۔ "ایسے بات کرو کہ جس سے احترامِ شرفِ انسانیت پر حرف نہ آنے پائے۔" یہ ہے: قَوۡلًا كَرِيۡمًا (17:23)۔

---

❶ قائم ہونا۔ ❷ میں آج تمہارا محتاج جو ہو گیا ہوں۔

Marfat.com

این کتاب نیست چیزے دیگر است

کیا لفظی ترجمے کرتے ہیں؟ اس سے مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

پرورش کے سلسلہ میں رحمِ مادر کی کیفیت

اسی نکتے کے تسلسل میں آگے آیت ہے: وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ (17:24)۔ قرآن یہاں پھر رحمت کا لفظ لے آیا اور بات رحمِ مادر کی طرف اشارہ کر کے پوری کر دی۔ اس نے ماں باپ دونوں کی بات اس مقام سے شروع کر کے کہا کہ انہوں نے تمہاری پرورش اس مقام سے شروع کی تھی جب تم اس باہر کی ہوا میں سانس لینے کے قابل بھی نہیں تھے۔ پرورش پوری لوچ و لچک کے ساتھ تھی۔ رحمت کے معنی یہی ''پوری لوچ لچک'' کے ہوتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی یہ بتایا تھا کہ قرآن کا رحم اور اس پہ یہ رحمت کا لفظ لانا کتنا بڑا اعجاز و ایجاز ہے! رحمِ مادر کے اندر صرف پرورش ہی نہیں ہوتی۔ سوچیے' اگر وہ رحم (Womb) کہیں اندر سوکھے ہوئے چمڑے کی طرح ہوتا تو کیا غضب ہوتا۔ کہا کہ اس میں تو اتنی لچک اور اتنی لوچ ہے کہ وہ کروٹیں بدل رہا ہے' پانسے بدل رہا ہے' رخ بدل رہا ہے' اِدھر ہو رہا ہے' اُدھر ہو رہا ہے' اس قسم کا وہ فوم کا سا بستر تو باہر بھی کسی کو نصیب نہیں ہوتا اور وہ جنین (Fetus) اس میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔ یہ نہ کہیں پھٹتا ہے اور نہ کہیں اس میں شگاف پیدا ہوتا ہے۔ یہ عجیب قسم کا بنایا ہے۔ اس قسم کی پرورش کہ جس میں اس کی ہر حالت کے مطابق راحت' رحمت اور محبت سے پرورش ہو' اور اس کے ساتھ ہی جس میں وہ صاحبِ استراحت ہے اس کے اندر اس قسم کی لوچ اور لچک ہو۔ اس قسم کی پرورش کو رحمت کہتے ہیں۔ اس نے اس طرح تمہاری پرورش کی۔ اُس ماں نے سردیوں کی راتوں میں' جب تم بستر پہ دس دفعہ رات کو پیشاب کرتے تھے' وہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ ٹھنڈی جگہ پہ آپ خود سو جاتی تھی' تمہیں گرم جگہ پہ سلاتی تھی۔ یاد ہے تمہیں اس کی یہ رحمت' اور آج اگر اُن کی یہ کیفیت ہو گئی ہے' تو کیا ہوا۔ بطور ان کے حق کے (As of their right) انہیں Repay کرو۔

مرغی اور اس کے چوزوں کی مثال

عزیزانِ من! مرغی اور اس کے چوزے کی قرآنِ کریم کی یہ مثال کئی دفعہ آ گئی ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں کی پرورش ہی نہیں کرتی' اگر چیل کا سایہ بھی اوپر سے گذرتا ہے' اس کو خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اپنے پر پھیلا دیتی ہے کہ چیل جھپٹے تو مجھ پہ جھپٹے' ان کا کچھ نہ بگڑے۔ اس طرح ان کو حفاظت میں لے لیتی ہے۔ کہا: اپنے پر پھیلا دیتی ہے' اور اس میں بھی حفاظت کا پہلو ہے۔ جَنَاحَ الذُّلِّ (17:24)۔ اس میں بھی سختی کا پہلو نہیں' تکبر کا پہلو نہیں۔ حفاظت بھی ٹھوس قسم کی دی جا سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک سختی کی حفاظت ہوتی ہے۔ اس کے لیے سب سے محفوظ ترین جگہ جیل خانہ ہوتا ہے۔ باہر کا کوئی دشمن وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا۔ آپ اسے حفاظت کہتے ہیں' یہ بڑے بڑے غنڈے' جن کو باہر جان کا خطرہ ہوتا ہے ''اوتر لے لیندے ہیگے' درخواستاں دیندے نیں' سفارشاں پہنچادے نیں' کہ سانوں جیل

Marfat.com

پچوا دیں"● لیکن یہاں قرآن کہتا ہے کہ مرغی کے پروں کے نیچے حفاظت کا سامان ہے' بہترین حفاظت کا سامان ہے۔ یہ جَنَاحَ الذُّلِّ (17:24) ہے۔ کہا: جیسے مرغی اپنے پر پھیلا دیتی ہے اور اپنے بچوں کو حفاظت کا سامان عطا کر دیتی ہے۔ یہ کچھ کرو۔ مِنَ الرَّحْمَةِ (17:24)۔ یعنی ان کی حفاظت بھی کرو اور اس طرح سے ان کی پرورش بھی ساتھ کرو۔ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا (17:24)۔ خدا نے ان سے کہا تھا کہ تم ان کی پرورش کا سامان کرو۔ یہاں کہا گیا ہے کہ تم خدا سے یہ کہو کہ "ان کی پرورش کے لیے مجھے اس قسم کا ذریعہ بنا دے"۔ یہاں پھر والدین کی پرورش کے لیے رب سے یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ بڑی عجیب چیزیں قرآن میں آئیں گی۔ وہ انسانوں سے یہ چیز کہے گا کہ "تمہیں یہ کرنا ہے"۔ اب انہیں پتہ ہے کہ یہ سارے عطیات عطاءِ رب ہیں' اس کے دیئے ہوئے ہیں' یہ سارے فرمان اسی کے عطا فرمودہ ہیں' یہ اس وقت باہر کی تمام چیزیں بھی اور میری صلاحیتیں اور استعداد بھی اس کا عطا کردہ عطیہ ہیں۔ یہ کچھ اپنے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہے میں جب پچھلی سورۃ نحل● میں "نعمت" کے اوپر آیا تھا اور اس میں جب یہ آیت آئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یاد رکھو یہ چیز معاشی نظام کی بنیاد ہے۔

نفسیاتی تغیر کا بہترین علاج

عزیزانِ من! ایمان یہ ہونا چاہیے کہ "جس قدر بھی سامانِ نعمت ہے' وہ باہر کی دنیا کے وسائل رزق ہوں یا اس رزق کے پیدا کرنے کی صلاحیت ہو' یہ تمام مجھے خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوئے ہیں۔" ایمان یہ ہے کہ "اس میں میرا کچھ نہیں ہے یہ سب خدا کا دیا ہوا ہے۔" یہ جو کہا ہے کہ تمہارے اندر اس قسم کا جذبہ نہ پیدا ہو جائے کہ باپ کی پرورش کر رہا ہوں' یہ بوجھ میرے گلے پڑ گیا ہے۔ اس جذبے کے دور کرنے کے لیے نفسیاتی طور پہ یہ کہا گیا کہ یہ جو سارا کچھ تمہیں ملا ہوا ہے' اس کے متعلق تمہیں یاد ہے کہ سچا ایمان یہ ہے کہ یہ میرا نہیں ہے' یہ سارا تیرا عطا کردہ ہے۔ اس کی یاددہانی کے لیے تم سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اپنے اندر یہ چیز پیدا کرو۔ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا (17:24)۔ یا اللہ ذریعہ تو میں ہی بن رہا ہوں' حقیقت میں یہ سب کچھ کرنے والا تو تُو ہی ہے' جب یہ چیز اپنے اندر پیدا ہو جائے گی تو وہ تکبر' وہ جذبہ جو دوسرے کو گداگر سمجھ کے خیرات دینے کا ہے' نکل جائے گا۔ پھر بات سمجھ میں آئے گی کہ میں تو بیچ میں ہوں ہی نہیں۔ دیکھا آپ نے کہ ایک ہی آیت کے اندر وہ ان سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے حکم دیا ہے۔ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (17:24)۔ وہی خدا اس کو یہ سکھا رہا ہے کہ یہ توفیق مانگو۔ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا (17:24)۔ یہ توفیق مانگو۔ یہی ہے جو حقیقت میں انسان کے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کرتا ہے کہ یہاں والدین کی پرورش کا ذریعہ بننے میں بھی یہ بات کبھی تمہارے حیطۂ خیال میں نہ آ جائے کہ میں اپنی طرف

● وہ ترستے ہیں' منت سماجت کرتے ہیں' درخواستیں دیتے ہیں' سفارشیں لگواتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح "ہمیں جیل بھجوادو"۔

● دیکھیے ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ لاہور کی شائع کردہ کتاب: "مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل۔" آیت 16:53۔ ص ص۔ 115 تا 120۔

Marfat.com

سے یہ کچھ دے رہا ہوں' اپنی طرف سے تو میں ''دینے جوگا'' ہی نہیں ہوں۔ ❶ وہ جو مجھے حاصل ہے' وہ تیرے عطیات ہیں۔ تو نے یہ کہا ہے کہ ان میں سے ان کی ضرورت کے مطابق انہیں دیدو' وہ میں دے رہا ہوں' اس طرح یہ بھی تو تو ہی دے رہا ہے' بالکل اسی طرح سے بالواسطہ دے رہا ہے جیسے پوسٹ مین آپ کو منی آرڈر دے جاتا ہے۔ تمہارے اندر یہ جذبہ بیدار رہنا چاہیے کہ یہ پرورش یوں ہو رہی ہے اور پھر اب دیکھیے یہ کس طرح سے Rationally کیا کچھ Explain کر رہا ہے' یہ تو ہمارے ہاں ساری عقیدے کی بات تھی' لیکن قرآنِ کریم تو یہ سب کچھ Reason کی رو سے کہہ رہا ہے۔ كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (17:24)۔ انہوں نے میری پرورش اس زمانے میں کی تھی جب میں پرورش کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے اب میرا فریضہ ہے کہ میں ان کی پرورش کروں جب یہ پرورش کے قابل نہیں ہیں۔ اب خالص عقیدے سے بڑھ کر یہ بات صغیراً کے اوپر آ گئی۔ کیوں کروں؟ یہاں کیوں کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہ کیوں والی بات اس طرح سے نہیں ہے کہ تو نے حکم دیا ہے: میں کر رہا ہوں۔ یہ خدا کے حکم کی پابندیاں جو ہمارے ہاں کرتے ہیں' وہ تو اسی طرح سے کرتے ہیں جیسے ایک بیگار میں پکڑے ہوئے جا رہے ہوں۔ ان کے ہاں یہ حکم ایسا ہی ہوتا ہے جیسے پولیس کے تھانیدار کا حکم ہوتا ہے کہ صبح روز آ کے حاضری لگوایا کرو۔ ہے تو وہ ایک شاعرانہ سا خیال ہی' جیسا کہ بیان سے ظاہر ہے' لیکن وہ بات بڑی عمدہ ہے' وہ جو اس طرح اس کو بیگار سمجھ کے کی جائے تو کہا:

مر رہے ہیں نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

یہاں تو والدین کے سلسلہ میں نجات کے غم میں مرنے والی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن عموماً سمجھا یہی جا رہا ہے کہ ہم نے تمہیں حکم دیدیا۔ عزیزانِ من! آپ بغور مطالعہ کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ساری چیزیں Reason پر آئی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ تمہاری اس طرح سے پرورش ہوئی۔ انہوں نے یہ سب کچھ کیا تو تم پہ احسان نہیں جتایا۔ کوئی بھی سختی سے نہیں بولے۔ انہیں جھاڑا نہیں' ڈانٹا نہیں' کچھ ایسا ضرر رساں کام نہیں کیا۔ ان کی حفاظت بھی کی۔ پرورش کا سامان بھی بہم پہنچایا۔ كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (17:24)۔ یاد کرو اس چیز کو کہ یہ ''جو دعائیں ہیں یہ یاد دہانیاں ہوتی ہیں۔'' یاد کرو اس چیز کو کہ انہوں نے یہ کچھ بلا مزد و معاوضہ کیا تھا اور اگلی بات یہ کہ تم جو اُن کے لیے کر رہے تھے' اس کے لیے یہ بھی یاد رکھو کہ وہ نہیں کر رہے تھے یہ سارا کچھ تیرا ہی دیا ہوا ہے۔ عَطَآءِ رَبِّکَ (17:20)۔ تیرا فیصلہ یہ ہے کہ اسے دیدو کیونکہ تیرے نشو و نما دینے والے کا عطا فرمودہ سامانِ رزق ان سب کے لیے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن جو ہر چیز Reason کے اوپر بتاتا ہے۔ کیوں کا جواب دینا چاہتا ہے۔ کہا کہ یہ تاکید کیوں کی گئی ہے؟ یہاں اس کی

---

❶ دینے کے لائق ہی نہیں ہوں۔

Marfat.com

ضرورت کیوں پیش آئی؟ بات تو ایک معاش کے عمل سے چلی آ رہی تھی۔ ٹھیک ہے ماں باپ کی کمی پوری کیا کرو' ان کی ضرورت پوری کیا کرو۔ انہیں سختی سے نہ ڈانٹا کرو۔ ان کا خیال رکھا کرو کہ انہوں نے بچپن میں تمہاری کس طرح پرورش کی۔ اس کا بھی دھیان رکھو کہ یہ جو کچھ تم دے رہو یہ کچھ تمہارا نہیں ہے' یہ خدا کی طرف سے ملا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قرآنِ کریم نے اسے نفسیاتی تبدیلی کہا ہے۔

خدا بھی کسی سے حکم کے ذریعے بات نہیں منواتا

کہا: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ (17:25)۔ تمہاری نفسیات کو ہم جانتے ہیں کہ اگر تم نے خیرات کے طور پہ دینا شروع کر دیا تو اس میں کیا کیا خیال گذریں گے۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ (17:25)۔ یہ خیالات تو نفسِ انسانی میں بیدار ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ حکم کے ذریعے سے کسی سے کوئی بات منوالینا خدا کا انداز نہیں ہے' تمہارے اندر ایسی تبدیلی پیدا ہو جائے کہ اس حکم کی تعمیل کرنا خود تمہارے اندر کا تقاضا ہو جائے۔ عربی زبان کا لفظ ''اطاعت'' تو خود اپنے اندر یہ معنی رکھتا ہے۔ اطاعت اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ ''جب کھجور یا پھل اتنا پک جائے اور پھر پکنے کے بعد از خود وہ ٹہنی کو چھوڑ دے' جھاڑ جھنکو سے اس کو نہ اتارا جائے' بلکہ وہ خود شاخ کو چھوڑ دے''۔ اسے اطاعت کہتے ہیں صاحب! خود اس کی اپنی زیست کا تقاضا یہ ہو جائے کہ اب مجھے یہ کرنا ہے۔ اسے نفسیاتی تبدیلی کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ سارا کچھ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ صرف مکینکل معاشی نظام نہیں ہے جو ہم تمہیں کہہ رہے ہیں۔ اس میں نفسیات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ (17:25)۔ معذور باپ کے لیے سامانِ آسائش تم نے مہیا کر دیا ہے۔ ان کا خیال بھی رکھا ہے۔ انہیں وقت پر کھانا بھی دیتے ہو۔ سارا کچھ کر رہے ہو تا کہ باہر کی دنیا دیکھے کہ یہ جی! ماں باپ کا بڑا خدمت گذار ہے اور اندر یہ چیز ہے کہ بڈھا مرتا بھی نہیں ہے۔ کہا کہ یہ مکینکل معاشی نظام نہیں ہے۔ اس میں تمہارے اندر سے (From Within) ان کی حفاظت کے جذبات ابھرتے ہیں' دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں۔ اس نظام کے قیام کے لیے نفسیاتی تبدیلی (Psychological Change) کی ضرورت ہے۔

قرآن کا اصل مقصد تو نفس کی تربیت ہے

خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر دل میں نمود و نمائش کا یہ خیال پیدا ہو جائے تو اس سے وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ مقصد صرف ان کی پرورش ہی نہیں تھا' ہمارا مقصد تو تمہارے اندر کے نفس کی تربیت بھی تھا' Development بھی تھا۔ اس لیے ساتھ کے ساتھ ہم یہ کہتے چلے گئے۔ اس سے دونوں مقصد حاصل ہو رہے ہیں۔ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا (17:25)۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری صلاحیتوں (Potentialities) میں وہ تبدیلی آ جائے جو ہم کہہ رہے ہیں۔

صلاحیتیں تو اس نے سب کو دی ہوئی ہیں۔ خدا تعالیٰ اس میں نفسیاتی تغیر چاہتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ''صالحین'' کے معنی کیا ہو جاتے ہیں؟ عملِ صالحہ کی کیا صورت ہو جاتی ہے؟ وہ صورت یہ ہے کہ نفسیاتی تغیر سے تمہاری یہ کیفیت پیدا ہو جائے اور یہاں لفظ اَوَّابِیۡنَ نے تو اس کو واضح کر دیا کہ ہر صلاحیت کے استعمال کے لیے تم خدا کی طرف رجوع کرو کہ اس کے لیے خدا کی کیا ہدایت ہے۔ بار بار اس کی طرف رجوع کرو' بار بار پوچھو کہ 'فرمایئے' کیا کیا جائے' اب آپ کی ڈائریکشن (Directions) کیا ہیں۔ جتنا کوئی مریض زیادہ Seriously بیمار ہوتا ہے' اتنا ہی زیادہ معالج کیطرف رجوع کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! آج کھانسی آئی ہے کیا کیا جائے' ذرا سی حرارت آ گئی ہے کیا کیا جائے۔ کہا: زندگی کے ہر شعبے میں' ہر قدم پہ' اس کی طرف رجوع کرو۔ خدا کی طرف رجوع کرنے کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ ہیں کہ دس ہزار مرتبہ صبح سے شام تک قرآن کی یہ آیت۔ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ (45:15) پڑھتے چلے جاؤ؟ کہیں آپ کو جواب ملتا ہے؟ لہٰذا اس کی طرف رجوع کرنے کے معنی یہی ہیں کہ اس کی اس کتاب قرآنِ کریم کی طرف رجوع کرو۔ یہ بتاتی چلی جائے گی کہ اب یہ کرو' اب وہ کرو۔ یہ نفسیاتی تبدیلی پیدا کی جائے گی۔ لِلۡاَوَّابِيۡنَ غَفُوۡرًا (17:25)۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ہر اس شخص کو خدا کی طرف سے سامانِ حفاظت مل جاتا ہے جو اپنی ذات کی حفاظت اور نشوونما کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ جو نفسیاتی خطرات تھے۔ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡ نُفُوۡسِكُمۡ (17:25)۔ تمہارا نشوونما دینے والا خوب جانتا ہے کہ تمہارے دل میں کیا ہوتا ہے' اس سے اسی صورت میں تم بچ سکو گے۔

یہ فریضہ ابھی ختم نہیں ہوا

لہٰذا اس پروگرام پہ عملدرآمد کیلیے' راہنمائی کیلیے' ہماری اس کتاب قرآن پاک کی طرف رجوع کرو۔ بہت اچھا' والدین کے لیے یہ چیز ہو گئی۔ لیکن وہ تو گھر کا صرف ایک جز تھے تو کیا ہمارا فریضہ ختم ہو گیا؟ کہا: ابھی تو فریضہ کا پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اس فریضہ کے میدان کی حدیں حدود فراموش ہیں۔ اس کے لیے تو ہم نے یہ کہا ہے کہ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:67) تمہارے دائرہ کار کے اندر جتنے ذی حیات واقع ہوئے ہیں' ان سبکی پرورش کے متعلق یہ پروگرام ہے۔ بات کی ابتداء تو ابھی گھر سے شروع کی ہے۔ وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى (17:26)۔ اپنے گردونواح پہ نگاہ ڈالو۔ معنی تو اس ذاالقربیٰ کے رشتہ دار کیے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ جتنا کچھ تمہارے قریبی ہوتا ہے اس میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ اپنے قرب و جوار میں پھر نگاہ ڈالو' یہاں سوال رشتہ داری کا نہیں ہے۔ یہ تو تمہاری تمدنی زندگی کا مسئلہ ہے کہ جسے ہم سوشل انداز کہتے ہیں۔ باقی رہے رشتہ دار تو وہ بھی اپنی جگہ ہیں۔ قرآن کے نزدیک تو یہ بات نہیں ہے اس میں تو ہر انسان کی پرورش کا ذمہ لے رکھا ہے' بات ماں باپ سے اس لیے شروع کی ہے کہ قریب ترین وہی واقع ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب آگے چلو' ٹھیک ہے' یہاں تک جو تم نے کر لیا' دل میں بھی ان کے خلاف کوئی خیال نہیں پیدا کیا۔ اب اس دائرۂ پرورش و حفاظت کو آگے بڑھاؤ۔

Marfat.com

ذا القربیٰ کا حق ہے نہ کہ خیرات

چلیے! سب سے پہلے تو اپنے مکان کے دائیں اور بائیں کی دیواروں کو ایسا بنا دیجیے کہ یہ گرائی بھی جا سکیں، اٹھائی بھی جا سکیں۔ ان کو ذرا گرا دیجیے تا کہ آپ کا مکان اور کشادہ ہو جائے، اِدھر کا پڑوسی اُدھر کا پڑوسی بھی اس کے اندر آ جائیں گے۔ اب وہ ذَا الْقُرْبٰی ہو گئے۔ ذا القربیٰ کی طرف آ گئے۔ دیکھیے ماں باپ کے متعلق قرآن کا اعجاز! یہ بات کہی کہ اس سلسلے میں ان کے لیے یہ کچھ کرو، وہ کچھ کرو۔ وہاں تو یہ تھا۔ اب یہ اگر Reason پہ پوچھتے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ یہ کچھ کیا تھا، ان کو تو دیدیا۔ ٹھیک ہے! جی انہوں نے یہ کیا تھا تو انہیں بطور حق دیدیا۔ اب یہ جو قرب و جوار میں رہنے والے ہیں انہوں نے تو تمہارے لیے ماں باپ کی طرح یہ کچھ نہیں کیا، تو ان کو جو دیا جائے گا تو اس سے ذہن میں بہر حال یہی جذبہ پیدا ہوگا کہ یہ خیرات کا کام ہے۔ سوچیے اور فیصلہ کیجیے۔ آپ اس کے علاوہ کسی اور نتیجہ پہ پہنچ ہی نہیں سکتے۔ کوئی بھی اس پیدا ہونے والے جذبہ کے متعلق کچھ پوچھے یا آپ کسی سے اس ہمدردی کی وجہ دریافت کریں تو کہے گا کہ صاحب! دیکھیے تمہارے پڑوس میں یہ بیمار ہے، یہ مریض ہے، بھئی! اس کو کچھ تو دو۔ غریب ہے بھئی۔ ''اس کو کیوں دیں؟'' کہنے لگے: دیکھیے، غریب آدمی کے لیے یہ کچھ کرنا اخلاق کا تقاضا ہے، ہمدردی کا تقاضا ہے۔ آپ کا وہ جذبہ، ہمدردی اسے خیرات دینے کی اپیل کر رہا ہے تو بات تو پھر وہیں آ گئی، وہ تو کسی سے بھی آپ یہ سلوک کریں گے شرفِ انسانیت کے خلاف چلا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں اس نے کس لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی (17:26)۔ اس کا تم پہ یہ اضافی حق ہے۔ یہ کچھ کرنا تمہارا فریضہ تھا۔ یہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو تو ہمارا حکم یہ تھا کہ اس کی پرورش و حفاظت کرو۔ یہ تمہارا فریضہ تھا۔ ہم نے اسے کہہ دیا تھا کہ تمہارے حصے کا جو رزق ہے وہ ہم نے اسے دے رکھا ہے، اس سے لے لو۔ تو جو تم اس کو دے رہے ہو وہ خیرات تو نہیں، یہ تو اس کا حق ہے جو تم اسے دے رہے ہو۔ یہاں حقہ کہہ کے کتنی بڑی نفسیاتی تبدیلی پیدا کر دی، یعنی یہاں آپ Intellectual Reason کے اعتبار سے دیکھیے، تو بات نہیں بن رہی تھی، وہ جذبہ خیرات کا آ جاتا، اس کے اندر کمپلیکس (Complex) پیدا ہو جاتا کہ اس نے میرے لیے کیا کیا ہے۔ لہٰذا سوال یہ نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ زائد از ضرورت جو ہے اس پہ تمہارا حق نہیں ہے۔ یہ اس کا حق ہے جس کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی۔ کئی مقامات پہ قرآن نے اس کو حق کہا ہے۔ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25)۔ مومن کی Definition یہ ہے کہ وہ جس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اسے اپنے زائد از ضرورت سے دے کر اسکی اس ضرورت کو پورا کرے۔ ''مصلین'' کی بھی یہی Definition ہے۔ یہ جنہیں آپ نمازی کہتے ہیں، وہ مصلین ہیں: وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19)۔ یہاں وہ دونوں لفظ آ گئے۔ ''سائل'' تو وہ ہے جو اتنی محنت کرنے کے کچھ قابل ہے لیکن اس محنت سے اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ ''سائل'' کا مادہ (Root) ''س ا ل'' ہے۔ اسی سے عربی لفظ ''سؤال'' ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ''سوال'' اور ''محروم'' میں فرق کیا ہے؟

سوال کے لفظ میں اور محروم کے لفظ میں فرق

''سوال'' کے معنی ''احتیاج'' ہوتے ہیں۔ محروم وہ ہوتا ہے کہ جس میں اس قسم کی سکت ہی نہیں' وہ ایسا مجبور اور معذور ہو جائے کہ کچھ کر نہ سکے۔ مصلین وہ ہیں کہ جن کے اموال میں سائل اور محروم دونوں کا حق ہے۔ وہ حق مانگنے کے لیے آیا ہے۔ تم نے اب دینے کے لیے کہیں لکھت پڑھت نہیں کرائی' یہ کوئی قرضہ تھا ہی نہیں کہ اس سے دستاویز لکھوالیتا۔ یہ تو اس کا حق ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ (70:24) کہا ہے۔ یہ خفیہ رکھی ہوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو منی آرڈر کے اوپر لکھا ہوا ہے: One Hundred Rupees یہ ہے قرآنی مفہوم حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (70:24-25) کا۔ ان مصلین کا مال صرف ان کے انفرادی مفاد کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ان لوگوں کا حق ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں یا جو کمانے کے قابل نہیں رہے اور اس طرح اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ گئے۔ اور وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ (17:26) اور ان کا بھی حق ہے جو تمہارے قرب و جوار میں رہنے والے ہیں۔

ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے عقیدہ کی حقیقت

قرآنِ کریم نے ایک جگہ بات بڑی لطیف کہی ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ عام مروج عقیدہ ہے کہ حقوق دو قسم کے ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ اللہ کے حق بھی ادا کرو' بندوں کے حق بھی ادا کرو۔ اس عام مروج عقیدہ کے مطابق بندوں کے حق تو یہی خیرات ہو جاتی ہے۔ اللہ کے حق یہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور وہ احکام جو اس نے دیئے ہیں' انہیں حقوق اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں کہیں حقوق اللہ کا لفظ نہیں آیا۔ سارے قرآن میں صرف ایک جگہ ''حَقَّهٗ'' (6:142) آیا ہے۔ دیکھیے! یہ لفظ کہاں آیا ہے! کہا: جب ہماری زمین پہ تم نے محنت کی' ہم مالک تھے اور آج کی اصطلاح میں تم مزارع تھے۔ وہاں یہ بات آئی ہے کہ تم نے اس میں محنت کی' کاشت کی' کھیتی اگی' فصل کاٹی' آ گئے یہ دانے' تو جب مالک آ گیا تو اس نے کہا کہ بٹائی کیجیے صاحب! بات ٹھیک ہے اس میں حیل وحجیں ہونے کی تو بات نہیں ہے۔ وہ زمین کا مالک آتا ہے: ''ہم مالک ہیں زمین ہماری تھی' محنت تمہاری تھی''۔ بہت اچھا جی! ''ٹوپے[1] ماپ کے دیئے۔ ہمارا حق ہے جی! ''حَقَّهٗ'' کا لفظ وہاں آیا ہے۔ کہا ہے: حقِ مالکانہ یہ ہوا۔ پوچھا کہ ''صاحب! یہ کس کو دینے ہیں' وہ مالک آپ تو لینے کے لیے آتا ہی نہیں ہے۔ حکم نامہ آپ کا آیا ہے جی کہ فصل جو بٹائی پہ لے رکھی تھی' اس فصل میں سے ہمارا حق ہمیں دیدو۔ کس کو دیدو؟'' کہا: وہ ''جو بھوکا بیٹھا ہوا ہے' اسے جا کے دیدو (41:10)۔ انہیں دیدو جی' جا کے''۔ ایک ہی جگہ 'اللہ کا حق' یہ بیان ہوا ہے۔ یہ ہے حق۔ اس حقوق اللہ کے ادا کرنے میں تو کوئی زیادہ فرق ہی نہیں آتا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تو وہ حق ہے۔ عام طور پر تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ ''یا اللہ! میرا یہ کام ہو جائے تو میں اتنے کی نیاز دوں' میں اتنے کی نیاز دوں''۔ یہ جو تاجر پیشہ ہیں وہ کہا کرتے ہیں کہ یا اللہ! میرا یہ کام ہو جائے ''میں سو نفل تیرے لئی پڑھاں' پیسہ اک ناں خرچاں''۔[2] یہاں ہمارے ہاں حقوق اللہ اس طرح سے ادا ہوتے ہیں۔

---

[1] اناج ناپنے کا ایک پیمانہ (Measure) ''ٹوپا'' کہلاتا ہے۔ [2] میں تیرے لیے سو نفل ادا کروں۔ مگر ایک کھوٹا سکہ بھی ادا نہ کروں۔

Marfat.com

پورے قرآن میں صرف اسی ایک جگہ اللہ کے لیے حق کا لفظ آیا ہے

میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! سارے قرآن میں یہاں صرف ایک جگہ یہ لفظ اللہ کے لیے آیا ہے۔ وہ وہاں اس کے مالکان کا' فصل کاٹنے کے وقت آیا ہے۔ اور پھر کہا ہے: لِلْمُقْوِينَ (56:73)۔ کہ یہ بھوکوں کے لیے ہے۔ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ (17:26)۔ اور آگے بڑھ جاؤ یہ تو قرب وجوار میں بسنے والے تھے اور آگے بڑھو۔ اب دیکھو کون ہے کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے' جو حرکت کے قابل نہیں رہا۔ کیا لفظ ہیں صاحب! جو متحرک سے ساکن ہوگیا۔ کسی اعتبار سے بھی کسی کی حرکت رک جائے وہ مسکین ہو جاتا ہے' ''اوہدا گڈا کھڈا چ پھس گیا ہیگا' ہر راہ چلن والا جیہڑا تندرست ہے اوہدے تے غریب کوئی شہ دیندا اے کہ جاکے دئیں یار موہڈا اینوں تھوڑا جیا کڈ تے گڈا ایدا''❶۔ مسکین کو متحرک بنادے' یہ پھر اپنی محنت آپ کرلے گا۔ کسی طرح سے اس کی گاڑی رک گئی ہے' ٹھیک ہے جی وہ تو اپنے تھے یہاں کے رہنے والے تھے' یہ ماں باپ تھے' ذاالقربیٰ تھے' یہ ذرا دور کا ہی صحیح' مسکین تھا' ٹھیک ہے۔ بات صرف یہاں تک ہی نہیں ہے۔ اسے آگے بھی جاتا ہے۔

یہاں تو سوال پوری کی پوری انسانیت کا ہے

یہ صرف یہی بات نہیں کہ یہ تمہارے ہاں کے رہنے والے ہیں ان کی بھنور میں پھنسی ہوئی گاڑی کو نکالنا ہے۔ یہاں تو انسانیت ہمارے سامنے ہے۔ یہاں کا رہنے والا ہو یا نہ رہنے والا ہو' وہ انسان تو ہے۔ کہا: ابْنَ السَّبِيلِ (17:26)۔ راہ چلتا مسافر بھی چلا جا رہا ہو اور اس پہ بھی کہیں یہ کیفیت طاری ہوگئی ہو تو تمہارے اوپر اس کا بھی حق ہے تو وہ بھی ادا کرو۔ یہاں نیشنل National اور غیر نیشنل (Non-national) کی بھی تمیز اٹھالی۔ قرآن کا مخاطب ہی انسان ہے۔ یہ حقوقِ انسانیت ہے' لیکن یہ سب کچھ کرتے وقت ایک بات کا خیال رکھو۔ وہ جو کہا کرتے ہیں کہ صاحب! اپنی ضرورت کے مطابق لو' اس سے زائد جو ہے وہ دوسروں کو دو' تو چونکہ ہمارا تصور' ہمارا دماغ' ہمارا ذہن' ہماری نگاہ' موجودہ نظام سرمایہ داری کے اندر رہتے ہوئے ہی کام کرتی ہے۔ اسی کا پیدا کردہ ایک خیال ذہن کے اندر ابھرتا ہے کہ صاحب! ایک شخص اگر اپنی ضرورتوں کو بڑھاتا چلا جائے' ضرورتیں تو ختم نہیں ہوسکتیں' اچھا بھلا مکان ہے' چار کمرے کا گذارہ ہو رہا ہے۔ کہتا ہے: کہیں تیرہ کنال کے اندر کوٹھی ہونی چاہیے' ٹھیک ہے جی' میری ضرورت ہے صاحب! اس کے بغیر میرا کام نہیں چلتا' چار قسم کے کھانے ہونے چاہئیں' یہاں پردے ہونے چاہئیں' یہاں یہ ہونا چاہیے' بڑھاتے چلے جایئے' اس کے جواب کے لیے اس قرآنِ پاک میں اگلے دو لفظ ہیں' جو صحیح جواب فراہم کرتے ہیں۔

---

❶ اس کی گاڑی کھڈے (Ditch) میں گر کر پھنس گئی ہے۔ ہر تندرست راہ چلنے والا اس غریب کو سہارا دیتا ہے کہ ''ارے یار! کندھا دینا ذرا اسے تاکہ اس کی گاڑی نکل جائے''۔

Marfat.com

بیج کے لیے رکھے ہوئے دانوں کی قیمت

عزیزانِ من! کسان کے ہاں جب اناج کے دانے آتے ہیں تو اس میں سے کچھ تو وہ ہوتا ہے جو اس کے کھانے کے لیے' اس کے بچوں کے کھانے کے لیے' اس کے سال بھر کی ضروریات کے لیے' ہوتا ہے۔ اس سے کچھ زائد بڑھ جاتا ہے' یہ جو بڑھ جاتا ہے بظاہر یہ اس کو یہاں زائد از ضرورت نظر آتا ہے' یہ اس سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہ بیج کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ اگر کوئی کسان ایسا ہے جو اپنے روزمرہ کی ضرورتوں کو اتنا بڑھا لیتا ہے کہ وہ جو اس نے اس کام کے لیے رکھا ہے' جو اس نے سال بھر کے کھانے کے لیے رکھا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ جو بیج کے لیے رکھا ہے' وہ اس تمام کو بھی پسوا کے اپنی روزمرہ کی روٹیاں پکوانے میں' پراٹھے پکانے میں' خرچ کر لیتا ہے۔ ایسے کسان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ جس دن اس نے یہ غلہ اپنی ضرورت کا اندازہ لگانے کے بعد رکھا تھا یہ اس کام کے لیے تھا۔ یہاں لفظ ہے۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (17:26)۔ ''بذر'' کہتے ہیں ''وہ دانے جو بیج کے لیے رکھے ہوئے ہوں''۔ کہا: ان دانوں کو بچا کر رکھنے کی ضرورت ہے' کہیں ایسے نہ کر لینا کہ وہ دانے جو بونے (Sowing) کی ضرورت کے لیے رکھے ہوئے ہیں' انہیں بھی پسوا کے کھا جاؤ۔ یہ جو ''بونے'' کے لیے رکھا ہوا ہے' جتنا یہ دوسروں کی بونے (Sowing) کی ضرورت کے لیے دیتے چلے جاؤ گے ایک ایک دانہ سات سات سو دانے پیدا کرے گا۔ عزیزانِ من! آپ فزیکلی (Physically) جسے کاؤنٹ (Count) کرنا کہتے ہیں وہ اس کے لیے کر کے دیکھیے کہ حساب کہاں بیٹھتا ہے۔

فلاحی ریاست (Welfare State) کی کامیابی کی کیفیت

ایسا معاشرہ کہ جس میں روٹی کی طرف سے ہر فرد مطمئن ہو جائے اور اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں' اس معاشرے میں تم دیکھو گے کہ اجتماعی دولت' National Wealth' کس تیز رفتاری سے بڑھتی ہے۔ یہ جو انہوں نے ویلتھ سٹیٹ (Wealth State) بنائی ہیں' کہیں ان کی رپورٹیں پڑھ کے دیکھ لیجیے صورت حال معلوم ہو جائے گی۔ وہاں کیفیت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ انہوں نے جہاں سے شروع کیا تھا' جتنی دولت سے شروع کیا تھا' یا یوں کہیے کہ انہوں نے جتنی سٹیٹ انکم (State Income) یا نیشنل انکم (National Income)' جسے ویلتھ کہتے ہیں' یہ اُسے فلاحی مملکت (Welfare State) کہتے ہیں۔ جہاں یہ کامیاب ہوئی ہیں' اُن میں سویڈن' ناروے سرفہرست ہیں' ان دو ممالک میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی ہیں۔ جہاں سے انہوں نے شروع کیا تھا وہ اس سے چند سالوں کے عرصے میں ہزاروں سینکڑوں نہیں' ہزاروں گنا بڑھ گئی ہے۔ وہاں دولت کا اتنا سیلاب آ گیا ہے کہ وہ انہیں رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی' اور یہ جو کیفیت ہے کہ ٹھیک ہے مجھے ضرورت ہے' سائیکل کے اوپر میرا کام نہیں چلتا' موٹر کی ضرورت ہے' ایک کی ضرورت نہیں' دو کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ ضرورتیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی ضرورتوں کی صورت یہ ہے کہ وہاں جنت کا سا نقشہ ہونا چاہیے: قالین بھی ہیں' صوفے بھی' پردے بھی ہیں' حریر و اطلس بھی ہیں' باغات بھی ہیں' نہریں بھی ہیں' پھل

بھی ہیں، نخل کھجور بھی ہے، لیکن یہ تمام کچھ ہر ایک لیے ہے۔

جنت میں سب کچھ ہوتا ہے مگر طبقات نہیں ہوتے

اس اعتبار سے جنت میں طبقاتی تقسیم سرے سے ہے ہی نہیں کہ ان کو تو فلیٹ یا جھونپڑے ہی کافی ہیں۔ گھر ان کیلیے چودہ چودہ کنال کی کوٹھیاں چاہیئیں۔ یہ بھی ان کی ضرورت اور وہ بھی ان کی ضرورت۔ وہاں یہ بھی نہیں ہے کہ "پھٹی ہوئی گدڑی کے اندر درویشانہ زندگی بسر کرو، تیسرے تیسرے دن سوکھے ہوئے چار ٹکڑے کھاؤ"۔ قرآن کہتا ہے ٹھیک ہے، اگر آغازِ کار کرنا ہے، اگر تم نے معاشرے کی ابتدا کرنی ہے تو طے کرو کہ اتنی ضرورت ہے تو ٹھیک ہے، دوسرے ہی دن ایک ایک روٹی کھاؤ۔ لیکن سب ہی دوسرے دن ایک ایک روٹی کھائیں گے اور اس طرح سے وہ کہتا ہے کہ تم یوں رزق کی تقسیم چند دنوں میں دیکھو گے کہ ہر ایک کو ہر روز روٹی ملنی شروع ہو جائے گی اور پھر آگے بڑھتے چلے جاؤ تو تم دیکھو گے کہ کس طرح سے تمہارے ہاں رزق برسنے لگ جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کچھ ضرورت کی صورت ہو۔ قرآن نے مال کے متعلق کہا ہے کہ یہ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (5:97) ہے۔ مال یعنی دولت کا مقصد یہ ہے کہ اس سے انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔ یہ الناس کے لیے ہو، یہ عوام الناس کے لیے ہو۔ "ل" کا تو عربی میں استعمال ہی "منفعت" کے لیے ہوتا ہے۔ یہ دولت عوام کی منفعت کے لیے ہو، یہ انسانیت کو اپنے پاؤں پر کھڑی کرنے کے لیے ہو تو یہ جو بیج کے لیے دانے رکھے ہیں انہیں بڑھاتے چلے جاؤ۔

جتنا زیادہ بیج کاشت ہو گا اس کے مطابق پھل ملے گا

زمین پہ اور زیادہ ہل جوتو، بیج کے لیے اور زیادہ دانے رکھو، اور زیادہ کاشت کرتے چلے جاؤ، دولت اور زیادہ بڑھتی چلی جائے گی۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (17:26)۔ ان کے متعلق یہ نہ کرو کہ میری ضرورت پوری نہیں ہوتی، ان دانوں کو بھی پیس کے کھا جاؤ، یہ دانے تمہارے نہیں تھے، یہ بونے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ایسا مت کرو کہ انہیں بھی پیس کر کھا جاؤ۔ یہاں اسراف آتا ہے، یہاں تبذیر آتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ان الفاظ کے معنی فضول خرچی ہو جاتا ہے۔ فضول خرچی کا تو لفظ ہی ایسا ہے جسے آپ متعین نہیں کر سکتے، جس کا مفہوم یوں ہے کہ آپ کے نزدیک ایک چیز فضول خرچی ہو گئی۔ دوسرا کہتا ہے: یہ میری ضرورت ہے۔ وہ جو سارا دن مسلسل Chain سے سگریٹ پیتا رہتا ہے، آپ کہتے ہیں "بڑا فضول خرچ ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں، میری ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس کے بغیر میں کام ہی نہیں کر سکتا۔ تو اس ضرورت کے تعین کے لیے سٹینڈرڈ (Standard) کیا ہو گا، جس کی بنیاد پہ یہ کہہ سکیں کہ اس چیز کو اسراف کہتے ہیں۔

عربوں کے ہاں اسراف کا لفظ کن معنوں میں استعمال ہوتا تھا؟

عربوں کے ہاں پانی ان کی بڑی ہی نایاب متاع تھی، بڑی ہی قیمتی، انمول شے تھی۔ اب بھی جہاں ہمارے زراعت پیشہ لوگ بستے

Marfat.com

ہیں: منٹگمری' لائل پور' سرگودھا' میانوالی۔ ان اضلاع میں جہاں یہ ہماری نہریں ٹوٹ کے جا پہنچتی ہیں' پانی وہاں ماپ کے ملتا ہے تو ان سے پوچھو: زمیندار پانی کی باری پر قتل ہو جاتے ہیں۔ وہ پانی نہروں سے' اپنے کنوؤں سے' نالیوں میں چھوٹی چھوٹی کھالیں'' جنوں کیندے نیں پنجابی اچ'' ❶ ان کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ یہ جو جنت کے متعلق باغات کے نیچے انہار کا لفظ آتا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (5:119)۔ یہ معنی سمجھ میں نہیں آتے کہ باغوں کے اندر سے وہ نہریں جاری ہو جائیں گی تو پھر'' باغ کتھے اُوگے گا؟'' ❷ عزیزانِ من! 'سنیے' وہ عربوں کے ہاں یہ جو'' آڑ'' ❸ ہوتی تھی: پانی کی نالی'' اوا ینوں وی نہر کیندے ہیگے سن' تے دریانوں تے بحر کیندے سن'' ❹۔ آپ دیکھیں گے جب زمیندار پانی لگاتا ہے مستقلاً ان کا ایک شخص وہ'' کہی'' ❺ جسے آپ کہتے ہیں اپنے مونڈھے پہ رکھے ہوئے آڑ کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔ ذرا یہاں سے شگاف ہوا' جھٹ سے مٹی اس نے ڈالی۔ ذرا وہاں ہوا' جھٹ سے مٹی ڈالی۔ مستقلاً اس پہ نگرانی کرتا چلا جاتا ہے کہ اس میں سے یہ پانی راستے میں ہی کہیں شگاف پڑ کے بہہ نہ جائے اور جہاں اس نے پہنچنا ہے' جہاں اس کی ضرورت ہے' کہیں اس سے پہلے ہی بہہ نہ جائے۔ یہ جو چیز ہوتی ہے'' پانی کا اس طرح سے ضرورت کی جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہی بہنا' اسے اسراف کہتے ہیں''۔ یہ ہے وہ لفظ جس کا ترجمہ آپ کے ہاں فضول خرچی ہے۔ ٹھیک ہے تمہیں پانی کی اتنی ضرورت ہے' دریا ہے' لے لیجیے' دیکھیے کہ یہ اِدھر اُدھر نہ بہہ جائے لیکن جہاں' جب بھی تمہارا کھیت بھر جائے' اس کے بعد تمہیں اس کے روکنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تمہیں یہ ضرورت ہے کہ تمہارے ہاں روز روٹی پکے' یہ جو بیج کے لیے دانے رکھے ہوئے ہیں' تمہیں ان کو پسوانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یاد رکھو! یہ جو ایسا کرنے والے ہیں۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (17:27)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جذبات کی پرورش کے لیے' اپنے جذبات کی تسکین کے لیے' اس مال کو خرچ کرتے ہیں۔'' شیاطین'' کے یہ معنی ہیں: '' یہ اپنی ضرورت کے لیے نہیں خرچ کرتے 'یہ تو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے خرچ کرتے ہیں''۔ کہا: وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ کَفُوْرًا (17:27)۔ شیطان کیا ہے؟ وہ ربوبیتِ عالمینی کے سامان کو لِرَبِّهٖ کَفُوْرًا ہے۔ وہ ربوبیتِ عالمین کے سامان کو چھپا کے رکھ دیتا ہے۔ اس کو شیطان کہتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے کہ مُبَذِّرِیْنَ کیا ہوتے ہیں؟ تبذیر کسے کہا جاتا ہے؟ پھر شیطان کیا کرتا ہے؟ وہ لِرَبِّهٖ کَفُوْرًا (17:27) کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس سامان کو تو ربوبیت کا سامان کہا ہے۔ اس سے بات صاف ہو گئی کہ تم نے اسے سب کو دینا ہے۔

---

❶ جنہیں بزبان پنجابی کہتے ہیں۔ ❷ تو پھر باغ کہاں پیدا ہوگا؟

❸ پنجابی میں پانی کی چھوٹی' باریک نالی (Drain) کو آڑ کہتے ہیں۔

❹ وہ اسے بھی نہر کہتے تھے اور دریا کو بحر کہتے تھے۔ ❺ کَسِّیْ

Marfat.com

ایک اور نفسیاتی کیفیت

عزیزانِ من! یہاں پھر وہی نفسیاتی کیفیت آئی۔ کہا: **وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا** (17:28)۔ اگر کوئی ایسا صاحب احتیاج تمہارے پاس آیا ہے یا تم نے اسے دیکھا ہے اور اسے دینے کے لیے ابھی تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ چیز جو قرآنِ کریم نے کہی ہے' بڑی عجیب چیز ہے۔ کہا: ہوسکتا ہے کہ تمہارے متعلق معلوم ہو کہ صاحب! تمہارے پاس کچھ ہے ہی نہیں' "گنجی نہائے گی کیا' تے نچوڑے گی کیا"۔ [1] اس بیچارے کا اپنا ہی پورا نہیں ہوتا۔ اس کے پاس تو کوئی نہیں جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ صورت یوں ہے کہ تم عام طور پہ اس حالت میں ہو کہ دوسروں کی کچھ مالی مدد کرسکتے' ہو حالات کچھ ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ تم ابھی اس قابل نہیں ہو۔ ویسے تمہیں امید ہے کہ ایسے حالات پھر دوبارہ آجائیں گے' انسانی زندگی میں ایسے حادثات' اس قسم کا وہ وقت آتا ہے کہ باہر ابھی بھرم بنا ہوا ہوتا ہے لیکن اندر سے اس کی حالت یہ ہوچکی ہوتی ہے۔ کہا: وہ ضرورت مند تمہارے پاس یہ توقع لے کے آئے گا کہ تم اس قابل ہو' لیکن تمہیں یہ معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسے میں اگر وہ آ کے ذرا تھوڑا سا اصرار بھی کرے تو وہ حق بجانب ہے کہ تمہارے متعلق اسے یقین ہے کہ تمہارے پاس اسے دینے کے لیے کچھ ہے۔ کہا: ایسے میں جو تم اس کو جواب دو تو ہمیں معلوم ہے کہ تم زِچ ضرور پڑ جاؤ گے۔ کہو گے: "تمہیں کیا پتہ کہ میں کن حالات میں سے گذر رہا ہوں۔ اپنی کیفیت تو یہ ہوئی ہے اور تم لوگوں کا یہ مانگنا؟" کہا: ایسے نہ کرو۔ وہ اس بھرم کی بناء پہ تمہارے پاس آیا ہوا ہے۔ کچھ اس قسم کی بات پیدا کرو کہ تم دونوں کے لیے کچھ آسانی سی پیدا ہو جائے۔ نہ اس پہ تلخ گذرے' نہ تم زِچ پڑو۔ کچھ یوں کرو۔ دیکھا آپ نے کہ قرآنِ حکیم کس قدر تفصیل سے یہ چیزیں بیان کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں سے ان حقائق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے مثلاً اگر آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں کوئی نماز کی اہمیت کو کم کر رہا ہوں یہ تو ایک اہم فریضہ اور بنیادی ستون ہے لیکن اس کی رکعتوں میں کیا پڑھا جائے قرآن نے اس کی تمام جزئیات نہیں دیں۔ جبکہ باہمی معاملات کی جزئیات تک دی ہیں۔

باہمی معاملات سے بچنے کے لیے شرعی حیلے

ہاں عزیزانِ من! قرآنِ حکیم انسانوں کے باہمی معاملات کی جزئیات تک پہنچا رہا ہے' لیکن اس کے برعکس آپ ذرا فقہ کی کتابیں اٹھا کے دیکھیے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی فقہ کی کتاب کا کم از کم ستر اسی فیصد حصہ سارا معتقدات کی بحثوں کے متعلق ہی ہوگا: صفاتِ خداوندی کو کیسے مانا جائے؟ وضو کے اور وتر کے مسائل کیا ہیں؟ جبر او راختیار کی باتیں کیا ہیں؟ یہ کتابیں یہ سارا قصہ لیے

---

[1] اس بے چارے کا اپنا ہی پورا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

ہوئے ہیں۔ حشر اور نشر کا قصہ لیے ہوئے ہیں' قبر میں نکیرین کیسے آئیں گے؟ اعمال نامہ کیسے لکھے گا؟ وہ ''ماہر فقہ'' لکھتا چلا جاتا ہے۔ اس میں انسانی معاملات کے متعلق بمشکل دس بیس صفحات ہوتے ہیں' یعنی انسانوں کے باہمی معاملات میں ان چیزوں کی اہمیت صرف اتنی ہی دینی چاہیے اور اس کے بعد یہ صورت بھی آخر میں ہوتی ہے یہ ماہرینِ فقہ جسے شرعی حیلے کہتے ہیں کہ یہ جو انسانی معاملات کے متعلق لکھا ہے کہ اس کو یوں ادا کرو' اس کے لیے یہ چیز کرو اور آخر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فقہ کے ان قوانین کو Avoid کیسے کیا جائے۔ اس میں سے بچ کے کیسے نکلا جائے' یہ بھی ان کتب فقہ کے آخر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ تو بہر حال انسانی معاملات کے متعلق آپ دیکھیے گا کہ ہماری اس فقہ میں صرف اتنا سا حصہ ہی ہوتا ہے اور اس میں بھی بچ نکلنے کے لیے ''باب حِیَل'' میں شرعی حیلے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

قرآنی احکام کا اصل مقصد انسانی معاملات کو سنوارنا ہے

آپ قرآن کو دیکھیے۔ سارے قرآن میں سب سے لمبی سورۃ' سورۃ بقرہ ہے۔ اِس کی 282ویں آیت سب سے لمبی آیت ہے۔ اُس میں یہ ہے کہ اگر کسی سے قرضہ لو تو اس کے لیے بھی لکھا ہے کہ کس طرح سے اُس کی دستاویز لکھو۔ کون لکھائے' کون گواہ ہو' کون کاتب ہو' اس کے کیا الفاظ ہوں' کس وقت یہ چیز ہو۔ ایسی Detail میں صفحہ بھر جاتا ہے بلکہ وہ ایک آیت صفحہ سے بھی زیادہ لمبی ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ چیزیں جنہیں ہم عبادات کہتے ہیں آپ کے ہاں جنہیں پرستش کہا جاتا ہے یا بہر حال وہ خدا کے ہاں اسطرح سے جھکنا ہے۔ ان کا مقصد بھی انسانی معاملات کو سنوارنا ہی ہے۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ ایک بڑھئی کو مقرر کر لیتے ہیں' دس پندرہ روپے دیہاڑی پر اپنا کام کروانے کے لیے تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ آ کے سب سے پہلے اپنا وہ تھیلا کھولتا ہے۔ کھولنے کے بعد وہ اپنی بٹی ❶ نکالتا ہے اور اس پتھر پہ تھوڑا سا پانی ڈالتا ہے اور وہ پہلے اپنا رندا لیتا ہے۔ اس کو گھساتا ہے پھر اس کے بعد اپنی وہ تیشی لیتا ہے' اس کو تیز کرتا ہے' پھر اس کے بعد پانی ڈال کے وہ اپنی اس بٹی (پتھر) کو صاف کرتا ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے لیکن اگر وہ سارا دن یہی کچھ کرتا رہے کہ ''رندا ای لاندا رئے' اودروازہ کیویں بنائے گا'' ❷۔ رندا نہیں لگاتا تو وہ بھی نقص ہے۔ وہ پھر دروازہ نہیں بن سکتا' جو دو گھنٹے میں بنتا تھا شاید اس دروازے کو بننے میں چھ گھنٹے لگ جائیں اور وہ بھی تمہارا نقصان ہوگا۔ یہ رندا اور تیشی تیز کرنا بھی ضروری ہے لیکن یہ مقصود بالذات (End in itself) نہیں ہے۔ وہ تمہارے دروازے کو اچھے سے اچھا' کم از کم وقت میں' بنانے کے لیے ایک ذریعہ ہے' ایک مقصد ہے۔ تو یہ جتنی چیزیں آپ پرستش کی کہہ کے پکارتے ہیں ''اے اس ترکھان دا رندا لانا ہیگا' جینے تہاڈے دروازے بنانے چاہیدے'' ❸۔ یہ ایک مقصد' مقصد کا ذریعہ ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔

---

❶ اوزار تیز کرانے کا پتھر۔ ❷ سارا وقت اپنا رندا ہی تیز کرتا رہے تو پھر وہ دروازہ کیسے بنائے گا؟

❸ یہ اس ترکھان (لکڑی کے مستری) کا رندا تیز کرنا ہے جس نے آپ کے دروازے بنانے ہیں۔

مذہب کی صلوٰۃ اور دین کی صلوٰۃ میں فرق

جو نماز انسانی معاملات کو درست نہیں کرتی وہ خدا کی بارگاہ میں تو مقبول نہیں ہو سکتی اور اس کے لیے فقہی بحثیں کتنی ہی کیوں نہ لے آئیں: وقت اتنے ہیں، رکعتیں اتنی ہیں، سجدے اتنے ہیں، اس میں یہ پڑھنا چاہیے، اس میں یوں اٹھنا چاہیے۔ یہ سارا مذہب ہے عزیزانِ من! اس میں عقل کی بات تو یہ ہے کہ سجدہ کرنے سے پہلے اور سجدہ کرنے کے بعد تمہارے اندر تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ ہے وہ صلوٰۃ جو اس کے ہاں مقبول ہوتی ہے۔ تمہارا معاملہ جس شخصیت سے پڑ رہا ہے اس کے لیے تم یہ کہہ کر کھڑے ہوئے تھے: اللہ اکبر: کبریائی تیرے ہی لیے ہے۔ پھر جھک گئے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ ''میں کاہے کے لیے جھک رہا ہوں۔ یہ سب کچھ کر رہا ہوں یہ کاہے کے لیے ہے''۔ کیا کبھی آپ نے اس پہ غور بھی کیا ہے؟

مُلا کی اذان میں اور مجاہد کی اذان میں بڑا ہی فرق ہے

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ غور کرنے کی تو ہماری صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ یہ ساری نماز ادا کرنے کے بعد جب آپ اپنی نماز کا اختتام کرتے ہیں تو آپ کو پتہ ہے کہ یہ اختتام کس چیز پہ ہوتا ہے۔ آپ جو بیٹھے ہوئے ہیں باہر والوں کو کہتے ہیں: السلام علیکم یعنی تم پر میری طرف سے سلامتی ہے، تم سلامت رہو گے، تمہیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ ''السلام علیکم''۔ تمہارے اوپر سلامتی ہے، اس لیے کہ میں نے سجدہ دے دیا ہے، میں نے صلوٰۃ ادا کر لی ہے۔ اس نے یہ اس لیے کہا تھا کہ ''صلوٰۃ ادا کرو، تاکہ دائیں اور بائیں جتنے تمہارے بسنے والے انسان ہیں تمہارے ہاتھوں سے محفوظ رہ جائیں''۔ تم انہیں سلامتی کی Assurance دیتے ہو: السلام علیکم اور ہر نمازی اپنے دائیں بائیں والے کو یہ سلامتی کی دعائیں دے کے، اٹھ کے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ہے مقصود بالذات صلوٰۃ کا یعنی انسانی معاملات کا سنورنا۔ لہٰذا عموا صالحین کا ترجمہ ''اعمالِ صالح کرنے والے'' کر جاتے ہیں۔ لیکن میں نے اعمالِ الصّٰلحٰت کے مفہوم میں یہی لکھا ہے کہ ''یہ وہ کام ہیں جو انسانی معاملات کو سنوار دیں''۔ لیکن میرے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ دیکھیں، اس صاحب نے ان الفاظ کا ترجمہ یہ کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ اس بناء پر مجھ پر کفر تک کا فتویٰ لگ گیا۔ لیکن میں نے کہا: ''ٹھیک ہے تمہارے نزدیک تو ان الفاظ کا ترجمہ انسانی معاملات کو بگاڑنے والے کام ہی اعمالِ صالح ہیں جو حقیقتاً ملا فی سبیل اللہ فساد ہیں''۔ یعنی میرا یہ کہنا ان کے ہاں برداشت کے قابل نہیں۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسانی معاملات کی باتیں قرآنِ کریم میں کس تفصیل سے آ رہی ہیں۔ حکم تو دو لفظوں میں ہی تھا جو اس نے پہلے دیا ہے کہ وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ (17:23)۔ بات یہ تھی کہ یہ عبودیت کیا ہے؟ کہا کہ اس کا نقطۂ ماسکہ، اصل الاصول یہ ہے کہ تم 'قوانینِ خداوندی کے علاوہ' کسی کی اطاعت نہ کرو۔ اُس کے سوا کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہ کرو۔ محکومیت صرف اُس کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس نقطۂ ماسکہ کی روشنی میں اس کی ابتدا کے لیے کہا کہ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ

Marfat.com

اِحۡسَانًا (17:23)۔ کہ اس کی ابتدا اپنے گھر کی زندگی سے کرو۔ تم اپنے ماں باپ جو کمانے کے قابل نہیں رہے، پرورش اور حفاظت کے سلسلے میں، ان کی اس کمی کو پورا کرو۔ لہٰذا قرآن اس کے متعلق برابر بتائے چلا جا رہا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ ان حقداروں میں سے کوئی ضرورت مند، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، تمہارے پاس اُس وقت آئے جب تمہارے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہ ہو تو انہیں نرمی سے بات سمجھا دو۔ سختی سے نہ جھڑکو: فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (17:28)۔ بات دراصل حالات کی تنگی کی بناء پر ''میسورا'' یسر کی ہو رہی تھی۔ لہٰذا کہا یہ گیا کہ اس پہ بھی تنگی آئی ہوئی تھی اور تم پہ بھی اتفاق سے تنگی آ گئی ہوئی ہے۔ موجودہ حالات، میں ''اسر'' میں، تم دونوں ہو، تو اس ''اسر'' کی وجہ سے تم بھی کچھ پریشان ہوئے ہو اور وہ بھی بیچارا تنگدست ہے، مجبور ہے۔ لہٰذا آپس میں کچھ ایسی بات کرو کہ یہ جو ''عسرت'' ❶ ہے اگر مالی طور پہ ''یُسر'' ❷ میں نہیں بدل سکتی تو بہر حال تم میں اور اُس میں ذہنی اور خیالی طور پہ تو کسی حد تک ہی صحیح کچھ ''یُسر'' پیدا ہو جائے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (17:28)۔ کہا ہے۔ برادرانِ عزیز! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 28 تک پہنچ گئے۔ آیت 29 سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❁❁❁❁

---

❶ تنگ دستی

❷ آسانی

ساتواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 29 تا 33)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾
إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ
خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ
كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿٣٣﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1975 کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 29 سے ہو رہا ہے۔ 17:29۔ سابقہ چھٹا باب' آیات 23 تا 28 میں یوں کہیے کہ ہماری معاشرتی زندگی کے متعلق ہدایات اور احکام چلے آرہے ہیں جن میں گھریلو زندگی' والدین کے حقوق' اولاد کی پرورش' احسان کا قرآنی مفہوم وغیرہ شامل ہیں۔

کام صلاحیت کے مطابق اور دام ضرورت کے مطابق

اصل میں تو قرآنِ کریم ہمیں اپنے اس پورے نظام کیطرف لے جانا چاہتا ہے جسے اس نے تجویز کیا ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ ہر کام کرنے والا' پوری پوری محنت اور دیانت سے' اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے مطابق کام کرے اور اس سے جو کچھ فائدہ ہو' اس کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت رکی نہ رہے' بلکہ صورت یہ ہو کہ جس کی ضرورت زیادہ ہے' وہ پہلے پوری ہو اور جس کی کم ہے وہ آخر میں اپنا حصہ لے' خواہ وہ کمانے والا فرد خود ہی کیوں نہ ہو۔ اصولاً بات کرنے کے بعد اس نے سمجھانے کے لیے یہ کہا کہ تم اپنے گھر کی زندگی میں ایسا ہی کرتے ہو لیکن ایسا کرنے میں اس نے بات اولاد سے شروع نہیں کی کہ اولاد کی پرورش تو حیوانات اور انسان دونوں میں قدرِ مشترک ہے گویا یہ اس جبلت (Instinct) کا نتیجہ ہے جو ہر جاندار کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس گائے کی نسل اور پھر اس کی ابتدائی پرورش وہ گائے اُسوقت تک کرے گی جب تک وہ خود اپنی پرورش کے قابل نہ ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ عجیب چیز ہے۔

Marfat.com

کوئی حیوان اپنے ماں باپ کی پرورش نہیں کرتا

قرآنِ کریم میں آگے چل کے بات آتی ہے کہ اولاد کے متعلق کیا ذمہ داری ہے لیکن اولاد کے متعلق حکم کے طور پہ یہ بات نہیں کہی گئی کہ بچہ پیدا ہو تو اس کو دودھ دیا کرو' اس کی ضروریات کا خیال کیا کرو۔ اس سے بالکل دوسری طرح بات کہی ہے جو حیوانی جبلت کے اندر نہیں ہے۔ کوئی حیوان بوڑھے ماں باپ کی ضروریات کا خیال نہیں کرتا' ہر حیوان اپنے بچے کی پرورش کرتا ہے لیکن کوئی حیوان ایسا نہیں ہے کہ جو ماں باپ کی پرورش کا بھی خیال کرے۔ وہ تو انہیں بھول ہی جاتے ہیں۔ جب تک بچہ اپنی پرورش کے لیے اپنی ماں کا ہی زیادہ محتاج ہوتا ہے وہ ماں کے ساتھ ہی چپکا رہتا ہے۔ ماں بھی اسے چپکائے رکھتی ہے اور جب وہ اپنی حفاظت اور پرورش آپ خود کرنے کے قابل ہوتا ہے تو دونوں مل جاتے ہیں۔ اس ماں باپ کو بھی یاد تک نہیں رہتا کہ یہ ہمارا بچہ تھا۔ بچے کو بھی اس کا احساس تک نہیں رہتا کہ یہ میرے ماں باپ تھے۔ بچے کی پرورش کے سلسلہ میں انسان کی بھی یہی صورت ہے۔

ہر ماں فطری طور پر بچے کی پرورش کرتی ہے لیکن آگے چل کر ماں باپ اسے جبلی تقاضے Instinct کے مطابق یہ کچھ نہیں کرتے تاہم قرآنِ کریم نے ماں باپ کی پرورش کے لیے خاص تاکید کی ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ جو نظام ہم دینا چاہتے ہیں کہ ہر ضرورت مند کی ضرورت پہلے پوری ہو۔ بچوں کی ضرورت تو تم اس طرح اپنے جبلی تقاضے سے پوری کرتے ہو لیکن ماں باپ کے معاملے میں تم ایسا نہیں کرتے۔ اس نظام کی ابتداء گھر سے کرو اور پرورش کے ضمن میں یہ بات پھر کہدی کہ بڑھاپے میں ان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان کی عادات کچھ بچپن کی سی ہو جاتی ہیں۔ ان سے کبیدہ خاطر نہ ہوا کرو۔ ان سے چڑ نہ جایا کرو۔ نہ ہی تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ میرے اوپر ایک بوجھ ہے' میں ایک بیگار ٹال رہا ہوں' ان کی عزت و تکریم کا خیال رکھو۔ محتاج ماں باپ کے سلسلے میں بات تو یہ کی جا رہی ہے لیکن یہ راہنمائی عالمگیر ہے کیونکہ آگے یہ بات چلی کہ اسی سلسلے کو اور آگے بڑھاؤ اور تمہارے گرد و پیش ایسے لوگ خواہ وہ رشتے دار ہوں یا دوسرے لوگ ہوں لیکن وہ ضرورت مند ہوں' تم اگر ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہو تو ان کی ضروریات کا خیال کرو' ان کی ضروریات کو پورا کرو۔

ہر گھر کو ایک یونٹ (Unit) کی شکل دی جائے گی

یاد رکھیے! یہ متذکرہ بالا احکام اس زمانے کے عبوری دور (Interim Period) کے احکام ہیں۔ جب بھی وہ معاشی نظام مملکت کی طرف سے نافذ ہوا تو وہاں اس کی شکل کچھ اور ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نظام کے تابع بھی تقسیمِ کار اس طرح سے کی جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسے ہی ہو گی کہ گھر کو ایک یونٹ رکھا جائے۔ قرآنِ کریم سے یوں نظر آتا ہے کہ وہ گھروں کو توڑنا نہیں چاہتا۔ وہ Family Life کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ آئندہ آنے والی نسل کی ابتدائی پرورش اور تربیت کا یہ یونٹ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ

Marfat.com

میں نے کہا ہے کہ یہ متواتر نسل' جو حیوانات میں چلتی ہے' اس کی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فطرت از خود اس وحی کے ذریعے سے جو' ان میں ہر ایک کے اندر رکھ دی گئی ہے' ان کی تربیت کرتی ہے' جس حد تک اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انسانوں کی یہ صورت نہیں ہے۔ انسانی بچے کی تربیت کے لیے تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تو آگے چل کے اس کی تربیت کا فریضہ عائد کیا ہے لیکن یہاں اس نے جو کچھ کہا ہے وہ یہی ہے۔ یہ نظام جو آگے چل کر اپنی مکمل شکل میں آئے گا تو وہاں معاشی ضروریات کی ذمہ داری یہ نظام اپنے سر لے گا۔ اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ یہ سہولت کس طرح سے تکمیل تک پہنچے گی؟ یہ بات باہمی مشورے سے (By Mutual Consultation) طے کی جاسکتی ہے لیکن میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس میں یہ نظر آتا ہے کہ قرآن یہ خاندان جسے ہم گھر کہتے ہیں' جسے ہاؤس (House) نہیں' ہوم (Home) کہا جاتا ہے' وہ اسے ضرور برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

مکان (House) کی بجائے گھر (Home) کو برقرار رکھنا ہوگا

اب تو دنیا کے تجربے نے بھی یہ بات بتادی ہے کہ یہ گھر (Home) والی بات بڑی ضروری ہے۔ آئندہ نسلِ انسانی کو صحیح راستہ پر چلانے کے لیے' اس کی تربیت کے لیے' اولیں گہوارہ گھر یعنی ہوم (Home) ہی بنتا ہے' گھر ہی بنتا ہے۔ یورپ نے گھر کو توڑ کے دیکھ لیا۔ اس سے آئندہ نسلوں میں اس قدر بے راہ روی پھیل گئی کہ اب ان کی کسی قسم کی کوئی تدبیر کارگر ہی نہیں ہو رہی۔ وہ اس قدر بیباک' اس قدر سرکش ہو گئے ہیں کہ ان نوجوانوں کو کسی قسم کی پابندیوں پر لانے کے لیے' ان کی کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی۔

یورپ کی بربادی کی وجہ

اب ان کے ماہرینِ علم النفس کہتے ہیں کہ یہ کام تو بچے کی تین سال کی عمر تک کرنے کا تھا جسے انہوں نے نہیں کیا۔ اب اس کے بعد یہ ہری لکڑی (Clay) تو خشک ہوگئی ہے' اب یہ ٹیڑھا کرنے سے ٹوٹ تو جائے گی' سیدھی نہیں ہوسکتی۔ قرآن گھر کے اس یونٹ کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ یونٹ یعنی Home وہی ہے جسے ہم خاندان (Family) یا ہوم کہتے ہیں۔ ہم تو مقلد واقع ہوئے ہیں جتنی دنیا کی یہ بڑی بڑی قومیں' جنہیں ہم ترقی یافتہ Developed Nations یا Progressive Nations کہتے ہیں ہم بھی بغیر سوچے سمجھے ان کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاں ہاؤس بریک کیے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں صورتِ حال ابھی بین بین ہے' اسے اسلامی روایات کہیے یا مشرقی روایات کہیے' یہ ابھی تک ہمارے ہاں چلی آرہی ہیں لیکن گھروں میں آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ماں باپ یا بڑوں کا اور چھوٹوں کا وہ تعلق باہمی قلب نہیں رہا جو اس سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ مکینکل سا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری آنے والی نسل' جواب آنے والی قوم بننے والی ہے' کے ذہنوں کے اندر بھی اسی قسم کے سرکشی کے جذبات اور جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو نسلوں کے بعد جب اقوامِ یورپ تجربے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچیں کہ ہم نے جھک ماری جو یہ ہوم لائف کو بریک کر دیا' اُس وقت ہمیں اس کا احساس ہو۔

Marfat.com

قرآن تقلید نہیں سکھاتا بلکہ مستقل اقدار دیتا ہے

ہمارے ہاں ہوم لائف بریک ہونی شروع ہوگئی ہے۔ ہم کرتے یہ ہیں کہ جتنی چیزیں وہاں یورپ میں ناکام رہ جاتی ہیں، وہ میرا خیال ہے، وہاں سے پیدل چل کے آتی ہیں، اتنا لمبا سفر طے کرتی ہیں، بڑی دیر میں یہاں بات پہنچتی ہیں۔ اُس وقت تک وہ انہیں Condemn کر چکے ہوتے ہیں اور ہم انہیں محبوب ترین، عزیز ترین مفاد سمجھ کے، اپنے گلے لگا لیتے ہیں۔ اب تو Inter Net نے ان چیزوں کے ابلاغ کو اور بھی تیز کر دیا۔ اسی لیے ہم ان اقوام کے مقابلے میں دن بدن زیادہ پیچھے ہٹتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآنِ کریم تو آپ کو مستقل اقدار (Permanent Values) دے کر ان پر چلنا سکھاتا ہے۔ وہ کسی کی تقلید نہیں سکھاتا۔ بہرحال اس میں قرآن کی تعلیم یہ بتا رہی ہے کہ وہ یہ گھر کا یونٹ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ قرآن نے والدین کے متعلق جو بات کہی، وہ اس یونٹ کو قائم رکھنے کے لیے ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اپنے گرد و پیش کو دیکھو۔

قرآن کے نزدیک سوال وطن کا نہیں، انسان کا ہے

اس نے کہا کہ اور آگے بڑھ جاؤ۔ ہر وہ شخص جس کی چلتی ہوئی گاڑی رک جاتی ہے، جسے مسکین کہا جاتا ہے، اس کی ضروریات کی طرف آؤ، انہیں پورا کرو۔ اور اس کے بعد اس کو یہاں تک لے گیا کہ اپنے وطن اور بے وطن کا بھی یہاں سوال نہیں ہے۔ سوال تو انسان کا ہے۔ کسی ملک کا کوئی بھی انسان تمہارے ہاں سے، راہگذر پہ ہی گذرنے والا کیوں نہ ہو، اگر تمہارے قریب، تمہارے راستے میں آ کر، اس کی کوئی ضرورت رک گئی ہے، اس کی گاڑی کو بھی دھکا لگاؤ۔ انسان ہے اور یہ فریضہ انسانیت ہے جو تم پہ ہم فائز کر رہے ہیں اور اس بات میں یہ کہا کہ اپنی اس آمدنی کو اس طریق سے کنٹرول رکھو: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (17:29)۔ یاد رکھو! اس خیال سے تمہاری یہ کیفیت نہ ہو جائے کہ ''صاحب! یہ جو کچھ میرے پاس ہے، اگر میں نے یہ دوسروں کو دے دیا تو میں تو پھر بھوکا مر جاؤں گا۔'' نہ تو اپنا ہاتھ ہی سمٹا کے بخل کی طرف لے جاؤ، نہ ہی اپنی ضروریات کے متعلق اسے کھلا چھوڑ دو۔ وہ جو قرآن نے اسراف اور تبذیر کہا تھا، بلا ضرورت صرف کر دینا، اُسے یاد رکھو۔ یعنی جس قوم کے جس مال کو جس طرح ہونا چاہیے، اسے بھی پسوا کے کھا لینا، یہ تبذیر ہے۔ آپ کو یاد ہوگا، پچھلی دفعہ (پانچویں باب میں) میں نے عرض کیا تھا، کہ اس پانی کو جس نے کھیتی کو سرسبز بنانا تھا، اُسے راستے ہی میں اِدھر اُدھر بہا دیا جائے، یہ اسراف ہے۔ کہا: اسراف اور تبذیر نہ کرو۔

اپنے ہاتھوں کو چھلنی نہ بننے دو اور نہ ہی درماندہ ہو جاؤ

نہ تو بخل کی یہ کیفیت ہو کہ ہاتھ بالکل باندھ کے رکھو اور نہ تمہاری فضول خرچیوں کا یہ عالم ہو کہ ہاتھ تمہاری چھلنی بن کے رہ جائیں، اس میں پانی کا کوئی قطرہ ٹکے ہی نہیں، اِدھر سے آئے اور اُدھر سے نکل جائے اور چلا جائے۔ اگر پہلے تم نے یہ کیا ہے کہ ہاتھ

Marfat.com

بالکل ہی باندھ کے بیٹھ گئے اور کسی ضرورت مند کی ضرورت کے لیے کچھ نہ دیا تو۔ مَلُوْمًا (17:29)۔ قابلِ ملامت ہو جاؤ گے۔ معاشرے میں ہر ایک تمہارے لیے ملامت کرے گا اور اگر تم ایسے فضول خرچ ہو جاؤ کہ کسی کو بھی کچھ نہ دیا اور اپنی ضرورت کے لیے بھی کچھ نہ رکھا۔ مَحْسُوْرًا (17:29)۔ تو یاد رکھو! درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ گے' یہ شکلیں اختیار نہ کرو۔ پھر کیا کرو؟ اِس کے لیے قرآن کریم نے بڑا عجیب اصول بتایا ہے۔ کہا کہ ''زیادہ سے زیادہ رزق پیدا کرنے کی کوشش کرو' زیادہ پیدا کرو۔'' یہ ہے علاج۔ یہ فرد کا ہی علاج نہیں ہے' قوموں کا بھی یہی علاج ہے۔ ''پیداوار میں زیادتی کرو۔'' اس پیداوار میں اضافہ کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ وہ جو بخل کا جذبہ ہے کہ ''صاحب! میرے پاس تو بہت تھوڑا سارہ جائے گا'' اِسے ختم کرو اور دوسری چیز تو تمہیں ہم نے بتا ہی دی ہے کہ وہ جو اسراف ہے' بہر حال وہ غلط ہے۔ اِسے بھی قرآنی احکامات کے مطابق ختم کرو۔ ''تو رزق زیادہ سے زیادہ پیدا کرو۔'' اب اگلی آیت میں قرآن اپنے اس پروگرام کو' اپنے اس نظام کو' اپنی ان اقدار کو' حکمت کے ذریعے سے' دلائل کے ذریعے سے' دلنشین کراتا چلا جارہا ہے۔

مروجہ تراجم کی حالت زار

عزیزانِ من! قرآن اکتسابِ رزق کے لیے یہاں جو چیز لایا ہے وہ یہ ہے کہ: اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (17:30)۔ اب یہاں آپ کے مروجہ ترجمہ نے وہ سارا کچھ جسے اس نے ''اسارہ'' کہہ کر وہ عمارت کھڑی کر دی تھی' وہ ساری کی ساری نیچے گرادی۔ اس آیت کا ترجمہ کیا گیا کہ ''رزق خدا کے ہاتھ میں ہے صاحب! جسے چاہتا ہے کشادہ دیتا ہے' جسے چاہتا ہے تنگی بھی پیدا کر دیتا ہے''۔ تو جب رزق اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تو پھر ہمیں یہ جتنی تاکیدات اور جتنی ہدایات دی جارہی ہیں' یہ کہاں کے لیے دی جارہی ہیں؟ کہا تھا کہ تم ضرورت مندوں کو دو۔ اب جبکہ رزق تو ''اے اللہ! تمہارے ہاتھ میں ہے' ہمارے ہاتھ میں کوئی تھوڑا ہے۔'' اگر کسی کو رزق کم مل رہا ہے تو یہ خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ رزق تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اب جسے خدا ہی رزق نہیں دینا چاہتا تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تم دو' ہم تو یہ ایسے خدا کے ساتھ اس قسم کی دشمنی بیئر' (برداشت) ہی نہیں سکتے کہ وہ کسی کا رزق بند کرنا چاہے اور ہم اس کی ضروریات کو پورا کرتے چلے جائیں۔ تو یہ تو خدا سے مخالفت لینے والی بات ہے یعنی وہ سارا کچھ ختم ہو گیا جو کچھ وہ کہے چلا آرہا ہے' کیونکہ رزق تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے' تو سورۃ یٰسین میں یہ چیز ہے' اس کا جواب وہاں ہے کہ جب ان مشرکین سے' کفار سے' یا مخالفین سے یا اس مترفین کے طبقہ سے' ان سرمایہ داروں سے' قرآن تو ان سب کو ایک صف میں لاتا ہے' یہ سب کچھ کفر ہے' ان سے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کا کوئی انتظام کرو' جن کی ضرورتیں ان کی اپنی محنت سے پوری نہیں ہوتیں' تو یہ کہتے ہیں کہ ''صاحب! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' ہمیں کہنے کی بجائے خدا سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ ان کی ضروریات پوری کرے۔ جنہیں وہ نہیں دینا چاہتا اگر ہم انہیں دیں گے تو ہم تو اس کے حریف ہو گئے۔ یہ تو اس کا مقابلہ ہو گیا۔'' یہ کچھ

قرآنِ کریم میں سورۃ یٰسین کے اندر ہے۔ ابھی میرے سامنے وہ ریفرنس (Reference) نہیں، ورنہ میں وہ ریفرنس دے دیتا۔ قرآن اس تصور کو کفر قرار دیتا ہے وہ اسے ضَـآلِّیْنَ کہتا ہے، اس کو کھلی ہوئی گمراہی قرار دیتا ہے۔ اس کو جسے ہم بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں، وہ کہتا یہ ہے کہ یہاں جو اس نے بات کہی ہے اس کا صحیح ترجمہ کر لیجیے، بات صاف ہو جاتی ہے۔ وہ رزق کے متعلق ہی کہتا ہے کہ وہ زیادہ فراوانی سے ملنا چاہیے یوں کرو تو کم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ تو تمہارا سارا کچھ اپنی مرضی پر ہے۔ یہ تو تمہاری اپنی محنت کا ماحصل ہے، جو زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا ہے، وہ اس قانون کے مطابق محنت کرے جو ہم نے بتایا ہے، زیادہ مل جائے گا، جو ایسا نہیں کرے گا اُس کا رزق تنگ ہو جائے گا۔ لِـمَـنْ یَّشَـآءُ (17:30)۔ ''جو زیادہ لینا چاہتا ہے''۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہی وہ چیز تھی جس میں کہا تھا کہ ہم نے حصولِ رزق کے سلسلے میں کہیں پھاٹک (Barriers) نہیں لگا رکھے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَـطَآءُ رَبِّكَ مَـحْظُوْرًا (17:20)۔ ہمارے طبعی قوانین (Physical Laws) کے تحت، جو ہم نے یہاں بیان کیے ہیں، جو محنت کرتے چلے جائیں گے۔ نُّمِدُّ (17:20)۔ ہم ان کی مدد کرتے جائیں گے، انہیں حصولِ رزق میں آگے بڑھاتے جائیں گے۔

زمین و آسماں کے درمیان یہ تمام وسائل اور سامانِ رزق قدرت کی طرف سے عطیہ ہے

ہم ان کی محنت کے تناسب کے لحاظ سے ان کی مدد کر کے، ان کو آگے بڑھاتے چلے جائیں گے۔ جاؤ، جہاں تک پیدا کرنا چاہتے ہو، پیدا کرتے چلے جاؤ۔ یہ سارا کچھ خدا کی طرف سے بطور عطیہ ملا ہے۔ وسائل اور سامانِ رزق عطیہ کے طور پر ملا ہوا ہے۔ اب اس میں سے تمہیں صرف محنت کے مطابق نکالنا ہے اور اس نکالنے کے ضمن میں ہم نے راستے میں پھاٹک (Barriers) نہیں لگا رکھے کہ تم یہاں تک جا سکتے ہو۔ تم جہاں تک جی چاہے آگے بڑھ سکتے ہو، ہم نے بند نہیں لگائے ہیں۔ اس لیے یہ جو تمہارے ذہن میں ہے کہ صاحب! تھوڑا رزق ہے، تھوڑی آمدنی ہے۔ ہمارے اس مقرر کیے ہوئے قانون کے مطابق محنت کرتے چلے جاؤ، زیادہ سے زیادہ کماتے چلے جاؤ اور اگر تم اس میں تھوڑا ہی کمانا چاہو، تو پھر تو وہ تمہارے پاس تھوڑا ہی رہے گا۔ وہ یہ نظام دیتا ہے کہ وسائلِ پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت میں نہ آئیں کہ وہ اس کے اوپر بند لگائے۔ جب وہ بند لگائے گا تو پھر تو وہ لوگ جن کے قبضے یا جن کی ملکیت میں مثلاً زمین نہیں ہے یا بیچاروں کے پاس یونہی چار مرلے زمین ہے وہ سال بھر جتنی جی چاہے محنت کر کے دیکھیں۔ ''گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا''۔ اس چار مرلے سے نکلے گا کیا؟ انکم (Income) محدود ہو گئی، انکم محظور ہو گئی، پھاٹک لگ گیا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس پھاٹک لگانے کی تو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تو عطیۂ خداوندی ہے۔ اب اس کے بعد اس عطیۂ خداوندی میں سے نکالنے کی جو بات ہے، وہ ٹھیک ہے، نکالتے چلے جاؤ۔ اب نکالنے کے تحت یہاں ایک اور چیز آ گئی۔ پھر غلط تصور نے الجھا دیا کہ ''جی ہاں! یہ جو وسائلِ رزق ہیں مثلاً زمین، اس کی ذاتی ملکیت پر حد (Limit) نہیں لگائی جا سکتی۔'' یہ آپ کے ہاں کا ایک ''شریعتِ حقہ'' کا مسئلہ بن گیا ہے، حالانکہ

Marfat.com

قرآن کے مطابق اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ جب کہا کہ نظامِ مملکت اس ذاتی ملکیت (Personal Property) کے اوپر حد بندی کرے تو ''شریعتِ حقہ'' نے کہا کہ یہ نہیں کر سکتے۔ یہ جو انہوں نے' ذاتی ملکیت والوں نے' اتنے اتنے بڑے وڈیروں نے' سرداروں نے' جاگیرداروں نے' زمینداروں نے' اپنے اپنے ہاں ذاتی ملکیت کی حد بندیاں کی ہوئی ہیں وہ تو ''شریعتِ حقہ'' کے مطابق ہیں لیکن مخلوقِ خدا کے فائدے کے لیے اگر ان کی اس لامحدود ملکیت کے اوپر حد بندی کی جائے تو یہ ان کی شریعت کے خلاف ہے۔

وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت کا تصور قرآن کے خلاف ہے

وہ جو قرآن کہتا ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26)۔ کہ صاحب! قرآن میں لکھا ہے کہ یہ حد بندی نہیں کی جا سکتی' پھاٹک نہیں لگا سکتے۔ تم پھاٹک نہیں لگا سکتے۔ تم نہیں لگا سکتے۔ لیکن وہ جو سردار ہیں ان کے پھاٹک بالکل صحیح ہیں'، حد لگا سکتے ہیں' تم ان کی ملکیت کے اوپر پھاٹک نہیں لگا سکتے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے پر پھاٹک لگا سکتے ہیں۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ ''فرق صرف زاویہ نگاہ کا ہوتا ہے۔ ایک اندازِ نگاہ سے دیکھو تو اُسی سے گمراہی کے راستوں پر جا پڑو۔ اور دوسری نگاہ سے دیکھو تو اُسی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کشادہ ہو جائیں' راہنمائی مل جائے۔'' پہلے اندازِ نگاہ سے قرآن کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔

قرآن کو چھوڑ دینے کا نتیجہ

یہ ہے قرآن کو چھوڑ دینے کا نتیجہ عزیزانِ من! وہ جو کہا ہے کہ اسی قرآن سے پھر یہ گمراہیاں کس طرح سے خریدتے ہیں۔ اپنے ذہن میں ایک فیصلہ ہوتا ہے قرآن کے نام کی کوئی سند ان کے پاس ہوتی نہیں۔ لہٰذا یہ تو پھر روز صبح شام آپ سنتے ہیں کہ رزق تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ ''جینوں چاہندا اے او ککھوں لکھ کر دیندا' جینوں چاہندا اے لکھوں ککھ کر دیندا ہیگا۔ اوتھے جناب دم مارن دی جا نئیں''۔ ❶ قرآن کہتا ہے کہ یہ عقیدہ کھلی ہوئی گمراہی ہے یعنی یہ کسی فکری دلیل کی رو سے نہیں ہے۔

ہر شخص اپنی محنت سے جتنا چاہے حاصل کر سکتا ہے

قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ عطیہ کھلا ہے جو جہاں تک اس میں سے پیدا کرنا چاہے کرتا چلا جائے تو۔ لِمَنْ يَّشَآءُ (17:30) کے یہ معنی ہوئے کہ جو زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا ہے' وہ اس میں سے زیادہ سے زیادہ لیتا چلا جائے۔ جو کم لینا چاہتا ہے' بیٹھا رہے' محنت نہ کرے۔ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا (17:30)۔ ہم اپنے بندوں کے احوال سے واقف بھی ہیں اور واقف ایسے نہیں ہیں کہ صبح نیوز پیپر میں خبریں آتی ہیں تو اخبار پڑھ کے خبیر ہیں تو اس کے ذریعے سے ہم تک نیوز پہنچتی ہیں یا ہمارے ہاں

---

❶ ۔ وہ جسے چاہتا ہے نادار سے کروڑپتی بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کروڑپتی سے نادار و قلاش بنا دیتا ہے۔ وہاں اس کے حضور' تو دم مارنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔

Marfat.com

کے جو رپورٹرز باہر چھوڑے ہوئے ہیں وہ کوئی خبریں بھیجتے ہیں۔ خبریں تو ہم کو بھی ملتی ہیں۔ واقف تو ہم بھی ہوتے ہیں۔ کیسے واقف ہوتے ہیں؟ بصیرًا۔ یہ خبر آنکھوں سے دیکھتے ہیں خبر بالواسطہ (Indirect) نہیں رہی' یہ بلا واسطہ (Direct) آنکھوں دیکھی بات ہوگئی۔ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اب پہلی بات تو تھی والدین کی حفاظت اور پرورش کے متعلق جو میں نے کہا کہ اس کی تاکید کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ حیوانی جبلت (Animal Instinct) کی رو سے وہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ انسانی زندگی کا خاصہ ہے۔

قرآن حکیم نے اولاد کی پرورش کے لیے ماں باپ کو کوئی حکم نہیں دیا

گھر کے یونٹ میں ماں باپ جب بوڑھے ہوگئے تو رزق کمانے کے قابل نہ رہے۔ ان کی اس استعداد میں کمی آ گئی۔ قرآن نے ان کے لیے یہاں کہا: اِحْسَانًا (17:23)۔ ان کی محنت کرنے کی صلاحیت میں' استعداد میں' استطاعت میں' جو کمی واقع ہو جائے اسے حسن کارانہ انداز سے پورا کیا کرو۔ اس کو بیگار نہ سمجھا کرو۔ وہاں قرآن' ان کی کمی کو پورا کرنے کی تاکید کرتا چلا گیا۔ میں نے کہا تھا کہ اولاد کے معاملے میں اس نے کہیں ماں کو یہ نہیں کہا کہ بچہ روتا ہے تو اُسے دودھ پلایا کرو۔ وہ تو کسی کمرے میں بھی ہو اور رات کی تنہائیوں میں بھی کہیں الگ ہو اور بچے کے رونے کی آواز آ جائے تو وہ دوڑتی ہوئی آ جاتی ہے۔ یہ اس کی جبلت کا تقاضا ہے' اولاد کے متعلق جو کہنے کی چیز تھی وہ یہ تھی: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (17:31)۔ اب اس کا بھی عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر کی وجہ سے مار نہ دیا کرو۔ یہ بات بھی تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے۔ مفلسی کے ڈر سے کوئی اولاد کو نہیں مارتا ہے' کوئی اپنی اولاد کو قتل نہیں کر دیتا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایسا قحط پڑ جائے کہ اس میں نہ ماں باپ بچیں' نہ بچے ہی بچیں' دونوں ہی بھوک سے مر جائیں لیکن یہ نہیں ہوتا ہے کہ مفلسی کے ڈر سے کوئی اپنی اولاد کو مار دے۔ یہ تو الگ بات ہے کہ کوئی پاگل ہو جائے' جنون میں ایسا کردے' دیوانہ پن میں یہ کچھ کر دے لیکن ایسا نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل کر دیں۔ جو نارمل (Normal) عقل وفکر کے لوگ ہوتے ہیں' ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اولاد کو قتل کر دیں۔

کہتے ہیں کہ عرب میں وہ جو ایک رسم تھی اور قرآن میں اس کا ذکر ہے کہ وہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے' دفن کر دیتے تھے تو قرآن نے خود بتایا ہے کہ وہ مفلسی کے خوف سے نہیں کرتے تھے' وہ ایسا کچھ شرمندگی اور جھوٹی ندامت کی وجہ سے کرتے تھے۔ شرمندگی اور جھوٹی ندامت ہی ہے جو قوموں کے اندر معلوم نہیں کب سے چلی آتی ہے کہ جو لڑکیاں ہیں ان کی شادی کی جاتی ہے' تو کوئی داماد بنتا ہے' کوئی پھر برابر کا سمدھی ہوتا ہے' تو یہ بڑی شرمندگی کی سی بات ہے' ندامت کی سی بات ہے۔ چودہ سو سال پہلے کے عربوں کا تو پتہ نہیں لیکن آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی کیا ہو رہا ہے؟

لڑکی اور لڑکی والوں کی حیثیت لڑکے والوں کے ہاں

آج بھی میرے عزیزانِ من! ہمارے معاشرے میں' دنیا کے نقطہ نگاہ سے جو مہذب بنے پھرتے ہیں' قرآن کو بھی پڑھنے

Marfat.com

والے ہیں' ماننے والے ہیں' یہ کیفیت ہے کہ لڑکی کی شادی کرنے کے بعد عمر بھر کے لیے ان کے زیرِ احسان ہو جاتے ہیں۔ آج بھی ہمارے ہاں وہ جو لڑکی لے جاتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ کہیں کہ یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد ہمارے حوالے کر دی یا کم از کم برابر میں وہاں تقریب ہی ہو یہ چیز قدم قدم پہ ہوتی ہے کہ ''اوساڈے سامنے کی کیہہ سکدے نیں' اوناں دے وال ساڈے پیراں دے تھلے ہیگے'' ❶۔ ہے ناں یہی بات عزیزانِ من! میاں بھی زبان سے کہے تو ہے ناں معاشرے کے اندر یہ چیز کہ جہاں لڑکی دی ہوتی ہے تو ان کی جائز اور ناجائز ہر بات آپ مانتے ہیں۔ آپ ان سے دب جاتے ہیں' کہیں گے کہ بڑی پیش پا افتادہ ❷ باتیں کہتا ہے۔ ''پیش پا افتادہ باتوں کے اوپر غور کرنے کے لیے بڑے عمیق ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔'' عزیزانِ من! بڑی بڑی باتوں پہ تو آپ کھڑے ہو کے غور کرتے ہیں یہ جو روزمرہ کی چلتی ہوئی باتیں ہیں اس پہ آج کوئی بھی غور نہیں کرتا۔ کبھی آپ نے یہ سوچا بھی ہے کہ آپ کے ہاں سالا کتنی بڑی گالی ہے۔ کیا جرم ہے اس شخص کا؟ یہی ہے ناں کہ تم نے اس کی بہن بیاہی ہوئی ہے' اور سالا بیچارہ بہنوئی کو ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔ ذرا سا دیکھا جائے کہ واقعی وہ دھاندلی کر رہے ہیں' ناجائز باتیں کر رہے ہیں' وہ بہن یا اس کی بیوی وہ آ کے اتنے بڑے بڑے آنسوؤں سے بھائی کی منت کرتی ہے کہ بھائی میں نے وہاں بسنا ہے' میں نے ان میں رہنا ہے جو کچھ تم کہتے ہو ٹھیک ہے لیکن میری حالت کے اوپر تو رحم کرو۔ وہ عرب غیرت اور حمیت میں بہت آگے تھے بلکہ وہ تو یوں کہیے کہ وہ حد سے آگے چلے گئے ہوئے تھے۔ وہ اس ندامت اور شرمندگی کو برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ قرآن اسے وہاں ندامت کہتا ہے' وہ اسے شرمندگی کہتا ہے جس سے بچنے کے لیے وہ عرب منہ چھپاتا پھرتا ہے اور آپ کے ہاں خواہ یہ باتیں لمبی ہوں یا نہ ہوں' وہاں صورتِ حال اس شرمندگی اور ندامت کی تھی۔ اور آپ کے ہاں ''تین لڑکیوں کی پیدائش کے بعد'' طلاق تک کی نوبت آ جاتی ہے۔

دو تین لڑکیوں کے پیدا ہونے پر طلاقوں کی نوبت

یہ تو آج بھی بات ہے کہ گھر میں جب بیٹی پیدا ہو جاتی ہے تو سب پہ افسردگی چھا جاتی ہے' کچھ دوسری قوموں کا ہی شاید اثر ہے' پہلی لڑکی کو تو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اگر علی التواتر دوسری بھی آ جائے' منحوس تو اسے ضرور پہلے دن کہا جاتا ہے اور اگر یہ سلسلہ دو تین تک ہو جائے تو وہ جس کے ہاں یہ لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں' اس کا اپنا مستقبل خطرہ میں ہو جاتا ہے اور اس چیز پر طلاقیں ملتی ہیں' اس معاملے میں دوسری شادیاں ہوتی ہیں کہ جس میں اس بیچاری کا کوئی دخل نہیں۔ اگر لڑکا پیدا ہوا ہے تو وہ بھی تمہاری کچھ کاریگری نہیں جو اس فخر سے آج کہہ رہے ہو صاحب کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو حل کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ''اوہ'' کیا کہتے ہو' اس کے لیے تو ہمارا قانونِ فطرت ہے: لڑکا پیدا ہوا یا لڑکی پیدا ہو گئی' یا بچہ پیدا ہی نہ ہوا''۔ یہ بھی قانونِ فطرت ہے'' کہ اولاد نہیں ہوتی' یہ بھی ہوتا ہے۔

---

❶ وہ ہمارے سامنے مقابلے میں' کیا کہہ سکتے ہیں' ان کے تو (عزت کے) بال ہمارے پاؤں کے نیچے ہیں۔

❷ واضح آشکار۔

Marfat.com

کہ مشترکہ طور پر بھی یہ چیزیں ہوتی ہیں''۔ اس نے کہا ہے کہ یہ چیز نہ تو کوئی باعثِ فخر اور وجہِ سرفرازی ہے کہ جی بیٹا پیدا ہو گیا اور نہ یہ چیز کوئی وجہِ ندامت ہے کہ لڑکی پیدا ہو گئی۔ یہ چیزیں قانونِ فطرت کی ہیں۔ اس بیچاری کا قصور کیا؟ اور جو دوسری بیوی لیے چلے آ رہے ہو' کیا اس میں پہلے سے ضمانت نامہ یا گارنٹی حاصل کر رکھی ہے کہ بیٹا ہی پیدا ہو گا؟ لیکن آپ کے ہاں یہ چیز بہرحال موجود ہے۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (17:31)۔ سے اولاد کو قتل نہیں کیا جاتا ہے۔ اولاد کے قتل کرنے کی ایک ہی مثال دی ہے: یہ بتایا ہے کہ بچی کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔

قاتل کی بجائے معصوم سے پوچھا جائے گا

کس حسین انداز میں قرآن اس جرم کے متعلق بات کرتا ہے۔ جرم جتنا سنگین ہے اسی کے مطابق وہ کہتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اس منظر کو سوچو کہ جب ایک بچی' جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کر دیا تھا' یعنی انداز یہ ہے کہ پوچھا عام طور پہ اس قاتل سے جاتا ہے' مجرم سے کہا جاتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ وہاں انداز یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ ہم اس معصوم سے پوچھیں گے کہ ''بیٹی! یہ بتاؤ کہ تم نے کیا جرم کیا تھا جو اس نے تمہیں قتل کر دیا''۔ جب اس سے یہ پوچھا جائے گا: بیٹی! ''تم نے کیا جرم کیا تھا کہ تمہیں قتل کر دیا گیا (81:9)۔ ہم کہتے ہیں کہ عزیزانِ من! یہ جاہلیتِ عرب کے زمانے کی باتیں ہیں جنہیں قرآن دہرا رہا ہے۔ عزیزانِ من! ہم ہر روز' وہ تو دو چار چھ مہینے یا دنوں کی بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے' ہم اپنے ہاتھوں سے جوان بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر کیسا ہے' وہ خاوند کیسا ہے' وہ لڑکا کیسا ہے؟ آوارہ' بدمعاش' بداخلاق۔ گھر کا پتہ ہے کہ ہمارے ہاں کی وہ بچی کس قسم کے گندے گھر میں دھکیلی جارہی ہے' ابھی حیا کا تقاضا ہے کہ بچیاں کچھ ماں باپ کو نہیں کہتیں۔ لیکن یہ بیچاریاں کونوں کھدروں میں جا کے تو آنسو بہاتی ہیں۔

لڑکی کی پیدائش سے پہلے اس کے مقدر کا فیصلہ

ان کو پتہ ہوتا ہے' ہمیں بھی اس کا پتہ ہوتا ہے کہ یہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ وہ بہت بڑی ماں تا کی ماری پکار رہی ہوتی ہے: ''میں اپنی بھین نال ہاں کر چکی ہوئی ہیگی آں۔ میں تے ایدے جمن توں پہلے ای اونوں کیتا سی' جے کُڑی ہوئی تے تیری رہی''۔ ❶ مقدرات کے فیصلے پیدائش سے بھی پہلے ہو رہے ہیں۔ یعنی وہ یہ نہیں کہتی کہ وہ گھر ایسا نہیں ہے' وہ لڑکا ایسا نہیں جیسا تم کہتے ہو۔ اوتم دیکھتے بھالتے یہ سارا کچھ کہتے ہو کہ ''جی ویکھ کے مکھی نئیں کھادی جاندی''۔ ❷ یہ تو تھی مکھی مگر یہ تو سانپ نگل رہے ہیں۔ اوتم خود یہ سب کچھ کہتے ہو کہ ''کہن لگے جی نجوکاں دی گل ہوندی ہیگی اے۔ پہلے تے گل اے ہوئی''۔ ❸ چل بھئی' یہ جو کہا ہے کہ یہ تو روحوں کے رشتے ہوئے۔

---

❶۔ میں اپنی بہن سے ''ہاں'' کر چکی ہوں۔ میں نے تو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ رشتہ اس کے ساتھ کر دیا تھا کہ اگر میرے ہاں لڑکی ہوئی تو وہ تمہاری ہوئی۔

❷۔ جی دیکھ کر تو مکھی بھی نہیں کھائی جاتی۔

❸۔ کہنے لگے کہ یہ تو قسمت کا لکھا ہوتا ہے پہلے تو ہوئی یہ بات۔

Marfat.com

یہ عرش پہ ہوتے ہیں' اللہ میاں خطبہ دین ڈئے ہیگے' فرشتیاں نوں گواہ ٹھہرایا ہویا اے'' [1]۔ یہ تو وہاں نکاح ہو جاتا ہے' او بھئی! اس کا مستقبل دیکھتی ہو' کہ ''جی اے تے قسمت دی گل ہیگی اے' نکاح نجوگاں دی گل ہیگی اے۔ اگے قسمت دی گل ہیگی اے'' [2]۔ اچھا جی اللہ نیک نصیب کرے' یعنی ''تسی تے اے کچھ کر دتا' او نیک نصیب کرے''۔ [3]

خدائے علیم وخبیر ان مظلوم بیٹیوں سے پوچھے گا

عزیزانِ من! یہ اسی معصوم بیٹی سے ہی نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارا باپ ہوتے ہوئے اُس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے کیوں قتل کیا تھا؟ عزیزانِ من! ہم میں سے ہر ایک سے' ہم میں سے ہماری ہر ایک بیٹی سے' کہ جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کیا ہے' یہ پوچھا جائے گا کہ بیٹی! بتاؤ تم نے کیا جرم کیا تھا جو اس کمبخت نے یا انہوں نے' تمہیں اس طرح زندہ درگور کر دیا؟ وہاں یہ تمہاری ماں کہے گی کہ ''میں اپنی بہن کو وعدہ دے چکی ہوئی تھی''۔ تم وہاں کہو گے کہ ''جی ہن تے پگڑی دا سوال آ گیا'' [4]۔ پگڑی کا سوال ہے تو خود کچھ برداشت کرو۔ اس بیچاری کی قربانی کیوں دے رہی ہو' محض اس لیے کہ یہ تمہاری محتاج ہے۔ لیکن صد افسوس کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک ''قتل'' کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (17:31)۔ یہ ''قتل'' کا لفظ جو عربی زبان کے اندر ہے سچ مچ گلا کاٹ دینے کے لیے ہی نہیں بولا جاتا۔ یہ کسی کو ذلیل وخوار کرنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہ کسی کو جاہل اور ناتربیت یافتہ رکھنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ وہ جو قرآن میں فرعون کے متعلق ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے ''ابنا'' کو کہیں قتل کرتا تھا' کہیں ان ابنا کے متعلق ذبح کا لفظ آتا ہے' وہ یہ نہیں تھا کہ وہ ان کو تہ تیغ کر دیتا تھا' ذبح کر دیتا تھا۔ وہاں یہ چیز ہے کہ وہ انہیں ذلیل کرتا تھا' انہیں جاہل اور ناتربیت یافتہ رکھتا تھا۔ وہ وہی کچھ کرتا تھا جو کچھ ہر مستبد حاکم قوم محکوم قوم کے ساتھ کرتا ہے۔ وہاں یہ لفظ یوں آئے ہوئے ہیں۔ ابنا کے معنی بھی چھوٹے چھوٹے بچے نہیں ہیں۔ ابنائے قوم تو ہم آج بھی بولتے ہیں۔ وہ فرعون محکوم قوم کے لوگوں میں دیکھتا تھا کہ اگر کسی میں بھی ایسا جوہر ہے جو سر اٹھا کے چلنا چاہتا ہے تو اس کے متعلق یہ تھا کہ ذلیل کرتا تھا۔ قرآن میں ہے کہ وہ پارٹیاں بناتا تھا۔ کبھی اِس کو کمزور کر دیتا تھا' کبھی اُس کو کمزور کر دیتا تھا۔ سیاست میں آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''قتل'' کے لفظ کے معنی سچ مچ ذبح کر دینا نہیں ہیں۔

---

[1] ۔ اللہ تعالیٰ نکاح کا خطبہ دیتا ہے اور فرشتے اس شادی کے ٹھہرے گواہ۔

[2] ۔ جی! یہ تو قسمت کی بات ہے۔ نکاح تو عرش پر ہوتے ہیں آگے اپنے اپنے مقدر۔

[3] ۔ آپ نے تو یہ کچھ کر دیا اب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کے نصیب بہتر کرے۔

[4] ۔ کہ جی! اب تو عزت کا سوال آ گیا۔

یہاں اس آیت (17:31) میں بھی یہ معنی نہیں ہیں' کیونکہ کوئی بھی اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہیں کرتا' اب اولاد کے متعلق جو تعلیم دینی تھی تو وہ تعلیم نہیں دی' ان کی وہ تعلیم و تربیت پیسے بچانے کی خاطر نہیں کی۔

پیسے بچانے کی خاطر تعلیم سے محروم رکھنا بھی قتل ہے

یہ چیز کہ مفلسی کے ڈر سے' پیسہ بچانے کی خاطر' اگر کسی کے پاس تعلیم کا انتظام نہیں ہے وہ تو مجبوری ہے' محض اس لیے اولاد کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا کہ اس سے پیسہ خرچ ہوتا ہے' انہیں ذبح کر دینا ہے۔ کہا: ''ایسا نہ کرو''۔ تو ایسا نہ کرو کہنے والے تو بہت سارے ہوتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کو یہ تلقین کرتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی کرتا ہے: ''او منڈے نوں سکول ضرور پچیا کر' اوئے''[1]۔ میاں صاحب کیا کریں اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے کہ یہ کچھ کیا جائے۔ ''او اللہ مالک اے' اونوں توں روز سکول پچیا کر[2]''۔ لہٰذا یہاں بھی یہی بات ہوتی تھی کہ بہت اچھا آپ نے یہ کہہ دیا کہ مفلسی کے ڈر سے یہ نہ کرو کہ اولاد کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھو' یعنی وہ خود کچھ دیتا نہیں۔ ورنہ محنت کرنے والے محنت کرتے ہیں لیکن محنت کے باوجود کچھ نہیں ہوتا تو کیا کیا جائے؟ یہاں بھی جس شخص نے اس کو یہ تلقین کی تھی کہ بچے کو سکول بھیجا کرو اور تم کہو کہ میاں صاحب! ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں' تو وہ اگر یہ کہہ دے کہ ''کوئی بات نہیں' اس کی تعلیم کا خرچ میں برداشت کرلوں گا' بھیج دو''۔ پھر تو یہ انکار نہیں کرے گا۔ تو یہ بڑی بات ہے اور اگر دوسرا یہ نہیں کرتا تو کہے کہ قرآن نے یہاں کہا ہے کہ اس بات کے ڈر سے اولاد کو تعلیم و تربیت سے محروم نہ رکھو۔ جی پھر ان حالات میں ہم کیا کریں؟ کچھ پیسہ ہے نہیں یا تھوڑا ہے۔ کہا: نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (6:152)۔ ہم ذمہ دار ہیں ان کی روٹی کے بھی' اور اگر تمہارے پاس کم رہ جائے گا تو تمہاری روٹی کے بھی۔ یہ وہ آنے والے دور کا نظام ہے۔ یہ کچھ اُس میں ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عبوری دور (Interim Period) میں کیا ہو؟

قرآنی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں عبوری دور کے انتظامات

اس عبوری دور کے اندر تو قرآن کریم نے جن کے پاس فاضلہ دولت تھی ان سے یہ کہہ دیا کہ تم ضرورت سے زیادہ نہیں رکھ سکتے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25)۔ ان دولت مندوں کی دولت میں ان سب کے لیے ان کا حق ہے۔ وہ اس میں سے As of Right لے سکتے ہیں اور یہ حقِ معلوم ہے۔ اس کا ہر ایک کو علم ہے' ہم نے اعلان کر رکھا ہے کہ یہ ان کا حق ہے۔ یہ تم سے لے سکتے ہیں۔ اس دور میں تو یہ چیز کہی اور اسی لیے ان کو بار بار ہر جگہ وہ تاکید کرتا رہتا ہے کہ ان کی ضروریات کو تم پورا کرو' ان کا تم پہ حق ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے اس نظام کی طرف لیے جاتا ہے کہ پھر ان افراد سے یہ کہنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

---

[1] او بھائی! بیٹے کو ضرور سکول بھیجا کرو۔ [2] ارے بھائی! اللہ مالک ہے مگر تم اسے سکول ضرور بھیجا کرو۔

Marfat.com

وہاں ہے یہ بات جہاں وہ کہتا ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ (6:152)۔ ہمارا نظام اس بات کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ تمہارے لیے اور تمہاری اولاد کے لیے سامانِ زیست مہیا کرے گا۔

اگر یہ کچھ نہیں ہے تو پھر وہاں اسلام نہیں ہے

یہ بات وہ نظام کہتا ہے جو خدا کے نام پہ قائم ہوا ہوتا ہے۔ وہ ان کو کہتا ہے کہ بچوں کو سکول بھیجو۔ کہتے ہیں کہ ''اتنی توفیق نہیں''۔ یہ نظام کہتا ہے کہ سوال یہ نہیں ہے۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ ان کے اوپر خرچ کرو۔ جو تمہاری ضروریات ہیں وہ بھی تو ہم پوری کرتے ہیں۔ یہ ایڈیشنل خرچ جو تمہارے اوپر آ پڑا ہے' یہ بھی ہم دیں گے۔ قرآن وعظ ہی نہیں کرتا' حل بھی بتاتا ہے اور پھر حل بتاتا ہی نہیں ہے بلکہ ذمہ داری لیتا ہے۔ لیکن یہ کچھ تو اس نظام کے تابع ہوتا ہے جس کے قائم کرنے کا نام وہ اسلام کہتا ہے۔ یاد رکھیے' اگر وہ نظام قائم نہ ہو تو پھر اسلام بھی نہیں ہوتا۔ اب جب اسلام نہیں ہوتا تو اس ذمہ داری کو کیسے نبھایا جائے؟ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے یہ جہاد کریں۔ اسلام تو اسی نظام کے اندر ایک زندہ دین بن سکتا ہے۔ اس نے سورۃ نور (24:55) میں کہا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ تمہیں اپنی حکومت' اپنا نظام' اپنا ملک ملے گا۔ یہ کاہے کے لیے ملے گا؟ اس میں کیا ہوگا؟ کہا: یہ اس لیے ہوگا کہ تم وہاں دین کو متمکن کر سکو۔ تو دین Establish ہی اس وقت ہوتا ہے جب استخلاف فی الارض ملے۔ اس کے بغیر دین Establish نہیں ہوتا۔ یہ مذہب ہوتا ہے جو ہر حکومت کے اندر' محکومی کے اندر' محتاجی کے اندر' بھی قائم رہتا ہے۔ ٹھیک ہے پڑھے جاؤ نمازیں' رکھے جاؤ روزے۔ انڈیا میں بھی تو تم رکھتے ہی تھے۔ آج بھی رکھتے ہو۔ وہاں تو ان کی آزادی ہے۔ اور ایسا نظام تو رشیا (Russia) تک میں بھی ہے۔ چائنا (China) تک میں بھی جو نظام ہے' جہاں خدا ہی کے منکر ہیں' وحی کے منکر ہیں' وہاں بھی جو مسلمان نام کے لوگ بستے ہیں' انہوں نے انہیں نماز روزے کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَ اِيَّاكُمۡ (6:152)۔ دراصل یہ ذمہ داری پوری کرنے والا جو نظام ہے وہ ہے اسلامی نظام۔ ان کو کہا: ان کی صحیح تعلیم و تربیت کرو۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ان کو اپنے ہاتھوں سے ''ذبح'' نہ کرو' کیوں؟ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا (17:31)۔ یاد رکھو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی' خطرہ ہے' یہ یہاں کا جرم ہے کہ اولاد کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھا جائے۔ اب آگے بڑھتے چلے جائیے۔ یہ ماں باپ کی پرورش اور اولاد کی تربیت و تعلیم دونوں کے متعلق آ گیا ہے۔ درمیان میں' معاشرہ کے اندر ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنا یہ سب کچھ آ گیا۔ اب یہاں سے یہ چیز آئی کہ یہ معاشرہ کس طرح متشکل ہوگا اور کیسے قائم رہے گا؟

یہ معاشرہ متشکل کس طرح ہوگا؟ اور قائم کیسے رہے گا؟

اب آگے بات چلی کہ یہ معاشرہ صحیح خطوط پہ کس طرح متشکل ہو سکتا ہے اور متشکل ہونے کے بعد کس طرح سے قائم رہ سکتا ہے

Marfat.com

اور یہاں وہ بات کہی کہ جو نظر بظاہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یوں کہیے کہ اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ابھی میں بتاؤں گا کہ اب کیوں یہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو کن کن بنیادوں پہ یہ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عصمت کی حفاظت کرو۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ احکام اس قسم کے دیئے جار ہا تھا اور درمیان میں یہ آ گیا۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا (17:32)۔ زنا کے پاس تک بھی نہ پھٹکو۔ ''لا تقربوا'' اس کے قریب تک مت جاؤ۔ مبادیات جسے کہتے ہیں' یہ وہ محرکات ہیں جن پہ چل کر آخر الامر آدمی یہاں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے اپنی حفاظت کرو۔ ہر سو شور مچ رہا ہوتا ہے کہ صاحب! یہ فحاشی عام ہو رہی ہے۔ ضمناً بات یاد آ گئی۔ میں بہت کم ٹیلیویژن دیکھتا ہوں' رات وہاں دیکھا تو بچوں نے یہ بتایا کہ وہاں ''آدابِ صبحگاہی'' تھا۔ شاعروں کی قوم تو ایسی حسین ترکیبیں لے آتی ہے۔ پہلے یہ حسین ترکیبیں غالب [1] دے گیا تھا۔ اب یہ اللہ بخشے اقبال [2] دے گیا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے عنوانات قائم کرنے کے بعد یہ قوم خوش ہے' آدابِ صبحگاہی' اس کے تابع عنوان تھا: فحاشی کے اسباب اور ان کے انسداد کے سلسلے۔ یہ عنوان تو بڑا اہم ہے اور آپ کو یاد ہے کہ میرے نزدیک تو کتنا اہم ہے۔ میں کیا' اور میرے نزدیک کیا' قرآن کے نزدیک کتنا اہم ہے! یہ بات اتنی زیادہ پھیلی ہوئی ہے کہ حکومتی سطح پر انہوں نے طاعون کو بھی روک لیا ہے' ہیضہ کو بھی روک لیا ہے' ملیریا کے Eradication کے متعلق بھی کوششیں جاری ہیں' یہ جو وبائی امراض تھے ان پر کنٹرول ہوا ہے۔

ٹی وی پر فحاشی کے سلسلہ میں ہمارے دانشوروں کی سوچ اور کوشش

لیکن یہ جو فحاشی کے جراثیم ہیں' وہ آپ کے ہاں بڑی سرعت سے پھیل رہے ہیں اور قوم بے بس ہے' تو جب کہیں یہ عنوان سامنے آجائے تو یقیناً وہ میرے پاؤں پکڑ لے گا۔ وہاں دانشورانِ قوم اور بہی خواہانِ ملت کا ایک جمِ غفیر نظر آیا' یہ ایک دو نہیں' یہ ایک جمِ غفیر تھا۔ یہ اتنے چنے ہوئے احباب جمع ہیں' دیکھیے کیا بتاتے ہیں کہ اسباب کیا ہیں' پھر اس کا ازالہ کیا ہے؟ یعنی آپ اندازہ لگائیے کتنا جامع اور مبہوت کن عنوان ہے۔ میں نے کہا: آج تو بات بن گئی' TV دیکھ ہی لیتے ہیں۔ تو پہلے ہی انہوں نے یہ کہا کہ بھئی وقت تھوڑا ہے اور حصہ لینے والے زیادہ ہیں اس لیے ساڑھے تین منٹ سے زیادہ کوئی شخص نہیں بولے گا۔ میں نے کہا: کیا بات ہے وہ فحاشی کے اسباب بھی بتائے گا اور پھر ساڑھے تین منٹ میں اس کو روکنے کی تجاویز بھی بتائے گا۔ تین منٹ میں اسباب اور آدھے منٹ میں ازالہ۔ اور پھر آگے یہ بات تھی کہ صاحب دیکھیے! آدابِ محفل کو ملحوظ رکھیے گا۔ کیونکہ بیک وقت سب بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو بات ایک سائیڈ سے شروع ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! پہلے تو یہ بتانا چاہیے کہ فحاشی کی Definition کیا ہے یعنی فحاشی کہتے کسے ہیں؟ پہلے تو یہ بتائیے۔ یہ اگلی بات تو پھر آئے گی۔ پتہ تو چلے کہ فحاشی ہوتی کیا ہے؟ ایک نے بات شروع کی' ساڑھے تین منٹ کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے کہا کہ صاحب

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)۔ [2] علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938)

Marfat.com

بات تو پوری ہونے دیجیے۔ اس نے کہا کہ جی باقیوں کی بھی بات ہے۔ تو اس کی Definition یوں کٹ کے آدھی رہ گئی۔ دوسرے نے بات شروع کر دی۔ وہ ابھی چار فقرے بھی بولنے نہیں پایا تھا کہ بیک وقت تین چار بول اٹھے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ "صاحب! خاموش خاموش خاموش"۔ انہوں نے بھی کہنا شروع کیا تو جو باقی خاموش بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بھی کہا کہ "خاموش خاموش"۔ "سارے بولن لگ پئے" ❶۔ بہرحال انہیں خاموش کرایا۔ میرا خیال ہے کہ پندرہ منٹ کا سارا وقت ہوگا۔ تیسرا یا چوتھا تھا جس نے Definition شروع کی' تو انہوں نے کہا کہ اب آپ کا شکریہ' وقت پورا ہو گیا۔ جی قوم نے اسباب بھی دریافت کر لیے' ازالہ کی تدابیر بھی کر لیں اور اس کے بعد حسب معمول اس میزبان نے وہ رٹے ہوئے فقرے دہرائے کہ "آپ نے آج آدابِ صبحگاہی کے تحت یہ اتنے بڑے اہم موضوع کے اوپر' اتنے اتنے بڑے دانشورانِ قوم کو سنا اگرچہ وقت کی کمی تھی لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس سمندر کو اس طرح کوزے میں بند کر دیا ہے" کہ "اوٹو ٹا ہویا لوٹا' اوہدے اچوں سارا ای پانی وگ گیا اے" ❷۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا: دعا کرو جی' لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ قوم کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ یہ میں نے کہا تھا کہ یہ تھا جو کچھ TV کے اوپر ہوا۔ پہلے تو ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ آیا اس فحاشی کے مسئلے کا قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ یعنی یہ ایک جنسی مسئلہ بالکل انفرادی سی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جنسی مسئلہ بس یونہی ایک انفرادی سا مسئلہ ہے۔ اسے قوموں سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ عام طور پر نوجوانوں کی طرف سے' امریکن لہجے میں جب وہ انگلش بولتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم الٹرا ماڈرن (Ultra-modern) ہو گئے ہیں۔

قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر اور ڈاکٹر انون (J.D. Unwin) کی تحقیق

آپ کو یاد ہوگا کہ میرا تو یہ موضوع بیس برس سے چلا آ رہا ہے۔ اسے دہراتا چلا جاتا ہوں۔ پچھلے کنونشن ❸ میں بھی تو آپ کو یاد ہے میرا خطاب یہی تھا: جنسی بدنہادی کا قوموں کی اجتماعی حیات پہ اثر"۔ اور قرآن سے تو میں اصول لاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہے اس کی تائید میں یورپ کے جتنے محقق ہیں' ان کی تحقیق ہمارے سامنے آگئی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی غیر مسلم ہوں' کوئی Atheist ہوں' ان میں سے خدا کو بھی شاید نہ ماننے والے ہوں' ان کی تحقیق میں سے ایک تحقیق ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ انون کی ہے۔ آپ کو یاد ہے میں اس کی کتاب کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔ یہ وہ تحقیق نہیں جیسی کہ ہمارے ہاں یوں ہوتی ہے جیسی کہ رات ٹی وی کے مذاکرے میں تحقیق ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ لوگ تحقیق کس طرح سے کیا کرتے ہیں؟ اس شخص نے عمر بھر افریقہ میں بسنے والے وحشی قبائل'

---

❶ سبھی بات کرنے لگے۔
❷ وہ ٹوٹا یا لوٹا ہی ٹوٹ گیا لیکن یہ مسلم ہے کہ اس میں کا تمام پانی بہہ گیا۔
❸ اب یہ خطاب ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف "قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر" کے عنوان سے ایک پمفلٹ کی صورت میں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

Marfat.com

آسٹریلیا میں بسنے والے' جنوبی امریکہ کے نیچے بسنے والے ان قبائل کا اُن کے اندر رہ کے مطالعہ کیا۔ پھر سولہ مہذب قوموں کا مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے کیا کہ قوموں کی موت وحیات پہ تحفظِ عصمت کا کیا تعلق ہے اور اس کے بعد اس نے یہ کتاب لکھی: Sex And Culture ❶ اور اس نے یہ کہا کہ میرے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ یہ بتا رہا ہے اور اس نے حقائق دیئے۔ اس کے ہاں کا ملخص یہ ہے کہ جس قوم نے بھی حفاظتِ عصمت میں لاپرواہی برتی' تاریخِ انسانیت گواہ ہے کہ وہ قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک یعنی سوسال تک زندہ رہ سکتی ہے' اس کے بعد وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ زوال تو اسے دوسری ہی نسل میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور تیسری نسل جس کو وہ کہتا ہے کہ سمجھ لیجیے سوسال کا عرصہ' اس کے بعد تو وہ قوم زندہ قوموں کی صف میں رہتی ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسری قسم کی تدابیر جتنی جی چاہے وہ قوم کر کے دیکھ لے' زوال سے عروج کی طرف نہیں آسکتی۔ یہ مسئلہ بنیادی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ شروع کی نسل میں' پچھلے کا جو دھکا ہوتا ہے' مومنٹم (Momentum)' یہ نسل اس کے زور پہ چل رہی ہوتی ہے لیکن ان کے قوائے فکریہ میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے اور یہ اضمحلال ایک Continuous Process ہے اس کا وہ Effect نہیں ہے کہ یہ ایک جنریشن Generation پر ہی ہو یا ایک فرد پر یا اسی کی ذات یا اسی کے ایک حصہ تک محدود ہے' یہ جتنا اضمحلال آ گیا ہوتا ہے' یہ متواتر اگلی نسل کے اندر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے اضمحلال ان کے قوائے فکریہ' اور عقلیہ اور عملیہ کے اندر جس سے آہستہ آہستہ یہ قوم رو بہ زوال ہوتی ہے اور آخر الامر ختم ہو جاتی ہے۔

لفظ اثم کا مفہوم

آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے جہاں زنا کے متعلق یہ کہا ہے' جہاں اسے جرم قرار دیا ہے۔ اس نے اسے ''اثم'' کہا ہے۔ اثم کے معنی کے لیے لفظ ''آثمہ'' کو دیکھیے۔ عرب آثمہ اس اونٹنی کو کہتے تھے ''جس کے قویٰ اتنے مضمحل ہو جائیں کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے''۔ قرآن کے پاس جرم کے لیے سینکڑوں لفظ تھے۔ آپ کو معلوم ہے عربی زبان کے اندر تو بے شمار مرادفات ہوتے ہیں۔ قرآن نے خود جرم کے لیے متعدد الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہاں اس نے اس نقطہ کا جو مفہوم ہے' اس کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے جس کے یہ معنی ہیں: ''قویٰ کا اس طرح مضمحل ہو جانا کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہ جائے' پیچھے رہ جائے''۔

جنسیاتی امراض میں مبتلا قوم کی حالت

چودہ سو سال کے بعد ایک غیر مسلم محقق اٹھتا ہے اور وہ اس تحقیق تک پہنچتا ہے کہ عصمت (Chastity) کی حفاظت کی طرف سے غیر محتاط ہو جانے والی قوم کے قوائے عملیہ اس طرح سے مضمحل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن کا ترجمہ ہے کہ ان کا Accumulative Effect' مجموعی تاثر جو نتیجہ ہے' وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس نے کہا ہے کہ پھر وہ جو فطرت کی تعزیریں ہیں' وہ

---

❶ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے 1934ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی۔

Marfat.com

اسے زیادہ سے زیادہ سو سال تک کے عرصہ کی مہلت دیتی ہیں۔ وہ اس سے زیادہ عرصے کی مہلت نہیں دیتیں۔ اب آپ نے یہ سوچا کہ نظام سے متعلق یہ جو اتنے بڑے اہم مسائل تھے' اس کے اندر قرآن یہ لایا ہے۔ **وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا** (17:32)۔ زنا کے پاس تک بھی نہ پھٹکو۔ یہ بڑا ہی ناہموار اور بُرا راستہ ہے اور فاحشۃ تو پھر ایسی حدود شکنی ہے جس سے معاشرہ میں فحاشی پھیل جاتی ہے اور چاروں طرف سے بُرائیوں کے راستے کھل جاتے ہیں۔ آگے فحش اور فحشات دو الگ لفظ ہیں لیکن مادہ ان دونوں الفاظ کا ایک ہی ہے۔ اس کا ہمارے ہاں عام ترجمہ بے حیائی کیا جاتا ہے۔ آپ غور کیجیے ان عربوں کی قوم کے الفاظ پر' اس قوم کی وسعتِ خیال کے اوپر میں تو حیران رہتا جاتا ہوں۔

فحش کے نتیجہ میں قوائے اقتصادی کے علاوہ وسعتِ خیال بھی ختم ہو جاتی ہے

میں نے لغات لکھنے کے زمانے میں جوں جوں ان کے الفاظ کی تحقیق کی کہ وہ انہیں کیسے استعمال کرتے تھے تو میں حیرت میں گم ہو جاتا تھا۔ فحش کا نتیجہ ہے کہ جتنے بھی قوائے اقتصادی ہیں' کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں' تَعْنِیف [1] پیدا ہو جاتی ہے۔ جب یہ کمزور ہوتے ہیں تو پھر اقتصادِ رزق کی جو قوت تھی' جو استطاعت تھی' جو استعداد تھی' اس پہ ان کا اثر پڑتا ہے۔ رزق کی کمی واقع ہوتی ہے تو یہیں سے انسان کے اندر ''بخل'' کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ بخیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ قوم اس ابتدائی چیز کو' جسے بے حیائی کہتے ہیں' اسے وہ فحش کہتی تھی اور بخل اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسے ہی فحشہ کہتے ہیں۔ وہ جو شیطان تمہیں فحشہ کا حکم دیتا ہے تو یہ وہی کچھ ہے جب تم جنسی جذبات کو بیباک کر دو' یہ ہو گیا شیطان کا مفہوم' تو آخر الامر اس سے فحشہ کی چیز پیدا ہو جائے گی۔ یہ جو آپ کے ہاں اقتصادی اور معاشی مسائل آ رہے تھے اُن کے اندر قرآن زنا کو لایا ہے۔ کتنا گہرا تعلق ہے ان چیزوں کے ساتھ! یہ ہے اس قرآنِ کریم کے اندر ربط: اس کے قریب بھی نہ جا۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اس پتھر کو پہاڑ کی چوٹی کے اوپر تھامے رکھ۔ وہاں سے ذرا بے احتیاطی برتنا شروع ہوا تو یہ اپنے مومنٹم (MOmentum) ' اپنے ہی زورِ دروں سے' تیزی سے' نیچے آنا شروع ہو جائے گا۔ پھر تم اس کو راستے میں روک نہیں سکو گے۔ اسی لیے اس معاملے میں قرآن ہمارے اس محاورے کے مطابق چور کی بجائے چور کی ماں کو مارتا ہے۔ وہ مبادیاتِ زنا' کو وہ ان محرکات کو' جو اس تک لیجانے کا سبب بنتے ہیں' وہ انہیں وہیں سے روکنا شروع کر دیتا ہے۔

یہ موضوع بہت وسیع ہو گیا۔ ایک ہی بنیادی بات تھی جو میں نے کہی تھی کہ عصمت کی حفاظت کا قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ بڑا ہی گہرا تعلق ہے۔ اس سیلابِ فحاشیات کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان ہے جو اپنی اور بیگانی کے اندر اخلاق سوز حرکتوں کی کوئی تمیز ہی نہیں کرتا' وہ یہاں تک بھی پہنچا ہوا ہو' پھر بھی میں نے کہا تھا کہ اقدار کا نفسیاتی طور پر تحت الشعور تک میں گہرا اثر ہے۔

---

[1] درشتی، بد خلقی

Marfat.com

تنہائی کی حالت میں بھی کنٹرول کی وجہ

میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں' بات سمجھانے کی ہے۔ اس قسم کا جذبات میں گھرا ہوا نوجوان لڑکا' گھر کے اندر' ایک کمرے کے اندر' رات کی تنہائی میں' وہاں سویا ہوا ہے' وہ جذبات کے اندر ڈوبا ہوا ہے' پاس ہی اس تنہائی کے اندر' اس کمرے کے اندر' اس کی جوان نہایت خوبصورت ہمشیرہ سو رہی ہے۔ یہ جذبات کے اندر کتنا ہی زیادہ مغلوب کیوں نہ ہوا ہو' پاگل پن کی کیفیت کو چھوڑ دیجیے یہ اس کی طرف نگاہِ بد اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ یہ اتنا گہرا نفسیاتی' تحت الشعور میں بھی اثر ہے حالانکہ عورت یا لڑکی ہونے کی حیثیت میں ابھی ابھی جس کو اس نے جھپکا مارا تھا اس میں تو فزیکلی کوئی فرق ہی نہیں۔ ایک چیز ہے جو بچپن سے ذہن میں ڈالی ہوئی ہے کہ وہ حرام ہے' وہ غلط ہے۔ اپنے ہاں تو چھوڑ دیجیے۔ یورپ کی اقوام کے اندر بھی ابھی تک یہ چیز ہے کہ یہ بیٹیاں ہیں۔ یہ بہنیں اور یہ مائیں ہیں۔ ذہن میں ڈالی ہوئی یہ ایک چیز ہے۔ اس ایک چیز کے اثر نے ذرا عقیدے کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ وہ عقیدے کی شکل اس قدر سخت گیر ہوتی ہے' انسان کے اندر اس قدر جڑ پکڑ لیتی ہے کہ ان جذبات میں اتنا زیادہ مغلوب ہوا نوجوان بھی آگے نہیں بڑھتا۔ یہ چیز اس کو بھی تھام کے رکھ لیتی ہے' پکڑ کے رکھتی ہے' ہاتھ آگے نہیں کرتا۔ ہاتھ تو رہا ایک طرف' وہ نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا' اسے اس کا خیال تک نہیں آتا۔ قرآن کیسے روکتا ہے اس پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا۔ اس نے جب کہا ہے کہ تمام مومن بھائی ہیں' تو مومن عورتیں بہنیں ہیں بجز اس ایک لڑکی کے کہ جسے خود خدا نے آگے چل کر کہا کہ اس طریقے سے یہ تمہارے ہاں حلال ہو جائے گی۔

اس شدت کے تحفظ کا علاج بہن بھائی کا تصور ہے

قرآن کے دیئے ہوئے ایمان کے تصور کی رو سے تمام معاشرے کی لڑکیاں' تمام معاشرے کی بیٹیاں' اس شخص کی بہنیں ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے یہ کہا: **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ** (49:10)۔ بھائی بھائی مومن مرد ہی نہیں ہوتے' مرد اگر بھائی ہوتے ہیں تو پھر یہ عورتیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ بہنیں ہی ہوتی ہیں۔ اس کے بیان کرنے کے لیے زبان کا اور کیا لفظ ہو! یہ انداز ہمیشہ یاد رکھیے' یہ آپ باقی کتابوں میں دیکھیے گا کہ جس میں قانون دیا جاتا ہے وہاں He کہہ کے اس کو پکارا جاتا ہے اور اوپر دیا ہوا ہوتا ہے کہ

Masculine in gender includes feminine gender

لاء (Law) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں یہ Include ہوتی ہے۔ یہ جو اس نے کہا ہے کہ مومن سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں تو مومنات بھی تو اس کے اندر ہیں۔ ان مومنات کے ساتھ ان کا کیا رشتہ ہوا؟ یہ ان کا وہ رشتہ بتاتا ہے کہ جس رشتے کے تصور کی بناء پر اس قسم کے بیباک جذبے سے مغلوب نوجوان کہ جس کے سر پہ شیطان سوار ہے' اسے بھی ادھر نگاہ اٹھانے نہیں دیتا۔

Marfat.com

حلال وحرام کی حدود

اس ایمان کی رُو سے، جو مسلم یا مومن نوجوان ہیں ان کے لیے دنیا بھر کی لڑکیاں بہنوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کے حکم کے مطابق وہ اس حرام کو حلال قرار دیتا ہے۔ ان باتوں کو ہی یادرکھیے ناں کہ یہ بکرے، یہ مرغیاں، یہ ساری چلتی پھرتی ہوتی ہیں۔ ان کی تو حیثیت ایک جاندار کی ہوتی ہے اور انہیں خدا کے نام پر ذبح کیا جاتا ہے تو حلال ہو جاتی ہے۔ اگر انہیں غیرِ خدا کے نام کے اوپر ذبح کیا جاتا ہے تو حرام ہو جاتی ہے۔ ان لڑکیوں میں سے یہ جو اس سے پیشتر اس کے نزدیک سب بہنیں ہیں، ان میں سے جس کے متعلق وہ اجازت دیتا ہے، کہ حلال کے معنی ہوتے ہیں رسی کھول دینا، کہ لو بھئی یہ ایک لڑکی تمہارے اس زمرے میں سے ہم نے اس کی رسی وہاں سے کھول دی۔ عقد کے معنی ہوتے ہیں وہاں سے گرہ باندھ لی۔ اب تم دونوں آپس میں ایک گرہ باندھ لو۔ ہم نے نکاح کے لیے، عقد کہا ہے۔ یہ ہے کہ اب تم اس کے ساتھ گرہ باندھ لو۔ اس نے گرہ باندھی۔ یہ ہوگئی ایک لڑکی خدا کی طرف سے حلال کردہ جسے بیوی کہا ہے۔ اور اس کے علاوہ جو باقی رہ گئیں پھر وہ بہنیں ہیں۔ اور تاکیدات تو الگ رہیں عزیزانِ من! اس بنیادی حقیقت کو تو دیکھیے، یہاں تو اس ایمان کے بعد دوسرے کی طرف انسان نگاہ بد اٹھا کے بھی دیکھ نہیں سکتا۔ بہرحال قرآن میں تفصیل آگے چل کے آتی جائے گی۔

حفاظتِ عصمت کا معاملہ نہ انفرادی (Individual) ہے، نہ ہی نجی (Personal)

قرآن نے عصمت (Chastity) کی حفاظت پہ بڑا زور دیا ہے۔ نہ یہ انفرادی اور نجی معاملہ ہے اور نہ ہی اس میں کسی کو حق حاصل ہے کہ دخل دے۔ اس کا تو فرد کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ وہ بھی میں بتاؤں گا کہ یہ جو وہاں مغرب میں ماہر نفسیات ہیں، جنسیات (Sex) کے اوپر بہت تجربے کر رہے ہیں۔ انفرادی طور پر وہ جس نتیجے پہ پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ جنسی بدنہادی (Sexual Peversion) سے کس قدر Psychological Complexes پیدا ہوتے ہیں۔ اگر جنسی طور پر انسان اجتماعی طور پر، بیباک ہو جائے تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ ان قوموں کو زیادہ سے زیادہ ایک سو سال تک زندگی ملتی ہے۔ یہ علت اس سے زیادہ مہلت نہیں دیتی اور اس کے بعد پھر قرآنِ کریم حفاظتِ عصمت پہلے لایا اور پھر حفاظتِ جان کا سوال آیا۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (17:23)۔ ترجمہ تو یہ ہے کہ تم ہر وہ جان کہ جسے خدا نے قتل کرنا حرام قرار دیا ہے، اسے قتل نہ کرو۔ یہاں قتل کے معنی ہی وہ ہیں جسے ہم مار دینا یا قتل کر دینا کہتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ حکم ایسا نہیں دیا گیا۔ یہاں کسی کو ''قتل نہ کرو'' کا حکم نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے إِلَّا بِالْحَقِّ (17:23)۔ بجز اس کے کہ حق کا یہ تقاضا ہو جائے کہ کسی کی جان تلف کر دی جائے۔ تو گویا یہاں اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ تحفظِ عصمت کے بعد تحفظِ جان کی طرف آؤ۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ یہ بنیادی قانونِ عدل کا تقاضا ہو۔ اُصول یاد رکھو کہ جس جان کو اللہ نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، اسے مت قتل کرو بجز اس کے کہ ایسا کرنا از روئے قرآن کریم حق کا تقاضا ہو۔

حرم اللہ کا مفہوم

اب یہ جو "حرم اللہ" ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس کا قتل کرنا حرام ہے۔ لیکن نہیں، اس کے معنی قتل نہیں۔ جب لفظ حرم اللہ ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں "جسے واجب التحریم قرار دیا ہے"۔ یہیں سے تو حرمت کا لفظ ہے، یہیں سے احترام ہے، یہیں سے کعبے کو مسجد الحرام کہتے ہیں، کیونکہ یہ تحریم واحترام ہے۔ یہ بھی کبھی آگے چل کے بتاؤں گا جسے ہم حرام کہتے ہیں یا جن چیزوں کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے اس لفظ کا تعلق اس کے مادے ح ر م سے کیا ہے؟ احترام بھی وہیں سے اور حرام بھی وہیں سے ہے۔ حرم اللہ کے معنی یہ ہیں کہ انسانی جان کو اس نے واجب احترام قرار دیا ہے تو جسے واجب احترام قرار دیا ہے پہلے تو یہ کہا کہ اسے ذلیل مت کرو اور پھر یہ بات کہی کہ اس کو ضائع مت کرو۔ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے سلسلے میں انسانی جان کی قیمت کا جو حکم دیا تھا، وہ اس نے ان الفاظ میں بیان کی ہے مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِکَ کَتَبۡنَا عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ (5:32)۔ اب یہ جو کہا تھا اِلَّا بِـالۡـحَقِّ بجز اس کے کہ حق کا تقاضا یہ ہو کہ تم جان لو۔ تو وہ یہاں آ گیا ہے کہ کسی نے کسی کو عمداً قتل کیا ہو۔ یاد رکھیے! قرآن کا یہ لفظ ہے عـمـداً اس کے معنی ہیں بالارادہ قتل۔ اگر یہ قتل سہواً ہو گیا ہو تو قرآن نے اس کے لیے جس کو خون بہا یا دیت کہتے ہیں، وہ سزا مقرر کی ہے۔ اور جو قتل بالارادہ ہے، جو عمداً قتل ہے، قرآن کریم کی رو سے اس کی سزا موت ہے، یہ وہاں چل کے بیان کروں گا۔ بِـغَيۡـرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ (5:32)۔ اس نے کسی کو مار دیا۔ یہاں "فساد فی الارض" ہے صاحب! یہ اتنا بڑا جرم ہے۔ فساد کے معنی بھی میں آگے چل کے بیان کروں گا۔ ہمارے ہاں تو صرف لڑائی جھگڑے کو ہی فساد کہتے ہیں۔ یہ بڑا وسیع المعنی لفظ ہے۔

انسانی جان کی قیمت

بہرحال، اسلامی نظام، قرآنی احکام، کی رو سے جن جرموں کی سزا موت مقرر کرے اور یہ سزائے موت دینا بالحق ہو جائے، تو اس سلسلہ میں کہا کہ اگر کسی شخص نے کسی ایک کی جان کو بھی ضائع کر دیا تو یاد رکھو۔ فَـكَـاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا (5:32)۔ یوں سمجھو کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ ایک جان کی قیمت اتنی بڑی ہے۔ وَمَـنۡ اَحۡيَـاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا (5:32)۔ اور ایک کو زندگی بخش دی، یاد رکھو ایک کی جان بچالی، یوں کہہ لیجیے تو سمجھ لیجیے کہ اس نے نوعِ انسان کی جان بچالی۔ یہ چیز اتنی بڑی قابلِ احترام ہے۔

ایک بات یوں ہی ضمناً یاد آ گئی۔ میں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر صاحب سے یہ بات کہی۔ وہ بڑا Serious سا آپریشن (Operation) کرنے لگے تھے تو یونہی ان کے ساتھ بے تکلفی بھی تھی، باتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب! ایک ذمہ داری تو آپ کے اوپر بحیثیت ڈاکٹر کے عائد ہوتی ہے، وہ تو آپ کو پتہ ہی ہے، کہ یہ بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک وہ دوسری ذمہ داری ہے جو قرآن کی رو سے عائد ہوتی ہے جو کہ بڑی اہم چیز ہے۔ وہ رک گئے۔ میں نے یہ آیت پڑھی، کہ جس کسی نے کسی ایک جان کو بھی

Marfat.com

یوں تلف کر دیا' یوں سمجھو کہ ساری انسانیت کو اس نے تلف کر دیا' جس نے ایک جان بھی بچالی' یوں سمجھیے کہ پوری نوعِ انسانی کو بچالیا۔ یہ آپ جو Operation کرنے لگے ہیں اگر آپ کی بے احتیاطی سے اس مریض کی جان ضائع ہوگئی تو قرآن کی رُو سے ساری نوعِ انسانی کے قتل کے جرم کے مجرم قرار پائیں گے۔ اور اگر آپ نے احتیاط برت کے اس کی جان بچالی' نظامِ خداوندی میں اس سے بڑا نیکی کا عمل اور کوئی نہیں ہوگا۔ آپ پوری انسانیت کو زندگی بخش رہے ہیں۔ موصوف بڑے قلبِ رقیق کے انسان اور فکرِ جمیل کی رسائی کے مالک تھے۔ آپ حیران ہونگے کہ وہ چاقو ہاتھ میں تھا' اس کو لے کے یوں کھڑے تھے۔ کہنے لگے: پرویز صاحب! پتہ ہی نہیں کہ آپ نے تو کیا سے کیا کہہ دیا۔ ایک طرف تو مجھے اس سے ڈر ہی اتنا ہونے لگ گیا ہے کہ اسی سے میرے ہاتھ کانپنے لگ گئے اور اس کانپنے کے بعد جب یہ احساس ہوا کہ اس کی وجہ سے اگر اس کی جان چلی گئی تو وہ کتنا بڑا جرم ہے۔ مجھ میں اتنی قوت پیدا ہو رہی ہے۔ اس توفیق کی دعا کیجیے کہ میری بے احتیاطی سے ایسا نہ ہونے پائے۔ میں نے کہا کہ ان چیزوں کا اطلاق تو بڑی دور تک ہوتا ہے چہ جائیکہ یہ چیز ہو جائے کہ پڑوسی اور ہمسائے کے بچے بھوکے مر جائیں اور تمہیں یہ سبق پڑھایا جا رہا ہو کہ رزق خدا کے ہاتھ میں ہے' وہ دے گا' تم عیش اڑاؤ۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (17:33)۔ غلط معاشرے میں ہوتا کیا ہے؟ کمزور' ضعیف' ناتواں' جن کا جتھہ نہیں ہوتا' جو طاقتور نہیں ہوتے' عام طور پہ گاؤں کی زندگیوں کے اندر یہ بڑے بڑے لوگ روز قتل کر دیتے ہیں' صاحب! کوئی پوچھ ہی نہیں رہا' پوچھتا ہی کوئی نہیں ہے' کبھی تحقیق کی نوبت آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صاحب! یہ سات قتل کر چکا ہے' کانوں کان خبر ہی نہیں ہوتی جس کا جتھہ مضبوط ہو ان کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے' ناحق چڑھائی کر کے دوسرے ملک کے اوپر لاکھوں کا قتل کر دینا یہ تو اور بات رہی۔ انفرادی طور پہ یہ ہوتا ہے کہ غریب اور کمزور آدمی کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ وہ روز کہتا ہے کہ صاحب! تھانہ والے مجرموں کے خلاف ایف آئی آر (F.I.R) ہی نہیں لکھتے' ان سے ڈرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ ہمارے نظام' ہمارے معاشرے میں' یہ بات نہیں ہوگی۔

قتل کا بدلہ نظام لے گا' کوئی فرد نہیں۔

قرآن نے کہا کہ یہ جو قتل کر دیا گیا ہے' اس قتل کی سزا دینے کے لیے' اس کا بدلہ لینے کے لیے' اس فرد کا کام نہیں ہے۔ یہ جو اس کے باقی وارث ہیں' یہ ان کی بات بھی نہیں ہے۔ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا (17:33)۔ ہم نے وہ لوگ مقرر کیے ہیں جو اس کی طرف سے قوت اور غلبہ رکھتے ہیں۔ یہ بدلہ لیں گے' ہمارا نظام بدلہ لے گا' وہ پولیس جو غریب کمزور کی ایف آئی آر نہیں لکھتی خدا کی طرف سے یہ جو اس مقتول کے ولی ہیں' وارث ہیں' غریب ہیں' کمزور ہیں' یہ لوگ ان کی مدد کے لیے سلطٰنا ہیں۔ بڑی قوت اور غلبہ رکھتے ہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (17:33)۔ لیکن ایک بات کی وارننگ (Warning) ہم تمہیں دیدیں: یہ کہ ہم نے کہہ دیا ہے کہ یہ لوگ تمہاری مدد کے لیے

Marfat.com

جائیں گے تو اب اس مدد کے لیے نظامِ باطل کے اوپر ایسا نہ کرنا کہ قتل تو ایک نے کیا ہے اور اس میں چار کے نام لکھا دو۔ یہ تمہیں بھی نہیں کرنا، ہم مدد کریں گے لیکن اس مدد کے یہ معنی نہیں ہونگے کہ اب تم یہ کرنا شروع کر دو کہ مجرم ایک ہے اور چار چار کو پھانسی کے تختے پہ لٹکوا دو۔ یہ بات نہیں ہوگی۔ یہاں حفظِ نفس آ گیا۔ اب آگے ان یتیموں کی حفاظت آتی ہے جو اس قتل کے بعد لاوارث رہ جاتے ہیں۔ قرآن کی تعزیرات میں ایک بات یاد رکھیے۔ یہ میں بتا دوں کہ ہماری تعزیرات میں، دنیا بھر کی تعزیرات میں، آپ کے ہاں چوری ہو جاتی ہے یا آپ کو کسی شخص نے کچھ ایسا مارا کہ آنکھ پھوٹ جاتی ہے، اندھا ہو جاتا ہے، چوری ہو جاتی ہے۔ فرض کرو مال برآمد نہیں ہوتا، اسے چھ مہینے کی قید ہو جاتی ہے۔ وہ جو آپ کی چوری ہوئی ہے، وہ جو آپ کا نقصان ہوا ہے، وہ تو کوئی پورا نہیں ہوا یعنی اس کو تو اس کے جرم کی کہیے سزا ملی۔ یہ جو اس چور کی چوری کی وجہ سے آپ کو سزا ملی تھی کہ گھر کا سب کچھ اٹھ گیا تھا، وہ نقصان تو ویسے کا ویسے ہی بحال رہا۔ اسے پورا کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ یہاں آتی ہیں قرآنِ کریم کی تعزیرات۔

کسی قسم کے نقصان پر مدعا علیہ نظامِ حکومت ہوگا

قرآن کی تعزیرات یہ ہیں کہ معاشرے میں جرم کی بناء پر کسی کا کوئی نقصان جو ہوا ہے، یہ آپس میں مدعی اور مدعا علیہ ہیں ہی نہیں۔ مدعی تو ہر حال میں یہ نظام ہے، یہ حکومت ہے۔ یہ جانے، مدعا علیہ جانے۔ اس حکومت کا فریضہ ہے کہ پہلے تو اس کا نقصان پورا کرے۔ اور وہ کہتا اس لیے ہے کہ اگر چور نے چوری کر کے اس کو نقصان پہنچایا ہے تو یہ حکومت کی ہی ذمہ داری ہے کہ اس نے انتظام کیوں نہیں کیا تھا کہ اس کے گھر چوری کیوں ہو۔ کیا یہ ہر فرد کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو ذاتی طور پہ محفوظ کرے۔ ناممکن ہے۔ اگر ذاتی طور پہ یہ حفاظت ہو سکتی تو پھر حکومت کے Institution کی، حکومت کے ادارے کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ تو ضرورت اس لیے پڑی تھی کہ ذاتی طور پر اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اگر اس چوری میں اس کی اپنی بے احتیاطی کا کوئی دخل نہیں ہے اور یہ اس لیے ہوا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس کا انتظام پورا نہیں ہو سکا تو اس کی جو تلافی ہے، وہ پوری کرنی پڑے گی۔ اب یہ جو جرم کیا ہے، وہ حکومت کا کیا ہے۔ وہ تو اس کو حکومت کا جرم قرار دیتا ہے۔ یہ اس کی سزا دے۔ انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ اس کا نقصان پورا ہو۔ اس کو جرم کی سزا ملے۔ یہ ایسا انتظام کرے اور بہر حال حکومت کا انتظام بھی تو یہ نہیں کہ چار آدمی اوپر بیٹھیں، ان میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ ہر جگہ انتظام کرتے پھریں، تعاون تو انہیں کرنا ہوگا جنہیں آپ عوام یا پبلک یا ملک کے باشندے کہتے ہیں۔ اِن سب کے تعاون سے ملک کا ایک نظام بنتا ہے۔ وہ تقسیمِ کار ہے جس کی رو سے کچھ لوگوں کے ذمے یہ لگتا ہے، کچھ لوگوں کے ذمے وہ بات ہوتی ہے۔ اس میں تعاون ہر ایک کا ہوتا ہے۔ یہ ہے بنیاد اس نظام کی۔ ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 33 تک پہنچ گئے۔ 34 ویں آیت سے ہم پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

Marfat.com

آٹھواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 34 تا 38)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ
اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا
الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَلَا تَقْفُ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ
فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ
رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

عزیزان من! آج جولائی 1975 کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 34 سے ہو رہا ہے۔ (17:34)۔

قرآن کی پوری تعلیم اصول و اساس پہ مبنی ہوتی ہے

آغاز کلام سابقہ احکام کے تسلسل میں ہی ہوگا۔ آپ کو یاد ہے کہ ان آیات میں قرآنِ کریم نے کچھ معاشرتی احکامات دیئے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم معاشرتی احکام دے یا معاشی' سیاسی دے یا تمدنی' اقوامی دے یا بین الاقوامی' ان سب کی بنیاد اس کے اصول اور اساس پہ ہوتی ہے' مستقل اقدار پر ہوتی ہے۔ اور اسی لیے وہ صرف احکام کو' صرف احکام کی حد تک نہیں دیتا' اس کے اندر اپنی اساس اور بنیاد کو ضرور شامل رکھتا ہے۔ ان میں بھی آپ دیکھیں گے کہ یوں تو یہ احکام ہی ہیں لیکن ان کے اندر اس کی وہ بنیاد شامل ہے کہ یہ سب مستقل اقدار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ کوئی حکم' جو عارضی حیثیت سے دیا جائے' اسے تو حکم کہا جا سکتا ہے لیکن اگر وہی حکم غیر متبدل ہو اور مستقل حیثیت اختیار کر لے' تو اسے قانون (Law) کہا جاتا ہے' وہ قانون بن جاتا ہے۔

Marfat.com

دین کی بنیاد ثبات اور تغیر کے امتزاج پر ہے

قرآن کے یہی احکام غیر متبدل بھی ہیں' ابدی (Eternal) بھی ہیں' ان کی بنیاد بھی ازلی اقدار پر ہے تو اسلیے یہ احکام عام معنی میں تو احکام ہی ہیں لیکن درحقیقت قرآنِ کریم کے غیر متبدل قوانین ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی Application میں' ان کے اطلاق میں' عملاً ان کے نفوذ میں' اِن کے طریقہ کار کا اختلاف تو ہو سکتا ہے۔ حالات کے اعتبار سے ان کی جزئیات (Bye Laws) بھی مرتب کی جاسکتی ہیں لیکن جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے' یہ غیر متبدل اقدار ہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہے دین کی وہ بنیاد جسے میں اکثر ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے امتزاج سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ اصول' اقدار اپنی جگہ غیر متبدل اور ان کے Apply کرنے کے طریقہ کار' جزئیات' تفصیلات' زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے بدلتے ہوئے۔ ایک دین کہ جس کو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہنا ہے اس کا انداز ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال ان احکام میں پہلے تو یہ چیز کہی گئی تھی کہ تمہارے مال میں ان کا حق ہے کہ جن کی ضروریات اپنی محنت سے پوری نہ ہو سکتی ہوں۔ ان کا حق ہے' وہ As of Right ڈیمانڈ (Demand) کر سکتے ہیں۔ اسے قرآن نے خیرات نہیں کہا۔ اب یہ دیکھیے کہ اس میں کتنی بڑی اصولی چیز آ گئی کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسانی بچہ کو انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

خیرات میں احترامِ انسانیت کی نفی ہو جاتی ہے

اگر آپ خیرات دیتے ہیں تو بات احترامِ انسانیت کے منافی ہو جاتی ہے۔ دینے والے کے دل میں ایک احساسِ برتری Superiority Complex پیدا ہوتا ہے' لینے والے کے اندر احساسِ کمتری Inferiority Complex پیدا ہوتا ہے۔ شرفِ انسانیت سے دونوں محروم ہو جاتے ہیں اور اگر اسے بطور حق کے لیا جائے اور دوسرے کے حق کے طور پر اسے دیا جائے تو اس میں یہ صورت پیدا ہی نہیں ہوتی' نہ دینے والا کوئی احسان رکھ کر دیتا ہے' نہ لینے والا اسے خیرات سمجھ کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر پہلا حکم یہ تھا کہ دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کے لیے اسے دو۔ پھر اس کے بعد یہ کہا تھا کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ جو اپنی ضروریات سے زائد ہو' وہ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ''بطور حق انہیں دے دیجیے'' تو سوال اپنی ضروریات کا تھا۔ یہاں پھر یہ اصول بیان کر دیا کہ ''نہ تو ایسا ہاتھ کھلا چھوڑتے ہوئے دو کہ وہ کنوئیں سے پانی نکلے' کھیت تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہی وہ جو راستے میں نالیاں (یا آڈاں جنوں کیندے نیں) ❶ ہیں' انہی میں سے بہتا ہوا کچھ اِدھر نکل جائے' کچھ اُدھر نکل جائے۔ یہ اسراف ہوتا ہے۔'' اور تبذیر یہ ہوتی ہے کہ ''ایسی صورت نہ پیدا کی جائے کہ جو اناج' جو غلہ' جو دانے' بونے کے لیے رکھے ہیں' انہیں بھی پسوا کر کھا لیا جائے۔'' دیکھتے ہیں الفاظِ قرآنی کیا چیز دیتے ہیں!

---

❶۔ جنہیں بزبانِ پنجابی ''آڈاں'' کہتے ہیں۔

Marfat.com

قرآنی معاشرے کی تیاری اور تشکیل کے مختلف پہلو

قرآن تو اپنے الفاظ کے انتخاب اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔ خیر' آگے یہ کہا تھا کہ اولاد کی تربیت ماں باپ کا حق ہے۔ صرف پرورش ہی نہیں' پرورش تو حیوانات بھی کرتے ہیں۔ تربیت کی ضرورت انسانی بچہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں علم و تربیت سے محروم نہ رکھو' اس لیے کہ تمہیں ڈر ہے کہ اس سے کچھ خرچ ہو جائے گا' تو ہم مفلس ہو جائیں گے۔ ایسا بالکل نہیں۔ تم دیکھو گے کہ ہم یہاں ایسا نظام قائم کریں گے کہ وہ تمہاری اور ان کی ضروریات کو پورا کرے گا۔ بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت سے محروم نہ رکھو۔

اس کے بعد حفاظتِ عصمت کا سوال آیا تھا اور اس نے صرف یہ جو جنسی اختلاط کا فعل ہے' اس کی بات تک نہیں کی۔ کہا: **لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی** (17:32)۔ کہ ان حدود کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ حدود وہی ہیں جنہیں مبادیاتِ زنا کہا جاتا ہے' جنہیں فحش اور بے حیائی کہا جاتا ہے' جنہیں تہمت تراشی کہا جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں ان حدود کے اندر آجاتی ہیں کہ یہ نہ کہو' وہ نہ کہو۔ اور میں نے کہا تھا کہ اس نے کہا یہ ہے کہ اس سے انسانی قوتیں' وہ فکری ہوں یا طبعی ہوں' ان میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس کو 'اِثْمٌ'' کہا ہے اور میں نے کہا تھا اب تو مغرب کے محققین اس نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ جو قومیں عصمت کی حفاظت نہیں کرتیں' وہ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ اقوام میں شمار ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا زوال' وہ تو پہلے ہی شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ اسکے بعد تو پھر وہ مردہ قومیں ہو جاتی ہیں۔ اور یہ صرف عصمت کے اعتبار سے ان لوگوں نے کہا ہے۔ یہ مغرب کے محققین کی تحقیق ہے۔

اس کے بعد حفاظتِ نفس یا حفاظتِ جان آ گئی۔ اس کی تو کتنی اہمیت بیان کی ہے۔ کہا کہ اگر کسی نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھیے جیسے اس نے پوری انسانیت کو تلف کر دیا اور جس نے کسی ایک کی جان بچالی' یوں کہیے کہ اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچالی۔ اس کے نزدیک انسانی جان کی اتنی اہمیت ہے لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ اس نے ہر حالت میں اس انسانی جان کو تلف کرنے سے منع کیا ہے۔ **اِلَّا بِالْحَقِّ** (17:33) کہا ہے اور الحق وہ ہے جو'' قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے قوانین اور تقاضوں کے ماتحت کوئی کام کرنا ہے۔'' یہ پھر دوسری چیز چلی جائے گی اور اس کے بعد اس نے یہ کہا تھا کہ یہ جو مقتول کا وارث ہے' وہ اگر کمزور ہے' ناتواں ہے' بے سہارا ہے' تو وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ بے سہارا ہے اور وہ کسی بڑے آدمی سے' جو قاتل ہے' کس طرح سے انتقام لے سکتا ہے' بدلہ لے سکتا ہے۔ اس کے لیے ہم نے صاحب تقویت نظام مقرر کیا ہے۔ یہ قتل کا کیس اس کا نہیں ہوتا' یہ ہمارا ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے لیے انتظام کرتے ہیں۔ ہم اس کی تقویت کا سہارا بنتے ہیں۔ ہم اس کے لیے سلطان مقرر کرتے ہیں۔ لیکن کہا کہ اس خیال سے کہ صاحب کو تو اب ڈر کا ہے کا' وہ تو خود خدا نے کہا ہے کہ ہم تمہارے لیے تمہارے پشت پناہ ہیں' یہ سہارے مقرر کرتے ہیں۔ قتل کے انتقام میں یا اس سلسلے میں یا اس جرم کی سزا میں مبالغہ نہ کیا کرو۔ زیادتی مت کرو۔ عدل کا جو تقاضا ہے وہیں تک آؤ۔ یہ نہ کرو کہ اس قانون کو اپنے ہاتھ میں لے

لو اور ایک قاتل کی بجائے اس کے پورے کنبے کو جا کے قتل کر دو۔ بہر حال اس کی تفصیلات اور ہو سکتی ہیں۔ قرآن تو اصولی بات بتاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے کہا: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (17:34)۔ تو قتل کے بعد یہ چیز عام طور پہ سامنے آتی ہے جو دراصل قتل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہ جاتے ہیں۔ تو ''قتل النفس'' کے فوری بعد قرآن کریم ان بچوں کی طرف آیا۔ پہلے تو اس نے اولاد کے متعلق وہ ہدایات دی تھیں کہ وہ تمہاری اولاد ہے۔ اب وہ ان بچوں کی طرف آ گیا جو تمہاری اولاد تو نہیں ہیں اور ان کے ماں باپ بھی زندہ نہیں ہیں۔ ہم انہیں یتیم کہتے ہیں۔

یتیم کا قرآنی مفہوم

میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن کے اس لفظ یتیم کے معنی کیا ہیں؟ عربی زبان میں بھی اور قرآن کے استعمال کی رو سے بھی ''یتیم'' صرف اسی بچے کو نہیں کہتے جس کے ماں باپ مر چکے ہوں بلکہ ''ہر وہ فرد جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے'' اسے یتیم کہا جاتا ہے۔ لڑکیاں جب تک ان کی شادی نہ ہو جائے، یتیم ہیں اور عورتیں جب بیوہ ہو جائیں' تو انہیں بھی قرآنِ کریم یتیم کہہ کر پکارتا ہے۔ اور وسعتِ معانی کے اعتبار سے ہر فرد، جو معاشرے کے اندر تنہا رہ جائے، وہ اسے بھی یتیم کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن یہاں' اس آیت میں چونکہ قتلِ نفس کے بعد یہ ذکر آیا ہے لہٰذا یتیم وہ ہیں کہ جن کے ماں باپ نہ رہیں اور وہ تمہاری زیرِ تربیت' زیرِ نگرانی آ جائیں۔ اگر ان کی کوئی پراپرٹی (Property) ہے' کوئی جائیداد ہے تو وہ بھی تو تمہارے زیرِ نگرانی ہوگی۔ کہا کہ یتیموں کے مال کو خود نہ کھاؤ۔ اس میں ایک ذرا سی اِسْتِشْنَا (Exception) رکھ دی ہے۔ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (17:34)۔ بجز اس صورت کے جو اس کے انتظام کے لیے ضروری ہو۔ گویا اس میں اس کے لیے گنجائش ہے۔ یہاں کہا: هِيَ اَحْسَنُ (17:34)۔ کہ وہ انتظام کی صورت عمدہ طریق سے ہو۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور اس کے لیے ایک مثال

میں یہ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات ہے۔ اگر اس نے ایک بات ایک مقام پہ کہی ہے تو اس کی مزید تفصیل' تشریح' تفسیر' تاویل' خود ہی کسی دوسرے مقامات پہ کر دی ہے۔ قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو بات اس نے کہی ہے' اس کے متعلق یہ دیکھا جائے کہ دیگر مقامات میں اس نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔ اگر وہ سارے کے سارے مقامات بیک وقت آپ کے سامنے آ جائیں' بیک وقت! تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن کس طرح نکھر کر اور واضح ہو کر سمجھ میں آ جاتا ہے اور میں نے عرض کیا تھا کہ بات تو بڑی ہے' منہ چھوٹا سا ہے اب تو یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ چالیس سال تک میں نے قرآن کو اسی طرح تصریفِ آیات کے ذریعے سے سمجھا ہے اور آخر الامر میں نے پھر کوئی دس سال کی محنت کے بعد جو ''تبویب القرآن'' مرتب کیا ہے' وہ ہے ہی یہ کہ ایک موضوع پر قرآنِ کریم میں کہاں کہاں اور کیا کیا آیا ہے' وہ تمام یکجا متعدد عنوانات کے تحت جمع کر دیا ہے۔ وہ تو بڑی ضخیم چیز ہے' بڑی

Marfat.com

ضخیم کتاب ہے ظاہر ہے اس کو ضخیم ہی ہونا چاہیے۔ لیکن بہر حال مرتب شدہ ہے اس کی کتابت بھی ہو رہی ہے۔ ❶

قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کوئی ایک آیت تنہا لے کے اس کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ ہمارے ہاں جتنی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ایک تو وہ ہیں جو اس کے غلط تراجم کی وجہ سے ہوتی ہیں اور دوسرے یہ ہوتا ہے کہ ہر آیت کو وہیں رکھ کے اور وہیں اس کے متعلق کچھ بات کرنی شروع کردیتے ہیں دیگر مقامات کو سامنے لاتے ہی نہیں ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے یعنی تصریف آیات کے ذریعے سے۔ ابھی قرآن کی آیت یہیں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ ہم نے اپنی بات بتانے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں هِيَ أَحْسَنُ (17:34) کہا ہے۔ بہترین طریقہ حسین ترین طریقہ مناسب ترین طریقہ کچھ معنی کر لیجیے۔ اب یہ طریقہ کیا ہے؟ سورۃ النساء کی آیت 6-4:5 اور دیگر مقامات بھی ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک ہی مقام سامنے لارہا ہوں پہلے تو اصول بیان کیا اور عجیب اصول ہے۔

یتیم سے بھی اگلا لفظ

کہا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (4:5)۔ اس آیت میں لفظ **سفھآء** دیکھیے: ”وہ لوگ جو اپنے مال و دولت کی حفاظت اس کا انتظام اس کو سنبھال کر رکھنے کے لیے عقل و دانش نہ رکھتے ہوں“۔ کہا کہ ان لوگوں کی حفاظت بھی تمہارے ذمہ ہے۔ یتیم سے بھی ایک اگلا لفظ آگیا۔ یہ کورٹ وارڈ (Wards) مقرر کرتے ہیں۔ عام طور پہ تو یہ وارڈ وہی ہوتا ہے جو یتیم رہ جائے۔ لیکن وارڈ وہ بھی ہوتا ہے کہ (مثلاً وہ) کچھ تھوڑا سا پاگل سا ہے عقل و ہوش پورے طور ٹھکانے پہ نہیں اس قابل نہیں کہ اپنی پراپرٹی کا آپ انتظام کر سکے۔ تو وہ خواہ جوان بھی کیوں نہ ہو جائے اس کا احوال بھی اس کیٹگری میں آگیا۔ کہا: اس کے مال کی حفاظت کرو اور وہی جو میں نے کہا کہ قرآن نے یہاں اصول بیان کر دیا۔ کہا کہ یہ نہ کہو اپنے ذہن میں یہ نہ سمجھو کہ یہ اس کا مال ہے اس کی جائیداد ہے اس کی پراپرٹی ہے وہ جیسے جی میں آئے کرے: ضائع کرے فضول کرے اپنی سفاہت کی وجہ سے پاگل پن کی وجہ سے حماقت کی وجہ سے جو مرضی کرے اس کا جہاں جی چاہے خرچ کرے اس میں میرا کیا ہے۔ کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ یہ ویلتھ آف دی نیشن (Wealth of the Nation) ہوتی ہے۔ **جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا** (4:5)۔ یہ دولت تو تم سب کے قیام کا ذریعہ ہے تو اس کی Wastage اس کا ضائع ہونا کسی ایک فرد کی دولت کا ضائع ہونا نہیں ہے۔ یہ تو تمہاری قومی معیشت ہے۔ **جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ**

---

❶ - یہ ضخیم کتاب (Quran- Classific) تبویب القرآن کے نام سے ادارہ طلوع اسلام لاہور سے بار اول ۱۹۷۷ء میں تین ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کی جلد اول ۶۱۶ صفحات جلد دوم ۴۶۲ صفحات اور جلد سوم ۴۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح بتویب القرآن کی یہ ضخیم کتاب ۱۴۲۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جن میں ۸۴ صفحات مراحل طلب و تجسس اور انڈکس بتویب القرآن ان پر مستزاد ہیں۔

Marfat.com

قِيٰمًا (4:5)۔ تمہاری قوم کا اپنے پاؤں پہ آپ کھڑے ہونے کا دار و مدار اس ویلتھ کے اوپر ہے۔ میں نے کہا تھا عزیزانِ من! بظاہر حکم تو محدود سا ہوتا ہے لیکن اس کے اندر بہت بڑی چیز شامل ہوتی ہے۔ کسی ایک فرد کے مال یا پراپرٹی کو "لکم" کہنا اور وہ بھی "لَكُمْ قِيٰمًا" کہنا بہت بڑی چیز ہے۔ "لَكُمْ" میں تو ساری ملت آ جائے گی اور جب ہم آگے بڑھیں گے' اس عمل (Process) کو بڑھائیں گے تو اس میں پوری انسانیت آ جائے گی۔ یہ اس ایک فرد کا ہی معاملہ نہیں ہے۔ اس میں تو پوری کی پوری انسانیت سمٹائے ہوئے ہوگی۔ اگر اسے اُس ایک امت تک بھی محدود رکھیے' ملت تک محدود رکھیے' اسی ایک مملکت تک محدود رکھیے تو کہا: یہ تو تم سب کے لیے باعث قیام ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے بے اعتنائی نہ برتو کہ مجھے کیا صاحب! اس کا جاتا ہے' ہمارا کیا جاتا ہے۔ اور غلط نظام میں تو افرادِ ملت کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے: روز آپ نے سنا ہوگا کہ "اوئے گتہ کیوں اتارنا پیاں ایس ریل دا؟ تیرے پیو دا کجھ جاندا پیگا اے سرکاری مال اے۔ سرکاری مال اینوں سمجھیا ہو یا ہوندا' جیویں لاوارث دا مال ہونداں اے' جیہدے اچ میرا کوئی دخل نہیں' میرا کوئی نقصان ای نئیں ہیگا جس طرح مرضی تباہ ہوئے"۔ ❶

اجتماعی زندگی کے قیام کا راز

وہ فرد کے مال کو کہتا ہے کہ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (4:5)۔ یہ قرآن ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ فرد کا یہ مال تمہارا مال ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ مال تمہاری اجتماعی زندگی کے قیام کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا جب وہ مال اجتماعی زندگی کے قیام کا ذریعہ بن جائے تو پھر اس کی حفاظت ہر فرد پر لازم ہو جاتی ہے۔ یہ جو اس وقت آپ دیکھتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ صاحب! کیا ہوا سرکاری مال ہے' کھاؤ' وہ یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مال جسے ہم ملت کا' امت کا مال کہتے ہیں' امت کے قیام کا ذریعہ نہیں بن رہا۔ بہرحال آپ دیکھ رہے ہیں' قرآن ایک ایک لفظ کے اندر کیا کچھ کہہ جاتا ہے! وَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ (4:5)۔ یہ جن کا مال تحویل میں لو تو اس کے کھانے پینے کا انتظام کرو' خورد و نوش کا انتظام کرو' اس کی ضروریاتِ زندگی پوری کرو۔ اور آگے یہ ہے کہ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (4:5)۔ اور ساتھ کے ساتھ یہ بات اتنی ہی نہیں ہے کہ ان سے بات کرو تو قاعدے کے مطابق کرو بلکہ کہا: قُوْلُوْا اس "قُوْلُوْا" کے اندر تربیت آ جاتی ہے۔ کہا: معروف طریقے پہ' جانے پہچانے طریقے پہ' قانون کی رو سے ایسا کچھ کرنے کی کوشش کرو کہ باتوں ہی باتوں میں اس کی تربیت بھی ہوتی چلی جائے۔ اگر سفاہت' اس کی بیوقوفی' یا غفلت کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے تو اسے دور کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس کے

---

❶ ۔ ارے احمق! ریل گاڑی کا یہ گتہ کیوں اتار رہے ہو؟ (اس نے کہا:) کیا یہ اتارنے سے تمہارے باپ کا کچھ نقصان ہو رہا ہے؟ یہ تو سرکار کا مال ہے۔ سرکار کے مال کو اس طرح سمجھا ہوتا ہے جس طرح کہ یہ کسی لاوارث کا مال ہو جس میں میرا قطعاً عمل دخل نہیں ہے۔ چونکہ اس میں میرا ذاتی کوئی نقصان ہی نہیں ہے۔ اس لیے جس طرح مرضی تباہ ہو' مجھے کیا۔

Marfat.com

ساتھ یہ کہا کہ سفاہت میں تو چھوٹے بچے بھی آ جائیں گے، بڑے آدمی بھی آ جائیں گے۔ اب یتیم کا لفظ آیا کہا: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6)۔ یتیموں کی پرورش کرو اور ان کے اوپر نگاہ رکھو کہ وہ کس طرح سے پروان چڑھتے ہیں۔ یہاں پہ اس میں ایک اور نقطہ آ گیا ہے۔ قرآن کریم اسے ختم کر کے، پھر اس موضوع کو لیتا ہے۔ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (4:6)۔ یہ وہی بات آ گئی۔ ان کے اوپر نگاہ رکھو جب وہ بالغ ہو جائیں اُن میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے مال و دولت کی، اپنی جائیداد کی، اپنی پراپرٹی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (4:6)۔ تو اُن کا وہ مال اُنہیں واپس دے دو، وہ مال ان کے سپرد کرو۔ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (4:6)۔ اور دیکھو جب تک وہ مال تمہاری تحویل میں رہے، یہاں پھر وہی اسراف آیا ہے، اُسے جہاں خرچ ہونا ضروری ہے وہیں خرچ کرو۔ پانی کو کھیت تک پہنچاؤ، یہ بڑا ضروری ہے، اسے ضائع مت کرو۔ تم ان کے مال کو ضائع مت کرو اور اسی آیت میں اگلی بات یہ ہے کہ وَبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (4:6)۔ خاص طور پہ جب دیکھو کہ وہ بڑا ہو رہا ہے اور اب تو صاحب! بس اگلے سال یہ بالغ ہو جائے گا اور یہ سب کچھ لے جائے گا تو تمہارے دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو کہ اسے لُوٹنا ہی شروع کر دو۔

انسانی نفسیات پر قرآن حکیم کی نگاہ

قرآن کریم کس طرح انسانی نفسیات پہ نگاہ رکھتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ غلط معاشرے میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب وہ تقریباً بڑا ہونے لگتا ہے تو اس وقت پھر کیا کیا ہتھکنڈے کیے جاتے ہیں۔ باقی یہ رہا کہ تم اس میں سے کتنا لے سکتے ہو۔ کہا: وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ (4:6)۔ جس کی ضروریات آپ پوری ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ اپنا وقت دے رہا ہے، لیکن اسے کسی قسم کی محتاجی نہیں ہے، تو وہ تو اس کی دولت سے کچھ بھی نہ لے۔ فَلْيَسْتَعْفِفْ (4:6)۔ دیکھیے قرآن ''عفف'' کا لفظ کہاں لایا ہے: اس ترغیب و کشش و جاذبیت کے باوجود کہ جو اس مال کے اندر تمہیں ایک کشش نظر آتی ہے یہ وہاں لایا ہے۔ ابھی اس نے زنا کے معاملہ میں کہا تھا کہ جو جنسی کشش نظر آتی ہے اس میں ''عفف'' (24:33) کو قائم کرو۔ یہ لفظ وہاں بھی آیا ہے۔ فَلْيَسْتَعْفِفْ (4:6)۔ قرآن نے وہی لفظ یہاں بھی استعمال کیا ہے۔ بات تو ساری کشش جاذبیت کو روکنے کی ہے۔ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (4:6)۔ اور جس کو ضرورت ہو، جو ضرورت مند ہو، اس کی جائیداد کے انتظام کے لیے اپنا وقت دے رہا ہے، محنت دے رہا ہے، تو اس کی وجہ سے اس کی اپنی آمدنی میں فرق پڑ رہا ہے، اس طرح وہ تنگ دست ہو رہا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ صاحبِ احتیاج ہو گیا ہے تو وہ قاعدے اور قانون کے مطابق، حق الخدمت لے لیا کرے۔ یہاں قرآن نے ''بالعروف'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ ''معروف'' سے ہے، یعنی قاعدے اور قانون کے مطابق۔

جب کوئی چیز واپس کرو تو معروف طریق سے کرو

یاد رکھیے! معروف قرآن کی رو سے ''قانون کے مطابق بھی آتا ہے اور معیشت کے مطابق بھی آتا ہے۔'' بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہ وہ جانا پہچانا ہوا طریقہ ہے جسے معروف کہتے ہیں' باقی جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں' 420 ہوتا ہے' وہ معروف نہیں ہوتا' اس کا طریقہ جانا پہچانا نہیں ہوتا' وہ انجانے طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ تو معروف میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جس کو ہر شخص جانے کہ یہ چیز یوں ہورہی ہے خواہ وہ قانون کی شکل لے لے یا جانے پہچانے طریقے سے تمہارے ہاں کے رواج کی شکل لے لے۔ اور پھر جب اسے آگے بڑھائیں گے تو قرآنِ کریم ''امر بالمعروف' نہی عن المنکر'' کہے گا تو وہاں المعروف کے معنی وہ ہونگے جسے قرآنِ کریم Recognize کردے۔ جس بات' جس طریقے کو بھی قرآنِ کریم Recognize کرلے' اسے المعروف کہا جائے گا۔ جسے وہ Recognize نہ کرے اسے منکر کہا جائے گا۔ ہاں تو کہا کہ معروف طریقے سے تم لے سکتے ہو۔ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ (4:6)۔ اور جب ان کا مال واپس دینے لگو تو یہ معاملہ تم دونوں کے درمیان نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے لیے معاشرے میں سے کچھ صاحبِ عدل گواہ مقرر کرلو۔ حساب کرو اور حساب دو' اسی کے ساتھ نہیں بلکہ ان گواہوں کی موجودگی میں۔

آپ کے ہر عمل کا اکاؤنٹ ہوگا

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا ہے کہ ہر بات میں قرآن اصول کی طرف جاتا ہے۔ مگر یہاں تو یہ سارا کچھ یوں ہورہا ہے جیسا کہ معاشرے میں قانونی جہت سے' حساب کے طریقے سے ہونا چاہیے۔ تو اس میں اسلام' دین یا قرآن کہاں آتا ہے؟ صاحبانِ بصیرت! سمجھ لیجیے کہ اسلام' دین یا قرآن یہاں آتا ہے کہ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (4:6)۔ یہ جو تم حساب کتاب کررہے ہو' اس کے اوپر ایک آڈیٹر جنرل بھی ہے۔ وہ کون ہے؟ وہ خود خدا ہے۔ حساب کرتے وقت یہ یاد رکھو کہ تم نے یہیں حساب نہیں چکا دینا' ایک آڈیٹر جنرل اور آگے جاکے بھی آتا ہے۔ تم نے وہاں اکاونٹ Surrender کرنا ہے تو یہاں ان کے ساتھ حساب کرتے وقت اس حقیقت کو یاد رکھو کہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہورہا' یہ حساب تم نے وہاں خدا کے ہاں بھی جاکے دینا ہے اور اس کے متعلق یہ ایمان رکھو کہ وہ دل کے ارادوں اور نگاہ کی خیانتوں کو بھی جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے اکاونٹس تو سب ٹھیک رکھے ہوئے ہوں۔ اور غلط معاشرے میں تو پوچھو نہیں صاحب! کیسے کیسے اکاونٹ ٹھیک رکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اکاونٹنٹ' بڑے بڑے انکم ٹیکس آفیسر' بڑے بڑے حساب دان انہیں یوں چکمے دیئے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ٹھیک ہے' حساب کرتے وقت اسے یاد رکھو کہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہورہا ہے۔

امت کا مال یتیم کا مال ہوتا ہے: حضرت عمرؓ کا قول

''یہ حساب کہیں اور جاکے بھی دینا ہے''۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے کہی تھی کہ بظاہر قرآنِ کریم ایک سوسائٹی کے متعلق'

Marfat.com

یتیموں کے مال کے متعلق، قانون کی رو سے، ایک حکم دے رہا ہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو اور اس کے آخر میں ایک اور چیز بھی کہہ رہا ہے کہ اسے ذہن میں رکھو کہ "یہ حساب یہیں ختم نہیں ہو جاتا، وہاں جا کے بھی یہ حساب دینا ہے"۔ میں نے کہا تھا کہ اس میں دو ایک باتیں آ جاتی ہیں۔ ایک تو مجھے فوراً ہی حضرت عمرؓ کا قول یاد آ گیا۔ ان سے کہا گیا کہ آپ خلافت کی ذمہ داریوں کو کیا سمجھتے ہیں؟ اس میں سے اپنی ضرورت کے لیے کتنا لیتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں تو حکومت کا یا امت کا جو مال ہے اسے یتیم کا مال سمجھتا ہوں اور اس کے بعد کہا: من کان غَنِیًّا فلیستعفف ومن کان فقیرًا فَلْیَأْکُلْ بالمعروف (۴:۶)۔ جسے لینے کی ضرورت نہ ہو وہ تو اس میں سے کچھ نہیں لیتا اور جو محتاج ہو وہ اتنا ہی لے سکتا ہے جتنا قرآن نے یتیم کے مال سے لینے کی اجازت دی ہے اور اس میں شرطیں یہ ہیں کہ حساب دو تو گواہ مقرر کرو اور آخری حساب جو ہے پھر یاد رکھو کہ وہاں جانا ہے۔ یہ لوگ ان چیزوں سے اپنے متعلق یوں فیصلے کیا کرتے تھے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے جو کہی گئی ہے۔ اگلی بات میں نے کہی تھی کہ اسی حکم سے ایک اور حکم نکلتا ہے صاحب کہ نکاح کی عمر کیا ہونی چاہیے؟ کیا بالغ ہونا اس کی شرط ہے؟

عائلی قوانین (Family Laws) کی مخالفت کیوں؟

لیکن آپ کے ہاں جو قانونِ شریعت مروج ہے اس میں تو صرف یہی نہیں کہ یہ بالغ ہونے کی شرط خلافِ شریعت ہے بلکہ اس بات پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ نابالغ کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو آپ کے ہاں بدقسمتی سے یہ جو Family Laws بن گئے، ان میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ لڑکی اور لڑکے کا بالغ ہونا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان قوانین کو بھی بارہ، تیرہ، چودہ سال ہو گئے ہونگے۔ وہ شاید 1962ء میں بنے تھے۔ آج تک "صاحبانِ شریعت" علمائے کرام اس کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں کہ یہ بلوغت کی شرط خلافِ شریعت ہے، ناجائز ہے، اس کو اس میں سے ہٹانا چاہیے۔ آئے دن یہ چیز ہوتی ہے کہ:

اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا

دین میں ترمیم کرنے لگے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دل کے موقف کے تحت جتنا پروپیگنڈہ ہوتا ہے وہ تو کر لیا ہے۔ ہزار علمائے کرام نے جو کفر کا فتویٰ پرویز کے خلاف لگایا تھا، اس میں اس بدبخت کے گناہوں کی فہرست میں ایک یہ بھی تھا کہ اس نے یہ کچھ کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بھی کہ یہ غلط پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ نکاح کے لیے بلوغت شرط ہے۔ آپ کے ہاں تو یہ صورت ہے اور یہ کچھ آج کی بات نہیں، یہ ہزار برس سے چلی آ رہی ہے، بقول ان کے یہ شریعت کا قانون ہے۔ اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے۔

نکاح کے لیے بلوغت کی کوئی شرط نہیں: ہمارے علمائے دین کا اجتماعی فتویٰ

ہم دلی میں تھے، دیر کی بات ہے۔ انگریز کے زمانے کی پارلیمان میں ایک ہندو کی طرف سے یہ بل آیا تھا کہ شادی کے لیے بلوغت شرط ہونی چاہیے۔ ہندوؤں کے ہاں ان کے دھرم شاستر کے اندر یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ ایک دن کی لڑکی کی شادی بھی کی جاسکتی

Marfat.com

ہے۔ان کے ہاں بالتصریح یہ لکھا ہوا موجود ہے۔ ہندو کی طرف سے یہ بل آیا اور آپ کو پتہ ہے کہ اس کی مخالفت کس کی طرف سے ہوئی؟ تمام مسلمان علمائے کرام کی طرف سے! مجھے اب تک یاد ہے علامہ اسلم جیراجپوری میرے ساتھ تھے۔ وہاں یہ چیز ہوئی تھی۔ ابھی میں بتاؤں گا کہ وہاں یہ چیز کیوں ہوئی تھی؟ ساردا نام کا ایک ہندو تھا جس نے یہ بل پیش کیا تھا۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کردل باغ میں اس بل کی مخالفت کے لیے تمام فرقوں کے علمائے کرام کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن مولانا نے مسکرا کے فرمایا کہ ہماری تاریخ عجیب ہے کہ اس اتنی سی بات پہ تو کبھی علمائے کرام کا اجتماع نہیں ہوتا کہ آمین بالجہر کہنی چاہیے یا بالخفی لیکن ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا جب بھی کہیں اجتماع ہوتا ہے ہمیشہ باطل پہ ہوتا ہے۔ اس بلوغت کے مسئلے میں کوئی بھی اختلاف نہیں کر رہا۔ کہنے لگے: دیکھیے! اجتماعی طور پر یہ مطالبہ پیش کرنے کے لیے وہ نیچے ایک ایک فرقے کے علماء کرام چلے آ رہے ہیں کہ یہ بل شریعتِ حقہ کے خلاف ہے۔ اس لیے اول تو اسے پاس نہ کیا جائے' اور اگر پاس کیا جائے تو مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یہاں بات کسی کے خلاف اعتراض کی یا نفرت کی نہیں ہے۔ ان بزرگوں کا میرے ذہن میں احترام ہے لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک تو یہ پروپیگنڈہ' وہ بھی اس نوعیت کا اور دوسرا اس پہ جذباتی طور پہ سوچنا یاللعجب!

وائسرائے ہند سے جناب مولانا محمد علی جوہرؒ کا مطالبہ

آپ کو معلوم ہے اس مسئلے میں لیڈ (Lead) کون کر رہا تھا۔ کوئی بہت بڑا مولوی عالم نہیں۔ یہ مولانا محمد علی جوہر جیسا بڑا اسٹیٹس مین (Statesman) تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے سٹیٹس مینوں (Statesmen) سے ٹکر لینے والا شخص' اتنا بڑا قابل آدمی کہ کامریڈ کا پرچہ پارلیمان کے ممبر نیاز کے دانے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرا کرتے تھے۔ اس کی اتنی اہمیت تھی کہ وائسرائے اپنا پرچہ الگ منگواتا تھا' اس کی بیوی الگ منگواتی تھی اور ویسے بھی ان کا سیاست کے اندر اتنا بڑا مقام ہے! اس مسئلے میں وہ لیڈ (Lead) کر رہے تھے۔ وائسرائے کے پاس Deputation گیا۔ اس میں وہ یہ کہنے کے لیے لیڈ کر رہے تھے کہ جو بل پاس ہونے والا ہے کہ نکاح کے لیے بالغ ہونے کی شرط قرار دی جائے' مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یہ نہ مانا گیا۔ آپ حیران ہونگے کہ مسلمانوں کی طرف سے جو Civil Disobedience شروع ہوئی وہ اس Issue پہ شروع ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کردل باغ میں ❶ وہ قیام فرماتے تھے' میں بھی مولانا کے ساتھ وہاں رہا کرتا تھا۔ وہاں یہ اجتماع ہوتے تھے کہ اس کی Civil Disobedience ❷ کیسے ہو؟ صبح کے وقت تانتا لگ جاتا تھا۔ کوئی گود میں بچی کو اٹھائے ہوئے ہے: اللہ اللہ' کوئی بچے کو لیے جا رہا ہے: ''جپ کر کا کا' جپ کر کا کا''۔ چھ چھ مہینے کے بچے اور بچیاں لیے چلے آ رہے ہیں اور وہاں اس سینٹر (Centre) کے اندر ان کا نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔ وائسرائے سے کہا جا رہا ہے: کر لو کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا: مجھے کیا پڑی ہے' تم پیدا ہونے والے سے پہلے نکاح پڑھا سکتے ہو۔ انگریز اس قسم کے چھوٹے چھوٹے معاملوں کو نہیں چھیڑا کرتا تھا' وہ بڑا حلیم واقع ہوا تھا' اس نے اس Civil Disobedience کا نوٹس ہی نہ لیا' سب کچھ چند دنوں

---

❶ علامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ ❷ سول نافرمانی

Marfat.com

کے بعد ختم ہو جائے گا اور یہی ہوا۔ لیکن آپ کی قوم کی یہ کیفیت ہے' کہیں گے ٹھیک ہے' پتہ نہیں' کسی نے اسی قسم کا پہلے کوئی فتویٰ دے دیا ہوگا۔ اس پر یہ چلے آ رہے ہیں۔ اسلاف سے جو چلا آتا ہے وہی تو ان کا مذہب ہے۔ بات یہ نہیں ہے۔ آگے جو دلیل آتی ہے' عزیزانِ من! وہ جگر پاش دلیل ہے' جس کی بناء پہ مجھے یاد ہے کہ میں اس زمانے کے بعد سے ہی معاف رکھیے گا: بڑا پرانا پاپی ہوں۔

53 برس کی عمر میں چھ سال کی لڑکی عائشہؓ سے نکاح کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کی جانے والی حدیث

ہم وہاں اس زمانے میں قرآن کی آیات سے ثابت کر رہے تھے کہ نکاح کے لیے بالغ ہونا شرط ہے۔ جبکہ یہ اس کے مقابلے میں یہ دلیل دیتے تھے کہ یہ لوگ قرآن سمجھے بیٹھے ہیں۔ سنتِ رسول ﷺ سے قرآن سمجھ میں آئے گا اور سنتِ رسول ﷺ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے 53 برس کی عمر میں چھ سال کی لڑکی عائشہ سے نکاح کیا تھا۔ عزیزانِ من! بات وہ نہیں تھی۔ اگر یہ اسے فقہ تک ہی رکھتے تو ٹھیک ہے۔ گو کہ یہ بات غلط تھی' اس نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک نہیں پہنچتی تھی۔ یہ ان کی ایک دلیل تھی کہ یہ ہے ہمارے پاس اس کی دلیل۔ دلیل یہ ہوتی ہے کہ قرآن تم سمجھتے تھے یا رسول اللہ ﷺ سمجھتے تھے۔ اس فقرے کے بول جانے کے بعد کون مسلمان' معاذ اللہ' معاذ اللہ' یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ ہم زیادہ قرآن سمجھتے ہیں۔

باہمی طور پر پیش کیے جانے والے دلائل

لیکن جسے تم کہتے ہو کہ رسول اللہؐ نے یہ سمجھا تھا' لہٰذا بات تو پوچھنے کی یہ ہے کہ واقعی رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا تھا۔ آپ حیران ہونگے کہ وہاں سے یہ بات چلی۔ اس سے پہلے میں نے یہ بات نہیں کی تھی۔ یہی چیز تھی اصولاً۔ یہ چیز مانتے چلے آ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کوئی قول یا کوئی عمل جو قرآن کے خلاف ہے اس کی نسبت رسول اللہؐ کے خلاف غلط ہے۔ حضور ﷺ نہ ایسا فرما سکتے تھے نہ ایسا کر سکتے تھے۔ ہماری دلیل یہ ہوتی تھی۔ لیکن ان کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ صاحب بخاری شریف میں یہ آ گیا ہے۔ اب تو آپ کے سارے دلائل رکھے کے رکھے رہ جائیں گے۔

روایات کی تاریخ

بخاری شریف میں کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے دو سو اڑھائی سو سال بعد ایک بزرگِ محترم بخارہ [1] سے اٹھتے ہیں۔ یہ عرب بھی نہیں ہے جتنی آپ کی مستندترین احادیث کی کتابیں ہیں' مجموعے ہیں جن کو صحاح ستہ کہتے ہیں' جنہوں نے انہیں جمع اور مرتب کیا ہے ناں حضورؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد ان میں کوئی ایک بھی عرب نہیں ہے۔ وہ سب کے سب ایرانی تھے۔ یعنی سارے

---

[1] Bukhara (also Bokhara). It is a city in Uzbekistan, central Assian (the then) USSR situated in the Zeravshan river valley. It is one of the oldest cultural and trading centers of Asia and was the capital of the Khanate, or State, of Bukhara during its heyday from the 16th to the 19th century (Reader's Digest, 1990, p. 215).

عرب میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا کہ ان میں سے کسی نے صحاحِ ستہ مرتب کی ہوئی ہو۔ ان کی دوسری بات یہ تھی کہ یہ بات بخاری میں آ گئی ہے' دلیل یہ ہوگئی کہ اگر یہ مان لیا جائے جیسا تم کہتے ہو جس کے حق میں قرآن کی آیات موجود ہیں' تو بخاری کی اس روایت پر زد پڑتی تھی۔ یعنی بخاری کی روایت پر زد نہ پڑے خواہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پہ لوگوں کی نظروں میں یہ بات آ جائے کہ ایک شخص چھ سال کی لڑکی سے شادی کرتا ہے اور کہتے تھے نو سال کی عمر میں رخصتی بھی ہوگئی تھی۔ عزیزانِ من! کوئی الہام اور وحی کا تو ہمیں دعویٰ نہیں اور اس پہ میں نے پھر تحقیق شروع کی کہ شاید کہیں سے کچھ مل جائے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ جہاں ہمارے ہاں کی تاریخ و روایات کی کتابوں میں یہ جو کچھ لکھا ہے' وہیں اس کے خلاف بھی کہیں کہیں مواد مل جاتا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ میں نے انہی کی کتابوں سے' انہی کے حوالوں سے' یہ ثابت کیا کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ بجائے اس کے کہ اس پہ بہر حال میں تو اس کا متمنی نہیں تھا کہ کچھ شکریہ ادا کراتا' اتنی تو توقع کی جا سکتی تھی کہ اس کو تسلیم کر لیا جائے' انہی کی کتابوں کو جنہیں یہ اپنے ہاں قابل اعتماد کہتے ہیں۔ اس تحقیق کو رد کر دیا کہ بخاری کی روایت کے بعد کوئی اور سند قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتی صاحب! اور معاملہ وہیں کا وہیں رکھا کہ حضور ﷺ نے واقعی چھ سال کی لڑکی سے نکاح کیا تھا۔ اس چیز کی یہ سند بن گئی کہ نابالغ کا نکاح ہو سکتا ہے۔ وہاں اس زمانے کے اندر انہوں نے چھ چھ مہینے کے بچوں کے نکاح پڑھائے' لیکن یہ تو دوسرا موضوع ہے آج تو میرا زیرِ نظر موضوع نہیں ہے۔

نکاح کی عمر کے سلسلہ میں تصریفِ آیات کی رو سے ثبوت

میں نے کہا تھا کہ قرآن تصریفِ آیات سے کس طرح سے یہ بیان کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یتیموں کے متعلق یہ کہا کہ ان کا مال ان کو اس وقت واپس کرو حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ (17:34)۔ جب متفقہ طور پر ان میں سے ہر ایک ''اشدہ'' ہو۔ اس لفظ کا ترجمہ' اس لفظ کے لغت کے اعتبار سے' تفاسیر کے اعتبار سے' معنی ''جوانی'' ہیں اور یہ سیدھی سی بات ہے کہ یتیم کو اس وقت مال دیا جاتا ہے یا واپس دینے کا حکم ہوگا جب وہ بالغ ہو جائے گا۔ اس کے لیے ''اشدہ'' لفظ موجود ہے کہ جب وہ جوان ہو جائے' جوانی تک پہنچ جائے' اس کو اس وقت اس کا مال واپس دیدو' ٹھیک ہے ان کا ہو گیا۔ مگر یہ بات جو تم بیان کر رہے تھے اس سے اس کا کیا تعلق؟ اس نے دوسری جگہ کہا ہے: وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ (4:6)۔ یہ مال اس وقت لوٹا ؤ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں: حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ (17:34)۔ یہ قرآن نے کہا ہے صاحب! وہ تو اپنے معنی آپ بیان کر رہا ہے کہ بلغ النکاح کے معنی کیا ہیں؟ یہ تو ''اشدہ'' ہیں۔ اب یہ چیز کہ وہ جوانی' جسے آپ بلوغت کہتے ہیں' وہ بہر حال عمر کے تعین کے اعتبار سے مختلف ممالک میں' آب و ہوا کے اعتبار سے' اس میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے۔ ٹھنڈے ممالک میں کچھ زیادہ عمر ہوگی' گرم Countries میں کچھ کم ہوگی۔ یہ معاملہ علمائے طب یا طبیعات کا مسئلہ ہے وہ یہ بتائیں کہ یہ جو بالغ ہونے کی حد ہے یا جسے آپ بلوغت کہتے ہیں یا جسے آپ جوانی کہتے ہیں جسے آپ بالغ ہونا کہتے ہیں اس کی عمر کیا ہوگی؟ لیکن

Marfat.com

بالغ ہونا تو بہر حال قرآن کی رُو سے شرط ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ موضوع کوئی ہوتا ہے' احکام یا اصول یا ہدایات اس کی رُو سے ملتی ہیں تو دو چیزیں اس کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ چیز موجود ہوتی ہے کہ اگر آپ تصریفِ آیات سے دیکھیے تو کئی ایک اور اس میں احکام اور موضوع ہوتے ہیں' جو اسی میں سے متفرق ہوتے چلے جاتے ہیں اور دوسری چیز یہ کہ جو حکم بھی وہ دیتا ہے اس میں وہ اپنا اصول اور اساسِ بنیادی' جو اس کے ہاں کی اقدار ہیں' انہیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور سامنے لے آتا ہے کہ بات صرف احکام منوانے کی نہیں ہے' بات تو اقدار کی پابندی کی ہے۔ اگر حکم کو مکینکلی (Mechanically) مانا جائے تو اس سے انسان کی سیرت اور کردار پہ کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر آپ بالکل نہایت عمدگی سے اُس چیز کو ادا کرتے چلے جائیں تو آپ کے کیریکٹر پہ اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ اکاونٹس بھی صحیح ریفر (Refer) کیجیے' ٹھیک ٹھیک' پائی پائی کا حساب بھی دیدیجیے' گواہ بھی موجود ہوں' لیکن یہ سب کچھ کرتے وقت یاد رکھیے۔ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (33:39)۔ کہ ہم اپنے اعمال کے لیے صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہیں اور کسی کے نہیں۔ اصل بات جواب دہی (Accountalibility) کی ہے' جس پر لازمی ہے کہ ایمان (Convicton) ہو۔

اصل بات: جواب دہی پر ایمان لازمی ہے

اصل بات جواب دہی کی ہے جس کا اثر آپ کے کیریکٹر پہ پڑے گا کہ ''نہ بھئی! مجھے تو یہ سارا حساب یہیں نہیں چکا دینا' یہیں معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اس حساب کتاب کا اس زندگی کے علاوہ اس سے اوپر بھی ایک حساب لینے والا ہے اور جب آپ کے ایمان کے درجے پہ یہ کیفیت پہنچ جائے کہ کوئی حساب لینے والا ہے تو پھر آپ کی صورت یہ ہو جاتی ہے۔ ورنہ ہر گول چکر (Round-Crossing) کے اوپر ہر سائیکلسٹ کا جی یہ چاہتا ہے کہ وہ دائیں کی طرف مڑ جائے' کسی طرح سے دو تین پاؤں کم مارنے پڑتے ہیں' اس پر Concession ہو جاتی ہے' چیز کو بھی Less کرتے کرتے اس سڑک پہ اگر یوں جانا ہے تو وہ یوں آنے کی بجائے یونہی نکل جاتا ہے لیکن اگر آپ کو نظر آئے کہ سامنے سپاہی کھڑا ہے پھر وہ ایسا نہیں کرتا۔ نظر نہ آئے' یہ پتہ چلے کہ وہ سپاہی یہاں ہوتا ہے ضرور کہیں چھپا ہوا ہو گا پھر بھی وہ اِس خیال سے ایسا نہیں کرتا کہ اسے معلوم ہے کہ اوپر دیکھنے والا ہے۔ اگر یہ چیز آپ کے ایمان کا درجہ حاصل کر لے کہ جو حساب بھی میں یہاں رینڈر (Render) کرتا ہوں' اس پر ایک اور آڈیٹر جنرل (Auditor General) ہے' خود خدا اس کا حساب لینے والا ہے۔ اس کا اثر آپ کے کیریکٹر پہ پڑے گا۔ پھر یہاں کسی کو حساب دینا ہو یا نہ دینا ہو یا نہ رکھنا ہو' آپ اس میں بے ایمانی اور بددیانتی کر ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ کو یہ یقین ہو کہ سپاہی دیکھ رہا ہے تو آپ کبھی ٹریفک کا قانون نہیں توڑتے یا اگلا یقین یہ ہو کہ صاحب! دیکھ بھی رہا ہے تو اس حساب لینے والے سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ اس خالقِ جنت کے متعلق یہ بات ہے کہ وہاں سب کچھ دے کے بھی چھٹکارا نہیں ہوتا۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ بات تو معاشرتی احکام کی ہو رہی تھی تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی حکم میں'

ایک ہی آیت میں کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ قرآن اس طرح سمجھ میں آتا ہے اور اس طرح سے وہ احکام دیتا ہوا آپ کا کیریکٹر بناتا، Build کرتا، چلا جاتا ہے صاحب! یہ ہے اس کا انداز:

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود

یہ اگر دل میں اتر جائے تو اندر کی دنیا بدل دیتا ہے اور

جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

اگر اندر کی دنیا بدل جائے تو باہر کی ساری دنیا بدل جاتی ہے۔

میں اب سمجھا یہ دنیا کیا ہے، دنیا میرا دل ہے

بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر اک چیز کا بدلا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔ یاد رکھو! خارجی ماحول کو خدا بھی نہیں بدلتا جب تک تم خود اپنے اندرونی ماحول کو نہ بدل لو۔ پھر کہوں کہ یاد رکھو: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ (13:11)۔ اللہ تعالیٰ بھی کسی کے خارجی ماحول کو خود نہیں بدلتا۔ اس لیے خود کو بدلنا ہوتا ہے۔

کسی بات کے صحیح ہونے کا پیمانہ صرف اقدارِ خداوندی ہیں

عزیزانِ من! یہ کوئی چھوٹی بات نہیں جو وہ کہہ گیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت جو یہ چاہے کہ قوموں کے افراد، بالخصوص ان آنے والی جوان نسلوں کی اندرونی دنیا میں نفسیاتی تغیر کیے بغیر، اُن کے خارجی ماحول میں تغیر پیدا کر دے، اصلاح پیدا کر دے، معاشرے کو درست خطوط پر چلا دے، وہ تو رہی ایک طرف قرآن کہتا ہے تم کون ہو اور تمہاری قوت کیا ہے۔ یہ تو اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ (13:11)۔ خدا بھی نہیں کرتا۔ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔ جب تک تم خود ان کے اندر نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کرتے کسی قوم کی حالت نہیں بدل سکتے۔ خدا بھی خارجی تبدیلی نہیں پیدا کرتا۔ نفسیاتی تبدیلی کا تعلق صحیح تعلیم و تربیت سے ہے اور جب ہم ''صحیح'' کہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کی بنیادیں اقدارِ خداوندی کے اوپر ہونی چاہئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم یتیموں کے مال کا حکم دے رہا ہے اور اسی ضمن میں باتیں کیا کیا کہہ جاتا ہے۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ اور جب بھی کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کرو، کوئی عہد کرو، پیمان کرو، Agreement ہو، وعدہ بھی ہو۔ یہ سب چیزیں عہد میں آ جاتی ہیں۔ اسے پورا کرو کیونکہ عہد کی باز پرس ہوگی، عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔ یہاں کے عہد و پیمان اور معاہدے تو آپ جانتے ہیں کس طرح سے ٹوٹتے ہیں، کس طرح سے بنتے ہیں۔ وہ ٹوٹنا اور بننا تو محاکاتی انداز میں ہے۔ یہ وہی انداز ہے جو ریاض اپنے مخصوص انداز میں کہہ گیا ہے:

Marfat.com

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن

یہ اپنے آپ سے عہد ہوتا ہے ناں کہ ''نہیں صاحب! اب نہیں پیوں گا''۔ٹوٹتا ہے ناں جب وہ جام شکنی ہوتی ہے:

سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

کتنی دفعہ ایسا ہی ہوا ہے اور اس کا ثبوت وہ سامنے پڑا ہوا' ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا ڈھیر ہے۔

وعدہ کا ٹوٹنا دراصل پیمانے کا ٹوٹنا ہوتا ہے

ہم جو وعدے صبح سے شام تک کرتے ہیں عزیزانِ من! اس کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے اگر آپ شام کو دیکھیں گے تو ٹوٹے ہوئے پیانوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوگا۔ ہر عہد کا' ہر وعدہ کا' ٹوٹنا اس کے حسین انداز میں پیمانے کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔ ہمارے ایک بڑے عظیم دوست تھے۔ کہا کرتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ سگریٹ چھوڑنا بہت مشکل ہے' یہ بڑی سخت عادت ہے' چھوٹ نہیں سکتی۔ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے' ہم نے بیسیوں دفعہ اسے چھوڑا ہے۔ ''بیسیوں دفعہ چھوڑے کے معنی'' آپ نے سمجھ لیے' کہ اب وہ چھوٹتی نہیں۔ میں نے کہا: ''جی بجا فرمایا۔ اس سے تو آسان ہی کچھ نہیں رہا''۔ بیسیوں دفعہ چھوڑی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ عہد کا پوچھا جائے گا۔ لیکن یہاں وہ پوچھنے والا بھی کہیں یا اس بیچارے میں اتنی سکت بھی نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ صاحب! آپ نے تو مجھ سے یہ کہا تھا پھر آپ نے اُسے پورا کیوں نہیں کیا۔ اِس کے بعد پھر آدمی ایسا کرنے کی جرآت نہیں کرسکتا' یہاں تو شاید اس قسم کے کھردرے الفاظ میں کوئی نہ کہتا ہو۔ ہم تو گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہاں تو جھٹ سے کہدیا جاتا ہے: ''اوتوں کون ہوناایں پوچھن آلا''❶ ٹھیک ہے کون ہوں میں پوچھنے والا؟ اور پھر اگر بات نیچے سے شروع کی جائے تو یہ بہت آگے تک پہنچتی ہے۔ کتنے وعدے روز کیے جاتے ہیں کہ کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ ان کو پورا کرنا ہے اور یہ روش تو پھر بگھرے ہوئے معاشرے میں اتنی عام ہوجاتی ہے کہ وعدہ کرتے وقت بھی یہ ذہن میں ہوتا ہے کہ کس نے پورا کرنا ہے۔ اس سے ذرا پہلے ایک ہی بات تھی کہ پھر وعدہ توڑنے والے کو کچھ شرم آجاتی تھی' کچھ حیا دامن گیر ہوجاتی تھی کہ کیسے منہ دکھاؤں گا۔ جب یہ روش عام ہوجائے تو پھر یہ حجاب بھی اٹھ جاتا ہے۔ اب کسی کو شرم ہی نہیں آتی' حیا ہی نہیں آتی صاحب! کہ کل ہی میں نے کیا کہا تھا اور اس کے بعد میں نے کیا کیا۔ اور پھر یہ چیز ہے کہ اگر کہیں آپ سے پوچھ بیٹھتے ہیں کہ اس عہد کے نہ پورا کرنے کا جو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے وہ بھی آپ کو معلوم ہے؟ یہاں تو وہ یہاں ہے ہی نہیں سرے سے۔

ہم کیے گیے وعدوں کے متعلق پوچھیں گے

پھر وہی بات آ گئی۔ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ اِن سے عہد کا پوچھا جائے گا۔ یہاں مسؤلاً کہہ کے قرآن نے

❶ ارے تم کون ہوتے ہو باز پرس کرنے والے۔

Marfat.com

Passive Voice استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں: "پوچھنے والے شروع ہو جائیں گے" اور اگر وہ نہ ہوگا تو یاد رکھو! "پھر آخر میں وہی جو پوچھنے والا ہے"۔ کہا ہے کہ تمہارے آپس کے وعدوں کے متعلق ہم پوچھیں گے۔ عزیزانِ من! جس نے کہا ہے کہ "ہم پوچھیں گے"۔ اس نے اپنے متعلق ایک بات کہی ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ جب اس قسم کی آیتیں پہلی دفعہ سامنے آئی تھیں تو پتہ نہیں مہینوں تک میری کیفیت تو یہ رہی تھی کہ سر پکڑ کے بیٹھ جاتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ کم از کم خدا کا اس قسم کا تصور دینے والا خدا ہی ہوسکتا تھا' کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں بات یہ ہوئی کہ تم سے وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا: "پوچھا جائے گا"۔ وعدہ ایسی چیز ہے کہ اس کے متعلق پوچھ سکتے ہو۔ خدا کہتا ہے کہ ہم پوچھیں گے۔ سورۃ الفرقان: كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (25:16)۔ میں اوپر یہ بات چلی آ رہی ہے کہ تم یہ کرو گے۔ خدا کہہ رہا ہے "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہ دیں گے" اور "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہ کریں گے' ہم وعدہ کرتے ہیں ایسا کریں گے"۔

کیے گیے وعدے کے متعلق تم خدا سے بھی پوچھ سکتے ہو

یہ کچھ کرنے کے بعد عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا نسخہ ہے تو نکال لیجیے۔ کہا کہ ہم تم سے وعدے کر رہے ہیں اور وعدے کے متعلق یہ یاد رکھو کہ وعدہ خواہ ہمارا ہی کیوں نہ ہو۔ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (25:16)۔ یہ خدا کا وعدہ تو ہے لیکن یہ ایسا وعدہ ہے کہ اگر بفرضِ محال پورا نہ ہو تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو کہ تم نے کیوں وعدہ پورا نہیں کیا؟ اللہ اکبر! یہ بات وعدے کے پورے کرنے کی اہمیت کے سلسلے میں کی گئی ہے کیونکہ اس نے تو کہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ(13:31)۔ ہم تو کبھی وعدہ خلافی کرتے ہی نہیں ہیں' کبھی کریں گے ہی نہیں' ہم پہ واجب ہے کہ یہ وعدہ پورا کریں۔ وہاں تو یہ کیفیت ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ جب یہ کہا کہ وعدہ مسئولاً ہے۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ تو اس میں خود خدا اپنی بھی Exception نہیں کرتا۔ کہنے لگا: "اور تو اور وڈے نانے خاں بنے پھردے ہو"[1] یہاں تو یہ عالم ہے کہ خدا بھی اگر بفرضِ محال وعدہ پورا نہ کرے تو تم اس کا گریبان پکڑ سکتے ہو کہ وعدہ کیا ہے پورا کیوں نہیں کرتے؟ یہ ہے خدا کا تصور جو قرآن پیش کرتا ہے۔ عزیزانِ من! ایسا خدا جو:

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

تو خدا کے تصور میں جس گوشے پہ بھی نگاہ ڈالیے' نظر آتا ہے کہ "رب بنا تینوں ای جچد اسی"۔[2] عزیزانِ من! جس جس شکل میں دنیا کے مذاہب کی کتابیں موجود ہیں وہ مدعی ہیں کہ یہ ان کی آسمانی کتابیں ہیں۔ کسی ایک کتاب میں بھی یہ بات نکال کے دکھا دیجیے جس میں خدا

---

[1] اور تو اور بڑے نگڑم باز بنے پھر رہے ہو۔ [2] خدا بننا تمہیں ہی جچتا ہے' تمہیں ہی زیب دیتا ہے۔

Marfat.com

نے کہا ہو کہ اگر ہم بھی جو وعدہ کرتے ہیں پورا نہ ہو تو ہم سے بھی تم پوچھ سکتے ہو کہ وعدہ کیوں پورا نہیں کیا۔ دیکھ رہے ہیں کہ وعدہ پورا کرنے کی اہمیت کس قدر ہے۔ یہ ہے وہ چیز' یہ ہے وہ لفظ مَسْئُوْلًا ! اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ یہی لفظ ''مسئولا'' وہاں استعمال ہوا ہے' یہ ہے اہمیت جس کو اب اتنا Lightly لیا جاتا ہے۔ پوچھو ہی نہیں ''جناب میں وہاں پورے 7 بجے آ ؤنگا''۔ او بھئی خدا کے لیے پکی بات کر۔ او ئے میں نے کہا ''آ جاؤنگا سات بجے''۔ یہیں تک اس کے دل میں وسوسہ آتا ہے کہ کہیں خدانکردہ وہ کہے کہ میں انشاءاللہ آ جاؤنگا تو پھر تو وہیں سمجھ لیا جاتا ہے کہ ''بس اے نئیں آن والا' ایہدی نیت ہنے ای بگڑی ہوئی اے''۔ ❶ ہاں تو خدا کا یہ تصور قرآن کے علاوہ دنیا کے کسی مروج مذہب میں نہیں ملے گا اور اس کے ساتھ وعدے کی اہمیت بھی۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ہمیشہ اپنا عہد پورا کرو۔ ایفائے عہد کے بارے میں' یاد رکھو! تم سے ضرور باز پرس ہوگی۔

کاروباری معاملات اور قرآن

قرآن کریم اور آگے چلا' کہا: وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (17:35)۔ کاروباری معاملات کے اندر بظاہر یہ الفاظ صرف انہی پر آتے ہیں: ماپ اور تول کے پیمانے صحیح صحیح رکھو' ترازو کی ڈنڈی دیکھو' سیدھی رہنی چاہیے۔ سمجھانے کی بات ہے۔ ڈنڈی سیدھی رہنی چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کاروبار' دوکانداری کی دنیا کے اندر' ایک اصطلاح ہے: ''او ڈنڈی مار جاندا اے' اے ڈنڈی مار جاندا اے'' ایک اصطلاح ہے۔ ❷ یہ بھی ایک ہاتھ کا کنڈا ہوتا ہے تولنے والوں کا۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (17:35)۔ یہ تول۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ پہلے تھا۔ اس سے بھی پہلے اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (17:34) تھا۔ عہد یا وعدے کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ کہا کہ یہ زبانی وعدہ نہ سہی تم میں اور دوکاندار میں ایک معاہدہ ہوا ہے کہ اگر تم اس کو چار روپے دو تو وہ تمہیں ایک سیر چیز دیدیگا' یہ بھی ایک معاہدہ ہے۔ اس لیے وہ لفظ اس کے لیے بھی اَوْفُوْا لایا ہے۔ اس کا ذریعہ' یہ ماپ تول کے باٹ ہیں' پیمانے ہیں' ترازو ہیں۔ لفظ تو یہ گاہک اور دوکاندار کا ہے لیکن اس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ کسی کے صلے میں' کسی کے معاوضے میں' کچھ دینے کے متعلق بھی یہ بات ہو جاتی ہے۔ ان سب کا اطلاق اس پر ہوتا ہے۔ الفاظ ہیں: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (17:35)۔ کہا: یہ ٹھیک ہے کہ ڈنڈی مار کے' کچھ تھوڑے سے باٹ میں اِدھر اُدھر کر کے' تھوڑا سا مفادِ عاجلہ تم حاصل کر لیتے ہو۔ اس میں بہت فائدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رکھو یہاں قرآن ''احسن تاویلاً'' لایا ہے یہ انجام کار فائدہ نہیں ہے۔

---

❶ ہاں یہ نہیں آئے گا۔ اس کی نیت (Intention) میں ابھی سے فتور ہے۔

❷ وہ ڈنڈی مارتا ہے۔ یہ ڈنڈی مارنا ایک اصطلاح ہے۔

Marfat.com

لفظ تاویل کا قرآنی مفہوم

''تاویل'' ایک اصطلاح ہے۔ ہمارے ہاں تو اصطلاحیں ہی بگڑ چکی ہیں۔ ہمارے ہاں تو ''تاویل'' کے لفظ کے صرف ایک ہی معنی رہ گئے ہیں: قرآن کا مفہوم اپنی مرضی کے مطابق بیان کرنا' اسے تاویل کہا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کو بڑا معیوب قرار دیا جاتا ہے۔

میری قرآن دانی پر خفا کیوں ہو گئے صاحب!

میں نے جو قرآن کی آیت پڑھ کے تمہیں بتا دی ہے اس کے اوپر ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ صاحب! یہ تو میرے خلاف جا رہی ہے۔ میں اپنے حق میں فتویٰ لینے کے لیے آیا تھا اور انہوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھ کے سنا دی۔ یہ تو سراسر ہمارے خلاف چلی گئی تو اس نے کہا کہ میں تمہارے پاس کیوں آؤں' میں مولانا حضرت صاحب کے پاس کیوں نہ تشریف لے جاؤں گا۔ انہوں نے پچیس روپے فتویٰ کی قیمت مقرر کر رکھا ہے میں وہاں سے لے لونگا۔ کہا: ''نہیں نہیں' جاؤ نہیں''۔ جیسے دوکاندار کہتا ہے' یہ صرف قرآن دانی ہے:

میری قرآن دانی پر خفا کیوں ہو گئے صاحب
مجھے تاویل بھی آتی ہے' اپنا مدعا کہیے!

کیا کہتے ہو' تم نے آ کے بات نہیں بتائی تھی۔ پوچھا یہی تھا کہ اس معاملے کے متعلق قرآن شریف کیا کہتا ہے۔ میں سیدھا سیدھا سا' بھولا بھالا سا' آدمی ہوں۔ میں نے قرآن کی آیت بتا دی۔ اب یہ اگر تمہارے موافق نہیں پڑھی' تو پہلے اپنا مدعا کہیے' بات کہو: کا ہے کے لیے چاہتے ہو؟ مجھے اس آیت کی تاویل بھی آتی ہے۔ خیر! عربی مبین میں ''تاویل'' کے معنی ''مآل کار'' ہوتے ہیں۔ مآل کا لفظ تو آپ اس ''مآل کار'' میں اپنے ہاں بولتے ہیں' لیکن تاویل میں یہ معنی نہیں لیتے۔ بہرحال ''تاویل'' کا قرآنی مفہوم ''مآل کار'' ہے۔

معاشرے میں اعتماد ہی کیوں باقی نہیں رہتا؟

مآلِ کار کے لفظ سے دیکھا کہ لفظوں کا کیسے فرق پڑتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: یہ ٹھیک ہے۔ ڈنڈیاں مارنے سے' پیمانے (Measures) غلط رکھنے سے' کاروبار کی دنیا میں دھوکا دینے سے' فریب کاریوں سے' بڑی جلدی پیسہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن یاد رکھو! انجامِ کار (Coseqently) اس معاشرے کا حسن بگڑ جاتا ہے۔ اس کا توازن بگڑ جاتا ہے اور یہی چیز اس کو لے کے ڈوب جاتی ہے۔ یہ توازن بگڑتا کیسے ہے؟ اس معاشرے میں کیا ہوتا ہے؟ پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دوسرے کا اعتماد ہی اٹھ جاتا ہے۔ جب یہ مشہور ہو جائے کہ لو صاحب! یہاں تو کوئی چیز خالص مل ہی نہیں سکتی۔ کوئی دوکاندار لاکھ کہتا پھرے کہ صاحب! میں خالص چیز بیچتا ہوں' کوئی مانتا ہی نہیں ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ یہ چیز اتنی عام ہوگئی ہے کہ صحیح بات کہنے والے کی بھی بات نہیں مانی جاتی اور یہ ہے معاشرے کا اصلی روگ' یہ

Marfat.com

ہے معاشرے کی تباہیوں کی اصل بنیاد۔ یہ جھوٹا پروپیگنڈہ ہوتا ہے' ایماندار دوکاندار بھی کہیں آ کے بیٹھ جائے' سب کچھ معلوم ہوتو جو ادھر اُدھر والے بے ایمان ہوتے ہیں وہ اس کے متعلق کس قدر افواہیں پھیلاتے ہیں کہ جی! آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہ کرتا کیا ہے' دیانتدار بنا پھرتا ہے' ایماندار نظر آتا ہے لیکن پوچھو نہیں کیا صورت ہے۔ اور یہ بات پھر صبح سے نکلتی ہے تو شام تک پوچھو نہیں سارے معاشرے کے اندر کیسے پھیل جاتی ہے۔ پہلے ذرائع ابلاغ اتنے تیز نہیں ہوتے تھے' اتنے عام نہیں ہوتے تھے۔ بات پھیلتے پھیلتے بھی کچھ وقت لیا کرتی تھی۔ اب تو صاحب! اللہ کے فضل و کرم سے اس قدر ذرائع ابلاغ موجود ہیں کہ کسی کے متعلق جو جی میں آئے آپ کہہ دیجیے تو شام تو بہت دیر میں جا کے ہوتی ہے' آپ چند گھنٹوں میں دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے اور پھر جب ان ذرائع ابلاغ پہ کنٹرول ہو تو پھر پوچھو ہی نہیں کہ جنودِ ابلیس (26:25) جسے قرآن نے کہہ کے پکارا ہے' وہ کیا سے کیا کر دکھاتے ہیں۔

خدا سے ابلیس کا مطالبہ

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں ہے کہ جب ابلیس نے ابنِ آدم کے متعلق چیلنج (Challenge) کیا تھا اور خدا سے یہ کہا تھا کہ ٹھیک ہے صاحب! اسے بھی دنیا میں چھوڑ دیجیے اور مجھے بھی چھوڑ دیجیے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ یہ نہ ہو کہ جب میں اس کا ٹینٹوا دباؤں تو آپ میرا ٹینٹوا دبا دیں۔ "دلدل دا منصف بنا ائے' تے دیانتداری نال بنا ائے' تے چھڈ دے سانوں تے دیکھ فیر تماشا"۔ [1] تو آپ کو پتہ ہے اس تماشے کے لیے اس نے کیا لفظ استعمال کیا ہے: دیکھ پھر تماشا۔ ہمارے ہاں شہری بچوں نے تو وہ تماشا دیکھا نہیں ہے' ہم گاؤں والوں نے دیکھا ہے۔ "پنڈ دے منڈے' اوہدے قابو کتے آ جائے کسے دا کوئی چھوٹا جیا پچھیرا"۔ [2] اب ان کے پاس نہ تو زین ہوتی ہے' نہ کاٹھی ہوتی ہے اور نہ ہی لگام ہوتی ہے۔ "کتے موگ دی رسی لبھے ناں اوہدے منہ نوں بھن دیندے نیں' اینوں کھبی کیندے نیں"۔ [3] میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ لفظ ہے قرآن کا "کھبی دیندے نیں اونوں پا' تے فیر جو کچھ اوہدا حشر ہوندا ہیگا"۔ [4] وہ ہم لوگ ہی جانتے ہیں' جنھوں نے دیکھا ہوا ہے اس بیچارے گدھے یا اس بیچارے پچھیرے [5] کا کیا حال ہوتا ہے؟ ابلیس نے یہ کہا تھا کہ مجھے چھوڑ دیجیے: یہ اجازت دیجیے' آپ اس میں نہ دخیل ہوں اور پھر دیکھیے کہ "میں اینوں کھبی پا کے نچاؤنا کیویں آں"[6] اور یہ پوچھا گیا تھا کہ اس کے لیے

---

1. اگر اس دلدل کا منصف بنتا ہے تو پھر ایمانداری سے بنیو (اور انصاف یہ ہے کہ) اب ہم دونوں کو آزاد چھوڑ دے۔ پھر دیکھ تماشا (کہ کس بھاؤ بکتی ہے)
2. گاؤں کے لڑکے ہوں اور اگر کہیں گھوڑی کا چھوٹا سا بچہ ان کے ہاتھ لگ جائے۔
3. "منج" کی رسی لے کر اس کے منہ کو باندھ لیتے ہیں۔ اسے وہ اپنی زبان میں "کھبی" کہتے ہیں۔
4. اسے "کھبی" ڈال دیتے ہیں۔ تو پھر اس کا جو کچھ حشر نشر ہوتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔
5. گھوڑی کا بچہ
6. میں اسے "کبھی" ڈال کر کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔

Marfat.com

کیا کیا ذرائع ہونگے۔ ''کہنے لگے: او تے تفصیل بڑی لمبی چوڑی ہے''۔ [1] اس نے یہ کہا تھا کہ اور ذرائع تو رہے ایک طرف مثلاً ان جوانوں کی تعلیم میں کیسے کرونگا' ان کے کاروبار میں میں اشتراک کیسے کرونگا' ان کے ایوانوں کی سیاست کے اندر میں کس طرح نقاب پوش جاؤنگا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میرا سب سے مؤثر ذریعہ افراد پر میرا کنٹرول کا ہوگا۔ آوازوں پہ میں کنٹرول رکھونگا' اور اس کے ذریعے سے وہ کچھ کر کے دکھاؤنگا کہ پتہ چل جائے گا کہ یہ ابنِ آدم ہے کیا' اس دور میں عزیزانِ من! وہ کنٹرول ہے۔ قرآن کی کیا بات ہے' اس نے ذریعہ ابلاغ پر کنٹرول کہا تھا۔ ذرائع ابلاغ کے اندر آج آپ کے پاس کی مشینری ہے جو اربابِ سیاست کے ہاتھ میں آئی ہے۔ عام طور پہ یہ دنیا کی حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ بڑے وسیع پیمانے پر ان کے پاس یہ بڑے مؤثر ذرائع ابلاغ ہیں۔ انہوں نے اِن پہ کبھی غور نہیں کیا۔ یورپ نے تو اس پہ بہت پہلے غور کر لیا تھا۔

مذہبی پیشوائیت کے ذرائع ابلاغ کا اثر اور اُن کے نتائج

مسلمان ممالک نے ابھی تک اس پہ غور نہیں کیا کہ مذہبی پیشوائیت کے پاس جس قدر یہ آلاتِ ابلاغ کی مشینری ہے' بڑی سے بڑی مملکت کے پاس بھی نہیں ہو سکتی۔ سارے ملک کے کونے کونے' کھدرے کھدرے میں' (Village) گاؤں کے اندر' جہاں کوئی چار جھگیاں بھی ہیں' وہاں ایک مسجد ہے۔ بغیر اشتہار کے' بغیر کسی قسم کے انتظام کے' بغیر کسی تردد کے' دن میں پانچ دفعہ وہاں لوگوں نے آنا ہوتا ہے۔ انہوں نے اس آنے کی اہمیت لکھ کے لگا رکھی ہوتی ہے کہ یہاں نہیں آ ؤ گے تو حشر کے دیہاڑے [2] پہلی چیز یہ پوچھی جائے گی کہ مولوی کی بات سننے کے لیے گئے تھے یا نہیں۔ اولیں پرسشِ نماز بود۔ سوچیے! اتنی بکھری ہوئی پروپیگنڈے کی مشینری کسی مملکت کے پاس بھی ہے! پھر یہ اتنی مؤثر ہے کہ اس میں لوگ ضرور جائیں گے' ان کے کسی ایک مرکز سے جو بات نکالی ہوئی' وہ کہاں کہاں پہنچتی ہے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اب تو یہ اور بھی آرگنائز ہو گیا ہے۔ آپ کے ہاں کا Religion پہلے سے زیادہ آرگنائز ہے' پیشوائیت آرگنائزڈ ہے جیسے یورپ میں ہوئی تھی۔ اور جس کے بعد پھر مملکتیں کانپ اٹھی تھیں' ان میں زلزلے آ گئے تھے۔ وہ تو پوچھو نہیں کہ ان کو ان کی حدود کے اندر باندھنے کے لیے کتنا بڑا جہاد کرنا پڑا' یورپ بچ گیا ورنہ ویسے تباہ ہوتا جیسے اس وقت آپ تباہ ہو رہے ہیں' ان مساجد کے ذریعے سے' ان منبروں (Pulpits) کے ذریعے سے' ان وعظ کے سٹیجوں (Surmons on these Platforms) کے ذریعے سے وہ پروپیگنڈہ ہوتا ہے صاحب! کہ اس کا ازالہ' اس سے مدافعت کسی اور قوت سے ممکن ہی نہیں۔ ادھر تو پھر بھی لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ ریڈیو پہ' ٹیلی ویژن پہ' اخبارات پہ' ان کی تقریروں سے' ان کے بیانات سے کہہ دیا جاتا ہے۔ سب جھوٹ بولا جاتا ہے۔ کسی مولوی صاحب کے متعلق تو آپ یہ بات نہیں کہہ سکتے اور کہنے کے بعد اس محلے میں نہیں رہ سکتے' اس گاؤں میں نہیں رہ سکتے۔

---

[1] اس کی تفصیل تو بڑی لمبی چوڑی ہے۔ [2] دن

Marfat.com

اس لیے کہ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں یہ بات کہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے: یہ ارشادِ خداوندی ہے' یہ فرمانِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ بزرگانِ کرام نے یہ کہہ دیا ہے۔ فلاں حضرت صاحب کا یہ قول ہے۔ آپ تو بات ہی نہیں کر سکتے۔ اپنی زندگی میں یہ کبھی نہیں کہتا کہ میں کہتا ہوں۔ جب یہی مرجاتے ہیں تو ان کا آنے والا ان کو حضرت صاحب کہہ کے پکار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا تھا: ہم نے یہاں سنا ہے صاحب۔ ہر شخص ان سے ڈرتا ہے۔ جس کے متعلق جو جی میں آئے یہ ایک بات کہہ دیتے ہیں' پھر اس غریب کا کہیں ٹھکانہ ہی نہیں۔ میں نے جو یہ گوشہ بتایا ہے' یورپ اس کے ہاتھوں بھگت چکا ہے۔ وہ تو میں نے کہا ہے کہ تباہ ہو چکا تھا' بچ گیا وہ۔ یہ کیفیت ہے اس پیشے کی۔

کاروباری دنیا کے پروپیگنڈے پر اربوں پونڈ کا خرچہ

کاروباری گوشے کے اندر یا میرے اللہ! میرے علم میں روز یہ چیزیں آتی ہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے مجھے بتایا ہے کہ معتبر ترین اخبارات کی یہ بات ہے کہ یہ کاسمیٹکس جو ہمارے ہاں آتے ہیں جس میں یہ میک اپ کیا جاتا ہے۔ اپنی بدنمائی کے داغوں کو چھپانے کی ناکام کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ اس کے پروپیگنڈے پہ' اس کے اشتہارات پہ' اربوں پونڈ خرچ ہوتے ہیں' یہ ایک چھوٹی سی آئٹم ہے اور یہ سگریٹ اور یہ غلط قسم کی دوائیاں اور پھر ان پر اشتہارات کی کیفیت یہ تھی۔ ایک اشتہار سامنے آتا ہے کہ ان کی Prepration اس طرح سے کی ہے کہ اس سے سردرد اور تمام دکھوں کا علاج ہوتا ہے۔ وہ ٹکیہ ابھی گلاس میں ڈال کے یوں رکھی ہوتی ہے کہ اگلا اشتہار آتا ہے کہ فلاں دوائی بڑی مضرِ صحت ہے' اس میں افیون ہوتا ہے' ہم نے یہ منڈوز نکالی ہے' اس میں افیون نہیں ہے۔ وہ بھی اسی طرح سے چلا آ رہا ہے اور اس کے ساتھ بھی اسی طرح سے ہوتا ہے۔ یہ کام چلا آ رہا ہے۔ یہ اشتہارات اس قدر مؤثر ہوتے ہیں کہ They create necessity یعنی آپ کو اس چیز کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ نفسیاتی بات ہے کہ ایک چیز بار بار بار جو کہی جائے تو آپ خود محسوس کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہاں مجھ میں بھی یہ ہے' اور پھر یہ کہ اگر نروس سسٹم میں کمزوری ہو تو اس کے لیے وہ دوائی بڑی مؤثر ہے۔ اب وہ نروس سسٹم کی کمزوری کی علامات گناتے ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس میں ان میں سے کوئی علامت نہ پائی جاتی ہو۔ ایک دن وہ use کرے گا' دو دن کرے گا۔ پھر کہے گا کہ ہاں صاحب! بات تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ آج ابلیس کا یہ سچ ہو گیا ہے جو اس نے کہا تھا کہ ''میں افراد پہ کنٹرول کر کے ان کو نچا کے تمہیں بتاؤں گا۔'' نچا رہا ہے ابنِ آدم کو آج۔

اس بیماری کا شافی علاج یہ ہے کہ تحقیق کیے بغیر کسی کے پیچھے مت لگو

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے قرآن نے یہ بات کہی کہ یاد رکھو! اس کا ایک علاج ہے۔ **لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** (17:36)۔ جس بات کا خود علم حاصل نہ کر لو اس کے پیچھے کبھی نہ لگا کرو۔ چار لفظ ہیں عزیزانِ من! میں کہتا ہوں سب کچھ چھوڑ دیجیے۔ آپ اس معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اس ایک ارشادِ خداوندی پہ عمل کر لیجیے: جس بات کی خود تحقیق نہ کر لو' اسکے

Marfat.com

پیچھے مت جاؤ' اس کے پیچھے ایک قدم نہ اٹھاؤ' یاد رکھو کہ یہی وعدہ کے متعلق تھا: كَانَ مَسْئُوْلًا (17:34)۔ کہا: ہم سے سن لو: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17:36) ۔تمہارے کانوں سے پوچھیں گے' تمہاری آنکھوں سے پوچھیں گے کہ تم نے خود تحقیق کی تھی' تم نے اس کو یہ کہتے ہوئے آپ سنا تھا' تم نے اس کو یہ کرتے ہوئے خود دیکھا تھا اور اگلی چیز تو اس سے الگ ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ جو چیزیں خبر کی شکل میں تمہارے پاس پہنچی تھیں اور تم نے سن بھی لیا' دیکھ بھی لیا۔ یہ اگلی چیز اس سننے اور دیکھنے سے بالکل الگ ہے۔

سننے اور دیکھنے کے بعد عقل وفکر سے کام لینا بھی ضروری ہے

عزیزانِ من! خالی سن لینا اور دیکھنا ہی کافی نہیں ہے۔ انسان کے اندر ایک چیز ہے جسے مائنڈ (Mind) کہتے ہیں' جسے آپ Reason کہتے ہیں' جسے عقل وفکر (Reason and Thought) کہتے ہیں۔ کہا کہ پھر جو کچھ تو نے دیکھا تھا' عقل وفکر کی رو سے اس کو پرکھ کے بھی دیکھ لیا تھا کہ بات یہی ہے۔ ٹھیک ہے کہ تم نے دیکھا ہے کہ شام کے ملگجے میں ایک شخص ایک جوان عورت کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ تم نے اسے دیکھا ہے' آنکھ تمہاری صحیح کہہ رہی ہے۔ تم نے اپنی قوتِ فکر سے بھی یہ پوچھا تھا کہ کہیں وہ اس کی بیوی نہ ہو' یہ اگلی بات ہے کہ جسے مائنڈ کہا جاتا ہے۔ یہ آپ کے اندر فیصلے کی قوت ہے۔ کہا: ان سب سے پوچھیں گے۔ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17:36) ۔ان میں سے ہر ایک کے متعلق ہم پوچھیں گے۔ برادرانِ عزیز! میں نے عرض کیا ہے کہ آپ اجتماعی طور پہ تو چھوڑ دیجئے' پتہ نہیں کون ایسے انتظامات کرے گا اور یہ کیسے ہوگا؟ انفرادی طور پہ ہی اگر آپ اپنی زندگی میں اپنا یہ اصول بنالیں کہ میں سنی سنائی بات کے متعلق کوئی اثر نہیں لوں گا' جب تک خود اس کے متعلق تحقیق نہیں کرلونگا' عزیزانِ من! آپ دیکھیں گے کہ آپ کی کم ازکم پچاس فیصد خرابیاں تو اتنے سے ہی دور ہو جائیں گی' اور آپ کو کتنا Confidence حاصل ہو جائے گا۔ اب اصل بات یہ ہے کہ اس پروپیگنڈے نے جو خرابی پیدا کی ہے' اُس سے آپس میں ایک دوسرے پہ Confidence ہی اٹھ گیا ہے۔

عدمِ اعتماد سے عدمِ سکون پیدا ہوتا ہے

اگر کوئی کسی کے متعلق نیک بات کہتا ہے کہ اس نے یہ کیا ہے تو کوئی اعتبار ہی نہیں کرتا' کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ وہ پیچھے سے کچھ کہہ کے چلا جاتا ہے مگر سامنے وہ کہتا ہے کہ یہ جو کہہ گیا ہے اس کا اعتبار کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب آپس میں آپ کا اعتماد نہ رہے تو یاد رکھیے! بس وہیں معاشرہ بگڑ جاتا ہے۔ عدمِ اعتماد سے انسان کے اندر عدمِ سکون پیدا ہوتا ہے' پھر ہزاروں وساوس پیدا ہوتے ہیں' ہزاروں شکوک ابھرتے ہیں' ایک دوسرے کے خلاف تاثرات پیدا ہوتے ہیں' نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں اسی بیج' اسی شجرِ خبیثہ کے ثمر و برگ ہیں۔ عزیزانِ من! ایک اسی چیز کو اپنی زندگی میں اصول بنا لیجیے گا۔ بڑے بڑے احکام کو تو چھوڑیئے' بس اتنی سی بات کو ہی اپنا اصول بنا لیجیے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ

Marfat.com

مَسْــــئُـوْلًا (17:36) ۔ جب تک خود تحقیق نہ کرلیا کرو کسی بات کے پیچھے نہ لگا کرو۔ سیاست کی دنیا میں تو اس نے یہ حکم دیا ہے کہ کوئی سیاستدان یا کوئی اس قسم کی خبریں پھیلانے والا شخص جب کوئی خبر پھیلائے' اُسے زبان سے مت نکالو بلکہ حکومت نے جو کوئی ذمہ دار مقرر کیا ہوا ہے اُسے جا کے رپورٹ کردو' کبھی کسی دوسرے شخص سے یہ بات نہ کرو۔ اُسے جا کے رپورٹ کرو۔ یہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ بات اصل میں کیا ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں' وہ بھی اسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ہم ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں کرتا۔

یہ چھوٹے چھوٹے احکام بڑی بڑی خرابیوں کا ازالہ کردیتے ہیں

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ قرآن کے جو احکام بظاہر آپ کو چھوٹے چھوٹے حکم نظر آئیں گے' یہ معاشرے کی بڑی بڑی خرابیوں کے ازالے کے لیے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم کس طرح سے یہ بات صاف کر رہا ہے۔ یہاں ایک چیز اور آ گئی ہے۔ یہ ابھی عرض کردوں اس کے بعد وہ آ ئیگا کہ ہم نے وحی کے ذریعے یہ تمام باتیں دی ہیں۔ درس کا وقت تو ہو گیا ہے لیکن میں جلدی ختم کردونگا۔ قرآن نے کہا: وَلَا تَـمْـشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (17:37)۔ بظاہر یہ بات نظر آتی ہے کہ قرآن نے کوئی خاص بات تو کہی نہیں ہے: اکڑ کے نہ چلو۔ اکڑ کر چلنے سے دو باتیں ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ زمین پہ پاؤں ذرا زور سے' دبا کے رکھا جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے یوں گردن کی جاتی ہے۔ سمجھانے کے لیے تو بات بڑی آسان تھی۔ کہا: وہ تمہارے اس زور سے پاؤں رکھنے سے یہ تو ہونے سے رہا کہ زمین میں شگاف پڑ جائے اور تمہارے اکڑنے سے یہ ہونے سے رہا کہ کوئی آسمان پھاڑ دے یا تن کر تم پہاڑوں کی لمبان تک پہنچ جاؤ تو تم یہ کر کیا رہے ہو؟ اتنا ہی نہیں کہا۔ وَلَا تَـمْـشِ فِـی الْاَرْضِ مَرَحًا (17:37)۔ ساری بات تو یہ ہے دیگر مقامات میں آپ لیجیے تو اس نے خود بتایا ہے کہ اس سے ہوتا کیا ہے؟ یہ کرنے والے کون لوگ ہیں؟ ایک چیز تو اس نے اس کے معنی میں ''فَخُوْرًا'' کہی ہے۔ میں نے بتایا ہوا ہے کہ عربوں کے ہاں ''فخر'' کس کو کہتے ہیں؟

فخر کا قرآنی مفہوم

''جس مجھ دا ہوانا وڈا اسارا ہووے' دودھ دا'' [1] وہ اسے ''تخرق'' کہتے تھے۔ یعنی ''اندروں پولا' باروں وڈا بنے''۔ [2] یہ اکڑ کر چلنے والوں کی نفسیاتی چیز ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اُن کا کردار کھوکھلا ہوتا ہے۔ وہ یوں بن کے دکھاتا ہے جو وہ ہوتا نہیں ہے۔ اور قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اسی کا نام ''فرحا'' ہے' اسی کا نام ''فخر'' ہے۔ اسی کو ''مرحا'' کہتے ہیں۔ یہاں یہی لفظ آیا ہے اور کہا کہ یہ چیز وہ لوگ

---

[1] جس بھینس کا ''ہوانہ'' بڑا سا ہو۔ ہاں ہاں دودھ کا ''ہوانہ''

[2] یعنی اندر سے خالی ہو اور باہر سے بڑا لگے۔

Marfat.com

کرتے ہیں۔ وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:187)۔ جو چاہتے یہ ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی وجہ سے ہو جو وہ کر کے نہیں دکھاتے۔ ''کہ اکڑے پھردے' جینوں قرآن نے کیا اے''۔ ❶ یہ بات اتنی ہی نہیں' کہ صرف گاؤں کا سردار ہی ''اپنا طرہ اوچا کر کے پھردا' اے تے پورے پنڈ وچ اکڑ اکڑ کے چلدا اے''۔ ❷ اس میں تو بڑے بڑے گروہ آ جاتے ہیں۔

تعمیری کام کیے بغیر تعریف کی خواہش

عزیزانِ من! اس وطیرے میں تو ہر ایک کی بنیاد یہ ہوتی ہے۔ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188)۔ کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی وجہ سے ہو جو وہ کر کے نہیں دکھاتے۔ ''اتنا بڑا تو سخی' اور تیرا باپ سخی' اور تو نے یہ کر دکھایا اور وہ بھی اس عہد میں یہ کچھ ہوا جو کہ عہدِ ہمایوں میں سارا کچھ ہوا تھا''۔ وہ کرنے والا بھی جانتا ہے کہ 'میں جھوٹ بولتا ہوں'۔ یہ بھی جانتا ہے کہ 'وہ جھوٹ بولتے ہیں'۔ لیکن ''یحمد'' خوش ہو رہا ہے۔ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188)۔ یہ اپنی روش پر بہت خوش ہیں اور چاہتے یہی ہیں کہ ان کی تعریف' ان کی ستائش و تحسین ان کاموں کی وجہ سے ہو جو وہ کر کے نہیں دکھاتے۔

اس طرح اکڑ اکڑ کے چلنے والے

کہا کہ جب یہ رُجحان (Tendency) ہو جاتی ہے' جب انسان کی یہ عادت ہو جاتی ہے کہ وہ ان باتوں سے خوش ہوتا ہے جو وہ کر کے نہیں دکھاتا۔ اس سے اپنے اندر ایک نفسیاتی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا اظہار وہ یوں اکڑ کر چلنے سے کرتا ہے۔ وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ بناوٹی طور پہ اپنے آپ کو بڑا بن کے دکھاتا ہے۔ جو کرتا نہیں ہے۔ لیکن اس بناء پہ چاہتا یہ ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ کہا: یہ نہ کرو۔ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا (17:38)۔ یہ تمام چیزیں جتنی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہیں اور یاد رکھو! یہ تمام تمہارے رب کے نزدیک بڑی ہی قابلِ نفرت ہیں۔ بڑا عجیب لفظ آیا ہے کہ ان تمام چیزوں سے باز رہو۔ اور آگے کہا کہ یہ باتیں یونہی نہیں کہی گئیں' ان کی بنیاد وحی پر ہے' جس پہ تم ایمان رکھتے ہو۔ ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 38 تک آ گئے' 39 سے اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

❶ جسے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اکڑتے پھر رہے ہیں۔

❷ یہ سردار ہی نہیں ہے جو اپنا طرہ اونچا کیے پھر رہا ہے۔ یہ تو پورے گاؤں میں اکڑ اکڑ کر فخر سے چل رہا ہے۔

Marfat.com

نواں باب: سورة بنی اسرائیل (آیات 39 تا 41)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1975ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 39 سے ہو رہا ہے۔ (17:39)۔ یہاں دہرادوں کہ یہ جو قرآن میں ان سابقہ آیات میں احکام دیئے تھے، وہ حکمت پر مبنی تھے۔ بات تو اُن میں یہ کہنی تھی کہ نظامِ ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص میں کسی وجہ سے کوئی کمی آ جائے اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے تا کہ اس کی اپنی ذات کا توازن برقرار رہے، معاشرے کا توازن برقرار رہے اور عالمگیر انسانیت کا توازن برقرار رہے۔ توازن کے برقرار رہنے سے ساری بات آگے چلتی ہے۔ یہ برقرار نہ رہے تو فساد پیدا ہو جاتا ہے۔

قرآنی نظام مکان (House) کو ہمیشہ گھر (Home) میں تبدیل کر دیتا ہے

نظامِ ربوبیت کی بنیاد اس توازن پہ تھی۔ جب وہ عملاً اس کو متشکل کرتا ہے تو وہ اس کی ابتداء چھوٹے چھوٹے یونٹ سے کرتا ہے، چھوٹے چھوٹے حلقوں سے کرتا ہے اور اس حلقے میں سب سے پہلے گھر کو لیتا ہے، ہوم (Home) کو سب سے پہلے ترجیح دیتا ہے۔ اور یوں کہیے کہ وہ ہاؤس (House) کو ہوم (Home) بناتا ہے اور اسی لیے ابتداء یہاں سے کی تھی۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17:23)۔ بڑھاپے کی وجہ سے والدین میں جو کمی آ گئی ہے، سب سے پہلے اسے پورا کرو۔ ظاہر ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے ان کے محنت کرنے کے قویٰ بھی مضمحل ہو جائیں گے اور ان کے دماغ پہ بھی کچھ اثر ہو جائے گا، دونوں باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا کہ یہ بات یاد رکھو کہ تم جب پیدائش کے فوری بعد ایسی حالت میں تھے کہ اپنی ضروریات خود پوری نہیں کر سکتے تھے اور اس کے بعد جب تک تم خود کمانے کے قابل نہیں

ہوئے تو تمہاری اس کمی کو وہ پورا کرتے چلے جاتے تھے۔ اب اگر ان میں عمر کی زیادتی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کمی آ گئی ہے تو اس کمی کو تم پورا کرو۔ اور دوسری بات یہ کہ بڑھاپے کی وجہ سے اگر ان کے ذہنی توازن میں بھی کچھ کمی آ گئی ہے' تو اسے پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ڈانٹو نہیں' ترش روی سے کام نہ لو۔ نہایت خندہ پیشانی سے' نرم خوئی سے' ان کے ساتھ بات کرو' معاملہ کرو اور اس طرح سے آپ دیکھو گے کہ نفسیاتی طور پر یہ جو بھی ان کے اندر کمی آ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے۔

ذی القربیٰ کا قرآنی مفہوم

قرآن نے والدین سے بات شروع کی اور اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر وَالْقُرْبٰی (17:26) تک آیا۔ کہا کہ اس سے مراد محض رشتہ داری ہی نہیں ہے بلکہ یہ جتنے تمہارے قریب رہنے والے ہوں' وہ سب بھی والقربیٰ ہیں' انہیں دیکھیے۔ جب انسانی تمدن کی قبائلی یا خاندانی زندگی تھی تو اس میں ذی القربیٰ عام طور پر اہلِ خاندان ہی ہوتے تھے' رشتہ دار ہی ہوتے تھے لیکن اس لفظ کو صرف رشتہ داروں تک محدود کر دینا غلط ہے۔ جو بھی' جس معنی میں بھی' قریب ہے وہ ذی القربیٰ میں آ جائے گا۔ دوسرے مقامات پہ قرآنِ کریم نے واضح طور پر' جسے ہم ہمسایہ کہتے ہیں' اور قریبی ہمسایہ' دور کا ہمسایہ' اس میں تو یہ دونوں دیئے ہیں' یہ تمام اس ذی القربیٰ کے دائرے کے اندر آتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ قرآنِ کریم چھوٹے چھوٹے یونٹ بناتا ہوا' ان کو پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ اور پھیلاتے ہوئے اس یونٹ کو عالمگیر انسانیت تک لے جائے گا۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن اس یونٹ کو سکیڑے گا تو صرف رشتہ داروں تک لے آئے گا۔ یہ تو گرد و نواح پہ آ جائے گا۔ اس کے بعد آگے آیا۔ وَالْمِسْكِيْنَ (17:26)۔ اب یہاں سے اور آگے بڑھا۔ کہا: یہ دیکھیے کہ جس کی حرکت رک گئی ہو' جس کی گاڑی کہیں دلدل میں پھنس گئی ہو' اسے نکالیے' اس کی جو کمی ہے اسے پورا کیجیے بلکہ اس سے بھی آگے اِبْنَ السَّبِيْلِ (17:26) تک چلا آیا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ تمہارے ہاں کا ہی رہنے والا ہو' باہر کا مسافر راستہ چلتے ہوئے بھی آ گیا ہے اور اس میں کوئی ضرورت کی کمی واقع ہو گئی ہے تو وہ بھی پوری کیجیے۔ اب تو ہمارے ہاں وہ شکل نہیں ہے لیکن عربوں کی زندگی میں تو آپ دیکھیے عام طور پہ وہ صحراؤں میں رہتے تھے' تو یہ ابن السبیل ان کے ہاں معاشرے کی عام روش تھی' وہ یہاں سے وہاں تک چلتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں نہ تو سرائے ہوتی تھی' نہ کہیں ہوٹل ہوتے تھے۔ جو بھی آنے والا ہے' ان کے ہاں وہ ابن السبیل تھا اور اس معاملے میں تو عرب اتنے متواضع تھے کہ ان کی تواضع تو ضرب المثل تھی۔ اس کے متعلق بھی یہ کہا کہ ابن السبیل کی رکی ہوئی ضروریات بھی پوری کرو۔

Marfat.com

راہگیر، مسافر، پورے گاؤں کا مہمان ہوتا تھا

ہمارے ہاں بھی یہ ذرا پہلے جو گاؤں کی زندگی تھی اُس میں یہ ہوتا تھا کہ آنے والے راہگیر، مسافر جہاں بھی ان کو شام ہو جاتی تھی، وہ اس گاؤں کے مہمان ہو جاتے تھے اور خاص طور پہ مسجد کا جو حجرہ تھا وہ مہمانوں کے لیے ہی رہائش کی ایک جگہ تھی، وہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ میں ان حجروں میں گیا ہوں۔ بڑی عجیب چیز تھی۔ شام ہوئی، کہیں کا وہ مسافر ہو، بلا تکلف حجرے میں آ جاتا تھا۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کسی سے پوچھتے بھی نہیں تھے، اگر چہ وہ آتے ہی اپنا تعارف تو فوراً کرا دیتا تھا، لیکن وہ ان میں کا ایک ہو جاتا تھا۔ بلا تکلف وہ وہاں آ کے اسی طرح ان میں گھل مل جاتا تھا اور انہوں نے اس کے لیے طریق یہ رکھا تھا کہ یہ عام طور پہ جتنے غیر شادی نوجوان ہوتے تھے ان کا کھانا اس حجرے میں آ جاتا تھا۔ کھانا بھی کسی خاص گھر سے منگوانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ گھروں سے وہ خود بخود کھانا چلا آتا تھا اور جتنے لوگ اس وقت حجرے میں ہوتے تھے، وہ سارے مل کر کھا لیتے تھے۔ حجرے ہی میں کچھ زائد لحاف وغیرہ رکھے ہوتے تھے، وہیں وہ سردیوں میں لحاف کی ضرورت ہوئی، سو گئے اور صبح اٹھتے ہی انہوں نے السلام علیکم کی اور چل دیئے۔ یہ معاشرے کی عام روش تھی۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ ابن السبیل کیا ہوتے ہیں۔

اولاد کی تربیت ایسی کرو کہ نسلِ انسانی میں قابلِ فخر ہو

پھر اسکے بعد اس نے یہ کہا کہ جو کمائی تمہارے پاس آ جائے، اس کے خرچ کرنے میں یہ بات ذہن میں رکھو کہ ایسی بات نہ ہو کہ وہ بے جا صَرف کرتے چلے جاؤ، جو چیزیں جس ضرورت کے لیے ہیں، انہیں اسی ضرورت میں ہی صَرف کرو، نہ تو تمہاری یہ کیفیت ہو کہ ہاتھ سکیڑ کے بالکل بقید ہو جاؤ، نہ یہ کیفیت ہو کہ چھلنی کی سی حالت ہو جائے کہ پانی ڈالتے جایئے اس میں کچھ نہیں رہے، بلکہ ان کے درمیان روش اختیار کرو۔ اولاد کی تربیت اس طرح سے کرو کہ وہ نسلِ انسانی میں ایک قابلِ فخر اضافہ ہو۔ میں نے بتایا تھا کہ حیوانات کے لیے بچوں کی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی تربیت لائحہ فطرت خود کر دیتی ہے۔ انسانی بچہ کی پرورش کے بعد اس کی تعلیم و تربیت خاص طور پہ کی جانی چاہیے۔ وہ انسان بنتا ہی اس تربیت اور تعلیم سے ہے جو اس کو ابتداء میں دی جاتی ہے۔ ایسا نہ کیا جائے تو قرآن نے کہا ہے کہ تم اپنے بچوں کو قتل کرتے ہو، یعنی قتل یہ نہیں ہے کہ گلے پہ چھری پھیر دیتے ہو بلکہ ان کی تربیت و تعلیم ایسے نہ کرنا کہ وہ انسانی سطح پہ آ جائیں، انہیں ذبح کرنے کے مرادف قرار دیا ہے اور اس کے بعد پھر سچ مچ جس کو قتل کرنا کہتے ہیں، یہ کہا ہے کہ ہر انسانی جان کو ہم نے واجب الاحترام بنایا ہے۔ اسے یوں قتل نہ کر دو۔ ہاں اگر کہیں قانون کا تقاضا ہو تو عدالت کی رو سے، حکومت کے قانون کی رو سے، ایک کی جان لی جا سکتی ہے لیکن کسی فرد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ کسی بھی ایک جان کو ضائع کر دے یا قتل کر دے۔ قتل کے بعد اگلی بات یہ آ گئی کہ مقتول کے چھوٹے چھوٹے یتیم لاوارث بچے رہ جاتے ہیں۔ یہاں قرآن یتیموں پہ آ گیا اور میں نے بتایا تھا کہ عربی زبان کی رو سے

Marfat.com

بھی اور قرآنِ کریم کی رو سے بھی یتیم صرف وہی نہیں ہے کہ جن چھوٹے چھوٹے بچوں کے ماں باپ مر جائیں بلکہ ''جو بھی معاشرے میں تنہا رہ جائے' وہ یتیم ہوتا ہے۔'' اسلیے انہوں نے کہا کہ ''یتمیٰ'' کے بارے میں بھی تمہارا وہی فریضہ ہے اور جو بچے یتیم ہو نگے' ان کے مال کی' ان کی جان کی حفاظت' اور ان کی تعلیم و تربیت تمہارے ذمہ ہے۔ اس میں یہ کہا کہ ان کی جان اور مال کی نگرانی کے سلسلے میں اگر تم ضرورت مند ہو' اس کے لیے ضرورت ہے تو اس میں سے طریقے کے مطابق کچھ لے سکتے ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر تم کچھ بھی نہیں لو۔

ان کے بعد کاروبار کی طرف آ گیا' بیع و شرع کی طرف' خرید و فروخت کی طرف' آ گیا۔ عام کاروبار میں بھی اس نے یہ کہا کہ ماپ اور تول کے پیمانوں کو صحیح رکھو' چیز صحیح دو' اور وزن میں بھی صحیح ہو' ماپ میں بھی صحیح ہو' قیمت میں بھی صحیح ہو اور اگلی بات یہ آ گئی کہ معاشرے میں یونہی افواہیں نہ پھیلاتے پھرو' نہ ہی کسی افواہ کو سن کر یونہی اس کے پیچھے لگ جایا کرو بلکہ جو بات تم تک پہنچے اس کی خود تحقیق کرو۔ اس لیے کہ تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ تم نے اپنی سمع اور بصر اور قلب سے اس بات کی تصدیق کر لی تھی یا نہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک سے پوچھیں گے کہ تم نے تصدیق کرنے کے بعد یہ بات آگے پھیلائی تھی۔

معاشرے میں اکڑ کر چلنے کی بجائے شجرِ ثمر بار کی طرح ہو جاؤ

اس کے بعد یہ کہا کہ معاشرے میں یہ نہ کرو کہ نوعِ انسانی کی منفعت کے کوئی اچھے کام تو نہ کرو لیکن لوگوں سے توقع یہ رکھو کہ لوگ تمہاری یونہی تعریف کرتے پھریں۔ اور معاشرے میں تم اکڑتے نہ پھرو' بلکہ تمہاری کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ شجرِ ثمر بار کی طرح جتنے زیادہ پھل لگیں' اتنی ہی تمہاری شاخیں زیادہ جھکنی چاہئیں۔ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ (17:39)- یہ ہیں وہ باتیں جو تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیں۔ تمہیں بتائیں کہ یہ ساری کی ساری Reason پر' علم پر' Based ہیں' حکمت پر ہیں۔ حکمت کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ ''راستے کے بیچوں بیچ چلاتا ہے تاکہ اِدھر اُدھر چلنے سے کوئی خطرہ نہ لاحق ہو جائے اور ان کے مطابق چلنے سے خطرات سے محفوظ رہو گے۔''

کبھی غلط بیج کی کاشت نہ کرو' سب کچھ ضائع ہو جائے گا

ہر چیز جو ہم کہہ رہے ہیں' Reason پہ' حکمت پہ مبنی ہے۔ لہٰذا قرآن نے قانون اور حکمت دونوں کو خدا کی طرف سے منزل کہا ہے۔ اور نازل کیا ہے۔ حکمت کے معنی ہوتے ہیں کہ ''ایسا کیوں کہا گیا ہے۔'' کیوں کے معنی ہوتے ہیں کہ ''ایسا کرو گے' تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا رہے گا۔'' یہ خدا نے خود بتا دیا ہے کہ ایسا کرنے سے کیا نتیجہ نکلے گا اور اس میں حکمت یہ ہے کہ تم خود ہی اپنے آپ کو مطمئن نہ کر لو' خود فریبی میں نہ آ جاؤ کہ ایک کام کو تم یہ سمجھ کے کرو کہ یہ تو خدا کے منشا' اس کے پروگرام' اس کے احکام' کے مطابق ہے اور اس کے بعد مطمئن ہو جاؤ مگر وہ کام اس کے مطابق نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو اُسے فوراً اس بات سے پرکھ لو کہ اس کا وہ نتیجہ نکل رہا ہے جو قرآن نے بتایا تھایا

Marfat.com

نہیں۔ تم کوئی بیج بونے سے یہ دیکھو کہ جس چیز کا سمجھ کر وہ بیج بویا تھا وہ فصل نہیں اگی' وہ دانے نہیں اگے' وہ پھل نہیں لگا' تو تم کبھی بھی اپنے آپ کو مطمئن کر کے اگلی دفعہ پھر وہی بیج نہیں بو دو گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جَو بوؤ اور اس کے بعد کہو کہ اس میں گیہوں لگ گیا ہے' گیہوں کا پھل آ گیا ہے۔ فصل جو کی ہونی چاہیے۔ اِس لیے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ بیج بوؤ گے تو یہ فصل اگے گی' اتنی اگے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا' تو کھڑے ہو کر دیکھو کہ کہیں غلطی ہو رہی ہے' ویسا نہیں ہو رہا جو اُس بیج سے ہونا ہے۔

قدرت کی طرف سے قوانین ملنے کا مقصد اچھے نتائج کا حصول ہے

قرآنِ کریم نے اپنے سارے احکام کو قوانین کی شکل میں اسی لیے بیان کیا ہے کہ ان کے نتائج سے آپ پرکھ کر دیکھ لو کہ وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں جو اس نے کہا تھا۔ جہاں اس نے کہا ہے کہ صلوۃ **تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** (29:45) ہے۔ یہ یاد رکھو! یہ تمہیں بخل سے' Selfishness سے' بھی بچالے گی اور ہر اس چیز سے بچالے گی جسے قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔ نماز ادا کرنے کے بعد یہ دیکھو کہ یہ ایسا کر رہی ہے یا نہیں کر رہی۔ اگر وہ نہیں کر رہی تو خدا نے جو اس کا نتیجہ بتایا تھا کہ ایسا ہوگا وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا تو دو ہی صورتیں ہونگی یا تو معاذ اللہ یہ سمجھنا ہوگا کہ یہ خدا نے معاذ اللہ یونہی بات کہہ دی۔ صلوٰۃ تو یہ نہیں کرتی اور اگر آپ کو یہ یقین ہے' اس پہ ایمان ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا' تو اس کے بعد آپ کو کھڑے ہو کر دیکھنا پڑے گا کہ پھر یہ صلوٰۃ وہ صلوٰۃ نہیں ہے جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ یہ صلوٰۃ یہ نتیجہ مرتب کرے گی۔ تو جہاں اس نے یہ کہا ہے کہ ہم نے قانون اور حکمت دونوں کو اپنی طرف سے نازل کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر حکم کے بعد دیکھو کہ اس کا وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں۔

خدا تعالیٰ نے اسی لیے قانون کے ساتھ حکمت کو بھی نازل کیا ہے

خدا تعالیٰ نے اپنے ہر قانون' اپنے ہر حکم کے بعد' یہ بتا دیا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ قدم قدم پر اسکی پرکھ کرتے چلے جاؤ۔ اگر وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے تو خدا کے احکام کی تعمیل' اس کی منشاء کے مطابق' ہو رہی ہے۔ اگر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا تو پھر تعمیل غلط ہے۔ اس حکم کی تعمیل اس طرح سے نہیں ہو رہی جس طرح ہونے سے وہ نتیجہ برآمد ہونا ہے۔ دنیا میں بلا نتیجہ تو کوئی بھی اپنے کام کو Repeat نہیں کرتا' لیکن مذہب اس قسم کی فریب دہ چیز ہے کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

وہ دوا پیے جا رہے ہیں' درمان ہی نہیں ہوتا' لیکن اپنے آپ کو دھوکہ دیئے جا رہے ہیں کہ نہیں ٹھیک ہے۔ ''تیری نماز نہیں ہوئی اے' اچھا جی' تیری جیہڑی ہوگئی اے' اونے کی کردتا ہیگا اے' جے میری نئیں ہوئی تے اونے نئیں کیتا' اس نماز دے بعد تے

اسیں دویں اکو جئے آں''۔ ❶ یہ کیسے ہوا' جو تم نے کہہ دیا کہ یہ نہیں ہوئی' کیسے نہیں ہوئی بھئی!''تیرے ہتھ ننگے نئیں سن۔ جید ے ذرا اوچے بدھے ہوئے سن' اوہدی ہوگئی۔جیہدے ذرا لٹک گئے ہیگے سن' تے اوہدی نہ ہوئی''۔ ❷

دین کے اور مذہب کے پیمانوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے

سوال تو یہ ہوا کہ اس نماز سے پہلے تم جیسے تھے' اس نماز کے بعد تمہارے اندر کوئی فرق پیدا ہوا یا نہیں۔ وہ جو اس نے ''تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ'' کہا تھا کہ یہ ہوا ہے یا نہیں ہوا' جس میں یہ نہیں ہوا' اس کی نماز نہیں ہوئی۔لیکن مذہب میں تو پیمانے ہی اور رہ جاتے ہیں۔ وہاں ہونے' نہ ہونے' کا سوال اس طرح نتائج سے منسلک نہیں ہے۔ وہاں تو ہونے' نہ ہونے' کی صرف مکینکل شکلیں ہوتی ہیں۔هُمۡ عَنۡ صَلٰوتِهِمۡ سَاهُوۡنَ اَلَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ (107:5-6)۔ کہ غالب مقصدِ صلوۃ جو ہے اس سے تو وہ غافل ہوتے ہیں۔ اس پہ اُن کی نگاہ نہیں ہوتی۔ اور جو چیزیں محسوس طور پہ نظر آتی ہیں' یہ ان کی بڑی احتیاط برتتے ہیں: دو پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیے' نماز کے احکام' جو چھپے ہوئے بھی آپ کو ملتے ہیں' اللہ اکبر کہتے وقت کانوں کی لو تک ہاتھ پہنچنے چاہئیں' انگلیاں یوں رہنی چاہئیں' قبلے کی طرف ایسے ہو۔ نماز ہونے کی پہلی شرط تو یہ ہوگئی۔ اس مقام پہ ہاتھ باندھیے' رکوع میں اتنے زاویے پہ جھکیے' سجدے میں یہ پنجے یوں زمین پہ لگے ہوئے ہونے چاہئیں' اس طرح سے اٹھنا اس طرح سے جھکنا' پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیے۔ یہ ساری چیزیں اگر کسی کی ہو رہی ہیں تو اس کی نماز ہوگئی اور اگر ان میں فرق آ گیا تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔ یہ ہیں نماز ہونے کی میکانکی شکلیں۔

نماز کی قبولیت کا پیمانہ حکمت ہے

قرآن نے یہ کہا تھا کہ یاد رکھئے! صلوۃ اس جذبے سے انسان کو بلند کردے گی' جس کی رو سے وہ سب کچھ خود سمیٹتا ہے' بہتے پانی کی طرح رہنے والے رزق کے آگے بند لگا دیتا ہے تاکہ یہ صرف اسی کے کھیت تک پہنچے' دوسرے تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ فحشاء کے معنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس نماز کے بعد اگر آپ کے اندر یہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے تو آپ کی یہ نماز ہوئی ہے' اگر یہ تبدیلی نہیں ہوئی تو آپ کی یہ نماز نہیں ہوئی۔ یہ ہے وہ کسوٹی جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے یہ بھی نازل کر دیا ہے' تم پہ نہیں چھوڑا تاکہ تم خود فیصلہ کر لو کہ نماز ہوگئی ہے یا نہیں۔ ورنہ خود فریبی (Self-Deception) میں مبتلا رہو گے کہ نماز ہوگئی اور صاحب انسان تو خود فریبی

---

❶ ۔تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اچھا جی! اگر تمہاری نماز ہوگئی ہے تو اس نے کونسا تیر مارا ہے جو میری نہ ہونے نے نہیں مارا۔ اس نماز کے بعد تو ہم دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔

❷ ۔تمہارے ہاتھ ننگے نہیں تھے۔ جس کے ہاتھ ذرا اونچے کر کے باندھے تھے اس کی نماز ہوگئی۔ جس کے ہاتھ ذرا نیچے ڈھلکے ہوئے تھے اس کی نماز نہیں ہوئی۔

میں مبتلا رہتا ہے' کہ اس فرقے والے کی نماز ہوگئی' اس فرقے والے کی نہیں ہوئی۔ فرقے کے اندر بھی اگر ایک شخص نے جھکنے کا وہ جو زاویہ نہیں رکھا جتنا تم نے کہا تھا تو اس کی نماز نہیں ہوئی: اگر اتنا ہوگیا تو اس کی نماز ہوگئی۔ خدا نے تو کہیں یہ حکمت نہیں بتائی تھی۔ اس نے تو اس کا نتیجہ بتایا تھا جسے آپ حکمت کہتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ہم نے کتاب اور حکمت دونوں کو اپنی طرف سے نازل کیا ہے۔

اعمالِ صالح کا نتیجہ زمین پر تمکّن ہے' استخلاف فی الارض ہے

یہ بڑی گہری چیز ہے۔ اسی سے اعمال وہ نتائج پیدا کرسکیں گے جو قرآن نے بتائے ہیں۔ جب آپ اعمال کے صحیح ہونے یا غلط ہونے کا معیار یہ قرار دیں کہ جو نتائج قرآن نے بتائے ہیں وہ نتائج مرتب ہورہے ہیں کہ نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہے' زمین پر تمکن ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ان اعمال سے' اس قسم کے ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی غیر مسلم مومنوں کے اوپر غلبہ حاصل نہیں کرے گا' اس نے کہا تھا: اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (47:35)۔ تم دنیا کے اندر بلند تر رہو گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ایمان اور اعمالِ صالح جس کا قرآن نے یہ نتیجہ بتایا تھا' اس کا یہ نتیجہ مرتب ہورہا ہے یا نہیں ہورہا۔ اگر نہیں ہورہا تو اپنے آپ کو خود فریبی میں رکھ رہے ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ ہم نے کتاب اور حکمت دونوں اپنی طرف سے نازل کی ہیں' تو اس حکمت کا بھی خدا کی طرف سے نازل کرنا دیکھو کہ آیا وہی نتائج مرتب ہورہے ہیں جو خدا نے کتاب میں نازل کیے ہیں۔ وہ کتنی اہم چیز تھی۔ اسی کا نام دین ہے۔

دین اور مذہب میں فرق یہ ہوتا ہے کہ اس میں انسان ان نتائج کو اپنی طرف سے کچھ متعین کرلیتا ہے اور وہ متعین کرنے کے بعد بھی ان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اصل میں وہ نتائج نہیں ہوتے۔ وہ تو محض ان کی مکینکل شکلیں ہیں جنہیں وہ اپنی طرف سے مرتب کرتا ہے۔ یہاں کچھ نتائج نہیں برآمد ہوتے۔ تو پھر وہ اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ یہاں یہ نتائج مرتب نہیں ہونگے' آخرت میں جاکے مرتب ہونگے۔ اب اس خود فریبی سے نکلنے کی کوئی شکل بھی نہیں ہے صاحب! عالمِ آخرت میں یعنی بعد از موت آپ کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہاں جاکے کیا ہوگا۔ اس طرح وہ اپنے اعمال کی اُن میکانکی اشکال پہ زور دیتا چلا جاتا ہے جو مذہب کی طرف سے بقول ان کے متعین شدہ ہیں۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم تو کہتا ہے کہ وہ تو فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:20) آخروی زندگی کی خوشگواریوں سے پہلے فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً (2:20) دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں ہیں۔ وہ ٹھیک ہے کہ اس کے بعد کی زندگی بھی ہے لیکن وہ تو دنیا اور آخرت میں کوئی فرق ہی نہیں کرتا۔

اعمالِ صالح کا محسوس نتیجہ: کوئی قوم تم پر حکمرانی نہیں کرسکے گی

قرآنِ کریم تو زندگی کو ایک مسلسل جوئے رواں بتاتا ہے۔ "یہاں کیا اور وہاں کیا" کی اس طرح کی تخصیص نہیں کرتا جو آپ کے ہاں مذہب کی دنیا میں کی جاتی ہے۔ لیکن وہ اس کی ابتداء یہاں سے' اسی دنیا سے کرتا ہے۔ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55)۔ اس دنیا کے اندر تمہیں وہ استخلاف حاصل ہوگا کہ کوئی غیر مسلم قوم تمہارے اوپر غلبہ حاصل نہیں کرسکے گی۔ فِی الۡاَرۡضِ یہ

اگلی شرط تو ایک طرف رہی کہ وہ غلبہ اتنا زیادہ قوی ہوگا کہ غیر مسلم کو تمہارے اوپر آ کے کسی قسم کا تغلب یا تسلط حاصل کرنے کا کہیں راستہ ہی نہیں ملے گا' وہ تو بڑی چیز رہی مگر انہوں نے یہاں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ نہیں' یہاں تو نتائج مرتب ہی نہیں ہونگے' اور یہ فیصلہ صرف اس لیے کر دیا کہ ان کے ہاں نیک کاموں کے نتائج اگلی دنیا میں آئیں گے۔ اس دنیا میں مرتب نہیں ہونگے۔ اگر قرآن کی رو سے اعمال کے پرکھنے کا یہ معیار' اس دنیا کے اندر مرتب ہونے والے نتائج کو قرار دیا جاتا تو ہم یہیں کھڑے ہو جاتے' اور پھر بار بار سوچتے کہ قرآن کی منشا کے مطابق یہ نتیجہ کیوں مرتب نہیں ہو رہا۔ اس نتیجے کے منزل من اللہ ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ قرآن کے احکام وقوانین کے نتائج بھی ابدی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کسی ایک دور میں ہی ایسے نتیجے نکلیں گے اور کسی دوسرے دور میں نہیں نکلیں گے۔ صحابہ کبار ؓ کے دور کے اندر آپ نے محسوس کر لیا کہ یہ احکام اور ان کے نتائج تو قیامت تک کے لیے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پھر ہمارے ہاں اعمال وہ نتائج کیوں مرتب نہیں کرتے جبکہ ان کے تو یہیں برآمد ہوتے تھے۔

مذہب کی دنیا انسان کو ہمیشہ خود فریبی میں مبتلا رکھتی ہے

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مذہب میں انسان خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اس خود فریبی سے بچانے کے لیے کہا کہ نتائج بھی ہم ہی تمہیں بتائے دیتے ہیں تا کہ تم قدم قدم پر پرکھ لو کہ وہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ ہے فرق دین میں اور مذہب میں۔ یہ دین اس وقت بنتا ہے جب خدا کی طرف سے بتائے ہوئے نتائج اس دنیا میں نکلنے شروع ہو جائیں۔ مذہب وہ ہوتا ہے کہ جس میں یہاں تو کوئی نتائج نہ نکلیں بلکہ الٹے چلے جائیں اور کہیں یہ کہ اعمال کے نتائج آخرت میں نکلیں گے۔ حالانکہ قرآنِ کریم اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (47:35) کہہ رہا ہے۔ کہ ''تم ان پر ضرور غالب آؤ گے۔'' اگلی سٹیج تو یہ آئے کہ یہ برابر باقی قوموں کے ہی ہو جائے' ان مغربی اقوام نے کائناتی طور پر غلبہ حاصل کیا' اس لحاظ سے خدا کے زیادہ مقرب بنے۔ مگر آپ کے ہاں کے علمائے مذہب نے کہا کہ یہاں جو جتنا زیادہ ذلیل وخوار ہوگا' اتنا ہی خدا کا مقرب بنے گا۔ اب منزل من اللہ جو حکمت' جو نتائج مرتب ہونے تھے' اس کی جگہ یہ چلے اللہ میاں کو پڑھانے کے لیے کہ نہیں نہیں۔ معاذ اللہ۔ ''یہ بات نہیں جو آپ نے کہی۔ بات یہ ہے کہ کوئی جتنا خدا کا مقرب ہوتا ہے' وہ الٹا اتنا ہی یہاں ذلیل ہوتا ہے''۔ فریب کی ہماری یہ کیفیت ہے کہ ان اہلِ شریعت یا مسجد والوں سے بہت زیادہ فریب کھایا جاتا ہے کہ ہاں صاحب! اللہ والوں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ جب کہیں دیکھیے کہ یہاں ہر قسم کی مصیبتیں' ہر قسم کا عذاب آیا ہوا ہے' ابتلا ہے' یہ کہتے ہیں کہ ''جی! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائشیں کرتا رہتا ہے۔'' اللہ میاں کے یہ کام ہیں کہ وہ آزمائشیں کرتا رہتا ہے۔ یعنی اسے معاذ اللہ کچھ پتہ نہیں ہوتا' آزماتا ہے' جیسے آپ دوست کو آزماتے ہیں: میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ایسے ہی وعدہ کر رہے ہو یا پورا بھی اترتے ہو۔

Marfat.com

یہ سارے ہتھکنڈے خود کو فریب دینے کے لیے ہیں

عزیزانِ من! یہ سارے تصورات اسلیے پھیلائے گئے کہ وہ جو اس نے کہا تھا کہ حکمت بھی منزل من اللہ ہے، نتائج بھی ہم نے بتا دیئے ہیں، یہ نکل کے رہیں گے۔ اس سے اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے یہ سارے ہتھکنڈے ہیں۔ اور اس کا نام مذہب ہے۔ یہ Religion ہے۔ یہ اسلام کی ہی بات نہیں ہے، دنیا کے ہر Religion میں یہی ہوا ہے، ابتداء میں خدا کی طرف سے جب ہر Religion آیا تھا تو وہ دین تھا، وہ یہاں نتائج پیدا کر کے دکھاتا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اہلِ کتاب کو، یہودیوں کو، عیسائیوں کو، یہ جتنے بھی اہل کتاب تھے، ان سب کو کہا تھا کہ میں وہ کتاب لایا ہوں جو ان چیزوں کی مصدق ہے جو تم سے کہی گئی تھیں، جنہیں تم آج بھی دہراتے رہتے ہو۔ ہم نے مصدق کے معنی کر لیے کہ وہ تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اب اس کے بعد کہا کہ صاحب! وہ تو خود کہہ رہا ہے کہ ان کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے۔ یہ اصل میں وہ رہی نہیں ہیں، تو آپ کو معلوم ہے یہ ہمارے ہاں ان لوگوں کی یہ کوششیں شروع ہوئیں کہ ان لوگوں کی تورات اور انجیل کے متعلق ہم ثابت کریں کہ نہیں ان میں تحریف نہیں ہوئی، اور اس پہ ہمارے ہاں بڑا کام ہوا ہے۔ وہ اس لیے تھا کہ اس کے اندر بھی وہی راز ہے جو مصدق کے غلط معنوں سے پیدا ہوا۔ مصدق کے معنی یہ ہیں کہ "یہ چیزیں جو تم اس کے اندر دہراتے ہو اور تم نے یہ کہہ دیا ہے کہ صاحب! یہ یہاں نہیں ہوگا، یہ ان چیزوں کو سچ کر دکھائے گا، یہ ہر دعویٰ سچ کر دکھانے والا ہے، جسے تم خدا کی طرف ان کتابوں میں منسوب کرتے ہو"۔

ہم واپس اہلِ کتاب کی سطح پر آ پہنچے ہیں

بہر حال، تحریف کے بعد وہ جو اصلی تعلیم تھی اس کا بہت کچھ تو ہے، کم از کم وہ کچھ چیزیں تو ہیں جیسے: یہاں یہ غلبہ ہوگا، یہاں خدا کی بادشاہت قائم ہوگی، اور یہ سب کچھ ہوگا۔ اس طرح وہ جو حصہ ہے اس کو یہ قرآن سچ کر دکھائے گا۔ اس نے سچ کر دکھایا۔ اس کے بعد یہ پھر اہل کتاب کی سطح پہ آ گئے۔ اب یہ مانتے ہیں کہ وہیں آخرت میں جا کے ملے گا۔ یہ مانتے ہیں کہ وہاں کی جنت ہمارے حصہ میں ہے۔ اس دنیا میں جتنی زیادہ ذلت و خواری ہوگی اتنا ہی وہ خدا کے مقرب ہونے کی دلیل بنتے چلے جائیں گے۔ آپ غور فرماتے ہیں کہ صحیح تصور بدلنے سے قومیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ **ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَةِ** (17:39)۔ یہ ہے جو خدا نے تیری طرف نازل کیا: کتاب اور حکمت۔

وحی کی دو قسموں والا عقیدہ

بات ذرا دوسری طرف نکل جائے گی لیکن آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے میں یہ عرض کر دوں کہ ایک عقیدہ پیدا کیا گیا کہ وحیِ خداوندی کی دو قسمیں تھیں: ایک کتاب اور ایک حکمت۔ وحی دو طرح کی ہوئی۔ کتاب تو وہ وحی ہوئی جو قرآن کے اندر رسول اللہ ﷺ نے

Marfat.com

دیدی اور حکمت وہ وحی جو قرآن کے اندر نہیں دی یعنی وہ ہوئی رسول اللہ کی حدیثیں' انہیں قرآن کا ''مثلہ معہٗ'' قرار دیا گیا یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ یہ تو اتنی سی کتاب ہے۔ یہ سارا قرآن جو اس نے دیا ہے' اسے اگر باریک ٹائپ پہ لکھا جائے تو چند صفحوں میں یہ آ جاتا ہے۔ اس طرح کتاب یعنی قرآن کی وحی تو ہوئی چند صفحات کی۔ اور باقی وحی یعنی حکمت جو قرآن سے باہر ہے' وہ کیا ہوئی؟ اس سلسلے میں مودودی صاحب ❶ کا فرمان قابلِ توجہ ہے۔

مودودی صاحب کا فرمان کہ وحی کا 9/10 حصہ قرآن سے باہر ہے

وہ حکمت جو قرآن سے باہر ہے' اس میں سے کم از کم اُسے لیجیے جسے یہ اپنے ہاں صحاح ستہ کہتے ہیں تو اس کی اتنی اتنی ضخیم جلدیں ہیں: اِن میں چھ تو الگ یہی مجموعے ہیں اور یہ خود سنیوں کے ہیں' اسی طرح سے شیعوں کے اپنے ہاں کے الگ اتنے اتنے بڑے کم از کم چار تو ان کے ہاں بھی مستعمل ہیں' اور اس کے علاوہ اور بے شمار کتابیں ہیں۔ تو خدا کی طرف سے جو دوسری وحی اس کے ساتھ' اس جیسی ہوئی ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جو یہاں مودودی صاحب نے کہا تھا کہ قرآن کے اندر تو دین 1:10 ہے' 9:10 اس سے باہر ہے۔ یہ جو باہر ہے اس کے متعلق پوچھو کہ کیا کیا بخشیں ہوئیں۔ ایک تو یہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد زبانی روایتوں کی رو سے یہ جمع ہوئیں۔ کہا کہ یہ وحی منزل من اللہ ہے' اور جو جمع ہوئی اس کے اندر ہر ایک کا یہ عقیدہ ہے کہ اس میں غلط بھی ہیں' صحیح بھی ہیں' وضعی بھی ہیں۔ بھئی کیسے پرکھا جائے؟ پرکھنے کے لیے معیار خود انسانوں کے تجویز کردہ ہیں۔ اور انہیں وحی قرار دینے والوں کی سمٹ سمٹا کے آخری بات یہاں یہ آ گئی کہ اسے مزاج شناسِ رسول کی نگاہ بتا سکتی ہے کہ اس میں کونسی چیز منزل من اللہ ہے اور کونسی نہیں ہے۔ خدا کی طرف سے دی ہوئی وحی کا معیار کسی ایک مزاج شناس کی نگاہ بتائے اور پھر مزاج شناس بھی وہ کہ جس کے متعلق خدا نے کہیں نہیں کہا کہ وہ مزاج شناسِ رسول ہے۔ خدا نے اپنے رسول کے متعلق تو کہا تھا کہ یہ میرا رسول ہے۔ جس دن یہ اتنا سا عقیدہ پیدا ہوا' آپ دیکھیے کہ کس طرح سے یہاں سارے کا سارا رخ موڑ دیا۔

اب میں نے اس سے پہلے یہ جتنی چیزیں کہی ہیں جس نے دین کو مذہب بنایا تھا' یہ سب کی سب اس میں ہیں جنہیں قرآن سے خارج رکھا گیا ہے۔ حیثیت اس کی قرآن کی مثل' قرآن کے ساتھ کی ہے۔ اب کوئی ان سے بات کرے تو اس کے بعد کفر کے فتوے' گالیوں کی بوچھاڑ' وہ پروپیگنڈہ' وہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ جو کچھ بھی بات کرنے کی ہے تو وہ دو فقروں میں ختم ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم پیچھے سے احکام دیئے چلا آ رہا ہے' اس کے اندر وہ احکام درج ہیں' وہ کہتا ہے۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ (17:39)۔ یہ وہ حکمت ہے جو خدا نے' تیرے رب نے' نازل کی ہے۔ یہ قرآن کے اندر پہلے سے موجود ہے اور اگر ان کے کہنے کے مطابق حکمت وہ ہے جو ان کتابوں کے اندر ہے تو خدا تو قرآن کو حکمت قرار دے رہا ہے۔ دراصل یہ سب اس چیز سے بچنے

---

❶ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (25 ستمبر 1903ء تا 22 ستمبر 1978ء)

Marfat.com

کے لیے ہے کہ اگر خدا کی طرف سے اس متعین حکمت کو مان لیا جائے تو پھر انسان خود فریبی میں نہیں رہ سکتا۔ خود کھڑے ہو کے سوچنا پڑتا ہے، چھوٹی چھوٹی سی باتوں میں بھی آپ سوچتے ہیں۔ دو تین دن بھی کسی طبیب کا علاج کرانے کے بعد اگر آپ دیکھتے ہیں کہ مرض میں فرق نہیں پڑا' آپ کھڑے ہو کے سوچ رہے ہوتے ہیں۔ طبیب سے' معالج سے' ہی یہ بات کہتے ہیں کہ صاحب! کچھ دوائیاں بدلیے۔ یا وہ خود بھی اس کے بدلنے کے لیے سوچ رہا ہوتا ہے۔ وہ کھڑا ہوتا ہے کہ وہ نتیجہ نہیں نکل رہا جو اس کا نکلنا چاہیے تھا' آج وہ نتیجہ نہیں نکل رہا تو بتایا جا رہا ہے کہ صاحب! وہ دوائیاں نہیں ملتیں' یہاں یونہی بنائی جا رہی ہیں گویا وہ دوائی نہیں رہی' آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس دوائی نے وہ نتیجہ پیدا نہیں کیا کہ جو اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ پیدا کرے گی۔ لیکن مذہب کی دنیا کے اندر قرآن کہتا چلا جائے کہ لَعَلَّكُمْ یہ ہو۔ لَعَلَّكُمْ کے تو معنی ہیں'' تا کہ یہ ہو' تا کہ یہ ہو''۔ وہ نہیں ہو رہا تو آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اہلِ شریعت' اہ مسجد والے علماء یہ کہتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ وہ جو نہیں ہو رہا تو اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہے۔ وہ کہتا ہے: ''ہم اپنے وعدے کے خلاف کبھی کرتے ہی نہیں ہیں۔'' آپ نے دیکھا کہ اتنی سی بات عملاً کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

گاڑی کا کانٹا اگر بدل جائے تو پھر منزل بدل جاتی ہے

میں جو کہا کرتا ہوں کہ جب وہ گاڑی کا نٹا بدلتی ہے تو ایک انچ کا فرق ہوتا ہے اصلی ریل کی پٹڑی سے اور دوسری پٹڑی سے جس پہ جا کے وہ پڑتی ہے لیکن پھر وہ جوں جوں اسی رفتار' اسی سرعت' سے چلتی جا رہی ہے اپنی منزل سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے اگر غلط پٹڑی پہ پڑ گئی ہے۔ اور اب اگر اس کا علاج یہ کیا جائے کہ صاحب رفتار اور تیز کرو' اس کے اندر اور ایندھن ڈالو' اس کو اور تیل دو اور یہ سب کچھ کرو تو وہ آپ کی منزل کی طرف سے اور تیزی سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

حکمت کے معنی ہیں کہ ہم نے منزل بھی متعین کر دی۔ حکم یہ دیا تھا کہ یہاں سے کانٹا یوں مڑے گا اور بتا دیا تھا کہ آگے چلو گے تو اس قسم کی علامتیں آئیں گی تا کہ ڈرائیور دیکھ لے کہ اگر یہ نہیں آئیں' اگلا سٹیشن نہیں آیا' جو آنا چاہیے تھا' تو وہ وہیں رک جائے گا' وہ کبھی آگے نہیں جائے گا۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ گاڑی چلائے جائے کہ وہ سٹیشن آتے ہیں تو آئیں' نہیں آتے نہ آئیں۔ لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ وَخَلَقْنَا لَهُم مِّن مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ (36:41-42)۔ تم ذرا اس پر غور کرو کہ تم کس بھروسے اور اعتماد سے' اپنے بال بچوں' چھوٹے بڑے' سب کو کشتی پر سوار کرا دیتے ہو' اور یہ کشتیاں' اس قدر وزن لیے کس طرح دریاؤں اور سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں۔ اور کشتیوں جیسی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم نے ان کی سواری کے لیے پیدا کر دیا ہے۔ وہاں ہمارے قانونِ طبعی کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق ڈرائیور کہے گا کہ ''او ساہیوال لاہوریو! اگے آئے گا''۔ [1] یہ ہوتا ہے' عزیزانِ من! قوموں کی زندگی میں! ایک ذرا سا یوں' تھوڑا سا یوں' مروڑ ادے دیا جائے تو آدمی کہیں

[1] اے اہالیان لاہور! ساہیوال آگے آئے گا۔

Marfat.com

سے کہیں چلا جاتا ہے اور آپ کے ہاں یہ چیز ہوئی ہے کہ یہ جو خدا نے بتایا تھا کہ ان اعمال کا یہ نتیجہ نکلے گا جسے کہا تھا کہ ہم نے ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰٓی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ (17:39) ۔ یہ نتیجہ نکلے گا' یہ نہیں نکل رہا' تو اس کے لیے پھر آگے کیا کہا جا رہا ہے کہ صاحب! یہ نتیجہ وہاں' اگلے جہان' میں جا کے نکلے گی۔ بھئی! کیسے تم کہہ رہے ہو کہ یہ چیز یہاں نکلے گی۔ فلاں تفسیر میں لکھا ہے جی! فلاں حضرت صاحب کا یہ ارشاد ہے۔ قرآن کہتا ہے: وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ (17:39)۔ خدا کے ساتھ اور خدا مت ملاؤ۔ اللہ اکبر! اعمال کے متعلق اگر آپ یہ کہیں گے تو وہ ابھرے نکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ دوسرا نہیں ملتا اگر چہ اس میں بہت اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں صاحب' لیکن یہ نتائج کے اعتبار سے جب آپ کہتے چلے جائیں گے تو بات کھٹکے گی نہیں۔

یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے فرمودہ احکام کے برعکس ہے

یہ جتنے نتائج آپ کو بتائے جاتے ہیں کہ اس پہ دس نیکیوں کا ثواب ہوگا' اس سے اتنی نیکیوں کا ثواب ہوگا' ''ال م'' تین حرف ہیں' ہر حرف کی دس نیکیاں ہیں' اس کی تیس نیکیاں ہیں۔ یاد رکھیے یہ خدا نے کہیں نہیں کہا۔ یہ تمام قرآن سے باہر کی چیزیں ہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان کتنا پکا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کو ناظرہ ہی پڑھتے چلے جاؤ' بغیر سمجھے ہوئے' اور کچھ نہیں تو اس پہ انگلی پھیرتے چلے جایئے' اس سے ثواب ہوتا ہے۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا۔ خدا نے ہر جگہ یہ کہا ہے کہ کتاب نازل کی تا کہ تم اس پہ غور و فکر کرو' عقل و شعور سے اسے پڑھو' سمجھو۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ اگر قرآن کی جگہ' دوسرا قرآن آ جائے' اُسے تو ہر شخص بھانپ لے گا' اس کے لیے اتنی سعی و کاوش ہوگی۔ اب آپ کے ہاں ایک نیا محکمہ ہے اور اس میں ابھی قوانین پہ قوانین بنتے ہیں کہ کتابت میں کوئی غلطی نہیں رہنی چاہیے۔ بالکل صحیح بات ہے' نہیں رہنی چاہیے' اچھا کام ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے کہ کتاب میں تو کوئی کتابت کی غلطی نہیں رہنی چاہیے اور وہ جو اس نے حکمت اور نتائج بتائے تھے کہ وہ سارے کے سارے وہ لینے چاہئیں۔ یہ قرآن میں کہاں کہا گیا ہے کہ وہ حکمت اور نتائج لینے چاہیے جو اس میں نہیں ہیں بلکہ اس کے خلاف ہیں؟

قرآن تو ایک ایک لفظ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے' تاکید کرتا ہے

قرآن میں تو ایک طرف' عزیزانِ من! عام طور پہ بھی آپ حکمت جسے کہتے ہیں' اسے Intellect بھی کہہ لیجیے' اُسے آپ عام عقل و فکر کہہ لیجیے' اس کے لیے بھی دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ جس کی زبان آپ نہ جانتے ہوں اور کتاب اس میں لکھی ہو اور آپ اسے پڑھتے رہیں۔ زبان کا نہ جاننا تو ایک طرف رہا' اگر اُس زبان میں آپ کی استعداد کم ہے اور وہ کتاب آپ کی استعداد سے زیادہ اونچی ہے' اگر اسے بھی آپ شروع کریں گے تو دو چار ورق پڑھنے کے بعد چھوڑ دینگے کہ ''نہیں صاحب! یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔'' آپ کسی کتاب کے ساتھ یہ نہیں کرتے لیکن ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ (2:2) جو ہے' اس کے ساتھ یہی چیز ہو رہی ہے۔ یہ ایک

ایسی کتاب ہے کہ جس کے لیے نہ زبان کا جاننا ضروری ہے' نہ اس کا سمجھنا ضروری ہے' نہ اس کے مفہوم تک پہنچنا ضروری ہے۔ پہلے یہ چیزیں آئیں گی تو اس کے اندر غور و فکر و تدبر ہو گا۔

دنیائے انسانیت کا وقار اور مقام صرف فکرِ قرآنی سے وابستہ ہے

جب سرے سے سوال ہی یہ ہو گا کہ آپ وہ زبان ہی نہیں جانتے' آپ اس کا مطلب ہی نہیں جانتے' تو آپ غور و تدبر کس میں کریں گے؟ یہ ساری چیزیں جو قرآن نے کہی تھیں' وہ سب کی سب اس ایک عقیدے کے ماتحت ختم ہو گئیں کہ قرآن کو یونہی پڑھ دینے سے بھی ثواب ہوتا ہے۔ پڑھتے چلے جائیے۔ یہ عقیدہ کس نے دیا ہے؟ خدا نے تو نہیں دیا۔ یہ بہت ناپختہ ہو چکا ہے لیکن خدا کے بتائے ہوئے اس عقیدے کے یکسر خلاف جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوا؟ اس خدا کا تو یہ ہے نہیں۔ آپ نے غور کیا کہ عقیدہ کہاں لاتا ہے؟ اسی لیے قرآن نے کہا: وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (17:39)۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہاں بھی Occasion ایسا نہیں تھا۔ یہ ہے وہ حکمت جو یہ حضرات اپنی طرف سے بنا لیتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ خدا کے ساتھ یہ نہ کرو اور نہ خدا کے ساتھ دوسرا صاحبِ اختیار و حکمت بناؤ۔ اگر تم نے یہ کر لیا تو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (17:39)۔ دھتکارے جاؤ گے' دنیا میں درماندہ و واماندہ رہ جاؤ گے' پچھاڑے رہ جاؤ گے' زندہ قوموں کی صفوں میں تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔ اگر تم نے یہ کیا کہ کتاب تو خدا کی رکھی اور حکمت تمہارے ہاں غیر اللہ کی آئی' یہ ہے وہ جہنم جس کے اندر جھونک دیئے جاؤ گے' کتاب نے تو فائدہ ہی اس صورت میں دینا تھا کہ آپ اس کی حکمت سے' اس کے نتائج سے' جانچتے کہ نتیجہ صحیح نکلا ہے یا نہیں نکلا؟

مسلمانوں کی کہانی مسلمانوں کی زبانی

عزیزانِ من! خیر دنیا تو کہے یا نہ کہے' ہمارے راندۂ درگاہ ہونے' دھتکارے جانے کی کیفیت یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل قوم' سب سے زیادہ کمزور قوم' مسلمان ہے۔ یہاں پہنچ کے' کبھی کھڑے ہو کے سوچیں کہ یہ کیا ہوا ہے؟ ہمیں استخلاف فی الارض حاصل نہیں ہے' دوسرے کی حکومت ہے اور ستم یہ کہ اس حکومت کے اندر بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلام پر عمل ہو سکتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا بھی یہ سارا قصہ اس پہ چل رہا تھا۔ کہا: قرآن نے استخلاف فی الارض بتایا ہے۔ یہ ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ ہے کہ وہ اس دنیا میں مملکت عطا کرے گا' حکومت عطا کرے گا' اقتدار عطا کرے گا۔ یہ کچھ کا ہے کے لیے' تاکہ تمہارا دین متمکن ہو سکے۔ دین کے تمکن کے لیے تو قرآن نے استخلاف فی الارض کی یہ شرط بتائی تھی' ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا تھا۔ دوسروں کی تمہاری محکومی ہے' اس محکومی کے اندر تم کہتے ہو کہ اسلام پر عمل ہو رہا ہے' یہ پھر کہاں گیا جو قرآن نے کہا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (5:9)۔ وہ خدا کا وعدہ ہے: وہ کہتا ہے ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے' یہ وعدے کی

Marfat.com

بات کہاں گئی؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ان لوگوں نے فی الارض کے لیے کیا کہا ہے؟ ان سے کہا کہ جی اس سے مراد ارض الجنت ہے' جنت کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے بعد بھی جنت کی زندگی ہے۔ کیونکہ یہ آگے اس نے کہا تھا کہ جس طرح تم سے پہلی گذری ہوئی قوموں کو تمکن دیا' اسی طرح سے یہ اسی زندگی میں دیا ہے' تو صاحب قرآن تو ان کی نظیر پیش کرتا ہے۔ کہنے لگے: ''جی وہ تم سے پہلے جنت میں بادشاہیاں کررہے ہیں''۔ کہا: اس نے کہا ہے تا کہ تمہارا دین یہاں' اس دنیا میں متمکن ہوجائے' تو دین کو یہاں متمکن کرنے کی بات ہے یا اس دین کو جنت میں متمکن کرنے کی بات کی ہے؟ کہنے لگے کہ ''تہاڈے جئے جھگڑالو ہوندے ہیگے' جیناں تے قرآن نے لعنتاں برسائیاں''۔ ❶ ٹھیک ہے جی ''کڈ دیوانیوں مسیتوں باہر'' ❷ آپ دیکھیے کہ اسی ایک چیز پہ ان کو مسجد سے باہر نکال دیا۔ میرا خیال ہے پورا درس اس پہ ختم ہو رہا ہے۔ ایک ذرا سی یوں مروڑی (Turn) دیدیں' بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔

اس سے آپ یہ دیکھیں گے کہ قرآن محض شاعری نہیں کرتا جب وہ یہ کہتا ہے کہ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ (17:39)۔ ہم نے کتاب اور حکمت دونوں کو اپنی طرف سے نازل کیا ہے۔ وہ یہ بات تھی۔ یہ یونہی نہیں ہے۔ آپ نے کتاب اس کی طرف سے لی' نتائج اپنی طرف سے کردیئے۔ وہ کہتا ہے: اِلٰـہًا اٰخَرَ (17:39)۔ تم خدا کے ساتھ دوسرا خدا بنا رہے ہو' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا (17:39)۔ تم طرح طرح کی ملامتوں کے ساتھ دھتکارے ہوئے بن گئے۔ پھر خدا کی مختلف شکلیں بنادیں۔ عہدِ جاہلیت میں خدا کی یہ شکلیں دیوی دیوتاؤں کی شکل میں' جہالت کی بنتی تھیں' خدا کو اس شکل میں مانا جاتا تھا۔ دراصل یہ خدا وہ پجاری اور مجاور بنتے ہیں' وہ مہانت بنتے ہیں' جو وہاں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اِن دیوی دیوتا کا تو صرف نام ہوتا ہے۔ یہ بالکل اُسی طرح سے ہے جس طرح سے وہ ساری باتیں خود کرتے ہیں لیکن نام حضرت صاحب کا ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں یہ جتنی نذریں نیازیں ان قبروں پہ دی جاتی ہیں' وہ نیچے والے بیچارے کو تو اس میں سے ایک ''لڈو پیڑے دا پورا ای نئیں ملدا ہیگا'' ❸ وہ تو قبر کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ جسے بھی آپ داتا صاحب کی نیاز کہتے ہیں' اس داتا صاحب کو اس میں سے کیا مل رہا ہے؟ روز داتا ❹ صاحب کے نام پہ دیئے جارہے ہیں۔ یہ دیوی دیوتاؤں کا تصور بھی ان کا پیدا کردہ تھا کہ ایک Exact Concrete سی چیز ان کے سامنے رکھی جاتی تھی' یہ انہیں محسوس شکل میں یہ لے آنا تھا' ان کے حضور وہ زیورات' وہ نقدیاں اور پوچھو نہیں کہ کیا کچھ پیش کیا جاتا تھا۔ ان مندروں کی کیا کیفیت ہے' اِن کا تو پوچھیے ہی نہیں۔

یہاں بھی ہمارے ہاں قریب ترین ملک ہندوستان کے مندر اور ان کی دیویوں کو دیکھیے: ان کے ہاں کے مہاراجے ان کے مقروض ہوتے تھے اور اُدھر یورپ میں تو چرچ نے ساری سلطنتیں خرید رکھی تھیں۔ جب انہوں نے چرچ پہ جھپٹا مارا ہے' وہ اس بات پہ سچے تھے'

---

❶ آپ جیسے لوگ جھگڑالو ہوتے ہیں۔ انہی پر تو قرآن کریم نے لعنتیں برسائی ہیں۔

❷ انہیں مسجد سے باہر پھینک دو گلی میں۔ ❸ اسے تو ایک لڈو پورا بھی نہیں ملتا۔

❹ پانچویں صدی ہجری کے بعد علی ہجویریؒ المعروف بہ داتا گنج بخش لاہوری (وفات 465ھ)

Marfat.com

انکا تو بال بال ان کے قبضے میں' ان کے قرضے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اتنی دولت' اتنی امارت' کس کے نام پہ لی جاتی تھی؟ اس محبوب کے نام پہ جو خود انہوں نے رکھا تھا۔ اس ساری دولت کا مالک کون تھا؟ اس کے مالک تھے یہ سارے مجاور' یہ سارے چرچ۔ وہاں یورپ میں چرچ نام تھا اور یہاں ہندوستان میں مندر نام ہے۔ ان منتریوں کا سارا مقصد دولت کا حاصل کرنا تھا۔

مندروں کے منتری ہوں یا قبروں کے مجاور یا متولی یا گرجوں کے پادری' ان سب کی سوچ کا پیکر ایک ہی ہوتا ہے

جو مندر کے پجاری ہیں' یہ مندر میں منتری ہیں' آپ کے ہاں سارا کام تو نام کا ہے۔ یہی مندر آپ کے ہاں مزارات ہیں' ان کے مالک مجاور ہوتے ہیں۔ یہاں نام کعبے کا ہوتا ہے' اس کے مالک کعبے کے متولی ہوتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے یہ لوگ نیازیں لینے کے لیے' کیا کیا شکلیں بنائے ہوئے ہیں۔ ذرا سا تیز ذہن ہونا چاہیے تو معلوم ہو جائے گا کہ کیا کیا شکلیں وہ پیدا کرتے ہیں۔ اب آپ سمجھ گئے کہ وہ دیوی دیوتا اس طرح سے مندروں میں آئے تھے۔ یہ تو دورِ جہالت کی باتیں تھیں۔ آپ نے پچھلے کنونشن میں دیکھا ہوگا کہ میرا ایک خطاب ہی اسی موضوع پہ تھا: مقصود بالذات کیا ہے...... فرد یا مملکت...... اس میں بتایا تھا کہ اس دورِ تعلیم و تمدن میں بھی کتنے ہی دیوی' دیویاں اور دیوتے بنا کر رکھے ہیں' جو اسٹیٹ (State) کے نام پر یہی کچھ کرتے چلے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ کچھ میں خود نہیں کہتا۔ اس وقت کے یورپ کے مؤرخین اور مفکرین نے خود یہ چیز کہنی شروع کر دی ہے کہ اسٹیٹ نے یہاں وہی حیثیت لے لی ہے جو یونان میں دیوتاؤں نے لے رکھی تھی۔ یہ سچ تھا' جو قرآن نے کہا تھا کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَالَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (3:56)۔ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے' اُن لوگوں پر جو قوانین خداوندی سے انکار کرتے ہیں' اس دنیا میں بھی آخر الامر سخت تباہی آتی ہے اور آخرت میں بھی۔ یہ ایسی تباہی اور بربادی ہے جس سے انہیں کوئی شخص نہیں بچا سکتا' کوئی ان کا یار و مددگار نہیں ہو سکتا۔ وہ مورخین اور مفکرین کہہ رہے ہیں کہ وہ جو چرچ نے Divine Rights بنائے تھے' انہوں نے وہاں سے نکال لیے لیکن پھر کیا ہوا؟ صرف پیکر ہی بدلا' انہوں نے وہی Divine Rights آ کے سٹیٹ کو دیدیئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ انہوں نے یہ Divine Rights' یہ حقوقِ خداوندی' انہیں کیسے دیئے؟

فقہی مسائل کے تحت مذہبی پیشوائیت کی الگ سلطنت کا وجود

خدا نے تو یہ حق بتایا تھا کہ تمہاری سلطنت اور مملکت ہمارے بتائے ہوئے قوانین کے تابع چلے گی۔ انہوں نے کہا کہ "نہیں صاحب! خدا کی مملکت گرجہ کی چار دیواری کے اندر ہے' خدا کی مملکت' مسجد کے اندر ہے' انہی کے فقہی مسائل تک ہے اور یہ ریاست' یہ سلطنت' یہ اسٹیٹ جو ہے' اس میں احکام و قوانین اسٹیٹ کے چلیں گے تو اس طرح خدا تو اس میں سے نکل گیا۔ یہاں پرستش سیٹھ کی ہوگی اگر پرستش آئی۔ وہاں کا معبود سیٹھ ہوگیا' یعنی وہی جو وہاں خدا کی پوزیشن تھی کہ قوانین و احکام اس کے جاری ہوں' دورِ جاہلیت میں

Marfat.com

وہ حیثیت دیوی دیوتاؤں کو دیدی گئی۔ جب انسان کا ذہن ذرا تھوڑا Refine ہوا' اسے کہیے مہذب ہوا' ان پتھر اور مٹی کی مورتیوں سے ذرا متنفر ہوا' اس نے وہی دیوی دیوتا اسٹیٹ کی شکل کے اندر دیدیئے۔ قرآن یہاں سے دورِ جہالت کی بات کرتا ہے کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم یہ سب کچھ خود بناتے ہو' نام بیٹیوں کا رکھتے ہو۔ عربوں کے ہاں بھی دیوتاؤں سے زیادہ دیویوں کی پرستش ہوا کرتی تھی۔

مرد کے ذہن میں مقامِ عورت

مرد کے ذہن میں یہی ایک بات ہے کہ یا تو اس نے عورت کو دیوی بنایا اور اب اس کے نام پہ یہ سب کچھ کرتا ہے یا پھر اس کو ہمیشہ کے لیے غلام بنالیا' اپنے برابر کبھی نہیں آنے دیتا۔ ان کی یہ بھی کیفیت تھی کہ ان کے ہاں دیویاں زیادہ تھیں' اور دیویوں کے متعلق یہ چیز تھی کہ یہ ہماری پیدا کردہ نہیں ہیں۔ وہ فرشتوں کی دیویاں بناتے ہیں اور یہ چیز پرانے ایرانی مذاہب کو انہوں نے دی تھی۔ ایران میں بھی جو فرشتے تھے' ان کو دیویاں بنایا جاتا تھا' یہ چیز اس قدر جہالت پہ مبنی تھی کہ قرآن نے اس کے لیے کچھ زیادہ ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ بہت بڑے بڑے دلائل لا کر اس کا رد کیا جائے۔ وہ جہالت کو تو یونہی کرتا ہے۔ اس نے عربوں سے یہ بات کہی کہ مجھے ذرا اتنی سی بات سمجھا دو کہ تم اپنی دیویوں کو عورت یا لڑکی کی شکل کے اندر کیوں بتاتے ہو۔ انہیں Faminine Gender یا Female کیوں بتاتے ہو؟ کہا: یہ بتاؤ کہ تمہارے اپنے ہاں ایک لڑکی پیدا ہو جائے تو تم معاشرے میں منہ چھپاتے پھرتے ہو' تمہارے نزدیک یہ اتنی قابل مذمت اور قابلِ ذلت چیز ہے' باعثِ فخر نہیں ہے' منہ چھپاتے پھرتے ہو زمین میں۔ تمہاری پوزیشن تو یہ ہے کہ ایک لڑکی پیدا ہو جائے تو یہ کچھ کرتے ہو۔ اور خدا کے بارے میں تمہاری پوزیشن یہ ہے کہ تم سینکڑوں ہزاروں لڑکیوں کے نام اللہ اللہ رکھ رہے ہو۔ (16:57:59) ''او فٹے منہ تہاڈا''۔ ❶ جب بھی وہ اس جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے' آپ دیکھیے کہ ان کے لیے یہ دلیل کتنی مؤثر ہے کہ خدا کو کم از کم اپنے جتنا باعثِ غیرت تو سمجھو یا غریب کی جورو سب کی بھابھی؟ قرآن نے کہا کہ اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَـنِيۡنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰۤـئِكَةِ اِنَاثًا (17:40)۔ ان سے دریافت کرو کہ کیا تمہارے رب نے بیٹیوں کو صرف تمہارے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا ہے! تم ایک لڑکی نہ برداشت کر سکو اور ہمارے لیے ان سینکڑوں ہزاروں لاکھوں ملائکہ یا فرشتوں کو بیٹیاں بنا دو اور اس لیے کہ بقول تمہارے یہ دیویاں ہیں۔ اور ہمارے لیے انہیں دیئے چلے جاتے ہو! یا للعجب!

---

❶۔ تف۔ لعنت تم پر!

ایک بیٹے کو بھی ماننے سے انکار کر دیا

لے دے کے عیسائیوں نے اللہ کا ایک بیٹا بنایا تھا' عرب اس کو بھی نہیں مانتے تھے' وہ عیسائیوں کا جو ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ تم اس ایک بیٹے کو بھی ہمارے ہاں برداشت نہیں کر رہے' اور خدا کہتا ہے کہ ہماری طرف تم ملائکہ کو بھی عرب دیویاں بناتے ہو۔ اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا (17:40) ۔ یہ کتنی بڑی سخت بات ہے جسے تم یونہی' بلا سوچے سمجھے کہہ جاتے ہو کہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور تم اپنے لیے بیٹے چاہتے ہو۔ مختلف مقامات پر' مختلف انداز سے قرآن یہ بات کہتا چلا گیا' یہ قرآن ایک ہی بات کے مختلف پہلو بدل بدل کے لاتا ہے' قرآن نے اپنے سمجھنے کا طریقہ یہی بتایا ہے۔ یہ لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (16:103) ہے۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ یہ عربی مبین کی کتاب ہے۔ یہ عربی مبین یعنی محاورہ عرب ہے۔ یہ سب سے پہلی چیز ہے جو اہم ہے۔ یہ نہایت واضح' صاف اور نکھری ہوئی عربی زبان میں ہے۔

قرآن حکیم کی تکرار انسان کو بور نہیں کرتی

قرآن کریم کے سمجھنے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ (17:41)۔ ایک ہی موضوع کو ہم قرآن میں پھیر پھیر کر لاتے ہیں' بار بار لاتے ہیں لیکن یہ انداز نہیں ہے کہ اس کی تکرار آپ کو بور کر دے۔ بات تو ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی اصول' ایک ہی قانون' ایک ہی قدر' بیان کرتا ہے۔ اس کے مختلف Faces اور Facets سامنے لاتا ہے' مختلف پہلو سامنے لاتا ہے' مختلف گوشے سامنے لاتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اسے اب اس زاویہ نگاہ سے بھی تم دیکھو' تو یہ بات یوں بنے گی۔ مختلف زوایہ نگاہ سے ایک بات کو پیش کرنا قرآن کا انداز ہے۔ اور عجیب انداز ہے۔ عزیزانِ من! اس انداز سے قرآن کی کوئی چیز آپ کے سامنے آئے گی تو آپ دیکھیں گے کہ کتنا بڑا اعجاز ہے اور کس قدر یہ چیز تاثیر کی ہے کہ ایک ہی بات کے مختلف گوشوں کو لوٹا لوٹا کے سامنے لانا' ہر گوشے کے لیے نئے دلائل پیش کرنا' اس سامنے لائے گئے گوشے کے لیے اس کے مطابق تشبیہات اور تمثیلات دینا' مفہوم اور تصور کو کتنا عمدگی سے واضح کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہ مختلف گوشوں کو اس طرح سے سامنے لاتا ہے۔ ہر گوشے کے متعلق یہ انداز اختیار کرتا ہے تو اس طرح سے اس نے پوری چیز کے' پورے موضوع کے' متعلق کس قدر جامع اور واضح چیزیں پیش کر دیں۔

جیسا کہ میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ باتیں تو اب جسے ''قلندر حرفِ گو دیدہ گو'' کہتے ہیں کے مصداق اب میرے لیے تو سنی سنائی یا تقلیداً نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! میں چالیس سال سے قرآنِ کریم کا مطالعہ اسی انداز سے کر رہا ہوں۔ اس پہ اسی انداز سے غور کرتا ہوں۔ لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (16:103)۔ اس کے لیے میں نے جتنی بھی کوہ کنی اور جگر خراشی کرنی تھی ''لغات القرآن'' آپ کے سامنے اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سارے قرآنک لٹریچر میں' ہماری ہسٹری میں' یہ پہلا لغت ہے' جو اس انداز کا مرتب ہوا ہے۔ بطور تحدیث نعمت کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ وہ چاہتا ہے تو اس کی اپنی تشبیہ کے انداز میں' ایک خشک لاٹھی سے اژدہے کا کام

Marfat.com

لے لیا کرتا ہے' لاٹھی پھر بھی لاٹھی رہتی ہے۔ تو پہلی چیز یہ تھی کہ جب قرآن نے اپنے سمجھنے کے لیے اس پہ زور دیا تو میں نے خود اس طرح سے سمجھا اور میں نے دیکھ لیا کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ میں نے اس پہ ایک مدت صرف کی ہے۔ ایسا کوئی لغت اس سے پہلے موجود نہیں۔ وہ لغت آج موجود ہے [1]۔ زندگی کا اعتبار نہیں' لیکن عزیزانِ من! میں یہ عرض کرونگا کہ آج نہیں تو کل آنے والی نسلیں اس لغت کو بڑی اہمیت دیں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بعد آنے والے اس کو چاہیں گے' اس کے اندر اضافے کریں گے اور وضاحتیں کریں گے۔ حرفِ آخر تو قرآن کے علاوہ کوئی اور ہو نہیں سکتا لیکن اس وقت تک تو یہ لغت حرفِ آخر ہے' اگر آپ کو قرآن سمجھنا ہوگا تو پہلی چیز یہ ہے کہ عربی مبین کے سمجھنے کے لیے' زبان سیکھنے کے بعد اس لغت کو لائیے۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ قرآن ایک ہی موضوع کے متعلق' اپنے ہاں لوٹا لوٹا کے کہ کہاں کہاں یہ بات کہی ہے' کس کس انداز میں بات کہی ہے' اُس موضوع کے مختلف گوشے لاتا ہے۔ یہ جتنی کتابیں میں نے لکھی ہیں ان سب کا انداز یہی ہے: ایک کتاب کا' ایک موضوع ہے' اس کے اندر اس موضوع کے متعلق قرآن میں جو کچھ ہے وہ میں نے اس میں دیا ہے' یہ مختلف کتابوں کے اندر بات تھی۔

تو اگلی چیز' اگلا تقاضا' میرے ساتھ ساتھ یہ تھا کہ نہیں جی' قرآن کا مفہوم بھی اسی انداز سے ہونا چاہیے۔ یہ مفہوم القرآن جو آپ کے سامنے ہے وہ یہی چیز ہے۔ اسی لغات کی رو پر مبنی قرآن کے مفردات یا الفاظ یا آیات کے الفاظ کے معنی وہاں متعین کیے ہیں اور اس طرح تصریفِ آیات سے قرآن بار بار ہر پہلو سے جس بات کو لایا ہے' ان چیزوں کو سامنے رکھ کے ایک ایک آیت کا مفہوم میں نے متعین کیا ہے۔ یہ مفہوم ہے۔ قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا' حتٰی کہ عربی زبان کے دوسرے الفاظ بھی اگر رکھ دیئے جائیں تو قرآن کے الفاظ کا بدل نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ کریم کی عربی زبان کے اندر سینکڑوں تفسیریں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ یہ بڑی بڑی ضخیم ہیں۔

کوئی انشاء پرداز قیامت تک قرآنِ حکیم کے اندازِ بیان کا متبادل پیش نہیں کر سکے گا

عربی میں لکھنے والے' بڑے بڑے عربی زبان کے انشاء پرداز' صاحبِ اسلوب' بڑے بڑے عظیم فصاحت و بلاغت کے امام مانے جاتے ہیں۔ صاحب! دنیا میں ان کی عربی کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں کی عربی کی تفسیر دیکھ لیجیے۔ خود ان سے نہیں کسی عربی دان سے پوچھ لیجیے۔ ان کی عبارت میں جہاں جہاں قرآن آتا ہے وہ آیت پتھروں میں پڑے ہوئے ہیرے کی طرح جگمگا رہی ہوتی ہے۔ عربی زبان میں اگر آپ ان ادباء کی دوسری کتابیں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی ادب' انشاء اور بلاغت میں وہ کتابیں سند مانی جاتی ہیں۔ وہ اتنی بلند پایہ ہیں! لیکن انہی کتابوں میں' ان کی انہی تفاسیر میں جہاں کہیں قرآن کی آیت کا کوئی ٹکڑا آتا ہے'

---

[1] یہ لغت چار جلدوں میں بارِ اول ادارہ طلوعِ اسلام لاہور سے چھپا۔ اس کی پہلی دو جلدیں 1960ء میں طبع ہوئیں اور تیسری اور چوتھی جلد 1961ء میں طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ یہ چاروں جلدیں 1838 صفحات پر مشتمل ہیں۔

Marfat.com

تو وہ صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ اس کا وہ انداز اور اسلوب نہیں ہے جو انداز یہ لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ خود انہیں بھی اعتراف ہے کہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیا چیز ہے: نہ یہ نثر ہے' نہ یہ نظم ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں انشاء کے جو اصول یا اسلوب ہیں' جسے اسالیب کہتے ہیں' ان سب پہ بحثیں کی ہیں کہ یہ بھی تحریر کا ایک انداز ہوتا ہے' یہ بھی انشاء کا انداز ہے۔ ان عربوں نے اپنی زبان کے اعتبار سے تو بہت کچھ لیا ہے لیکن جہاں وہ قرآن پہ آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انداز کیا ہے! اس کا کیا نام رکھیں! میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے جو کہا ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا (17:41)۔ یہ ہے جو اس سے آپ کے سامنے اس کے مفاہیم آئیں گے۔ اور ہم نے حقیقت کو نکھار کر بیان کرنے کے لیے مختلف پیرائے اختیار کیے ہیں۔ اور اس کے مختلف گوشوں کو پھرا پھرا کر غور و فکر کرنے کے لیے سامنے لاتے ہیں۔ لِیَذَّكَّرُوْا (17:41)۔ تا کہ سارے گوشے تمہارے سامنے آ جائیں' اس کا طریقہ تصریفِ آیات ہے۔

کچھ تبویب القرآن کے متعلق

عزیزانِ من! میں یہ عرض کر دوں کہ اس کام کے لیے' اپنے سمجھنے کے لیے' میں قرآنِ کریم کے ان مختلف مقامات کو' موضوعات کے اعتبار سے ان آیات کو جو بار بار آئیں' یکجا کرتا چلا گیا۔ اسے تبویب کہتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ کئی دفعہ کیا' ہر بار جب پھر ضرورت پیش آئی دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی نا تمام تھا' اسے کئی بار کیا۔ بہر حال احباب کا یہ تقاضا ہوا کہ یہ چیز تو ایسی ہے کہ تم ہر بار کرو گے' ہر بار اس کو نا تمام پاؤ گے' اس کی ضرورت بڑی ہے۔ اس کو باہر لاؤ۔ میرا یہ بہت بڑا ضخیم مسودہ ہے۔ آپ اس کا سرِ دست نام تبویب القرآن رکھیے۔ [1] اس چالیس سال کے اندر قرآنِ کریم میں جتنے موضوع میرے ذہن میں آتے گئے ہیں اور آپ جانتے ہیں وہ سینکڑوں ہو سکتے ہیں۔ ہر موضوع کے متعلق قرآنِ کریم نے جہاں جہاں جو کچھ کہا ہے وہ سارا میں نے اس موضوع کے تابع کیا ہے۔ پتہ نہیں یہ چیز کتنی جلدوں میں آئے گی۔ بہر حال احباب کے تقاضے کے رو سے اس کی کتابت شروع کر دی ہے۔ اتمام کی توفیق پہ ہے جب یہ ہوگا۔ ایک فرد جو کچھ کر سکتا ہے' وہ میں نے کیا ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ ساری کوششیں قرآن کو سمجھنے کی ہیں۔ قرآن یوں سمجھ میں آئے گا۔ اس نے کہا ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا (17:41)۔ کہ اس قرآن کے مختلف گوشوں کو پھرا پھرا کر سامنے لاتے ہیں تا کہ وہ تمام کا تمام تمہارے سامنے آ جائے۔

اس ذکر کے دوران یہ بندہ بھی ہارٹ فیل ہونے سے بمشکل بچا تھا

یہ لِیَذَّكَّرُوْا (17:41) عجیب چیز ہے' اس کا ترجمہ ذکرِ خدا' اللہ کا ذکر ہو گیا' پھر یہ ذکرِ خدا عشاء کی نماز کے بعد ہر مسجد میں شروع ہو گیا۔ پہلے یہ خلوتوں میں ہوتا تھا۔ اربابِ طریقت اپنے ہاں ذکرِ خفی کیا کرتے تھے۔ قلب پہ ضربیں لگا کرتی تھیں۔ روزانہ سینکڑوں تو ہارٹ فیل ہو جاتے تھے۔ یہ بندہ ناچیز مرتے مرتے بچا ہے اور اس سے بچنے میں ساری عمر لگ گئی ہے' کہیں نہ کہیں' کسی نہ

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کا صفحہ: 1۔

Marfat.com

کسی شکل میں اس ذکر نے اثر کیا ہوا ہے۔ بہر حال یہ چیز ہو جاتی تھی' اور وہ جو یوں ہوتا تھا' اسے یقین کہا کرتے تھے۔ اب مساجد کے اندر ذکرِ جلی ہونا شروع ہوگیا۔ پہلے بھی یہ مسجد کے اندر بین بین' برزخی سا' ہوا کرتا تھا' مگر مسجد کے اندر ہی ہوتا تھا۔ اب تو لاؤڈ سپیکر پہ جو ہوتا ہے تو وہ جلی سے بھی بہت آگے پتہ نہیں ''تجلی'' ہوگئی ہے۔ اب تو چار لاؤڈ سپیکر مسجد کے اندر اور اس میں پھر جو ذکرِ ظاہری ہوتا ہے یا جلی ہوتا ہے' پوچھیے نہیں کیا ہوتا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کا یہ ذکر ہے' جی ''یہ صرفنا'' ہے' یہ کہتے ہیں کہ بار بار کہو۔ بات ختم ہوئی' ''اللہ اللہ'' بار بار کہو۔ یہ ہوگیا بار بار' یہ ہوگیا ذکر۔ لیکن یہ تو وہ چیز ہے کہ اگر یہ انداز اختیار کرو گے تو یہ جو مخالفین ہیں' ان پر اس سے کچھ اثر نہیں پڑتا مگر **وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا** (17:41)۔ جتنے تم زیادہ قرآن کو سمجھتے چلے جاؤ گے' تمہارے خلاف اتنی ہی ان کی نفرت بڑھتی چلی جائے گی۔

نزولِ قرآن کے وقت ایران اور روم کی تہذیبوں سے ٹکراؤ اور ردِ عمل

حضور ﷺ جب یہ پروگرام لے کر اٹھے تو پھر یہ نفرت کس طرح سے بڑھی تھی' چھوٹے سے پیمانے کے اوپر تو قریش سے پوچھیے' ان کی تحریک سے پوچھیے' اور اگر بڑے پیمانے پہ پوچھنا ہے تو ایران سے پوچھیے کہ یہ زبان تو عربوں کی تھی۔ اس لیے ان کو کبھی ضرورت نہیں تھی' لیکن تصریفِ آیات سے جو قرآن ان عربوں کے سامنے آیا ہے' اس سے کتنا خطرہ محسوس کیا تھا! یہ جاننے کے لیے ایران اور روم کی سلطنتوں کو دیکھیے۔ اس وقت دنیا کی یہ دو ہی تہذیبیں تھیں عزیزانِ من! اس وقت یہ ساری دنیا پہ چھائی ہوئی تھیں۔ عرب کے بائیں دائیں تھیں۔ روم کو بازنطینی (Byzantine) کہتے ہیں اور ایرانی کو مجوسی طاغوت کہتے ہیں۔ ہزاروں سال سے یہ سلطنتیں چلی آ رہی تھیں۔ ساری دنیا میں ان کا سکہ جما ہوا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح سے تھا جس طرح آج آپ Big Powers کہتے ہیں۔ اس زمانے کی یہ دو ہی بگ پاورز تھیں' یہ سلطنتیں ہی بڑی نہیں تھیں' ان کی تہذیب نے اس زمانے کی آباد و مہذب ساری دنیا کو اس انداز سے ڈھانپ رکھا تھا کہ اگر کبھی ان کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا تھا تو کسی دوسرے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جب عربوں نے قرآن کو اس طرح سے لیا۔ **لِيَذَّكَّرُوْا** (17:41)۔ قرآن اس طرح سے ان عربوں کے سامنے آیا ہے تو پوچھو نہیں کہ ان عربوں کے خلاف ان کی نفرت کتنی بڑھی۔ پھر انہوں نے اس کا جو انتقام لیا ہے' وہ بھی تاریخ میں ایک یادگار چیز ہے۔ انہوں نے دراصل عربوں کی سلطنت سے انتقام نہیں لیا' انہوں نے قرآن سے انتقام لیا ہے' انہوں نے دین سے انتقام لیا اور اس انتقام میں انہوں نے کیا یہ کہ اسلام کو مذہب میں تبدیل کر کے رکھ دیا' ''اوہدے بعد اوناں کیا ہن ستے خیراں''۔ [1] اب یہاں سے بات آگے چلے گی تو وقت بہت ہو جائے گا۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔ اس درس میں تو ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 41 تک ہی آئے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

[1] اس کے بعد تو انہوں نے کہا کہ اب تو روئے عالم پہ خوف و حزن کی کوئی بات ہی نہیں رہی۔

Marfat.com

دسواں باب: سورة بنی اسرائیل (آیات 42 تا 52)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ لَّوْ
كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ
بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا
بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ
يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِى الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ
اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا
رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾ وَقَالُوْۤا ءَاِذَا
كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا
مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ
اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ
بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1975 کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة بنی اسرائیل کی آیت 42 سے ہو رہا ہے۔ (17:42)۔

سابقہ آیات میں کہا گیا تھا کہ ان لوگوں کی جہالت یہ ہے کہ یہ خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اس انداز سے مانتے ہیں کہ اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک قرار دیتے ہیں۔ دورِ جہالت میں وہ شرکاءِ دین دیوتاؤں کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے اور اس کے بعد ان شرکاء کے پیکر بدلتے رہتے ہیں۔ فکرِ انسانی میں روح وہی کارفرما ہے کہ تنہا خدا کافی نہیں ہے۔ پہلی چیز تو قرآن اگلی آیت میں یہ لیتا ہے کہ قبل اس کے کہ ہم تمہاری اپنی زندگی کی طرف آئیں، تم ذرا کائنات کے نظام کی طرف آؤ اور سوچو۔ اگر خود نہیں سوچ سکتے تو جو سوچنے والے محققین

Marfat.com

ہیں جو Scientists ہیں، ان سے پوچھو کہ اگر خدا کے علاوہ قوتیں کارفرما ہوتیں تو کائناتی کنٹرول کا کیا ہوتا؟

خدا کے علاوہ اگر مزید قوتیں ہوتیں تو کائناتی کنٹرول تباہ ہو جاتا

عزیزانِ من! قرآن نے کہا: قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (17:42)۔ کہ اگر واقعی خدا کے ساتھ ایسی اور قوتیں ہوتیں جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہو اور اگر پوزیشن یہ ہو جائے تو کائنات کے کنٹرول کے لیے مختلف خدا ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنے لگ جائیں اور ہوسکتا ہے کہ کسی وقت بھی کوئی تھوڑے وقت کے لیے جھپٹ کے لے جائے، پھر کوئی دوسرا یورش کر دے، یہ پھر اس کے قابو میں آ جائے۔ وہ کہتا ہے: ذرا ان اربابِ تحقیق و فکر سے پوچھو کہ پھر اس کائنات کا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔ یہ نظام تو اُس حسن و خوبی سے چل ہی اس لیے رہا ہے کہ اس کا مرکزی کنٹرول صرف ایک کے ہاتھ میں ہے۔ اگر قوانین میں اس طرح سے تضادات واقع ہو جائیں، یا قوتیں یوں بدلتی رہیں، یا یک وقت ٹکراؤ شروع ہو جائے تو اندازہ لگاؤ کہ اس کائنات کا کیا بنے گا۔ یہ تو اس کی Unity of Laws ہے جس کی بنیاد پہ یہ سلسلہ اس طرح باہم مربوط چل رہا ہے۔ اس میں Unity ہے۔ اس میں کہیں تضاد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ سارا سلسلہ اس حسن خوبی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ توحید ہے کہ اگر ان کے خیال کے مطابق اور قوتیں بھی ساتھ شریک ہو جاتیں یا کر دی جاتیں تو پہلی چیز جو وہ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ تم کائنات کے متعلق اربابِ تحقیق سے پوچھو کہ اس کا کیا حشر ہوتا۔

لفظ کبریائی کا مفہوم

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (17:43)۔ کیا کیا الفاظ ہیں جو قرآنِ کریم نے اس آیت میں استعمال کیے ہیں! بات تو کبریائی کی تھی، بات تو علو ہونے کی تھی، بات تو تعالیٰ ہونے کی تھی، بات تو آج کی اصطلاح میں Sovereignty کی تھی۔ کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں یہ اس سے بہت دور ہے، بلند ہے، پاک ہے۔ وہ علو ہے، وہی کبیر ہے۔ اور عربی زبان والے جانتے ہیں کہ لفظ کبیر کا صیغہ خود بتا رہا ہے کہ اس کی یہ کبریائی کوئی ہنگامی نہیں کہ کسی ایک وقت میں ہو اور پھر نہ ہو۔ اس میں تو دوام پایا جاتا ہے، اس میں تو استمرار پایا جاتا ہے۔ یہ تو مسلسل، بدستور چلی آ رہی ہے۔ کبریائی اسی کے لیے ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ لوگ جو کچھ خدا کے متعلق کہتے ہیں، وہ اس سے بلند ہے۔ بہت ہی بلند ہے اور ہر قسم کے غلبہ و اقتدار کا مالک ہے۔ کائنات میں کبریائی (Sovereignty) صرف اسی کے لیے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا مرکزی کنٹرول اُس ایک قوت کے ہاتھ میں ہے۔

Marfat.com

اجرامِ فلکی کی حقیقت

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (17:44)۔ کائنات کی پستیاں اور بلندیاں' ارض اور اجرام فلکی' اور جو کچھ بھی ان کے اندر ہے' وہ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ اس آیت میں وَمَنْ فِيهِنَّ کو دیکھیے' بات کہاں جاتی ہے۔ جیسا کہ شاید آپ کو معلوم ہے' کئی دفعہ وہ آیت سامنے آئی کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اجرامِ فلکی میں سے بھی ایسے ہیں کہ جن کے اندر آبادیاں ہیں اور ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے کہ یہ آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں (42:29)۔ ارض ہو یا یہ اجرامِ فلکی ہوں یعنی جو کچھ تم سے بلندی پہ واقع ہوا ہے' یہ سب مل جائیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی رو سے ''سما'' اور ''ارض'' خاص طور پہ اس زمین' اس سورج کو ہی نہیں کہتے بلکہ یہ ''نیچے'' ''اوپر'' اضافی اصطلاحات Relative Terms ہیں۔ یہ ''بلندی'' اور ''پستی'' اضافی Relative جہتیں ہیں۔ یہ ''نیچے'' اور ''اوپر'' اضافی جہتیں (Dimensions) ہیں۔ جو ''نیچے'' ہے اس کے جو اوپر ہے' اسے ہم ''اوپر'' کہیں گے اور ''اوپر'' والا اسے ''نیچے'' کہے گا۔ بجائے خویش یہ کوئی چیز نہیں ہے' یا تو کوئی جامد چیز درمیان میں ہو تو ہم اس کے ''اوپر'' اور یا اس سے ''نیچے'' ہیں۔ لیکن سما اور ارض کے متعلق تو یہ نہیں ہے کہ یہ جامد (Static) ہیں۔ اس لیے ان سے نیچے اور اس کے اوپر کے تصور اضافی ہیں۔ اسے اس طرح سے سمجھیے کہ اگر تین چیزیں اوپر اور نیچے رکھی ہوں تو سب سے اوپر والی کے مقابلے میں درمیان والی چیز نیچے ہوگی اور سب سے نیچے والی کے مقابلے میں وہی درمیان والی' اوپر ہوگی۔ اس طرح' ہر پستی (نیچے) کی ایک بلندی (اوپر) ہوتی ہے اور ہر بلندی (اوپر) کی ایک پستی (نیچے)۔ یہی صورت' فضا میں بکھرے ہوئے اجرامِ فلکی (کروں) کی ہے۔ ہر کرہ (Sphere) اپنے سے نیچے والے کے مقابلے میں بلند (اوپر) اور اپنے سے اوپر والے کے مقابلے میں پست (نیچے) ہے۔ یہ مطلب ہے ہر ''سماء'' کے مقابلے میں اس جیسی ایک ''ارض'' کا۔ سماء بلندی (اوپر) اور ارض پستی (نیچے)۔ سماء اوپر والا کرہ۔ اور ارض' اس سے نچلا کرہ۔ عزیزانِ من! سنیے اور جھوم جائیے جو قرآن اس شے کے لیے کہتا ہے کہ یہ جو ''اوپر'' اور ''نیچے'' کہہ کے پکارا جاتا ہے' Relative چیز ہے۔ وہ کہتا ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (65:12)۔ یہ زمین کے اوپر جو تم دیکھ رہے ہو' یا یہ جتنا کچھ بھی ہے جنہیں تم نہیں بھی دیکھ رہے' جس کو بھی تم اوپر کہتے ہو' وہ کہتا ہے: ہر ''اوپر'' کی ایک مثل اس کے ''نیچے'' ہوتا ہے۔ کیا بات ہے! یہ ارض یہی ارض نہیں ہے جسے کوئی ''اوپر'' والا اپنے ''اوپر'' کہتا ہے۔ ''اوپر'' والے کی نسبت سے وہ ''نیچے'' والا ارض ہو جاتا ہے۔

وہ کہتا ہے: جتنے ''سماء'' ہیں اتنی ہی ''ارض'' ہیں۔ چودہ سو سال پیشتر' عزیزانِ من! اور وہ بھی عرب کی اس سرزمین میں' جہاں اس کا مرکزی شہر مکہ' اتنی شہرت کا شہر تھا' اس کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ بس صرف لکھنا پڑھنا ہی جانتے تھے۔ یہ علمی درسگاہیں اور یہ اس قدر تحقیقات اور یہ علومِ سائنس کا تو گویا اس قوم کے اندر سوال ہی نہیں ہے'

وہاں یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ ایک شخص جو وہ قرآن پیش کر رہا ہے وہ خود یہ اعلان کرتا ہے کہ اس سے پیشتر میں خود اَن پڑھ تھا۔ اور وہ اُس وقت یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ارض صرف ایک ارض نہیں' یہ سماء صرف یہ نہیں جو اوپر نظر آتے ہیں۔ سلسلہ یہ ہے کہ جسے تم ''اوپر'' کہتے ہو' اوپر والا اس کے نیچے والے کو ''نیچے'' کہتا ہے۔ یہ تمہارے لیے ''سماء'' ہے' تم اس کے لیے ''ارض ہو'' تو تم سے نیچے والا جو ہے وہ تمہیں ''سماء'' کہتا ہے' وہ تمہاری ''ارض'' ہے۔ اس زمانے کے علم الارض کے جو بڑے بڑے ماہرین تھے' بطلیموسی نظام (Ptolemaic System) جاری تھا' وہ زمین کو ساکن مانتے تھے۔ کل کی بات ہے کہ وہ (Nicolaus Copernicus 1473-1543) بیچارے نے کہیں یہ کہہ دیا کہ یہ زمین گھومتی ہے' اس پر کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ خدا خدا کر کے جان بچ گئی' اُسے بھاگنا پڑا۔ یہ ابھی کل کی بات ہے مگر یہ قرآن چودہ سو سال پیشتر کہہ رہا ہے کہ یہ ارض یہی ارض نہیں' یہ سماء یہی سماء نہیں۔ ہر سماء کی ایک ارض ہوتی ہے صاحب! اسی لیے کہا کہ وَمَنْ فِیْهِنَّ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے: تُسَبِّحُ لَهُ یہ تمام کے تمام خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

تسبیح کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں تو یہ ہو گیا ہے کہ ہر ایک تسبیح کرتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ خارجی کائنات کی ہر شے میں سے' ہر ایک اپنے اپنے دیئے گئے پروگرام میں سرگرمِ عمل ہے۔ ان سب کے لیے ایک مرکزی کنٹرول ہے اور اسی کے بتائے ہوئے فرائض کو سرانجام دینے کے لیے ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ عمل پیرا ہے اور وہ مرکزی اتھارٹی جانتی ہے کہ کس نے کیا فریضہ سرانجام دینا ہے اور اس کا دوسروں کے ساتھ کیا ربط (Interrelatedness) ہے۔ جیمز (Sir James Jeans) کو تو آپ جانتے ہیں' ہمارے دور کا علم الافلاک کا سب سے بڑا ماہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات (Universe) کے اندر اس قدر ربطِ باہمی ہے کہ جس کا احاطۂ ادراک انسانی عقل نہیں کر سکتی کہ یہ کائنات کتنی بڑی وسیع ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تم ان کے ربطِ باہمی کو کیا سمجھتے ہو۔ کہتا ہے: تم ایک انگلی ہلاتے ہو تو اس کا اثر ثریا تک جا کے پڑتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ فضا کی اتنی سی جنبش کہاں تک ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ:

لہو خورشید کا ٹپکے' اگر ذرے کا دل چیریں

ہر ایک کے ربطِ باہمی کی یہ کیفیت ہے: یُسَبِّحُ لَهُ اور اگر یہاں ایک سے زیادہ صاحبِ اقتدار قوتیں ہوتیں تو کوئی اس کے بتائے ہوئے ایک کام پہ چل پڑتا' کوئی دوسرے کے بتائے ہوئے کام پہ چل پڑتا' اور پھر وہ کہتا ہے کہ وہاں جو تماشا ہوتا' اسے تو کوئی دیکھنے والا ہی نہ رہتا۔ پھر اس کے بعد فرمایا: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ (17:44)۔ کائنات کی پستیاں اور بلندیاں' اور جو کچھ اُن کے اندر ہے' سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں' جو اُس پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں نہ ہو۔

Marfat.com

السبع کا لغوی معنی

یاد رکھیے! عربی زبان میں ''سبع'' کا لفظ صرف سات کے لیے ہی نہیں آتا۔ جن معنوں میں ہم لفظ Several یا متعدد استعمال کرتے ہیں' یہ اس کے لیے آتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں بیس مرتبہ میں نے کہا ہے کہ نہ کرو۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ گن کے بیس مرتبہ کہا ہے۔ اسی طرح سو بار میں نے کہا ہے: ہزار دفعہ تم آؤ گے' بات نہیں ہو سکتی۔ یہ جو اس طرح ہند سے ہوتے ہیں' ان کی تعداد کے اعتبار سے گنتی نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ جو آپ وعظوں میں سنتے رہتے ہیں ستر ہزار: یہاں ستر کے ساتھ آپ دیکھتے ہیں کہ عام طور وہ اس کا ترجمہ ستر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہاں اس کا مطلب متعدد بار ہوتا ہے۔ اسی طرح ''سبع'' کے معنی متعدد ہوتے ہیں اور ہر سماء کی ایک ارض ہے' اور جو کچھ بھی ان کے اندر ہے' وہ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ اس آیت میں لفظ لَهٗ آیا ہے۔ 'ل' ملکیت کے لیے بھی آتا ہے اور 'ل' نافع بھی ہوتا ہے' منفعت کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ سب کچھ اس کے بتائے ہوئے پروگرام کے لیے ہیں۔ ملکیت تو اس کی ہے۔ سَمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر' بیشمار مقامات پہ آیا ہے۔ وہ تو ہے ہی یہ کہ جو خالق ہے' وہ مالک ہے' سیدھی سی بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ چیز بھی ہے کہ یہ تمام اس کے بتائے ہوئے پروگرام پہ سرگرمِ عمل ہیں۔ اور اس آیت کے اگلے حصے میں ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (17:44)۔ اس کارگہِ کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں' جو اُس پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل نہ ہو' جس کے نتائج خدا کی حمد و ستائش کے زندہ پیکر بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے کوئی شے شر اور بیکار پیدا نہیں کی

عزیزانِ من! یہاں اس آیت میں یہ الفاظ ہیں: یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (17:44)۔ ہمارے ہاں تو اس کے عام ترجمے اس طرح کے آ جائیں گے کہ ''کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں ہے جو تسلیم نہیں کرتی اس کی تعریف کے ساتھ''۔ غور کیجیے کہ اس ترجمے سے کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ قرآن کے لفظ 'یُسَبِّحُ' کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اکثر خدا کا لوگوں سے یہ سوال ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو ایسی چیزیں جو خدا نے پیدا کر دیں' تمہارے لیے نقصان کا باعث ہیں؟ مثلاً جب برسات کے زمانے میں بادلوں کے دروازے کھول دیئے جائیں (54:11)۔ تو کیا اس کا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا ہے؟ یا مثلاً ہم جب بھی دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بھڑیں کاٹتی ہیں' اس کے علاوہ اور تو اُن کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ ہمیں تو اس کے متعلق اتنا ہی معلوم ہے کہ سانپ ڈستے ہی ہیں' بجلی کڑکتی ہے تو ہمیں اتنا ہی پتہ لگتا ہے کہ وہ کسی کے اوپر آ پہنچی ہے' اس کو فنا کر کے رکھ دیتی ہے۔ تو کیا یہ چیزیں شر کے لیے پیدا کی ہیں؟ کیا تباہیوں کے لیے پیدا کی ہیں؟ تو وہ اچھا خالق ہے کہ بجلیاں کڑکیں بھی تو اس پہ گریں۔

Marfat.com

لیکن چودہ سو سال پیشتر بھی خدا کا جواب یہی ہے کہ تمہاری سوچ غلط ہے۔ کائنات کی ہر شے فِیْ ذَاتِہٖ (Intrinsically) ایک قوت رکھتی ہے۔ اس کو خیر اور شر تم بناتے ہو، ہم نے تو ہر شے کو خیر کے لیے پیدا کیا ہوا ہے۔ وَبِیَدِکَ الْخَیْرُ (3:25)۔ کائنات کی ہر چیز کو جو فریضہ دیا ہوا ہے، وہ اس کو پورا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ کیوں سرگرمِ عمل رہتی ہے؟ بِحَمْدِہٖ (17:44)۔ اس کی حمد کے لیے یعنی اس کے پروگرام کو قابلِ حمد و ستائش بنانے کے لیے کائنات کی ہر شے سرگرمِ عمل ہے۔ ''قابلِ حمد و ستائش بنانے کے لیے''! کیا بات ہے! حمد کے معنی کا تو آپ کو پتہ ہے کہ کسی حسین اور نادر شاہکار کو دیکھ کر بے ساختہ انسان کی زبان سے اس کی تحسین و ستائش (Appreciation) کی بات نکل جائے۔ انسان کے دل میں اس حسین و نادر شاہکار کے لیے تحسین و ستائش کے جو جذبات پیدا ہوں، ان کے اظہار کا نام ہے۔'' کیا کبھی بھڑوں کے متعلق بھی یہ چیز ہماری زبان سے نکلتی ہے؟ کیا کبھی سانپ کے متعلق بھی یہ ستائش نکلتی ہے؟ کیا کبھی رات کے متعلق بھی یہ تحسینی جذبہ نکلتا ہے، حالانکہ رات کے متعلق تو اس نے خاص طور سے کہا ہوا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ (10:67)۔ رات بنائی تاکہ تم آرام کر سکو۔ پھر کہا کہ یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (17:44)۔ اس کائنات کی ہر شے اپنے اپنے مقرر کردہ پروگرام میں سرگرمِ عمل ہے تاکہ ان کے نتائج خدا کی تحسین و ستائش کے زندہ پیکر بن کر سامنے آ جائیں۔ جہاں یہ کہا ہے کہ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ (13:13)۔ ان بادلوں کی گرج، قانونِ خداوندی کی ہیبت سے لرزہ براندام، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتی ہے تاکہ اُس کی ربوبیت (Nourishment) اس طرح نکھر کر سامنے آ جائے کہ ہر دیکھنے والے کی زبان پر ''بے ساختہ کلماتِ تحسین'' آ جائیں۔ مگر یہ اتنا ہی دیکھتے ہیں کہ بجلی گرتی ہے اور مار دیتی ہے انہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ وہ بھی ہماری حمد کے لیے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ کہا: صرف تمہاری سوچ غلط ہے۔

جنوبی امریکہ میں ایک خاص ضرورت کے تحت بھڑوں کی برآمد

ہمارے ہاں یہ چیز تحقیق طلب ہے، یورپ کے سائنسدان (Scientists) جب بھی تحقیق کرتے ہیں، وہ ہر شے کو انسان کے لیے مفید پاتے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چند سال اِدھر، یہاں سے، بیشمار، بھڑیں (Export) برآمد کی گئیں۔ وہ انہیں جنوبی امریکہ میں لے گئے، کیونکہ وہاں ایک کیڑا تھا، جو اُن کی فصلوں کو بڑا ہی نقصان پہنچاتا تھا۔ انہوں نے بہت کچھ کر کے دیکھ لیا۔ وہ کسی طرح سے تلف ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کیڑے پہ تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ اس کیڑے کو بھڑ مار سکتی ہے۔ وہاں جنوبی امریکہ میں بھڑیں ہوتی نہیں تھیں۔ ''ایتھے تے ہر بندہ بھڑ بنا پیا اے''۔ [1] انہوں نے سرِ دست بھڑوں کا پہلا Consignment لیا پھر انہوں نے بھڑوں کی اس طرح پرورش کی جیسے وہ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں۔ انہیں وہاں چھوڑا اور اپنی فصلیں نقصان سے بچالیں۔

---

[1] یہاں تو ہر آدمی بھڑ بنا ہوا ہے۔

Marfat.com

مجھے سانپ کے زہر سے زندگی ملی

عزیزانِ من! اسی طرح سانپ بھی ہمارے ذہن میں ہلاکت کے لیے ہی آتا ہے۔ اس پر جو تحقیق کی تو معاملہ کچھ برعکس ہی نکلا۔ شاید میں نے یہ پہلے بھی بتایا ہے کہ یہ (یعنی میں) جو آپ کے سامنے بندہ ناچیز بیٹھا ہوا ہے' یہ دس سال سے آپ کو درس سنا رہا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ سانپ کے زہر کے ایک قطرے کی بناء پہ زندہ رہا تھا۔ جب میرا آپریشن ہوا ہے تو اس میں خون کو روکنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے وہ سب کچھ کر کے دیکھ لیا مگر خون تھا کہ رکتا ہی نہیں تھا' حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب نے۔ وہ ڈاکٹر صاحب تو ڈاکٹر سید عبدالودود تھے۔ وہ مجھ پہ جان چھڑکتے تھے۔ دوستوں کو بھی بلا لیا۔ دوستوں سے کہہ دیا کہ ''بات ختم ہو رہی ہے' کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا''۔ بڑی محبت کے وہ لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھے بعد میں بتایا کہ میری بچیوں نے مصلے بچھا لیے اور سجدہ میں گر گئیں۔ یہاں اس کرائسس (Crisis) میں یہ چیز مجھ پہ آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ایک چیز ابھی باقی ہے اور وہ جو دیکھا تو کہنے لگے کہ اتفاق ہے کہ اتنے کم نوٹس پر یہ چیز ان کے وہاں موجود ہے۔ یہ ایک انجیکشن تھا۔ وہ انجیکشن لگایا گیا۔ صحت یابی کے بعد میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ آبِ حیات کیا تھا؟ کہنے لگے: بھئی! جنہیں تم موت کا پیغام کہتے ہو' یہ اُس سانپ کی زہر سے تیار کیا ہوا انجیکشن (Injection) تھا۔ ایک سیکنڈ میں میرے ذہن میں آیا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ (17:44) یہاں کوئی شے ایسی نہیں جو اس پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں نہ ہو' جس کے نتائج خدا کی حمد و ستائش کے زندہ پیکر بن کر سامنے نہ آجائیں۔ اس انجیکشن کے بعد جب وہ خون رک گیا' تو بیک وقت بے ساختہ زبانوں سے نکلا: سبحان اللہ' کیا ہے تیری شان! کس چیز کو تو نے کس مقصد کے لیے بنایا ہے' ہم ہی نہیں جانتے۔ ہم تحقیق ہی نہیں کر سکتے۔ ہم نے تو قرآن کا یوں ترجمہ لیا کہ ''یہ تسبیح کرتی ہے''۔ یہ تحقیق تو یورپ کی لیبارٹری میں ہوتی ہے اور انہوں نے بتایا کہ یہ مہلک سانپ کس طرح اس کے پروگرام کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں صاحب! قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کی ایک ایک شے خدا کے تفویض کردہ پروگرام کو لائقِ تحسین بنانے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَھُوۡنَ تَسۡبِیۡحَھُمۡ (17:44)۔ لیکن تم نہیں سمجھتے کہ وہ کس طرح اپنے مفوضہ فرائض (Assigned Duties) کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہاں تَفۡقَھُوۡنَ کہا ہے۔ یہ ان کی تسبیح کیا ہے؟ کیا پروگرام ہم نے ان کے ذمے لگا رکھا ہے؟ اسے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تم تفکر سے کام نہیں لیتے' اس لیے تمہیں معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تفکر کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو تفکر کے معنی فقہی مسائل ہی ہو گئے۔

کائنات کے ہر ذرّے اور ہر شے پر' بڑی حلیمی کے ساتھ' ریسرچ کی ضرورت ہے

قرآن کی رو سے تفکر کے معنی Scientific Research کے ہیں۔ اس سائنسی تحقیق و تدقیق کے بغیر تَسۡبِیۡحَھُمۡ کی

Marfat.com

بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس کے لیے تفکر چاہیے۔ وہاں یورپ میں تفکر کا عمل ہو رہا ہے' وہ ایک ایک شے کو بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ آپ حیران ہونگے کہ ایک کیڑے کے متعلق Scientist بیٹھا ہوا ہے' لیبارٹری کھلی ہوئی ہے۔ اس یقین کے ساتھ' یہ ان چیزوں پر تحقیق کرنے میں لگے ہوئے ہیں یہ اور ان چیزوں کے متعلق اس طرح Proceed کرتے ہیں کہ ان میں خیر کا پہلو ضرور ہے۔ وہ خیر کا پہلو کیا ہے؟ وہ حمدیتِ خداوندی کیا ہے جس کے لیے ان کو بھی پیدا کیا؟ یہ سب کچھ عملِ تحقیق سے معلوم ہوگا۔ لیکن یہ عمل بڑی سہار (Support) چاہتا ہے' برداشت چاہتا ہے' بردباری چاہتا ہے' استقامت چاہتا ہے' تحمل آمیز قوت چاہتا ہے۔

دیکھیے! قرآن کی کیا ہی دو صفتیں یہاں آئیں! کہا: اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (17:44)۔ ہر شے جسے تم سمجھتے ہو کہ نقصان ہی دینے والی ہے' اس سے حفاظت کا پہلو نکل سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس حفاظت کے پہلو کو معلوم کرنے کا انتظام ہو۔ اگر ہمارے ہاں یہ انتظام ہوتا تو یہ کچھ ہو سکتا تھا۔ یہ نظم و انصرام بڑا بردبار' بڑا سہار' بڑی استقامت چاہتا ہے۔ ان لوگوں کے ایک ایک کیڑے پر ریسرچ کرتے چالیس چالیس سال گذر جاتے ہیں' کس قدر پتہ مارنے والا' برداشت کرنے والا' حوصلہ رکھنے والا' تحمل آمیز قوت رکھنے والا' یہ کام ہے!

غفور بننے کے لیے حلیمی' تفکر' وحدت اور استقامت کے اجزاء کی اہمیت کو جاننا اور اپنانا ہوگا

عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے حَلِيْمًا غَفُوْرًا' کہ اپنی تمام تر تحمل آمیز قوتوں کے ساتھ' نہایت محکم انداز سے نظم کائنات کو اپنے کنٹرول میں رکھتے ہوئے' اس کی ہر طرح سے حفاظت کیے جانا تا کہ اس میں کہیں فساد اور خلفشار رونما نہ ہونے پائے۔ اس طرح کائنات کی کوئی شے بھی ایسی نہیں جو جاذبِ حمد و ستائش نہ بن جائے لیکن اس کے لیے اپنے اندر خدا کی صفتِ حلیمی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ'' جلدی سے گھبرا نہ جاؤ۔'' اس کے لیے ضروری ہے کہ'' یہ کام کرنے والا بڑا بھاری بھرکم ہو' بردبار ہو' بڑی سہار والا ہو۔'' جلدی سے بیزار نہ ہونے والا ہو' جلدی سے بات کو یونہی نہ چھوڑ دینے والا ہو۔ اس قسم کے تفکر کے لیے ان صفات کا ہونا ضروری ہے۔ حلیم بھی بنیے اور تفکر بھی کیجیے پھر دیکھیے گا کہ تم کس طرح سے غفور بن جاتے ہو۔

اب آیئے' انسان کی زندگی کی طرف۔ پہلے تو دیوتاؤں کے متعلق' کائنات کی زندگی کے متعلق' یہ کچھ آیا تھا۔ اب انسانوں کی زندگی آ گئی۔ وہاں کہا کہ تم نے قانون کی وحدت' اس کے اوپر کنٹرول کی وحدت کو دیکھ لیا۔ انسانوں کی زندگی میں بھی ہماری وحی کے بھیجنے کا یہی مقصد تھا' لیکن وحی کے سلسلے میں تو ان سے کچھ ذہنیت (Mentality) کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ (یہ آیت پہلے آ گئی ہے)۔ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (17:41)۔ اگر انہیں قرآن کی طرف دعوت دو تو یہ پہلے سے ہی ایک سٹریٹیجک مائنڈ (Strategic

لے کے' نفرت لے کے' (Mind) اس کی طرف آتے ہیں جبکہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم پہلے سے ہی کوئی چیز اپنے ذہن میں رکھ کر اس کی طرف آؤ۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ تم پہلے سے آنکھیں بند کر کے اس پہ ایمان لاؤ۔

قرآن کی طرف آنے کے لیے خالی الذہن ہونا اشد ضروری ہے

قرآن کہتا ہے کہ جب تم اس (یعنی قرآن) کی طرف آؤ تو یہ نہ ہو کہ تمہارے دل میں اس کے خلاف نفرت ہو۔ اگر تم پہلے ہی سے کوئی نفرت لے کے' کسی شے کی طرف آؤ گے' تو عزیزانِ من! نہ وہ بات سمجھ میں آئے گی' نہ اس کا کوئی خوشگوار پہلو تمہاری نگاہوں کے سامنے آئے گا۔ اگر اس پر کوئی بات کی جائے گی تو تم اس کے خلاف جاؤ گے۔ اس لیے نہیں کہ یہ بات ایسی تھی جو مخالفت کے قابل تھی یا نفرت کے قابل تھی' بلکہ اس لیے کہ تم نے اپروچ (Approach) ہی اس طرح سے کیا اور پہلے سے ہی اس کے متعلق نفرت کا پہلو لیے ہوئے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس Attitude of Mind سے' اس زاویۂ نگاہ سے' آؤ گے تو تم پر حقائق منکشف نہیں ہوں گے۔ عجیب بات ہے! تو پھر کیا ہوگا؟

قرآنِ کریم نے کہا: وَاِذَا قَـرَاْتَ الْـقُـرْاٰنَ (17:45)۔ قرآن اُن کے سامنے پیش کیجیے جو پہلے سے ہی Unconscious Mind لیے ہوئے' اس کی طرف آ رہے ہیں۔ اس کے برعکس جو پہلے سے ہی نفرت کا پہلو لیے ہوئے' اس کی طرف آ رہے ہیں' جانتے ہو اس سے کیا ہوگا؟ کہا: جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (17:45)۔ یہ جو اس طرح سے نفرت کا پہلو لیے ہوئے قرآن کی طرف آتے ہیں اگر اس حالت میں قرآن ان کے سامنے پیش کرو' تو ان کے اور قرآن کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ ایک حجاب حائل ہو جاتا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ حجاب تو ہے ہی روک (Determent)' یہ رکاوٹ کا ایک پردہ (Covering) ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ حجاباً مستوراً ہے' یہ اِن آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ یہ بڑا ہی چھپا ہوا پردہ (Clandestine Covering) ہوتا ہے۔ سائیکالوجسٹ سے پوچھیے عزیزانِ من! وہ بتائیں گے کہ وہ ''چھپا ہوا پردہ' کچھ اس قسم کا ہے کہ اگر وہ کسی دوسرے کو نظر نہیں آتا' تو خود انہیں بھی نظر نہیں آ سکتا۔'' یہ Unconscious Mind کے اندر پردہ ہوتا ہے' یہ نفسِ لاشعور کے اندر ایک پردہ ہوتا ہے۔ ان کا اس وقت کا اپنا شعور Conscious Mind بھی انہیں نہیں سمجھا سکتا کہ یہ کیا ہوا ہے۔

نفرت کا پردہ ہی حجابِ مستور ہوتا ہے

حجاب بجائے خویش ایک پردہ تھا۔ بس اتنا ہی کافی تھا کہ اسے صرف حجاب کہہ دیتے لیکن وہ جو قرآنِ کریم نے پہلے ''نفوراً'' (17:41) کہا ہے کہ یہ نفرت ہے تو نفرت کے جذبات کی بناء پر جو ایک پردہ حائل ہوتا ہے' وہ حجابِ مستور ہوتا ہے۔ یہ تو سائیکالوجی کی

Marfat.com

ایک چیز ہے جسے انسان کا Conscious Mind شعور بھی نہیں دیکھ سکتا چہ جائیکہ کوئی دوسرا ہی اسے دیکھ سکے۔ عزیزانِ من! جذبات کے پردے اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کتنے پردے ہمارے دلوں کے اندر ایسے ہیں جنہیں ہم خود بھی نہیں دیکھ سکتے! وہی تو حجاب مستور ہوتے ہیں۔

مومن کی ایک اہم خصوصیت

قرآن کے سمجھنے کا' قرآن کی طرف آنے کا' یہ پہلا طریقہ ہے کہ خالی الذہن ہو کر اسے سمجھا جائے۔ وہ تمہیں یوں نہیں منواتا کہ آنکھیں بند کرلو۔ سورۃ فرقان کی آیت کئی دفعہ آ چکی ہے' وہ تو یہ کہتا ہے کہ **وَالَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِّرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ لَمۡ يَخِرُّوۡا عَلَيۡهَا صُمًّا وَّعُمۡيَانًا** (25:73)۔ کہ مومن تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ جب اس کے سامنے اور تو اور خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں' تو وہ بہرے اور اندھے بن کے ان کے سامنے نہیں گر پڑتے۔ وہ تو مومن کی Definition ہی یہ بتاتا ہے۔

قرآن کا مطالبہ

قرآن تو یہ مطالبہ ہی نہیں کرتا کہ آپ اندھے اور بہرے بن کے خدا کی آیات کو Accept کریں۔ وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ اندھے بہرے بن کے Accept کرنا' قبول کرنا' ہمارا مطالبہ نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ یہ بھی یاد رکھو کہ نفرت کے' یا مخالفت کے' یا عداوت کے جذبات لے کے' اس کی طرف آئے تو یہ سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ یہ تو یوں آئے گا کہ اس کی طرف نہایت کھلے اور صاف دل کے ساتھ آؤ۔ ہر ریسرچ (Research) کے متعلق عزیزانِ من! یہ Essential Condition ہوتی ہے کہ پہلے سے اس کی طرف دل میں ایک خیال جما کے (Biased) ریسرچ کی طرف نہ آؤ۔ ایسا کرنے سے ریسرچ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کرتی۔ اگر شروع سے ہی' پہلے سے ہی' آپ نے اپنے دل میں کوئی عقیدہ جما لیا اور اس طرح سے Fair-Haired لے کے' اس کی طرف آ گئے یا پہلے سے ہی تم نے کوئی بات تسلیم کر لی اور پھر اس کی طرف آ گئے تو پھر اس کے اندر تمہیں وہی کچھ نظر آئے گا' جو کچھ لے کر تم اس کی طرف آئے ہو۔ نفرت لے کے آ گئے تو اس کے بعد تو میں نے کہا ہے کہ جس کے خلاف نفرت کا جذبہ ہو' اس کی تو ہر حرکت آپ کے نزدیک نفرت آمیز ہوگی۔ یہی **حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا** ہے۔

نفرت اور اندھی تقلید دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے

انہی **حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا** رکھنے والوں کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ **وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا** (17:46)۔ آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں' دل غلافوں کے اندر آ جاتے ہیں' حالانکہ وہ طبعی طور پر دیکھ بھی رہے ہوتے ہیں' سن بھی رہے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوتا کہ ان کے ماتھے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ ان کے دل کی

Marfat.com

آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ نفرت کا جذبہ لیے کسی کے سامنے چلو اور اسکی باتیں سنو۔ اب دیکھو تو سہی کہ کیا سنائی دیتا ہے: کچھ وہ بک رہا ہوتا ہے اور کچھ آپ تک رہے ہوتے ہیں۔''

قرآن کے سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کی طرف خالی الذہن آؤ' (Unbiased) ' پہلے سے کچھ بھی لے کر نہ آؤ۔ بات یہیں ختم نہیں کی۔ یہاں کوما ہے' فل سٹاپ نہیں آیا۔ کہتا ہے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ نفرت کے جذبات کیسے ہوتے ہیں؟ اور یہ کہ یہ چیز ان غیر مسلم یا قریش مخالفین کی نہیں ہو رہی۔ عزیزانِ من! سنیے یہ کس کس کی بات ہو رہی ہے۔ دیکھیے کہ کہیں ہمارا ہی ذکر تو نہیں ہو رہا۔ فقرہ پورا یوں ہوتا ہے: وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (17:46)۔ نفرت کس بات پہ ہے؟ اس بات پہ ہے کہ تم خالص خدا کی بات کرتے ہو' تم صرف قرآن کی بات کرتے ہو۔ جب تم یہ کرو گے' اس کے ساتھ کچھ اور نہیں ملاؤ گے' تو ان کے دل میں خالص قرآن سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ رہا ہے کہ جب تم قرآن میں صرف ایک خدا کا ذکر ان کے سامنے کرو گے' تو ان کے دل میں نفرت پیدا ہوگی۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس کی تشریح کی ہے۔ آپ ان دونوں آیتوں کو ملایئے' پھر آگے چلیے تو آپ دیکھیے گا کہ بات کیسے واضح ہوتی ہے۔ کہا ہے: وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (39:45)۔ تم اگر ان کے سامنے خالصتاً ایک خدا کا ذکر کرو' تو جو لوگ آخرت پہ ایمان نہیں رکھتے' تو تم دیکھو گے کہ ان کے دل جھنس جائیں گے' اکھڑ جائیں گے'' وٹ پے جائے گا' مروڑے چڑھ جائیں گے''۔ ❶ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (39:45)۔ اور جب اس کے ساتھ اور انسانوں کو ملا لو گے تو اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45)۔ کہیں گے کہ واہ واہ کیا بات کی ہے صاحب! خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں' بولتے ہیں کہ کچھ دوسرے لوگوں کو جنہیں وہ اپنا کارساز سمجھتے ہیں' ملا کر ان کے سامنے خدا کی باتیں کرتے رہو' وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (39:45) اور اگر کچھ اور لوگ خدا کے ساتھ ملاؤ۔ تو یہ کچھ آج یہاں تک ہوتا ہے کہ قرآن کی آیت تبرکاً عزیزانِ من! لکھی جاتی ہے' تلاوت بھی کی جاتی ہے۔ ہر جلسے کے آغاز میں یہ کچھ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک آپ دیکھیں گے کہ انسان زیادہ سے زیادہ احترام میں خاموش رہتے ہیں لیکن اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت تو وہیں رہ جاتی ہے اور پھر جو سارا ذکر آپ کے ہاں ہوتا ہے' وہ خدا کو چھوڑ کے اوروں کا ہوتا ہے۔ اس سے سب خوش ہوتے ہیں۔ آگے واعظ داستان سرا ہو' یا آپ کے ہاں کا وہ لیڈر' افسانہ نگار ہو' وہ عام انسانوں کو ساتھ ملائے گا اور اپنا راگ الاپتا چلا جائے گا۔ زندگی کا کونسا گوشہ ایسا ہے۔ جہاں آج یہ کچھ نہیں ہو رہا۔

عزیزانِ من! ہم صرف خدائے خالق پر ایمان چاہتے ہیں۔ خدائے واحد میں کہوں گا' ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ اس پہ زور دیا گیا'

---

❶ ۔ان کے پیٹ میں درد اٹھے گا' نفرت آ گئیں۔

Marfat.com

کہ یہ لوگ قبروں پہ جاتے ہیں اور ان سے بھی مرادیں مانگتے ہیں۔ ٹھیک ہے جو بھی شکل ہے لیکن یہ ایک ہی شکل ہے۔ لیکن جو لوگ وہاں اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے' ان سے پوچھیے کہ وہاں سے ادھر آنے کے بعد جب آپ شریعت یا فقہ کی دنیا میں آتے ہیں تو اس میں خدا کا کتنا حصہ ہوتا ہے اور خدا کے علاوہ انسانوں کا کتنا حصہ ہوتا ہے۔

اکثر انسانوں کو خدائے واحد کا نام راس نہیں آتا

آپ جسے شریعت کہتے ہیں' جسے فقہ کہتے ہیں' کہیے کہ اس میں کتنا حصہ خدا کا ہوتا ہے اور کتنا حصہ خدا کے علاوہ انسانوں کا ہوتا ہے؟ قرآن میں ایک خدا کا ذکر ہے۔ ذکر کے معنی یہ نہیں کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (112:1)۔ کہہ: اللہ ایک ہے کہ یہ خدا کی توحید ہوگئی۔ توحید کے تو معنی یہ ہیں کہ اسے عملاً مانا جائے کہ عالمِ انفس و آفاق میں صرف خدا کا قانون جاری و ساری ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ رکھیے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق اس کی وحی کے ذریعے قائم ہے' قرآن کے ذریعے قائم ہے۔ جب خدا کہا جائے گا تو قرآن کہا جائے گا۔ ہم اس کے متعلق کچھ اور جان ہی نہیں سکتے' ہم کچھ اور پہچان ہی نہیں سکتے۔ وہ سرسید احمد خاں (1817-1898) بھی بڑا مزے کا آدمی تھا' عجیب شخص تھا۔ اس زمانے میں یہ پادری بڑے نازک ہوا کرتے تھے۔ بیہودہ اور بے معنی سوچتے تھے۔ گاڑی میں سفر کر رہے تھے' ساتھ ہی پادری صاحب بھی تشریف لے آئے۔ یہ اپنی فکر میں ڈوبا ہوا' اور وہ پادری صاحب مناظر جو ہوتے ہیں۔ "اے تے جس طراں کے نوں کھرک ہندی اے او تے رہ ای نئیں سکدا"۔ ❶ اس زمانے میں بھی بعض فرقے ایسے ہیں جو مناظرے پیدا کرتے تھے' کہیں آپ ہوں کسی جگہ ہوں' جتنا جی چاہے دھتکاریئے ڈانٹیے کچھ بھی کیجیے انہیں "کھرک" ہوگی "اوناں نے ضرور بحث چھیڑ دینی ہوئی اے"۔❷ تو پادری صاحب نے بھی معلوم کیا کہ آپ ہیں حضرت صاحب! تو اس نے کہا کہ صاحب! دیکھیں آپ یہ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں' یہ پوچھنا ہوتا ہے تو میں آپ کے متعلق ایک Question کہتا ہوں: "فرمایئے' خدا کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟" تو سرسید نے کہا کہ "جی! ہمیں ان سے ملاقات نہیں ہوئی" اور اپنے کام میں لگ گئے۔ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے؟ کیسا ہے؟ ہم ان کی بات نہیں سن سکتے۔ دیکھیے' اس کے ساتھ ہمارا تعلق صرف اس کی وحی کے ذریعے سے ہے' قرآن کے ذریعے سے ہے' جسے ہم خدا کا کلام کہتے ہیں۔ اب خدا کے احکام اور کلام صرف قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ تو بات ہی یہی ہے جو قرآن کرتا ہے' حکم بھی وہی ہے جو قرآن دیتا ہے۔

---

❶ (ان پادری صاحبان کی مثال تو یوں ہے کہ) جس طرح کسی کو خارش کا مرض لاحق ہوتا ہے' وہ خارش کیے بغیر رہ نہیں سکتا (اسی طرح یہ پادری مناظرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔)

❷ ان پادریوں نے ضرور کوئی نہ کوئی بحث چھیڑنی ہی ہوتی ہے۔

Marfat.com

کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرنے والے ہی کافر ہیں

میں نے عرض کیا کہ خدا کے ساتھ اوروں کا ذکر کرنا ہی نہیں ہے مگر تم ہو کہ قبروں پہ جا کے دوسروں کو حاجت روا مانتے ہو، وہ تو یہ کہتا ہے کہ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) یہ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، فیصلے نہیں کرتے تو یہی لوگ تو ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یہاں اس نے کہا ہے کہ قرآن کے ساتھ اوروں کا ذکر نہیں ہے۔ یہ پہلی شرط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس چیز سے ان کو چڑ ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ تم وحدہ کے ساتھ اوروں کو نہیں ملاتے۔ صاحبانِ اختیار وکارساز کو ساتھ ملایئے تو یہ بہت خوش ہو جاتے ہیں اور یہ ہے قرآن کی آیت جس کے متعلق صاحب! امام طبری ❶ نے یہ فرمایا ہے، فخر الدین غالی یہ کہتے ہیں کہ ارشادِ عمل ہے، فلاں نے یہ کہا ہے اور پھر یہ تو ہو گیا علومِ ظاہری۔ اور باطنی جس کے متعلق ایم اے عربی نے باطنی معنی یہ بتائے، اور اس نے وہ کہا۔ اللہ کے ساتھ ان دوسرے ناموں کی ڈوری لگی ہوئی ہے اور ہم ساری انہی کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔

اوپر خدا کا نام اور نیچے سارے انسانوں کے نام

قرآن کا ذکر تو ہمارے ہاں اتنا ہی ہوتا ہے جیسے خط کے اوپر ہم بسم اللہ لکھ دیتے ہیں یا اس کو بھی سمیٹ کے 786 کا عدد لکھ دیتے ہیں۔ جناب! یہ تو ہمارے ہاں اتنا سمٹا ہوا ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ دوسرے اتنے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ ایک ہی سانس میں یا ایک ہی نشست میں نہیں، ایک ہی دن میں نہیں، ایک ہی سال میں نہیں، ہماری صدیاں گذر گئیں کہ تبرکاً اس کا نام اوپر ہوتا ہے اور نیچے سارے انسانوں کے نام ہوتے ہیں۔ اور اس پہ سب خوش ہوتے ہیں۔ قرآن کے اس خدا کا قانونِ خالص کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا، اس کی خالصتاً حکومت کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہی کہتے اور کرتے ہیں کہ اس خدا کے ساتھ اور کارسازوں کو بھی ملاؤ۔ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (39:45)۔ ان کا اس بات پہ ایمان نہیں کہ اس کے سامنے جا کے ہم نے جواب بھی دینا ہے۔ اس کا جواب بھی دینا ہے کہ ہم نے کس کے قانون کے مطابق زندگی بسر کی تھی۔ یہ ہے وہ بات جو یہ مانتا ہے۔ وہ پھر اس کے ساتھ کسی دوسرے انسان کو کھڑا نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ یہ ہے اصل بات۔ جو یہ نہیں مانتے، ان کی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد کا ذکر کرو، صرف اکیلی اس کی بات کرو۔ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ (39:45)۔ تو انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ عزیزانِ من! عجیب لفظ ہیں! میں اس کا کیا ترجمہ کروں بہ پچھ یوں ہے کہ اندر سے یہ "مروڑا" کھا رہے ہیں۔ پھر کہا کہ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45)۔ جب ان کے سامنے ان کا ذکر کیا جاتا ہے، جنہیں وہ خدا کے سوا اپنا کار

---

❶ ابن جریر طبری، طبرستان کے رہنے والے ایرانی تھے۔ (پرویز، 1986، ص۔ 33)

Marfat.com

ساز و ہمسر سمجھتے ہیں تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یہ دیکھیے کہ وہاں جو لفظ ہے وہ **اشمازت قلوب** ہے۔ یعنی اندر ہی اندر کچھ یوں ہوتا ہے گویا کہ ان کے پیٹ میں مروڑ پڑ رہا ہے' سخت ناخوش گواری کا احساس ہو رہا ہے اور جب خدا کے ساتھ اوروں کو شامل کیا جاتا ہے تو یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ کھل کھلا اٹھتے ہیں۔ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں۔

خدا کے ساتھ دوسروں کو کیسے ملایا جاتا ہے؟

پھر برملا کہتے ہیں کہ دیکھیے جناب کیا نکتہ فرمایا ہے! اس نے معاذ اللہ یہ بات تو نہیں کی تھی' وہ یہ بات کی تھی۔ کیا نکات آفرینی ہے صاحب! اس کا جو حکم تھا وہ تو ناقابلِ عمل تھا جناب! کہا: انہوں نے اس کے متعلق جو تفاصیل دی ہیں صاحب! کیا ہی نکتہ وا کر دیا۔ یہ ہے خدا کے ساتھ اوروں کو ملانا عزیزانِ من! اب بات یہ ہے کہ جب بھی صرف خدا کی بات کیجیے تو دلوں میں ناخوشی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ اوروں کو ملایئے تو بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ کسی جملے میں خدا کی صفات کا ذکر کیجیے' اس میں کسی انسان کو شریک نہ کیجیے تو وہ چیز تجریدی (Abstract) ہی رہ جاتی ہے اور جب خدا کے ساتھ دوسرے کارسازوں کو بھی شریک کر لیجیے تو وہ خوشی سے باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ عملی زندگی کے اندر بھی آپ دیکھیے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہو' اس میں کسی دوسرے انسان کی شرکت نہیں ہو سکتی۔ یہی چیز ہے جس کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے نزدیک یہ جرمِ عظیم قرار پا جاتا ہے۔

اصل بات تو وہ ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو

جب بھی کوئی بات کیجیے کہ قرآن کے یہ معنی ہیں صاحب! تو جواب ہوتا ہے صاحب! یہ سلفِ صالحین کے خلاف ہے۔ او بابا! یہ کہو کہ یہ قرآن کی کس بات کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ کہو کہ قرآن کی رو سے یہ بات یوں ہے' بات آگے کہیے۔ لیکن ان کے متعلق تو عقیدہ یہ ہے کہ یہ سلف صالحین قرآن کی آیتوں کو منسوخ کرتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز کہ جس سے ان میں اور قرآن میں ایک حجابِ مستور پیدا ہو جاتا ہے۔ اب سنیے قرآن کی اس آیت کو وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَیۡنَکَ وَبَیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا. وَّجَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَفِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا ؕ وَاِذَا ذَکَرۡتَ رَبَّکَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَہٗ وَلَّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِہِمۡ نُفُوۡرًا (17:45-46)۔ جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا جاتا ہے تو منہ موڑ کے چل دیتے ہیں' پیٹھ پھیر کے چل دیتے ہیں' ماتھے پہ جفر [1] کے نقشے بن جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے' وہ کہتا ہے کہ جو اس Attitude of Mind سے' دل کی اس کیفیت کے ساتھ' تمہاری محفل میں' قرآن کی محفل میں آئے گا۔ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ (17:47)۔

---

[1] وہ (غیر حقیقی) علم جس سے غیب کا حال بتایا جاتا ہے۔

Marfat.com

تو بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ وہ آگے بیٹھتے ہے گویا کہ بہت غور و خوض کے ساتھ سن رہے ہیں۔ قرآن کریم نے **یَسْتَمِعُوْنَ** کہا ہے۔ عربی زبان ہے عزیزانِ من! اس کے معنی ہیں کہ ''بظاہر نظر آئے کہ یہ کچھ ایسا کر رہا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو'' عربی زبان کا یہ انداز ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اس کے اندر آ جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے (Prejudice Mind)' طرفداری کا ذہن لے کے آئیں۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے بھی نظر آ رہے ہیں' بظاہر بات بھی سن رہے ہیں لیکن اندر کچھ اور زہر گھلی ہوئی ہے۔ اور اس کا پتہ کب چلتا ہے؟

مجلس سے باہر کی کیفیت

وَاِذْھُمْ نَجْوٰٓی اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا(17:47)۔ جب آپس میں اندر ہی اندر باتیں کرتے ہیں' ایکدوسرے کے ساتھ خفیہ مشورے کرتے ہیں' خلوت میں پہنچتے ہیں تو وہاں وہ جو کچھ کہتے ہیں' قرآن نے مختلف مقامات پر اس کا احوال دیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ ''ہم تو مذاق اڑانے گئے تھے' ہم یہ کچھ کرنے گئے تھے''۔ اور اس کے بعد یہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جب اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ''کہو' آج تم نے سنا تھا' کیا خیال ہے''؟ کیا خیال ہے؟ ایسا ''نظر آتا ہے'' کہیں یہ کہا کہ ''یہ پاگل سا نظر آتا ہے''۔ کہیں کہا ہے۔ رَجُلًا مَّسْحُوْرًا(17:47) "ایسا لگ رہا ہوتا ہے کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے' بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے''۔ کہیں یہ کہا ہے کہ ''یہ ساحر ہے' اس کی کیفیت تو یہ ہے کہ اس کی مجلس میں جانا ہی نہیں چاہیے' بالکل جادوگر ہے' ساحر ہے''۔ آج بھی باہر آپ نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اس مجلس میں نہ جانا۔ وہاں جو جاتا ہے' پھنس جاتا ہے۔ وہاں سے نکلتا ہی نہیں۔ میں یہ بات آج کی کر رہا ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

قرآن کی بات اگر دلائل و براہین سے کی جائے تو پھر وہ تو چپک جاتی ہے

خدائے واحد کا ذکر' قرآن خالص کا ذکر' اگر قرآن کی رو سے پیش کیا جائے' جسے قرآن دلائل و براہین' بصیرت و علم و یقین کی بنا پہ کہتا ہے' تو واقعی جسے یہ سحر کہتے ہیں' یہ ذکر سحر ہی کرتا ہے۔ دلائل صحیح کی رو سے اگر قرآن کی بات کی جائے تو چپک جاتی ہے۔ اس سے انسان نکل نہیں سکتا لیکن یہاں تو کہا: رَجُلًا مَّسْحُوْرًا(17:47)۔ کہ یہ نہیں ہے کہ یہ جادو کرتا ہے بلکہ نہایت طنز و طعن آمیز انداز سے کہتے ہیں کہ تم ایسے آدمی کے پیچھے لگ رہے ہو' جس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے اور بہکی بہکی باتیں کرتا ہے' کسی نے اس پر جادو کر دیا۔ یہ کفار کا قول ہے۔

آپ ﷺ پر جادو ہونے کے سلسلہ میں بخاری کی تفصیل اور قرآن کی تردید

آپ کو معلوم ہے عزیزانِ من! کہ آپ کے ہاں کا عقیدہ کیا ہے اور کہاں سے وہ عقیدہ آیا ہوا ہے۔ بخاری شریف میں حضورؐ کے متعلق یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر معاذ اللہ ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا۔ آپ اس جادو کے اثر میں آ گئے تھے اور کیفیت یہ

Marfat.com

ہوگئی تھی کہ آپ کو یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ میں نے فلاں کام کیا ہے یا نہیں کیا۔ حتی کہ یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے نماز بھی پڑھ لی یا نہیں۔ ''اس پہ کسی نے جادو کر دیا ہے'' قرآن اس کی نفی کر رہا ہے۔ یہاں پہ کفار کا قول بتا رہا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کی معتبر ترین کتاب بخاری کی ہے۔ اس میں یہ چیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اوپر کسی یہودی نے جادو کر دیا تھا اور بڑی لمبی تفصیل ہے کہ جادو کیسے کر دیا تھا' کس طرح سے آپ کی یہ کیفیت ہوگئی تھی آپ رَجُلًا مَّسۡحُورًا 'معاذ اللہ' بن گئے تھے۔ پھر کس طرح سے یہ پتہ لگایا' کس طرح سے لوگوں کو وہاں بھیجا یہاں وہ تعویذ کالا جادو کیا ہوا' کنویں میں سے نکالا' پھر اس کا اثر زائل ہوا۔ یہ ساری تفصیل دی ہوئی ہے۔ یہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ کفار کا حضور ﷺ کے خلاف یہ قول ہے کہ وہ رَجُلًا مَّسۡحُورًا ہے اور یہ کالا جادو لگائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر اس کی Justification کے لیے تفسیروں میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔

جادو کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی تفسیر

قرآن کے حوالے سے دورِ حاضر کے سب سے بڑے آپ کے ہاں کے مفکر مودودی صاحب [1] کی تفسیر لیں۔ آپ دیکھیے کہ کتنا لمبا چوڑا لکھا ہوا ہے کہ ہاں صاحب ٹھیک ہے' کسی نے آپ پہ جادو کر دیا تھا' جس نے اس جادو کا انکار کیا' اس کے متعلق یہ ایک ہی لفظ کہہ دو کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ او بابا! اس سے اس لیے انکار ہے کہ اول تو بہرحال عقل و بصیرت کی بناء پر یہ چیز آ جاتی ہے۔ عقیدت و احترام کو تو چھوڑیے عزیزانِ من! خالص اس بناء پہ یہ لیجیے کہ جو شخص دنیا کے اندر اتنا عظیم انقلاب پیدا کرتا ہے' لاکھوں انسانوں کے دل کے اندر اور پھر باہر کی دنیا کے اندر بھی اتنا عظیم انقلاب پیدا کرتا ہے' اس کی کیفیت یہ ہے۔ جادو کا مارا ہوا انسان خود تو وہ کسی اور کے لیے یہ کچھ کرنا ایک طرف رہا' اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ جسے یہ بھی یاد نہ رہا ہو کہ میں نے نماز بھی پڑھ لی یا نہیں' وہ اتنی عظیم مملکت کا بھی انتظام کر لے گا؟ کتنے عظیم انسانوں کے قلب و نگاہ کی دنیا کو بدل کے رکھ دے گا۔ کیا وہ رَجُلًا مَّسۡحُورًا ہوگا؟۔ معاذ اللہ نہیں' قطعاً نہیں۔ اور میں تو دلائل و براہین میں اس سے بھی آگے چلا کرتا ہوں۔

اس سلسلہ میں قرآن کا اپنا بیان

میری تو سند یہ ہوتی ہے کہ کیا قرآنِ کریم یہ کچھ کہتا ہے یا یہ کفار مخالفین آپ کے خلاف آ کر اس قسم کی کفر کی باتیں کرتے تھے کہ یہ رجلاً مسحور ہے؟ یہ ان پہ جادو کر دیا؟ قرآن خود یہ بتا رہا ہے کہ کفار کا قول تھا۔ آپ ہم سے کہتے ہیں کہ مانیے کہ ہاں آپ رجلاً مسحور تھے' اس پہ کوئی کیا کرے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ نہ کوئی دلیل ہے' نہ کوئی برہان ہے' نہ محفوظ بات کو رد کر سکتے ہیں۔ یہ کچھ الگ کہا گیا ہے۔ بھئی دلیل و برہان ہے تو بتائیں کہ وہ غلط کہتا تھا' وہ بات اس طرح سے غلط کی ہے۔ یہ بات یوں تھی مگر ایسا کچھ نہیں۔ اس کے متعلق کیا کہہ

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1978)

Marfat.com

رہے ہو کہ وہ جادو کا مارا ہوا' بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتیں کیا کرنی ہیں۔ یہ تو جب آپ کسی کو بھی یہ کہتے ہیں کہ وہ جادو کیا ہوا ہے' وہ جن چڑھا ہوا ہے' جسے آپ کہتے ہیں' اس کی فطری حرکات' سکنات' اقوال باتیں ساری ہوتی ہیں۔ تو کیا کوئی ان کے اوپر نہایت سنجیدگی سے غور وفکر شروع کرے گا؟ لیکن یہاں تعلیم یہی دی جارہی ہے کہ وہ تو جادو کا مارا ہوا بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ (17:48)۔ یہ تیرے خلاف کس کس قسم کے تہمات لگاتے ہیں! عزیزانِ من! یہ کون کہہ رہا ہے؟ یہ قرآن کہہ رہا ہے۔ اس پر بخاری کی اس حدیث کو کوئی کیا کرے۔ حضور ﷺ کو کہہ رہے ہیں' دیکھو! یہ تیرے خلاف کس کس قسم کے الزامات لگا رہے ہیں؟'' فَضَلُّوْا (17:48)۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ تیرا تو کچھ نہیں بگاڑ رہے' اس طرح سے جیسے خود اپنا ہی راستہ گم کر بیٹھے ہیں۔

منافقانہ ذہن (Mind) رکھنے والوں کو کوئی صراطِ مستقیم نہیں دکھا سکتا

ایسے راہ گم کردہ لوگوں کے لیے قرآن کہتا ہے کہ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (17:48)۔ کتنی ہی کوشش کریں' ان کو صحیح راستہ مل ہی نہیں سکتا' اس منافقانہ ذہن (Mind) سے آنا' قرآن کو سننا' تمہاری محفل میں بیٹھ کر دل میں یہ خیالات رکھنا' اٹھ کے جانا تو یہ بات کہہ دینا کہ وہ رجل مسحور ہے۔ کہا کہ اس کا نتیجہ اس قسم کا راستہ گم ہو جانا ہے کہ پھر کہیں راستے کو پانے کا نشان ہی نہیں رہتا۔ جب تک یہ کیفیت رہتی ہے' کوئی صحیح راستے پر آ ہی نہیں سکتا۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ بہکی بہکی جو باتیں تھیں' ان میں سے ایک بطور مثال کے قرآن نے پیش کی ہے۔ کن باتوں کو یہ کہتے ہیں؟ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (17:49)۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ تو مر جائے گا' ہڈیاں رہ جائے گا' گل سڑ کے ریزہ ریزہ ہو جائے گا' تو مرنے کے بعد پھر تمہیں زندگی ہوگی' زندہ ہو گے' اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا' مواخذہ ہوگا' تمہارے سامنے یہ چیزیں آئیں گی۔ قرآن کہتا ہے: ''یہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ کہہ رہا تھا''۔ یعنی اس بات کو انہوں نے ایک رجلاً مسحور کی بات کہا۔ کیا کوئی عقل وفکر کا انسان' جس کے حواس قائم ہوں' قرآن کہتا ہے کہ کیا وہ اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرے گا؟ کہا کہ وہ ہرگز بہکی بہکی باتیں نہیں کرتا' بالکل بہکی بہکی باتیں نہیں کہتا۔

تعلیم یافتہ نوجوان کا اعتراض

عزیزانِ من! آپ آج کے معاشرے کے اندر' بالخصوص ہمارے ہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ پراگندہ ذہنیتیں (Mentalities) لیے پھرتے ہیں۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ آخرت کی زندگی کو مانتے ہیں۔ کہتے ہیں مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ہے۔ ان سب کا نام مسلمانوں کا ہوتا ہے اور مذہب کے کالم میں اپنا مذہب اسلام لکھتے ہیں' اپنے آپ کو مسلمان لکھتے ہیں' قرآن' ان کی ایک بات کا جو وہ کہتے ہیں کہ ''یہ بہکی بہکی کرتا ہے'' کا تذکرہ کرتا ہے۔ آج آپ کے ہاں کے نام نہاد دانشورانِ قوم قدم قدم پہ یہ کچھ کہتے پھرتے ہیں کہ ہمیں اس پہ اعتراض نہیں ہے۔ یوں تو اس پہ اعتراض نہیں کہ آپ خدا کو سرے سے ہی نہ مانیں۔ وہ نہیں

مانتے۔ ہمیں اس پہ بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تم آخرت کی زندگی کو نہ مانو۔ اعتراض اس پہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ کہنے کے بعد اپنے آپ کو مسلمان کہو۔ تو برائے کرم یہ کچھ مت کرو' اورنہیں تو کم از کم پانچ کلموں کی آپ کے ہاں بنیادی شرط ہے' جس سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرتا تو سب سے اہم چیز جو اس میں ہے' وہ یہی بالآخرت پہ ایمان ہے۔ اگر اس پہ ایمان نہیں ہے تو پھر آپ اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ اخلاقی پابندیاں اٹھاتے ہیں' وہ بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ وہ کہیں کہ ہاں صاحب! ہم مسلمان نہیں ہیں تو اپنے کارڈوں کے اندر لکھیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ کوئی ان کا کارڈ اٹھا کے دیکھے تو مذہب کے خانے میں مسلمان لکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟

موت کے بعد زندگی کے متعلق قرآن کا بیان

عزیزانِ من! سنیے قرآنِ حکیم اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ ہمارا جسم ریزہ ریزہ ہو جائے گا' ہماری ہڈیاں چورا چورا ہو جائیں گی' ہمارا جسم Disintegrate ہو جائے گا۔ اس وقت وہ مضبوط شکل میں ہے' پھر یہ اجزا منتشر ہو جائیں گے۔ یہ اتنا ہی کہتے ہیں۔ تو کہا کہ ان سے کہو: قُلْ كُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ (17:50-51)۔ اتنا ہی نہیں کہ تمہارا جسم ریزہ ریزہ ہو جائے گا' یہ تو ہے کہ اس جسم کے اجزاء تو باقی رہیں گے' ان اجزاء سے یہ تو ہو سکے گا کہ انہیں جوڑ دیا جائے۔ ہمارے ہاں بھی تو برتن ٹوٹ جاتا ہے' ایسے سلوشن (Solution) نکلے ہوئے ہیں کہ جن کو لگا دیا جائے تو وہ جڑ جائے۔ کہنے لگا: یہ بھی نہیں اور آگے چلو۔ یہ صدیوں والی بات نہیں۔ تم مرنے کے بعد پتھر بن جاؤ' لوہا بن جاؤ یا کوئی اور چیز بن جاؤ' جس کے متعلق تمہارے ذہن میں یہ ہو کہ اس میں تو از سرِ نو زندگی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے کہا کہ یہ تو پھر بھی Organic Element تھا' جو ریزہ ریزہ ہوا ہے' اس کے اندر بھی زندگی ہوتی ہے۔ قرآن تو اور آگے بڑھا ہے۔ کہنے لگا کہ یہیں تک کیوں رک گئے ہو اور آگے بڑھو۔ کہو کہ انسان کا یہ جسم ان چیزوں میں تبدیل ہو جائے گا' جن میں زندگی کی نمود ممکن ہی نہیں' تو کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اور چیز تمہارے ذہن میں آتی ہے کہ جس کے متعلق تم سمجھو کہ اس میں زندگی ناممکن ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز تمہارے ذہن میں ہے تو وہ بھی کہہ دو۔ چنانچہ قرآن نے ان کا قول نقل کیا۔ کہا: فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا (17:51)۔ تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ کہ جب یہ حالت ہو جائے گی تو کون ہے جو ہمیں دوبارہ اس طرح سے انسان بنا دے گا؟ یہ بہت بڑا سوال ہے اور بہت بڑی چیز ہے۔

قرآن کا انداز دیکھیے۔ انہوں نے تو اس جسم کا اتنا ہی کہا تھا کہ یہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا' گل سڑ جائے گا' اس کے اجزاء منتشر ہو جائیں گے۔ قرآن نے فرمایا کہ اتنا ہی کیوں کہتے ہو' اب آگے بڑھو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ وہ کون ہے جو ہمیں دوبارہ یہی انسان بنا دے گا؟ پوچھو کہ کون ایسا کر دے گا؟ جواب سنیے عزیزانِ من! اور جھوم جایئے۔ کہا: یہاں تو پھر بھی تم یہ کہو گے ناں کہ ایک جسم تھا' ریزہ ریزہ ہو گیا' ہڈیاں چورا ہو گئیں' اجزاء چورا ہو گئے' وہ لوہا بن گیا۔ وہ پتھر بن گیا' اس میں کچھ تو موجود تھا۔ جس میں کوئی تبدیلی آئی۔ بہر حال یہ

Marfat.com

چیزیں تو اس میں موجود ہیں۔ سمجھ لیا ناں کہ اس کی کیفیت تو یہ تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی تو سوچو کہ۔ قُلِ الَّذِیْ فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (17:51)۔ تم موجودہ زندگی میں آنے سے پہلے تو تھے ہی نہیں، تم میں (Organic Element) کہیں موجود ہی نہیں تھے۔ تو یہاں مرنے کے بعد تو پھر بھی مانتے ہو کہ کچھ تو موجود رہتا ہے۔ قرآن کریم کہنے لگا کہ اس حالت پہ غور کرو، جس میں تمہاری پیدائش سے پہلے تم میں کچھ موجود ہی نہیں تھا۔ اس نے اس حالتِ معدوم Nothingness سے تمہیں بنا دیا۔ کیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ تمہارے اجزاء سے تمہیں پھر انسان بنا دے؟ عزیزانِ من! دلیل وہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے عرب کے جہلا یا ان کے یہودیوں کو نہیں دی گئی تھی، آج بھی یہی دلیل ہے۔

علت ومعلول کا قانون اور حالتِ معدوم (Nothingness)

عزیزانِ من! آج آپ کے ہاں کے بڑے سے بڑے Scientists ہر بات کی تحقیق کے لیے دلیل اور ثبوت مانگتے ہیں۔ زندگی کے سلسلہ ہائے تسلسل (Hierarchy) کو دیکھنے کے لیے یہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات میں، سلسلۂ علت و معلول Cause & Effect کی بنیاد پر ہر چیز وجود میں آتی ہے۔ پیچھے اس کا ایک سبب ہوتا ہے، ایک Cause ہوتا ہے۔ اس Cause کا ایک Effect ہوتا ہے۔ پھر وہ جو Effect ہوتا ہے وہ Cause بنتا ہے پھر وہ Effect میں آتی ہے۔ سائنس کی یہ ساری تحقیق اس عمل پر ہوتی ہے کہ پہلے یہ چیز موجود تھی، اس میں سے یہ چیز ہوئی۔ عربی زبان میں اسے ''تخلیق'' کہتے ہیں: پہلے کچھ موجود ہو، اس کو آپ نئی نئی Proportion دے کے، اس میں نئی نئی تراکیب پیدا کر کے، پھر نئی نئی چیزیں پیدا کرتے چلے جائیں۔ یہ سائنسدان پیچھے چلتے جاتے ہیں ایک مقام وہ آ جاتا ہے، جہاں Origin of Universe آ جاتا ہے۔ پھر سوال یہ آتا ہے کہ سب سے پہلے جو شے تھی جس کے بعد یہ سلسلہ آگے چلا، وہ شے کیسے وجود میں آ گئی؟ پانی کا تو ہمیں پتہ چل گیا کہ دو یونٹ ہائیڈروجن، ایک یونٹ آکسیجن ملائیے تو وہ اس طرح پانی بن گیا۔ بہت اچھا جی! سارا پانی تو ہم نے دیکھا کہ اس طرح یہ بن گیا۔ وہ جو ہائیڈروجن یا آکسیجن یا اس قسم کے یہ جنہیں Elements کہتے ہیں، وہ تو دوسری چیزوں سے اس طرح مل کے نہیں بنے۔ یہ Basic Elements کہلاتی ہیں۔ وہ تخلیق کے دائرے میں ہی نہیں آتیں۔ تخلیق تو اس کو کہتے ہیں کہ جو دوسری موجود چیزوں کے اس طرح سے ملنے سے دوسری چیز وجود میں آئے اور جہاں تم کہتے ہو کہ یہ ایسی چیز ہے جو کسی چیز کے ملنے سے نہیں بنی، یہ تو Element ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ Element کیسے وجود میں آ گئی؟ یہ ہے وہ مقام جہاں ''خلق'' کا لفظ نہیں آتا۔ یہاں عربی کا لفظ ''فطر'' آتا ہے۔ یہاں ''ابداع'' کا لفظ آتا ہے۔ یہ Nothingness سے Being بنانا۔

Marfat.com

انشقاق [1] (Disintegration) سے تکوین و تکمیل [2] (Integration)

''جس شے کا وجود ہی نہیں ہے' اس کو وجود میں لے آنا'' یہ پہلی بات ہے۔ کہا: تم اس پہ تعجب کرتے ہو اور اسے ناممکن بتا رہے ہو' کہتے ہو کہ یہ جو Disintegrated اجزاء ہیں' منتشر اجزاء ہیں' ان میں دوبارہ تکوین اور تکمیل Integration کیسے پیدا ہوگی؟ یہاں تم نے اتنا تو مان لیا کہ یہ'' کچھ موجود ہے۔ اب کہتے ہو کہ اس کی دوبارہ تکوین کون کرے گا؟ کہا: یہ وہ کرے گا' جس کی کیفیت یہ ہے کہ جب کچھ بھی موجود نہیں تھا تو اس نے پھر یہ موجود کر دیا۔

قدرت نے آئن سٹائن Albert Einstein (1879-1955) اور دہقان کو ایک مقام پر لا کھڑا کیا

یہ وہ مقام ہے جہاں عزیزانِ من! آج آئن سٹائن بھی یہ کہہ رہا ہے کہ جب ہم (کائنات کے ماخذ) Origin of the Universe پہ پہنچتے ہیں کہ اس کائنات کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟ کیسے ہوگئی؟ وہ کہتا ہے کہ یہاں ہم بھی اسی طرح سے ششدر و حیران کھڑے رہتے ہیں' جس طرح سے ایک ہل چلانے والا دہقان۔ اس مقام پہ پہنچ کے ہم میں اور اس میں کوئی فرق نہیں رہتا اور جس مقام پر آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے یونان کے حکماء تھے' وہیں آج ہم کھڑے ہیں۔ یونان کے وہ حکماء یہ کہتے ہیں کہ اس سے پیچھے علم انسانی جا ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیا جواب دیا گیا ہے؟ یہ جواب کہ علمِ انسانی اس سے پیچھے جا ہی نہیں سکتا۔ یہ جواب اُس زمانے کے جاہل عرب کو ہی نہیں دیا گیا' آج بھی یہی ہے۔ آج بھی آپ کے ہاں جو سب سے بڑا منکر ہے' جسے آپ آخرت کا انکار کرنے والا کہتے ہے' آج بھی جو آپ کے ہاں سب سے بڑا Scientist ہے' جو ہر بات کو دلیل سے مانتا ہے' اس سے بھی یہ کہیے کہ جواب دیجیے۔ مَن يُّعِيۡدُنَا (17:51)۔ کون دوبارہ Disintigration کے بعد پیدا کرے گا؟ وہ اسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کے اعتراض پر حیران و ششدر کھڑا ہے' جس طرح کائنات کی ابتداء کی علت و معلوم کرنے پر کھڑا تھا۔ اس کا قرآن نے جواب دیا کہ قُلِ الَّذِىۡ فَطَرَكُمۡ (17:51)۔ بتا دو کہ وہ کرے گا' جو تمہیں Nothingness سے Being میں لے آیا تھا' جو تمہیں اس حالت سے وجود Being میں لے آیا جب کہ کچھ بھی نہیں تھا' ہر طرف معدوم ہی معدوم Nothingness تھا۔ یہاں' موت کے بعد' تو پھر بھی کچھ موجود ہے۔ کہیے اس دلیل میں یہ قوت نہیں ہے؟ پوچھے کسی Scientist سے کہ کیا اس دلیل میں وزن ہے کہ نہیں؟ یہ ہے وہ جواب عزیزانِ من! کہ جس سے انکار ہی نہیں ہوسکتا۔ خدا کا انکار کرنے والا بھی یہاں پہنچنے کے بعد بے بس نظر آئے گا۔ ٹھیک ہے وہ یہ نہیں کہے گا کہ خدا نے یہ کہا ہے یا خدا نے یہ کیا ہے' لیکن وہ یہ ضرور کہے گا کہ یہاں پہ آ کر ہم بے بس ہیں۔ فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہماری ساری سائنس یہاں پہ آ کر ختم ہوگئی۔

---

[1] ٹوٹ کر' ریزہ ریزہ ہو کر' شق ہو کر' پھٹ کر' الگ ہونا [2] وجود میں لانا

Marfat.com

یہ ساری کائنات علت و معلوم کا ہی ماحصل نہیں

آخر کار سائنسدان بھی یہی کہے گا کہ یہ تو ہم نہیں بتا سکتے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کس نے کیا؟ لیکن یہ بات ایسی ہی ہے جو ہمارے اس سلسلہ علت و معلول میں نہیں آتی۔ یہاں ساری سائنس ختم ہو گئی۔ سائنس کا دعویٰ یہ تھا کہ ہر Effect کے لیے ایک Cause ہوتا ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ کچھ موجود ہو۔ اس سے پیشتر کچھ موجود ہونا چاہیے۔ اس میں' اِس Being میں' تغیرات کے ذریعے سے نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مقام کہ "کچھ موجود نہ ہو اور وہاں کچھ موجود ہو جائے" بڑا ہی حیرت کدہ ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہاں ہم حیران و ششدر کھڑے ہیں' یہاں ہم مبہوت ہیں۔ عزیزانِ من! آج ہم میں اور ان میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ پیدا کرنے والا یہی ہے' جس نے یہ سب کچھ پہلی دفعہ پیدا کیا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ جس نے بھی یہ کیا ہے' اس کو کچھ بھی کہہ لو اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہم "نہیں کہہ سکتے کہ کیسے ہو گیا"۔ ٹھیک ہے' پھر اس کے بعد بھی جب پیدا ہو' تو کہہ دینا کہ "ہم نہیں کہہ سکتے"۔ تم اور ہم میں فرق اتنا ہی ہے۔ **فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ** (17:51)۔ کہنے لگا: اس کے بعد جب یہ کہہ دو کہ کہیے سرکار! اسے مانتے ہو کہ Originally یہ چیز پہلی دفعہ وجود میں آ گئی جب کہ اس سے پہلے کوئی شے وجود میں نہیں تھی۔ ہے کوئی ایسا جو یہ کچھ یوں کر دے؟ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان کے پاس دلیل تو کوئی ہوتی نہیں۔ لہٰذا **فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ** (17:51)۔ وہ سر مٹکاتے ہوئے یونہی چلے جاتے ہیں۔ کیا لفظ قرآن لے آتا ہے۔ بعض اوقات کسی سے کہیے کہ یہ جو اس طرح کی کیفیت ہوتی ہے' وہ کیا چیز ہے؟ لیکن قرآن یہاں ایک اور چیز لے آیا۔

اس زندگی کے بعد کی زندگی حیاتِ نو ہو گی' خلقِ جدید ہو گی

قرآن کریم جس طرح انسان کی اس زندگی کے بعد' اس کی اگلی زندگی کے متعلق یہ ساری بات کرتا ہے' اسے وہ حیاتِ نو کہتا ہے' خلقِ جدید کہتا ہے' نشاۃِ ثانیہ کہتا ہے۔ آپ اپنی زبان میں بھی یہ الفاظ قوموں کے لیے بولتے ہیں: مردہ قومیں' زندہ قومیں۔ قوم کو نئی زندگی مل گئی' حیاتِ تازہ مل گئی' نشاۃِ ثانیہ ہو گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپ یہ سارے الفاظ قوموں کے متعلق بولتے ہیں' یہ قرآن ہی کی اصطلاحیں ہیں۔ قرآنِ کریم مردہ قوموں کو حیاتِ نو عطا کرنے کے لیے بھی یہ لفظ لاتا ہے اور یہی ہے وہ جگہ' جہاں آ کے ہم غلطی کھا جاتے ہیں' ہم گھپلا کر دیتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآن کے ہر مقام پر جہاں بھی حیاتِ ثانیہ' حیاتِ نو کے یہ الفاظ آتے ہیں تو ہم اس کو ہر جگہ مرنے کے بعد کی انسانی زندگی تک ہی محدود کر دیتے ہیں' اور بیشتر مقامات ایسے ہیں کہ جہاں یہ معنی فٹ نہیں بیٹھتے۔ ہمارے ہاں کے ان مترجم یا معنی بیان کرنے

Marfat.com

والوں کو تو یہ خیال ہی نہیں ہوتا' ہمت ہی نہیں ہوتی کہ یہ دیکھیں کہ آیا یہ معنیٰ فٹ بیٹھتا ہے یا نہیں بیٹھتا لیکن جو قرآن کو قرآن کی رو سے سمجھتا ہے' اسے تو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے اس کے اندر یہ چیز فٹ بیٹھتی ہے۔ وہاں ان مترجمین کی سی یہ چیز نہیں ہوتی۔ اگر ان مقامات پہ غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ یہاں قرآن ان الفاظ کو' اس کی حیاتِ ثانیہ کے متعلق لاتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں خود صدرِ اول کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے۔ اول تو یہ کہ پورے عرب ہی' ایرانیوں اور رومن کے مقابلے میں' مردہ اقوام میں شمار ہوتے تھے۔ زندہ قوموں میں' اس زمانے میں اسلام سے پہلے ان کا کہیں ذکر ہی نہیں آتا۔ قوم کی حیثیت سے یہ کہیں مشہور ہی نہیں تھے' متعارف ہی نہیں تھے۔ یہ اسی طرح آباد تھے جیسے وہ جنگلی خانہ بدوش قبائل ہمارے ہاں کے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں کے' ایک دو سارے شہر تھے۔ ان میں سے ایک جگہ شہر مکہ تھا جو ان کے لیے کعبہ کا تقدس تھا۔ اس کی بناء پر اور وہ بھی اس وجہ سے کہ یہ شاہراہ پہ واقع تھا جو کہ ایک تجارتی شاہراہ تھی' ان کے ہاں تجارتی منڈیاں تھیں۔ لیکن دنیا کی سلطنتوں میں' حکومتوں میں' قوتوں میں' اقتدار میں' شان و شوکت میں' ان کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہ قومیں ان عربوں کے ساتھ روابط رکھنا تو ایک طرف' ان کے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ ذلت سمجھتی تھیں۔ رومن ایمپائر [1] Roman Empire کی کیفیت تو آج بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ سامنے آنے سے وہ کیا بنتی ہے۔ ان کا یہ دبدبہ اور طنطنہ ان کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ پہلے تو یہ کہ پوری عرب قوم کے ساتھ ان کا یہ وطیرہ تھا اور دوسرا یہ کہ اس قوم میں سے جنہوں نے شروع شروع میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر ایک نئی جماعت کی تشکیل کی' وہ بھی بالعموم ان سے بنی' جو ان میں بہت زیادہ غریب' نادار' ضعیف اور کمزور تھے۔ بالعموم میں نے اس لیے کہا ہے کہ ان میں اِستِثنَا تھی' اس میں اچھے اچھے اکابرین بھی شامل ہوئے تھے لیکن من حیث الجماعت یہ کمزوروں کی ایک جماعت تھی۔ پھر یہ کہ جہاں مدینہ میں یہ پناہ لینے کے لیے گئے تھے یا اپنے پروگرام کی دوسری کڑی کی ابتداء کرنے کے لیے مدینہ میں گئے تھے۔ وہاں کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ وہاں بڑے کمزور تھے' یونہی چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔ وہاں یہودی غالب تھے۔ یہ کمزوروں کی ایک جماعت تھی' اس طرح یہ تھی ایک جماعت' جس کو زندہ قوموں کے صف میں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا' چہ جائیکہ ایرانی اور رومن اور چہ جائیکہ قریشِ مکہ اس جماعت کو جو مدینے میں جا کے بنی تھی' کبھی خاطر میں لاتے۔ وہ تو انہیں مردہ کہا کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کا اس قدر نامساعد فضا اور ناگفتہ بہ حالات میں حیاتِ نو کی طرف آغازِ سفر

یہ مردہ قوم! ذرہِ ناچیز و تعمیرِ بیابانِ نگر! دعویٰ ان کا یہ کہ ''یاد رکھو کہ ہمارے ہاتھوں تم تو ایک طرف رہے' نہ ایران کی سلطنت باقی

1. Roman Empire was the land governed by the ancient Romans. In AD 395, it was divided into East Roman Empire or Byzantine Empire and Western Roman Empire. It is the government of Rome and its lands from 27 BC by Augustus (63 BC – AD 14) and the later emperors (Reader's Digest, 1990, p. 1389).

Marfat.com

رہے گی، نہ رومن ایمپائر کی تہذیب باقی رہے گی' ہر جگہ ہمارا نظام قائم رہے گا' قائم ہو کر رہے گا۔'' وہ مذاق اڑاتے تھے' ان پہ ہنستے تھے کہ تمہیں اس قسم کی حیات نو' حیات تازہ' جسے آپ کہتے ہیں یہ تھے وہ الفاظ' کیسے حاصل ہوگی؟ یہ کہتے تھے کہ ہر ''قوم پیدائش سے ہی اپنے ساتھ یہ کچھ نہیں لاتی''۔ ٹھیک ہے کہ قومیں اپنے اسلاف کی دولت مند قوموں کی جہت سے ان اقوام کی وارث بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں اقوام کی زندگی میں آتی ہیں۔ جیسے ایرانیوں کے ہاں آ گئیں' رومن کے ہاں آ گئیں۔ انہوں نے کہا: ایران کا بتاؤ' جب شروع میں تم بھی ہمارے جیسے تھے' تو یہ ثروت وقوت تمہیں کیسے مل گئی تھی؟ مل جاتی ہے۔ تو یہ ان سے کہا کرتے تھے کہ یہ دلیل کچھ نہیں ہے کہ ہم اس وقت کمزور ہیں' ہمیں زندگی نہیں مل سکتی۔ اور یہ کہتے تھے کہ اس قانون کے مطابق یہ زندگی مل سکتی ہے' حیاتِ تازہ مل سکتی ہے' یہ انقلاب آ سکتا ہے۔ آج جو تم اتنے دبدبے اور طنطنے کے مالک بنے پھرتے ہو' سرنگوں ہو جاؤ گے اور ہم' جنہیں تم کسی حساب شمار میں ہی تسلیم نہیں کرتے' اسلام کے نظام کے تحت تمکن فی الارض کریں گے۔ یعنی آپ دیکھیے کہ یہ کچھ اس زمانے میں کہا جا رہا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے خطوط ایران اور رومن ایمپائر کے نام

عزیزان من! صرف قریش ہی کو یہ نہیں کہا کہ ایک دن تم سرنگوں ہو کے آؤ گے۔ ایران اور رومن ایمپائر کے بادشاہوں کو یہ خط لکھے کہ '' تمہارے ہاں کے محنت کشوں اور کاشتکاروں کے اوپر جو مظالم ہو رہے ہیں' ہم دیکھ رہے ہیں: رسول اللہؐ۔ اس میں ایک ہی تو فقرہ ہے کہ ان پہ ظلم ہو رہا ہے۔ یہ دیکھیے کہ وہاں مدینے میں بیٹھے ہوئے' اس حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو لکھا یہ جا رہا ہے کہ '' ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے ہاں کے محنت کشوں' غریبوں کاشتکاروں کے اوپر بڑے مظالم ہو رہے ہیں۔ ان سے باز آ جاؤ' ورنہ تمہیں ان کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ بتاؤ باز آتے ہو یا نہیں۔ یہی ایک فقرہ ہے ان خطوط کے اندر۔ ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر۔ ارے دیکھو تو کہ اس حیثیت میں بیٹھا ہوا یہ شخص یہاں سے ان لوگوں کو للکار کے کہہ رہا ہے کہ چھین لوان سے۔ یہ تھا ایمان۔ یہ تھا ایمان نشاۃ ثانیہ کے اوپر' اس دنیا کی زندگی میں۔ یہ تھا ایمان بالآخرت' بعد موت کا ایمان تو یقینی جزوِ ایمان ہے۔ یہاں جو زندگی کا ایمان ہے' اسے دیکھیے کہ ان سے یہ کہا جا رہا تھا' مکہ کے قریش سے بھی یہی کہا جا رہا تھا' مدینے کے ان یہودیوں سے بھی یہی کہا جا رہا ہے۔ یہ ہے کیفیت ان کے ایمان کی' اس للکار پر وہ کہنے لگے کہ وَيَقُولُونَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (17:51)۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انقلاب کب واقع ہوگا؟ کہا کہ اس کی تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ انقلابوں کی تاریخیں متعین نہیں ہوا کرتیں لیکن ہو سکتا ہے کہ قریب ہی ہو' انقلاب دور نہ ہو۔ قوموں کی زندگی میں تو یہ اتنا قریب واقع ہوا ہے کہ انسانیت کی تاریخ اتنی جلدی' اتنے چھوٹے عرصے میں' اتنے عظیم انقلاب کی مثال ہی پیش نہیں کر سکتی۔

ہجرت کا یہ واقعہ ایک پروگرام کے تابع ہوا تھا

عزیزانِ من! مدینے کی زندگی کی ابتداء تو اس طرح سے ہوئی۔ لیکن عام تاریخ میں جتنے بھی ہجرت کے واقعات ہیں' مورخین

Marfat.com

انہیں Fright کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "بھاگ کے گئے تھے' عام یہاں سے فرار ہو کے گئے تھے' جان بچا کے بھاگے تھے۔" عام ہجرت کو وہ یہی کچھ کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی! اس حیثیت سے گئے تھے۔ مگر آگے تو اس ہجرت کے ساتویں سال مکہ فتح ہو کے سارے عرب میں ان کی مملکت قائم ہو گئی تھی اور چند ہی سالوں کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ پورے کا پورا ایران اور تمام رومن ایمپائر کا حصہ دیکھیے کہ ان کے ہاتھوں میں تھا اور پھر یہ کہ اپنی زندگی کے متعلق یہ خود بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس سے زیادہ' قریب تر' اور کم وقت میں برپا ہونے والا انقلاب کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! ہسٹری اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی' اتنی جلدی یہ انقلاب! یہی تھا وہ انقلاب جسے قرآن نے کہا ہے کہ **عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنَ قَرِيۡبًا** (17:51)۔ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی ہو۔ کون سا دن ہے؟ **يَوۡمَ يَدۡعُوۡكُمۡ فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ** (17:52)۔ فتح مکہ کی شکل میں وہ دن آ گیا۔ بات شروع ہوئی تھی کہ کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ جو خدا کے پروگرام کو حمد میں لانے کے لیے سرگرداں نہ ہو' یہاں کہا: کہ یاد رکھو! **فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ** (17:52)۔ اس کی حمد و ستائش کے مجسمے بنے اس کی دعوت پر لبیک کہو گے۔

ایران کی ہزار سالہ اور رومن کی صدیوں پر پھیلی ہسٹری (History) کو بدل کے رکھ دیا

کہا: کہ یہ دن قریب ہے' جب تم کو بھی بلایا جائے گا اور تم سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے آ ؤ گے اور کہو گے کہ ہاں ہم بھی اس نظام کو تسلیم کرتے ہیں' اس میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ یہ نظام خدا کے پروگرام کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لیے قائم کیا جا رہا ہے۔ پھر کہا کہ وہ دن قریب ہے۔ باقی رہا تمہاری مخالفتوں کا لمبا عرصہ جسے تم یوں شمار کر رہے ہو تو سنو! ایران کی ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی اس کی اپنی ہسٹری اور رومن ایمپائر کی صدیوں کے اوپر پھیلی ہوئی' اس کی اپنی ہسٹری کو نگاہِ عبرت سے دیکھو' یہ بات سمجھ میں آ جائے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَتَظُنُّوۡنَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا** (17:52)۔ کچھ وقت گذر جانے کے بعد یہ باتیں خوابِ پریشاں ہو جائیں گی۔ اور پھر تمہیں نظر آئے گا کہ صاحب! وہ عیش کے دن تو یونہی گذر گئے۔ وہ دن بھولی بسری ہوئی داستانیں بن جائیں گے۔ قرآن نے کہا ہے: **وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ** (23:44)۔ اور کہانیاں رہ جائیں گی' **وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ** (23:44)۔ صرف ان کی داستانیں رہ جائیں گی۔ خود تم اس کے بعد یہ کہو گے کہ جی! وہ ٹھیک ہے' وہ تو چند دن کی بات تھی' آئی گئی ہوئی' وہ سلسلہ ختم ہو گیا' اب تو یہی ہے' جو کچھ بھی یہاں ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 52 تک آ گئے' 53 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ.

Marfat.com

گیارھواں باب: سورة بنی اسرائیل (آیات 53 تا 60)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ
يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝53 رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ
يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝54 وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا
بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝55 قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا
يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝56 اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ
الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝57
وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي
الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝58 وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ
النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝59 وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ
وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ
فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝60

عزیزانِ من! آج اگست 1975 کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 53 سے ہو رہا ہے۔ 17:53۔ اس سورۃ میں اس سے پہلے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سی پُرحکمت باتیں معاشرتی آئین و آداب وضوابط کے مطابق چلی آ رہی تھیں۔ اسی سلسلے میں یہاں ایک اور بنیادی بات کو بیان کیا گیا ہے کہ وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (17:53)۔ اور یہ بڑی جامع چیز ہے۔ ''اے رسول! میرے بندوں سے کہہ دو کہ......'' یہاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ مخاطب انہیں کیا گیا ہے، جنہیں میرے بندے کہا گیا ہے۔ ویسے تو ساری مخلوق خدا کے بندے ہیں لیکن جب یہ کسی کو اپنا ''عبد'' کہہ کے پکارتا ہے تو یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو خدا کے احکام کی اطاعت میں پورے اترتے ہیں۔ وہی اس کے ''عبد'' ہوتے ہیں اور یہی شرفِ انسانیت کی انتہا ہے یعنی خدا کی ''عبدیت'' میں کمال تک پہنچنا۔ اسی وجہ سے قرآنِ کریم نے خود نبی اکرم ﷺ کو اور اپنے رسولوں کو ''عبد'' کہہ کے پکارا ہے تو گویا یہ ''عبد اور عبد ہونا'' شرفِ انسانیت کا بلند ترین خطاب ہے، جو بارگاہِ خداوندی کی طرف سے عنایت ہوتا ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا

Marfat.com

ہے کہ ''عبد ہونا'' شرفِ انسانیت کی انتہاء ہے تو اس میں بھی ایک نکتہ مضمر ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ جب انسان صرف خدا کا عبد ہوتا ہے تو پھر وہ دنیا میں کسی اور کا عبد نہیں ہوتا۔ غلامی کی ہر زنجیر' خدا کا عبد ہونے کی بناء پر کٹ جاتی ہے اور یہ ایک ہی کا عبد ہوتا ہے۔ اسی لیے تو وہ انہیں اپنا عبد کہہ کے پکارتا ہے کہ میرے سوا تم تو اب کسی اور کے عبد نہیں رہے۔ اسی لیے تو اقبالؒ (1877-1938) نے قرآن کے متعلق کہا ہے:

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے

پرستش اور عبادت میں بنیادی فرق ہے

وہ انسان ہر نوع غلامی کی عبدیت سے آزاد ہو جاتا ہے' جو ایک خدا کا عبد بنتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ ''عبدیت'' یا جسے ''عبادت'' کہا جاتا ہے' یہ خدا کی محکومیت ہے۔ اس کے معنی ''پرستش'' ہے ہی نہیں۔ پرستش کا تصور تو مذہب کا دیا ہوا ہے' دین کا تصور محکومیت کا تصور ہے' حقائق کا تصور ہے' فرماں پذیری کا تصور ہے۔ اور وہ کوئی خاص شعبہ نہیں ہے جس کے اندر خدا کی عبادت کی جائے۔ ہمارے ہاں تو جب یہ کہتے ہیں کہ بڑا عبادت گذار ہے تو آپ کے ذہن میں ایک خاص تصور آتا ہے کہ یہ ساری ساری رات عبادت میں گذار دیتا ہے۔ تو اس میں آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی کوئی نفل پڑھنے لگ جاتا ہے' کبھی تسبیح کی گردش رکھتا ہے۔ یہ مذہب کی دنیا میں پرستش کا تصور ہے۔ عبادت کا نہیں ہے۔ عبادت کا تصور تو خدا کی محکومیت میں ہے۔ بس یہی ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔

ہماری عبادت گاہوں کی اصلیت اور باہر کی زندگی

یہی دو تین چیزیں ہیں' جسے ہم عبادت کہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ پرستش ہوتی ہے اور ہماری عبادت گاہ تو پھر پرستش گاہ ہوئی یعنی یہ ایک خاص مقام ہے' جہاں پہ عبادت ہوتی ہے اور جونہی آپ نے وہاں سلام بھیج کے دعا مانگی اور جوتا پہنا' اگر وہاں محفوظ ہے' اور باہر نکلے تو بس عبادت تو عبادت گاہ میں ختم ہوگئی۔ یہ باہر کی دنیا تو اب عبادت گاہ نہیں ہے۔ اب باہر نکلے تو آپ اس اعتبار سے خدا کے عبد نہ رہے اور جب اِس ایک کے عبد نہ رہے تو پھر دنیا میں قدم قدم کے اوپر مختلف خداؤں کی عبودیت کی زنجیر کے حلقے آپ کی گردن میں ڈلنے شروع ہوگئے۔ خدا کی عبدیت کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ہر انسان' ہر نوع کی غلامی سے' آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اس ایک آستاں کے اوپر سجدہ ریز ہونے سے' آدمی دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹوں سے سرفرازانہ' قلندرانہ گذر جاتا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

تو ایک اللہ کا عبد ہو جانا' ساری دنیا کے اندر سرفرازی اور سربلندیوں کا سزاوار قرار پا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے خصوصیت سے یہاں ''عبادی'' کہہ کے پکارا ہے۔ وہ گرامی قدر ہستیاں جو انسانیت کے معراجِ کمال پہ پہنچی ہوئی تھیں' ان میں سے بڑے پیار اور

Marfat.com

محبت سے ہر رسول ﷺ کو ''عبد'' کہا ہے اور نبی اکرم ﷺ کو بھی خاص طور پہ ''عبدہ ورسولہ'' کہا جو ہم کلمہ شہادت میں دہراتے ہیں۔ محمدؐ کو ''عبدہ ورسولہ'' ہی کہا ہے۔ تو یہ عبدیت تو بہت بڑا مقام ہے۔

اصل میں احسن، حسن یا حسین کا لفظ متوازن اعتدال کے معنوں میں استعمال ہونا چاہیے

کہا کہ میرے بندوں سے کہہ دو: یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (17:53)۔ اس انداز سے کہنے سے بہت ہی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، بہت ہی بڑی بات ہے جو اس طرح خاص طور پہ یہ کہا ہے کہ ''میرے بندوں سے یہ کہہ دو''۔ کیا بات کہہ دو؟ کہہ دو کہ ''باتیں کیا کریں''۔ اب یہاں لفظ ''احسن'' ہے۔ بات کریں تو ''احسن'' کریں۔ جس بات میں حسن ہو، توازن ہو، اعتدال ہو، وہ بات کریں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں باتوں کے لیے اردو زبان میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ ہم اردو میں ''حسین باتیں'' نہیں کہتے۔ اصل میں دشواری زبان کی ہے۔ اردو زبان، جو ہمارے ہاں رائج ہوئی ہے، میں غزل کی وجہ سے حسین، حسن، عشق اور اس قسم کے اور الفاظ آتے ہیں۔ ان الفاظ نے خاص معنی کا رنگ پہن رکھا ہوتا ہے مثلاً جب ہم حسین کہتے ہیں تو وہ اس معنی میں نہیں ہوتا کہ ہم اسے متوازن کہہ سکیں لیکن باتوں کے لیے کہتے ہیں کہ ان میں ''توازن ہو'' اعتدال ہو۔ اردو زبان میں خاص کر غزل کی وجہ سے حسین کے معنی اور ہوتے ہیں، اسی طرح عشق کے بھی اور معنی ہوتے ہیں۔

زبان دانی کے سلسلہ میں اقبالؒ کا احسان

خدا اقبالؒ (1877-1938) کا بھلا کرے کہ اس نے اس قوم کی ان تصورات سے جان چھڑائی۔ اس نے اپنی شاعری میں ان الفاظ کو اور معنی پہنائے۔ چونکہ وہ شاعری اتنی زیادہ بڑی اونچی اور اتنی زیادہ معنی خیز ہے کہ قلب ونگاہ پر چھا جانے والی ہے، اس لیے ان کی شاعری کے یہ الفاظ اب دوسرے معنی میں استعمال ہونے لگ گئے اور ان شعروں کو بھی ہم گھروں میں پڑھنے لگے، ورنہ ہم اپنے شریف گھروں کے اندر جوان بہو، بیٹیوں کے سامنے کبھی عشق کا لفظ نہیں کہہ سکتے تھے۔ قرآن نے جب یہ بات کہی ہے، آپ پھر مجھے کہیں گے کہ یہ پنجابی کو ضرور لے آتا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ لانی ہی پڑتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس زبان میں یہ بات موجود ہے۔ ہاں تو قرآن نے جب باتوں کے لیے کہا کہ ان میں توازن رکھو، اعتدال رکھو، پنجابی میں یہ یوں ہے: ''سوہنیاں سوہنیاں گلاں کریا کرو۔ اے اوہدا ترجمہ اے۔ بلکہ جس گل اچ تسی آخر تے Agree کر جاؤ، تے نظر آجائے کہ ہاں بڑی ٹھیک ہے، او ساڈے محاورتاوی اونوں کیندے نیں، ہاں ہاں جی بڑی سوہنی گل اے''۔ [1] یہ ہے وہ بات کہ جس میں حسن ہو اور قرآن نے تو ''احسن'' کہا ہے، جسے آپ حسین ترین کہیں گے۔

---

[1] ۔سوہنی سوہنی...... پیاری پیاری، میٹھی میٹھی، توازن بدوش...... باتیں کیا کرو۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔ بلکہ یوں بھی ہے کہ جس بات پہ آپ انجام کار متفق ہو جائیں اور نظر آنے لگے کہ ہاں یہ بات بڑی صحیح ودرست ہے، وہ ہمارے ہاں محاورۃً کہی جاتی ہے کہ جی ہاں! یہ بڑی سوہنی، پیاری، میٹھی، توازن بدوش بات ہے۔

Marfat.com

''گل کرو تے ایہو جئی کرو' سوہنیاں سوہنیاں گلاں کریا کرو''۔ ❶ قرآن تو الفاظ سے بات کو سمجھاتا ہے کہ یہ حسین باتیں ''اے سوہنیاں گلاں'' ❷ کونسی ہونی چاہئیں۔ اگلے فقرے میں اسی آیت میں' ساتھ ہی یہ بات کہدی کہ ایسی باتیں نہ کیا کرو جن میں :اِنَّ الشَّيۡطٰنَ يَنۡزَغُ (17:53)۔ خدا کی راہ سے بہکانے والی قوتیں ہوں' جو ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ تم میں بگاڑ اور فساد پیدا ہو جائے۔

شیطان کا عمل' بات کرنے کا انداز

تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ شیطان کرتا کیا ہے؟ یہاں قرآن نے ''نزغ'' کا بڑا عجیب لفظ استعمال کیا ہے۔ ''نزغ'' کے معنی ہوتے ہیں: ''سوئی چبھو دینا''۔ یہاں پھر وہی بات آئی کہ اردو زبان میں بات وہ نہیں بنتی جیسے پنجابی میں بنتی ہے۔ ''فیر ایہو جیاں گلاں کردا اے سوئی والیاں'' ❸ یہ ہے اس کا ترجمہ: ''اکسا دینا کسی کو دوسرے کے خلاف''۔ عربوں میں اس کے عام معنی ہوتے ہیں: ''معاشرے میں انتشار پیدا کر دینا' فساد پیدا کر دینا''۔ لیکن یہ کچھ اس انداز میں ہو جیسے کسی کے خلاف سوئی چبھو دی ہے' وہ کچھ اس انداز میں باتیں بتائے اور سوئی چبھو کے الگ ہو جائے۔

شیطان تو کہا ہی وہاں جاتا ہے' جہاں کوئی محسوس پیکر سامنے نہ ہو لیکن وہ سوئی بری طرح سے چبھ جائے۔ اور پھر اگر غبارے میں سوئی چبھ جائے تو؟ تو کہا کہ یاد رکھو! یہ جو انسان کے جذبات ہیں اگر تم انہیں وحی الٰہی کے تابع نہیں رکھو گے' تو ان سے اس قسم کی کیفیت پیدا ہو جائے گی گویا کہ وہ بات چبھ جانے والی ہوگی۔ اس لحاظ سے احسن بات وہ ہوگی جو کسی کو چبھے نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں دوسرے کی تردید بھی ہوتی ہے' تغلیط بھی ہوتی ہے' تصحیح بھی ہوتی ہے' عدمِ موافقت بھی ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ کہا: یہ سب کرو لیکن بات کا انداز شریفانہ چاہیے' اس میں بازاری پن نہ آئے' اس میں ابتذال نہ آئے۔ ایسی بات کیوں آئے کہ بات تو تم کرو ناصحانہ' لیکن ہو وہ چبھ جانے والی۔'' اور یہاں ہمارے ہاں تو ہر نصیحت میں ''چوبھ ہی چوبھ'' ❹ ہوتی ہے۔ یہ حضرات جب کبھی کسی کونے اور خاص طور پر منبر پہ کھڑے ہوئے' نصیحت کرتے ہیں' تو اس میں تو پوچھو ہی نہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سارے دوسروں کے خلاف نفسیاتی Complexes ہوتے ہیں جن میں ایک تقدس کے لباس میں سب کچھ کہا جاتا ہے' ان میں چبھن ہی چبھن ہوتی ہے اور اب پھر آگے بات نصیحت کی آ گئی۔

---

❶ بات کرو تو ایسی ہی کرو: سوہنی' پیاری' شیریں' توازن والی۔

❷ پیاری' میٹھی'...... توازن بدوش باتیں' اعتدال لیے ہوئے۔

❸ یہ پھر وہی چبھنے والی باتیں کرتا ہے۔ جس سے انسان تڑپ اُٹھے۔

❹ چبھن ہی چبھن۔

Marfat.com

نصیحت اور سوئی چبھونے کا مفہوم

عربوں کے ہاں جو ''نصح'' ہے' جسے آپ نصیحت کہتے ہیں' وہ سوئی ہے۔ عرب ''نصح'' سوئی کو کہتے ہیں لیکن یہ صرف اُس سوئی کو کہتے ہیں جو کسی کے چاک گریبان میں سلائی کردے' اس میں رفو کردے' کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دے۔ یہ سی دینے والی جو سوئی ہے' یہ ہے وہ جسے نصیحت کہا جاتا ہے' یعنی نصیحت وہ ہے جو کسی کے چاکِ داماں کو رفو کردینے والی ہو۔ اور ایک سوئی وہ ہوتی ہے' جسے شیطان کی طرف سے کہا ہے کہ ''یہ چبھنے والی باتیں نہ کیا کرو'' ۔ ایک وہ سوئی جو کسی کے چاک گریباں میں رفو (Darning) کردے اور دوسری سوئی وہ جو کسی کا گریباں چاک کردے۔ ایک بات وہ جو ثوبِ حیات کو رفو کردے اور دوسری وہ جو قلب پرسوز کو سرکش بنا کے دوسروں کے دامن چاک چاک کردے۔

اس لیے قرآن نے کہا: اِنَّ الشَّیۡطٰنَ کَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا (17:53)۔ یاد رکھو! یہ تو ہم نے تمہیں پہلے دن کہہ دیا تھا کہ نوعِ انسانی کا سب سے بڑا دشمن' انسان کے وہ جذبات ہیں' جو وحی سے بے باک اور سرکش ہو جائیں۔ اور اس کے بعد تو پوچھیے نہیں کہ وہ وحی خداوندی سے بے باک اور سرکش جذبات والا انسان کیا کچھ کرتا ہے۔ وہ جو میں اکثر دہرایا کرتا ہوں کہ ابلیس نے چیلنج میں کیا کہا تھا' یہ اسی جگہ ذرا آگے چل کے آرہا ہے۔ بہر حال یہ کہا کہ باتیں کیا کرو تو احسن طریق سے کیا کرو' چبھنے والی بات نہ کیا کرو۔

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ یوں تو یہ ایسی چیزیں ہیں' جنہیں آپ کہیں گے کہ یہ روزمرہ کی باتیں ہیں' جو قرآن نے کہی ہیں لیکن اگر معاشرہ ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ بھی عمل پیرا ہو جائے تو آپ دیکھیے گا کہ ہم سے کتنی بڑی بڑی خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ بہت سی خرابیوں کا مدار ہے' بہت سی خرابیاں اسی مدار Orbit کے گرد گھومتی ہیں۔ ''گلاں ناں ایہو جیاں کریا کرو' سونڑیاں سونڑیاں گلاں کریا کرو''۔ ❶ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِکُمۡ (17:54)۔ خدا یہ باتیں اس لیے کہہ رہا ہے کہ اسے پتہ ہے کہ یہ کن کن راہوں سے آیا کرتا ہے اور کس طرح سے یہ فساد انگیز باتیں کیا کرتا ہے۔

معاشرے کی خوبصورت عمارت انہی اصولوں پر استوار ہوتی ہے

لہٰذا ہم نے یہ ساری باتیں تمہیں معاشرتی اخلاق وضوابط کی بتائی ہیں۔ اِنۡ یَّشَاۡ یَرۡحَمۡکُمۡ اَوۡ اِنۡ یَّشَاۡ یُعَذِّبۡکُمۡ (17:54)۔ اب اس کے بعد اس کا یہ قانونِ مشیت ہے' جو ہم نے یہاں واضح کر دیا ہے۔ اس کی رو سے تم چاہو تو خدا تمہاری نشوونما کا سامان کر دے گا' رحمت کا سامان کر دے گا' تمہارے زخم پر لطافت اور نزاکت سے مرہم لگا دے گا' تمہارے لیے سامانِ نشوونما مہیا

---

❶ ایسی سوئی چبھنے والی باتیں نہ کیا کرو۔ میٹھی' پیاری' پُراعتدال' توازن بدوش باتیں کیا کرو۔

Marfat.com

کردے۔ اور اگر اس قانونِ مشیت کی خلاف ورزی کرو گے تو پھر اس کے ہاں جامع لفظ عذاب کا ہے' وہ "عذاب"، قلبی اضطراب بھی ہے: معاشرے کی تباہی بھی ہے۔ ان تمام چیزوں پر قرآنِ کریم کا یہ ایک لفظ "عذاب" حاوی ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ سے یہ کہا گیا کہ آپ یہ باتیں پہنچاتے چلے جایئے۔ ان باتوں کے پہنچنے کے بعد ہم نے انسان کے اپنے اختیار وارادہ پہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ چاہے تو انہیں قبول کرلے اور چاہے تو ان سے اجتناب برتے۔ قبول کرے گا' تو رحمت (Nourishment) ملے گی۔ اجتناب برتے گا' تو عذاب ملے گا ۔وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ وَکِیۡلًا (17:54). تمہیں ہم نے ان پہ داروغہ بنا کے نہیں بھیجا کہ ہنٹر ہاتھ میں لیے تم ان کے پیچھے پڑے رہو۔ تمہارا کام بات کو پہنچا دینا ہے' سمجھا دینا ہے۔

قرآن کی ایک امتیازی بات

آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ وہ انسان کے اختیار وارادہ (Choice and Will) کو کہیں سلب [1] نہیں کرتا۔ یہی تو حیوانوں اور انسانوں میں امتیازی بات ہے کہ حیوانوں کو اختیار وارادہ نہیں دیا گیا۔ ان کے اندر' جبر کی لگامیں' رکھ دی گئی ہیں۔ وہ اپنی فطرت و جبلت (Nature&Instinct) کے خلاف نہیں کر سکتے۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ یہ کچھ کریں یا نہ کریں۔ لیکن کہا یہ کہ ہم حضور کو نیک و بد سمجھائے جائیں گے۔ یہ نیک و بد کا سمجھانا رسولوں کی وساطت سے' خدا نے اپنے ذمہ لیا۔ رسالت کے بعد نیک و بد کا سمجھانا اس کی کتاب قرآن کریم کی وساطت سے انسانوں کے سامنے آ گیا اور اس کے بعد انسانوں کو چھوڑ دیا کہ "تمہارا جی چاہے یہ کرو' جی چاہے وہ کرو"۔ بچہ بالغ ہو گیا ہے' اب اسے مار مار کے آپ ایک راستے پہ نہیں لا سکتے۔ اسے نیک و بد کا تصور ہی سمجھا سکتے ہیں۔ رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِکُمۡ (17:54)۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کے اندر کیا کیا چیزیں ہیں' جو فساد کا موجب بنتی ہیں' کون کون سی چیزیں ہیں' جن سے زندگی حسین ہو جاتی ہے' خوبصورت ہو جاتی ہے۔ قرآن نے زندگی کا خوبصورت ہونا بھی کہا ہے۔ اس لیے جنہیں ہم نیک عمل کہتے ہیں' وہ تو انہیں بھی حسنات کہہ کے پکارتا ہے۔ خوبصورتی بڑی چیز ہے۔

زندگی بڑی خوبصورت نعمت ہے

قرآن کی رو سے' اگر ہم ان معنوں میں لیں جن میں وہ لیتا ہے کہ اُس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو' زندگی کتنی خوبصورت ہے' تو بات یوں ہے کہ وَرَبُّکَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (17:55). اتنا ہی نہیں ہے کہ ہم تمہارے ہی معاشرے کے متعلق جانتے ہیں کہ کن باتوں سے فساد مچے گا' کون سی باتیں حسین ہیں۔ ہم تو ارض و سماوات میں ہر ایک کے متعلق جانتے ہیں' ذرہ ذرہ کے دل پہ ہماری نگاہ ہوتی ہے لیکن تمہارے بارے میں یہ جاننے کے لیے ہم نے انبیاء کو منتخب کیا ہے۔ اور ان کی وساطت سے ہم نے اپنے علم کو

---

[1] مٹانے کا عمل (Process)' چھین لینا۔

Marfat.com

انسانوں کی طرف منتقل کیا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ کن باتوں سے تمہارے اندر فساد برپا ہوگا۔ یہ جاننا ہماری اپنی ذات تک نہیں رہے گا۔ ہم علمِ الٰہی میں تمہیں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے اور یہ وحی کے ذریعے سے شریک کیا جائے گا' جو انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچی ہے۔ یہ بھی ایک چیز ہے۔

کشف والہام خدا کی طرف سے ملنے والی بات نہیں

جیسا کہ میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' یہ کشف والہام وغیرہ خود انسان کے اپنے ذہن کے نفسیاتی (Psychological) تخیلات ہوتے ہیں' باہر سے ان کا وجود نہیں ہوتا' یہ خدا کی طرف سے علم ملنے والی بات نہیں ہوتی۔ خدا کی طرف سے صرف وحی کے ذریعے علم ملتا تھا جو نبی اکرم ﷺ کی ذات پہ ختم ہو گیا۔لیکن جیسا کہ یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہمیں کشف والہام کے ذریعے خدا کی طرف سے علم ملتا ہے' اس میں اور اس وحی کے ذریعے ملنے والے علم میں ایک بنیادی فرق کیا جاتا ہے۔

کشف والہام اور وحی میں بنیادی فرق ہوتا ہے

یہ بنیادی فرق یہ ہے کہ کشف والہام کی صورت جسے علم ملتا ہے' وہی اس سے لذت آشنا ہو سکتا ہے۔اس کی کیفیت ایک نشے کی سی ہوتی ہے۔نشہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو سمجھا ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے اس علم کے متعلق' جس کے یہ حضرات مدعی ہوتے ہیں' کہا یہ جاتا ہے کہ:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا' تا نہ چشی

اس شراب سے نشہ کیا پیدا ہوتا ہے؟ یہ نشہ تو جب تک تم خود اپنے اندر پیدا نہ کرو گے' دوسرا نہیں بتا سکتا۔ تو ٹھیک ہے اگر وہ تمہاری ہی کشید کردہ شراب ہے' نشہ بھی تم تک ہی رہنا ہے تو صاحب! مجھے اس سے کیا تعلق ہے! اس میں انسانیت کے لیے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس علمِ خداوندی جو انبیاء کرام کی وساطت سے ملتا ہے تو انہیں علم ملنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** (5:67)۔ یہ علم تمہاری ذات کے لیے مختص نہیں ہے' تم تو صرف اس کا ایک ذریعہ اور واسطہ ہو' اس کو آگے بھی پہنچاؤ' تو رسول کا فریضہ علمِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے اور یہ بہت بڑا فریضہ ہے۔اس کے لیے نبی پر ایمان لانے کی' وحی پر ایمان لانے کی' ضرورت پڑتی ہے تو یہ علمِ الٰہی ہے' جو ان راستوں سے ہم تک پہنچتا ہے اور اسی لیے یہاں کہا کہ جو کچھ تمہارے معاشرے میں تمہاری ضرورتیں ہیں' ہم جانتے ہیں' اورارض وسماوات کے اندر' ذرہ ذرہ کے دل کی حرکت کو پہنچانتے ہیں اور اسی لیے ہم نے انبیاء کرام کو بھیجا۔

دنیائے عرب میں انبیاء کی بعثت

انبیاء کرام کی بھی کیفیت یہ ہے: **وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا** (17:55)۔ اور

Marfat.com

قرآن کریم میں کئی ایک اور مقامات پہ بھی یہ بات کہی ہے۔ یہاں دو باتیں ہیں، جو بظاہر متضاد نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136)۔ ہمارا ایمان ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں رسول بھیجے، ہر ملک میں رسول بھیجے۔ ان میں سے بعض کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے تصریحاً ❶ ان کا ذکر کیا ہے اور جو باقی ہیں ان کا ذکر نہیں کیا۔ ذکر انہی کا کیا ہے جن سے قرآن کی اولیں مخاطب قوم یعنی عرب، کسی نہ کسی حیثیت سے متعارف تھے، جانتے تھے۔ لامحالہ یہ وہی انبیاء ہو سکتے ہیں جو عرب اور اس کے گرد و نواح کے ملکوں میں آئے یا ان قوموں میں آئے جنہیں آپ سامی النسل قومیں کہتے ہیں، مثلاً یہ یہودی وغیرہ۔ تو یہ عرب ان سے متعارف تھے۔ قرآنِ کریم میں جن انبیاء کا صراحت سے، نام لے کر ذکر آیا ہے یہ وہی تھے، جن سے عربوں کے کان آشنا تھے۔ یہ ان کی کہانیاں سنتے تھے۔ جن قوموں کی طرف وہ آئے تھے یہ صبح شام ان راستوں پہ سفر کرتے تھے، جہاں ان کی بستیوں کے کھنڈرات ہوتے تھے۔ یہ قومِ عاد کی یا قومِ ثمود کی یا قومِ لوطؑ جو حضرتِ نوحؑ کی قوم تھی، کی بستیاں تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا تو ذکر ان کے ہاں تھا ہی۔ قرآن کریم نے انہی انبیاء کے نام دیئے۔

بڑی صاف سی بات ہے کہ اگر ان اولین مخاطب قوم یعنی عرب سے کہا جاتا کہ مثلاً ہم نے اہلِ چین کی طرف کنفیوشس (Confuciusc. 551-479 BC) ❷ کو بھیجا اور انہوں نے آ کے یہ کہا اور اسکی قوم نے یہ کہا تو یہ ان سے پہلے پوچھتے کہ صاحب! وہ کنفیوشس کیا ہے؟ یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ چودہ سو سال پہلے کا عرب ہے کہ جہاں علم کی کوئی کرن بھی نہیں پہنچی تھی۔ آج بھی ہمارے ہاں کتنے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں: کنفیوشس کیا ہے؟ یہ تو میں نے جو اپنی کتاب مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی لکھی ❸ ہے تو اس میں یہ جتنے مذاہب تھے جن سے کسی کا کان بھی آشنا نہیں تھا، ان کی کتابوں کا بھی یہاں تذکرہ کیا ہے تو مجھ سے بھی لوگوں نے پوچھا: یہ کب ہوئے؟ کہاں ہوئے؟ ان کا تعارف کیا تھا؟ عربوں کو اگر کہا جاتا کہ تاؤ (Tao) بھی تھا، ❹ اور کنفیوشس (Confucius) بھی تھا، تو وہ اسی

---

❶ وضاحت سے، تفصیل سے، تشریح سے۔

❷ Confucius(C. 551 – 279 BC) is a Chinese philosopher, who was a statesman and adviser to various feudal lords. When none would implement his philosophy of one's own moral character, he became a teacher. Many books and sayings have been attributed to him but few can be authenticated (Reader's Digest, 1990, p. 335).

❸ ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں''۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ بعد ازاں دوسرا ۱۹۷۷ء میں، تیسرا، چوتھا اور پانچواں بالترتیب ۱۹۸۹ء۔ ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۶ء (بلا ترمیم) طلوع اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ) لاہور سے طبع ہوا۔ اس کا ۱۹۹۶ء (بلا ترمیم) ایڈیشن ۱۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

❹ تاؤ (Tao) کے متعلق Kwang نے اپنی چوتھی کتاب میں لکھا: ''آؤ میں بتاؤں کہ مکمل Tao کیا ہے؟ اس کا جوہر یکسر تاریکی میں ملفوف ہے۔ اس کی انتہائی بلندی، خاموشی اور عظمت میں ہے۔'' Taotehking میں ہے: ''میں نہیں جانتا کہ Tao کس کا بیٹا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید خدا سے بھی پہلے موجود تھا۔'' [مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں۔ پانچواں ایڈیشن طلوع اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ) لاہور، 1996ء ص۔ 129۔]

Marfat.com

جھگڑے میں پڑ جاتے کہ نہیں صاحب! آپ ایسے ہی باتیں کرتے ہیں۔ ہم نے نہ کبھی سنا' نہ دیکھا اور پھر کسی نے ان کا ہم سے ذکر تک بھی نہیں کیا۔ برادرانِ عزیز! قرآن تو مناظرے کی کتاب نہیں ہے۔ اس نے تو وہ بات پہنچانی تھی' جو کانوں کے راستے دل تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی لیے تو یہ بلیغ ہے' پہنچ جانے والی بات' اتر جانے والی چیز ہے۔ تو ایسی چیزیں ہی نہیں کہی گئیں کہ جن کے متعلق ابتدا ہی میں وہ جھگڑا کھڑا کر دیتے کہ صاحب! یہ ہے بھی یا نہیں ہے؟ تو اس لیے قرآنِ کریم نے انہی انبیاء کرام کا ذکر کیا ہے جن سے وہ عرب لوگ اچھی طرح سے متعارف تھے۔ اس لیے کسی نے ان کے متعلق پوچھا ہی نہیں کہ آپ یہ کیا کہتے ہیں یا یہ قوم کہاں سے آئی ہے؟ ان کا کیا انجام ہوا تھا؟

انبیائے کرامؑ کے درجات میں فرق پیدا کرنے کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے

اب ان کے متعلق ایک بات تو یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے۔ ان کے اس رسول ہونے کی حیثیت میں لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136)۔ ہم کوئی فرق نہیں کرتے' اور قطعاً نہیں کہتے کہ رسالت میں ان کا یہ درجہ فلاں سے نیچے اور فلاں سے اوپر ہے۔ یعنی اب تو ہماری یہ صورت ہے کہ ہم نے خود ہی اپنے ذہن کے اندر یہ فیصلے کر لیے ہوئے ہیں کہ۔ معاذ اللہ۔ کوئی گھٹیا درجے کے رسول تھے اور کوئی بڑھیا درجے کے تھے لیکن ایک اور چیز ہے جس میں مدارج بھی قرآن گنا تا ہے۔ یہاں تو کہتا ہے: لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136)۔ ان کے رسول ہونے میں ہم ایک میں اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ (17:55)۔ جہاں تک ان کے دائرہ تبلیغ' اثر ونفوذ واحاطہ تبلیغ کا تعلق ہے' اس میں فرق تھا۔ کوئی رسول ایک بستی میں آیا۔ اس بستی کی ایک خرابی تھی' اس میں سے ہی اس کا پیغامبر تھا۔ اس نے وہ پیغام آ کے دیا۔ بات بستی تک محدود رہی۔ اس کے بعد یہ چلا گیا۔ ایک اور رسول آیا۔ حضرتِ موسیٰؑ' صاحب ضرب کلیم آئے' اس وقت اتنی بڑی آویزش فرعون جیسی قوم کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہ بھی خدا کا ایک رسول تھا۔ اسی میں بنی اسرائیل کے اندر حضرتِ سلیمانؑ اور داؤدؑ بھی آئے ہیں۔ وہ اتنی بڑی مملکت تھی کہ آج تک تاریخ کے اندر شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داودی ضرب المثل ہوگئی ہے۔ انہی میں حضرتِ ابراہیمؑ بھی آئے۔ وہ جتنے بھی اسلام کے پیرائے میں نام لینے والے ہیں یا خدا کے دین کے جتنے بھی پیروکار ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں خواہ وہ یہودی بھی ہوں' عیسائی بھی ہوں' مسلمان بھی ہوں' وہ (حضرتِ ابراہیمؑ) ان سب کے مورثِ اعلیٰ ہیں' بزرگ خاندان ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ اور پھر آخر میں نبی اکرمؐ ہیں کہ جن کے دائرہ تبلیغ واثر وتعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ قیامت تک کے لیے رسول' ساری دنیا کے لیے رسول ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ جو ان کے دائرہ تبلیغ و اثر ونفوذ کی حیثیت ہے' ان میں فرق ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ رسول ہونے کی جہت سے تو ہم ایک دوسرے میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن ان کے دائرہ اثر وتبلیغ کی اس جہت سے ان میں فرق ہے۔ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ (17:55)۔ ان میں تفوق ہے۔ بنی اسرائیل میں داؤد علیہ السلام کو دیکھو' یہ بڑی شہرت کے مالک تھے اور عربوں کے ہاں بھی ان کی مملکت کو بطور ضرب المثل پیش کیا جاتا تھا: وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (17:55)۔ اور داؤدؑ کو دیکھو کہ ان کی مملکت اتنی عظیم تھی اس کے ساتھ ہی خدا کی طرف سے ان کو کتاب بھی ملی ہوئی تھی۔

Marfat.com

یہ تھا ہمارا وہ علم جسے ہم نے ان انبیاء کی وساطت سے انسانوں تک پہنچایا' وہ جو علمِ خداوندی دیا گیا ہے' اس میں احکام دیئے گئے اور ہدایات کی کتنی تفصیل ہی کیوں نہ ہو' بنیاد تو صرف ایک ہی تھی: ایک خدا کو صاحبِ اقتدار ماننا' اسے تمام قوتوں کا مرکز قرار دینا اور آگے یہ قوتیں جنہیں یہ اختیارات حاصل ہوں' ان کے متعلق یہ چیز کہ یہ خدا ہی کی عطا کردہ ہیں' یہ اس کی طرف سے ملی ہوئی ہیں' اپنی نہیں ہیں' یہ تمام منزل من اللہ ہیں۔ اب بنیادی چیز یہی ہے جسے توحید کہتے ہیں۔

نفع اور نقصان کی مالک صرف ذاتِ خداوندی ہے یعنی اس کا قانون ہے

قرآن نے کہا: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا (17:56)۔ اور خدا کے علاوہ جن کو تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہاری حاجت روائی' مشکل کشائی' کر سکتے ہیں' مرادیں بخش سکتے ہیں' نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں' ان سے ڈرتے ہو کہ نقصان نہ پہنچا دیں' ان سے جا کے گڑگڑا کے دعائیں کرتے ہو کہ تمہاری مرادیں پوری کر دیں۔ کہا کہ کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے' کسی کو اس کی قدرت حاصل نہیں ہے۔ یہاں جن چیزوں کو تم نفع اور نقصان کہتے ہو مثلاً ڈاکٹروں کے ہاتھوں دوائیوں کی رو سے آپ کو صحت ملتی ہے' شفا ملتی ہے۔ کوئی آ کے آپ کے کپڑوں کو آگ لگا دیتا ہے' نقصان پہنچ جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کرنے والے تو وہ یہی لوگ ہیں لیکن یہ سب کچھ خدا کے ان قوانینِ طبعی کی رو سے ہوتا' جو ان کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔

خدا کے قانون کی ایک مثال

اب خدا کے قانون کی اس بات کے کہنے کے لیے' میں نے اگلے دن یہ بات Explain کی تھی کہ یہ صرف قرآن کے کہنے کا انداز ہے۔ مثلاً آپ نے آگ میں انگلی ڈال دی: فوراً کسی نے یہ کہا کہ آگ نے انگلی جلا دی' دوسرے نے کہا کہ اس نے اپنی انگلی جلا لی' تیسرے نے کہا: میں نے آگ میں انگلی ڈالی' اس سے انگلی جل گئی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ "اس نے آگ میں انگلی ڈالی تھی' قانونِ خداوندی کی رو سے انگلی جل گئی۔" اور یا پھر اگر خدا یہ کہے کہ "یاد رکھو! جو بھی آگ میں انگلی ڈالے گا' ہم اس کی انگلی جلا دیں گے"۔ تو بات ایک ہی ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی اس قسم کی ایک ہی بات کو مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے اور یہ تو ہر نظام کا خاصہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کی نسبت براہ راست اس کے کرنے والے کی طرف ہو جاتی ہے اور کہیں اس انداز سے گفتگو ہوتی ہے کہ درمیان کے واسطے' جو ذرائع ہوتے ہیں' انہی کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ جبھی تو قرآن یہ کہتا ہے کہ کسی میں بھی یہ سکت نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "یہ جن قوانین کی رُو سے ایسا ہوتا ہے' وہ خدا کے پیدا کردہ ہیں۔"

کوئی چیز نہ خیر ہے نہ شر' بات صرف اس کے استعمال کی ہے

اب بات صرف یہی رہ جاتی ہے کہ یہ Exercise کرتے وقت' انسان کی ذمہ داری اس بات پہ ہے کہ یہ قانونِ خداوندی کو

Marfat.com

استعمال کس طرح سے کرتا ہے۔ اگر باپ کو سنکھیا دیتا ہے' اس لیے کہ فالج کا علاج ہو جائے تو عملِ خیر ہے۔ اگر دشمن سنکھیا دیتا ہے تاکہ اس کی موت واقع ہو جائے تو یہ عملِ شر ہے۔ سنکھیے کے اندر یہ دونوں خاصیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ سنکھیا (Arsenic) بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر ہے اور اگر اسے خدا کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ کبھی شر نہیں ہوتا' ہمیشہ خیر بنتا ہے۔ اسی لیے خدا کے متعلق یہ کہا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:25). تیرے ہاتھ میں تو خیر ہی خیر تھی۔ یہ تو انسانوں نے اس کا غلط استعمال کیا' یعنی تیرے بتائے ہوئے طریق کے خلاف استعمال کیا' شر بن گیا۔ اسی لیے آخری سورتوں میں آپ کو جو دعا سکھائی گئی ہے کہ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ. مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ (113:1-2). تو اس میں مَا خَلَقَ (113:2) سے بچنے کی بات نہیں کی گئی کہ تو نے جو کچھ پیدا کیا گیا ہے' اس سے ہمیں محفوظ رکھ۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ مَاخَلَقَ (113:1-2). کا وہ استعمال' جس سے شر پیدا ہوتا ہے' اس سے محفوظ رکھ۔ سنکھیے کے اُس استعمال سے جس سے موت واقع ہو جاتی ہے' ہم حفاظت چاہتے ہیں' ہم سنکھیے سے حفاظت نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ اگر ہم نے اسے اپنے اوپر حرام قرار دے دیا تو بیسیوں ایسے امراض ہیں' جن کا علاج سنکھیے سے ہی ہوتا ہے' وہ تو خیر ہے' تو پھر ان امراض کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ ''ماخلق'' کو شر کے پہلو سے' یعنی اس کے اس استعمال سے جس سے وہ شر بن جائے' ہم تعرض چاہتے ہیں' حفاظت چاہتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے جہاں بھی یہ کہا ہے کہ یہ سب چیزیں خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہیں لیکن ہوتی ہیں تمہارے اختیارات کی رو سے۔ جس طرح سے ان کا استعمال کرو گے ویسا ہی وہ نتیجہ پیدا کر دیں گی' ورنہ خدا کی کسی چیز میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ تمہیں نقصان پہنچا دے۔ وَلَا تَحْوِيْلًا (17:56)۔ اور نہ اس کی مَقدِرَت ...... طاقت' حیثیت کہ تمہارے حالات بدل دیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ جنہیں تم خدا کے علاوہ مشکل کشا سمجھتے ہو' ان میں نہ تو اس کی طاقت ہے کہ وہ کسی ایسی مصیبت کو جو ہمارے قانون کے مطابق تم پر آ رہی ہو' تم سے مٹا دیں اور نہ ہی اس کی مَقدِرَت کہ تمہارے حالات بدل دیں۔ اس لیے کہا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (17:57)۔ یہ بڑے بڑے اولیاء کرام بھی' جن کی طرف یہ اپنی حاجت روائی کے لیے جاتے ہیں' وہ وسیلہ بن گئے ہیں۔ میں یہ لفظ عام معنوں میں لے رہا ہوں۔ حالانکہ ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ان میں سے جنہیں یہ سب سے زیادہ مقرب خیال کرتے ہیں' وہ بھی ہمیشہ اس طلب اور خواہش میں رہتے ہیں کہ انہیں خدا کے ہاں اچھا مرتبہ اور درجہ مل جائے (5:35) وہ اس کی طرف سے سامانِ نشوونما کے متوقع اور اس کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کسی کو بھی وسیلوں کے چکروں میں نہیں ڈالتا

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ہاں' ہمارے اور خدا کے درمیان' ایک بنیادی عقیدہ بن گیا ہوا ہے۔ جب کوئی اور دلیل اس بات کی نہ آئے کہ صاحب! یہ آپ ان بزرگوں کے پاس کاہے کو جاتے ہیں' ان سے کیوں کہتے ہیں کہ ہماری بات خدا تک پہنچا

دیکھیے' خدا تو یہ کہتا ہے کہ ہم ہر بلانے والے کی آواز کو سنتے ہیں' تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ تم اس کی شہ رگ کی طرف دیکھ رہے ہو تو کیا خدا کے اس دعوے پہ تمہارا ایمان نہیں ہے کہ وہ تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ اسے سنانے کے لیے تم دوسروں کے پاس کیوں جاتے ہو: ''حضرت ہمارے لیے بھی خدا سے دعا کیجیے گا''۔ تو گویا یہ یوں ہے کہ جس طرح کے ہر افسر کے ہاں ڈیوڑھی میں بیسیوں دربان وسیلے کھڑے ہوتے ہیں' تمہاری درخواست اندر ہی نہیں پہنچ سکتی جب تک یہ بیس وسیلوں کے ذریعے سے آگے نہ جائے اور اس کے نیچے سونے چاندی کے پہیے نہ لگے ہوئے ہوں۔ بہرحال آپ کو تو یہاں وسیلہ ڈھونڈنا پڑتا ہے اور وہاں بھی' جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ منکسر المزاج افسر سمجھوانا چاہتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میرے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہونگے۔ دروازہ تو کھلا ہوتا ہے مگر آپ کھڑکی میں سے نکل کے باہر چلے جاتے ہیں۔ وہ باہر سے آنے والے جب بھی باہر والے دربان سے پوچھتے ہیں: دروازہ تو کھلا ہے صاحب کہاں ہیں؟ ''میٹنگ میں ہونگے'' یا غسل خانے میں۔

یہ جو چیز ہے کہ خدا تک بات پہنچانے کے لیے درمیان میں آپ وسیلے ڈھونڈتے ہیں اور یہ ہم ایسا کہہ دیتے ہیں کہ جیسے ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بات جو تھی کہ صاحب! تم ان سے مرادیں کیوں مانگتے ہو' اس سے تو ذرا جھجک پیدا ہوتی ہے؟ کہا: نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے۔ کہ ہم ان سے مانگتے ہیں' مانگتے تو ہم خدا ہی سے ہیں' ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ خدا سے یہ لے لیجیے۔ یہ ہماری درخواست وہاں پہنچا دیجیے گا اور وہ بھی درخواستوں کے ساتھ اس کو لیے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے اوپر سٹیمپ لگی ہوتی ہے لیکن وہ بھی لیے جاتے ہیں کہ صاحب! رات کو ہم جائیں گے اور یہ روز خدا کے پاس ہوتے ہیں' اور وہ ان کے اوپر احکام لکھوالاتے ہیں۔

یہ حضرت صاحب تو خود خدا کے قرب کے متلاشی ہیں

قرآنِ حکیم اس چیز کو عجیب انداز میں سمجھاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: جنہیں یہ وسیلہ بناتے ہیں کہ خدا تک یہ بات پہنچائیں گے' ان سے بھی جب یہ پوچھو کہ حضرت صاحب! آپ اتنی مشقتیں اٹھا رہے ہیں' ریاضتیں کر رہے ہیں' آپ بھی اتنی عبادت کرتے ہیں۔ وہ پہلے تو یہ بتاتے ہیں کہ ساری رات حضرت صاحب کھڑے رہتے ہیں اور یہ کمرے میں ہی کھڑے نہیں رہتے بلکہ وہ تو باہر جا کے دریائے راوی میں سردیوں کی راتوں میں پانی میں کھڑے ہو کر یہ عبادتیں کرتے ہیں صاحب۔ یہ کاہے کے لیے صاحب: ''ہم قربِ خداوندی کے حصول کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں''۔ تو قرآن ان کے الفاظ ان کے منہ پہ دے مارتا ہے۔ عجیب انداز ہے قرآن کا! کہتا ہے: جنہیں یہ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب ہم میں اور خدا میں وسیلہ بنیں جبکہ یہ تو خود ہی یہ کہیں گے کہ ہم خدا کا قرب ڈھونڈنے کے لیے' اس کا مقرب بننے کے لیے' یہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ تو خود خدا کا قرب ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تم ان کے وسیلے سے خدا تک بات پہنچا رہے ہو۔ وہ تو قربِ خداوندی تلاش کر رہے ہیں' مقرب بننے کے لیے یہ ساری ریاضتیں کی جا رہی ہیں' یہ ساری مشقتیں اٹھائی جا رہی ہیں اور ان میں سے ہر شخص جنہیں آپ حضرت صاحب کہتے ہیں: یہ کہے گا کہ ہم قربِ الٰہی کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ جب

Marfat.com

یہ بھی قربِ الٰہی ڈھونڈ رہے ہیں تو تم بھی براہِ راست قربِ الٰہی ہی ڈھونڈو۔ تم خود یہ سب کچھ کیوں نہیں کرتے ہو۔

خدا اپنے درمیان کسی کو بھی حائل نہیں ہونے دیتا

میں پھر عرض کر دوں کہ یہ وہ چیز ہے کہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ''مجھے پکارو تو میں تمہاری ہر پکار کا جواب دوں گا۔'' بہت بڑی چیز ہے جو کہی گئی ہے اور اسی پہ سارے اعتراضات ہوتے ہیں کہ صاحب! ہم تو پکار پکار کے تھک گئے، ہمیں تو جواب نہیں ملتا۔ اسی لیے وہ ان ڈاکخانوں کی طرف جاتے ہیں۔ یہ ڈاکخانے چل ہی اسی لیے رہے ہیں کہ کسی کی چٹھی براہِ راست پہنچتی ہی نہیں۔ یہ سمجھتا یہ ہے کہ ہم نے تو پکار پکار کے دیکھ لیا: وہ نہیں سنتا۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ٹھیک ہے تمہاری نہیں سنتا: ''ہماری تو سنتا ہے''۔ حالانکہ وہ قرآن ہی میں یہ کہہ رہا ہے: ''جب بھی کوئی پکارتا ہے پکار کا جواب دیتے ہیں''۔ بڑی بات ہے۔

خدا کی طرف سے پکار کا جواب اس کا عطا کردہ ضابطہ حیات ہے

عزیزانِ من! بظاہر یہ بات ہمارے تجربے کے خلاف جاتی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہی بات ہے جو میں بار بار کہتا ہوں کہ خدا کا اور ہمارا تعلق اس کی کتاب قرآن کریم کے ذریعے سے ہے۔ اسے وہ کلام اللہ کہتا ہے، خدا کی باتیں کہتا ہے کہ جو بھی آپ کسی بات میں پوچھنا چاہتے ہیں اس کو آواز دیتے ہیں کہ یہاں میں کیا کروں، ایسی صورت ہوگئی ہے یا ایک مشکل آ گئی ہے اس مشکل میں ''میں کیا کروں''۔ یہی چیز ہے ناں؟ دعا کے معنی ''مانگنا'' تو نہیں ہے۔ اس کے تو معنی ''بلانا'' ہے کہ جب بھی آپ کہیں راستہ گم کرتے ہیں، راہ چلنے والوں کو ''آواز دے کے'' پوچھتے ہیں کہ بھئی صاحب! میں کدھر جاؤں، راستہ کونسا صحیح ہے؟ یہ ہوتا ہے جسے آپ داعہ کہتے ہیں۔ ''بلاتے ہیں''۔ وہ کہتا ہے: ٹھیک ہے جب بھی آپ کسی ایسے گومگوں کی حالت میں، دوراہے (Cross-roads) پہ کھڑے ہو جائیں، آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں کدھر جاؤں، کیا کروں؟ اس وقت تم مجھے پکارتے ہو کہ ''میں کیا کروں''؟ تو تمہاری پکار کا جواب میری کتاب تم کو دے گی کہ یہ کرو، بلکہ میں نے تو پہلے ہی تمہارے ہر سوال کا جواب اس کے اندر لکھ دیا ہے، ہمیں صرف اس کتاب کے ذریعے پکارو۔ اور تم دیکھو کہ تمہاری ہر پکار کا جواب اس میں ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ اس کے معنی ہیں: اس کو ملنا، اس کو انفرادی طور پر پکارنا، انفرادی طور پر یہ توقع کرنا کہ وہ تمہیں بتائے گا، تم سے بات کرے گا، تمہیں جواب دے گا۔ یہ نہ سمجھ لیں کہ حضرت صاحب سے جواب دلواتا ہے اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ہمیں ہی وہاں سے جواب ملتا ہے۔ یہ ساری چیزیں عزیزانِ من! اس لیے ہیں کہ قرآن کی صحیح پوزیشن ہماری نگاہوں میں نہیں رہی ہے۔

آج خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا یہی ایک ذریعہ ہے، مکمل ذریعہ ہے، آخری ذریعہ ہے۔ **وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ** یہی ذریعہ ہے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ ہر پکار کا جواب اس سے ملتا ہے، ہر دکھ کا مداوا اس سے ملتا ہے۔ وہ اس کو شفا کہتا ہے۔ ہر مرض کا علاج اس سے ملتا ہے۔ ذرا اس کے بتائے ہوئے طریقے سے، اس کو پکار کے تو دیکھو، تم دیکھو تو سہی کہ کون سی تمہاری پکار ہے جس کا جواب اس کے

Marfat.com

اندر موجود نہیں۔ یہ تو عجیب و غریب کتاب ہے عزیزانِ من! کہا کہ جن کو تم خدا کے علاوہ جا کے بلاتے ہو کہ ہماری یہ مرادیں پوری کر دو' کسی میں بھی یہ اقتدار اور قوت نہیں کہ ہمارے قوانین کے خلاف کسی کو نقصان پہنچا دے یا کسی کو کوئی فائدہ دیجائے۔ ان کی تو اپنی کیفیت یہ ہے جیسا کہ تم ان کی زبان سے سن رہے ہو کہ ''صاحب! ہم بھی خدا سے مانگتے ہیں' خدا ہماری آزمائشیں کرتا رہتا ہے۔ ہم تو خود خدا سے ڈرتے رہتے ہیں' خائف ہیں''۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کی مثال قرآن کے ہی آئینہ میں

اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا (17:57) ۔ خدا کا عذاب (یعنی انسان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ) فی الواقع ایک ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ تباہیاں' وہ غلط روش کے تباہ کن نتائج ایسے ہیں جن سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ واقعی اس کی طرف سے یہ گرفت آتی ہے۔ اس کے احکام کے خلاف چلنے والی قوموں کی زندگی' ان کا عروج و زوال' ان کی موت وحیات' یہ بھی خدا کے قانون سے وابستہ ہیں۔ اب وہاں یہ کہا گیا ہے کہ وَاِنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا نَحْنُ مُھْلِکُوْھَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اَوْ مُعَذِّبُوْھَا عَذَابًا شَدِیْدًا (17:58)۔ یہ لوگ اپنے غلط نظامِ زندگی پر نازاں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا مستحکم اور پائیدار ہے اور اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ ان سے کہہ دو کہ غلط نظام کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا۔ کوئی قوم ایسی نہیں کہ وہ غلط نظام کی حامل ہو' اور وہ اسی دنیا میں تباہ یا سخت عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھو۔ اب یہاں اگر انہی الفاظ کو لیا جائے گا تو اس میں تو یہ ہو گا کہ کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے کہ جسے تباہ نہ کر دیا گیا ہو' برباد نہ کر دیا گیا ہو۔

مُھْلِکُوْھَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (17:58)۔ ''قیامت'' کے معنی میں نے عرض کیا تھا کہ ''آخرت'' کے معنی میں لے لیجیے یا ''انقلابِ عظیم'' کے معنی میں لے لیجیے جو آخری مرتبہ نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں ہوا۔ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (83:6)۔ کہ جب پوری انسانیت خدا کی ربوبیت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''قامہ'' کے یہی معنی ہیں۔ لیکن بہر حال پہلی بات یہ کہ کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے کہ جسے ہم نے ہلاک نہ کیا ہو۔ تو گویا یہ ایسی بات ہے۔ اس اتنے سے ٹکڑے سے تو یہ نظر آیا کہ ہر قوم کو خدا تباہ کرتا چلا جاتا تھا تو پھر تو کوئی قوم بچ ہی نہ سکتی' جو جی میں آئے کیجیے' قرآن تو کہتا ہے کہ ہر قوم کو تباہ کیا' ہر قوم کو تباہ کر دے گا۔ عزیزانِ من! ہر قوم کو نہیں' یہ وہی ہے جو میں نے قرآن کا طریقہ بتایا ہے کہ قرآن سے پوچھو کہ دوسرے مقام کے اوپر اس نے کن الفاظ میں وضاحت کی ہے عزیزانِ من! یہاں ہے کہ کوئی قوم بھی نہیں تھی کہ جو تباہ نہ ہوئی ہو اور وہاں ہے۔ ھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (6:47)۔ اور یاد رکھو! تباہ صرف وہ قوم ہوا کرتی ہے جو ظلم پہ اتر آیا کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اگر پہلی آیت اکیلی لی جائے تو اس سے کتنا غلط مفہوم ذہن میں آتا ہے اور دونوں کو ملا لیا جائے تو بات کتنی صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ہوا یہ ہے' آپ تفاسیر میں اٹھا کے دیکھئے گا' انہوں نے

Marfat.com

وہاں اتنی آیت لی، پہلے تو اتنی کا یہ ترجمہ کر دیا، کہیں یہ لکھا نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی ملا کے دیکھو اور اس کے بعد جب یہ کیا کہ صاحب! کوئی قوم نہیں جسے تباہ نہ کیا ہو اور اس کے بعد بھی پھر اسی طرح یہی ہوگا۔ **قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ** (17:58)۔ کے معنی یہ ہو گئے کہ ہر قوم نے تباہ ہی ہونا ہے تو پھر قوم کیا کر سکتی ہے؟ اس کا یہ ترجمہ کیا۔ پہلے تو ترجمے نے آپ کو یوں الجھا دیا اور پھر جو اتنے ٹکڑے کی تفسیر ہوئی، وہ بھی قرآن سے پوچھ کے نہیں ہوئی لہٰذا ان کے جو جی میں آیا کہہ دیا گیا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم واضح کرتا ہے

اگر قرآن کا بتایا ہوا طریقہ سامنے ہوتا اور یہ دیکھ لیتے کہ قرآن دوسری جگہ خود کیا کہتا ہے اور پھر یہاں ترجمہ نہیں بلکہ اس کا مفہوم دیا جاتا، تو بات واضح ہو جاتی۔ بہرحال اب آپ نے دیکھا کہ میں نے اپنے ہاں ترجمہ کیوں نہیں کیا، قرآنِ کریم کا مفہوم کیوں دیا۔ میں نے کیا ہی یہ ہے کہ مثلاً یہی آیت لی ہے، اس سے متعلقہ جو آیات قرآن کے اندر آئی ہیں، ان کو بھی سامنے رکھا ہے اور پھر ان سب کو ملا کے دیکھا ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہے تو پھر ان آیات کا وہ مفہوم دیا ہے۔ حوالہ دیدیا ہے تو اب ان آیاتِ خداوندی کو لیجیے اور اس کے بعد دیکھیے اس آیت کا مفہوم یہ بنے گا۔

ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ ہے طریقہ قرآن سمجھنے کا۔ قرآن خالی ترجمے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ عام طور پہ جتنے آپ کو برگشتہ ہوئے نظر آتے ہیں، وہ ان خالی ترجموں کی رو سے ہیں اور اگر تفسیروں کی رو سے ہیں تو چلیے پھر پوچھو ہی نہیں کہ کس قدر پریشان کن کیفیت ہوتی ہے۔ بہرحال یہ ہے طریق عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ بات صاف ہو گئی۔ ہمارا اصول یہ تھا۔ **هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:47)۔ کہ جو دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے، وہ ہلاک ہو کر رہتا ہے۔ اس نے واضح کر دیا۔ **اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا**۔ (17:58) کہ کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ کچھ کرے تو بھی سخت عذاب میں مبتلا نہ ہو۔

قوموں کی موت و حیات کے لیے نظامِ قدرت کا ترازو

یہ ٹھیک ہے کہ عذاب اور ہلاکت دو چیزیں قرآن بیان کرتا ہے۔ قوموں کے لیے عذاب تو وہ ابتدائی جھٹکے ہوتے ہیں، جو پہلے تھوڑے تھوڑے دیئے جاتے ہیں کہ اب بھی سنبھل جاؤ، اب بھی سنبھل جاؤ۔ یعنی یہ وہ خرابیاں ہوتی ہیں جو اس زمانے میں آتی ہیں کہ جب ابھی اس قوم کیطرف سے اچھے کام بھی سرزد ہو رہے ہوتے ہیں۔ خرابیاں نتیجہ پیدا کرتی ہیں لیکن وہ اچھے کام ان کو کاؤنٹ (Count) اور بیلنس (Balance) کر جاتے ہیں۔ تھوڑی سی تباہی آتی ہے، بچ جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ تباہیوں والے، خرابیوں والے، تخریب والے، کام بڑھتے چلے جائیں تو کیا ہوگا؟ اس کے لیے قرآن کا اصول یاد رکھیے: وہ **ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ** (101:6)۔ اور

خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ (101:8) ہے۔ وہ اقوام کے اعمال پلڑوں میں رکھتا ہے' ایک طرف ان کے تعمیری کام' دوسرے پلڑے میں تخریبی کام اور اس کے بعد دیکھتا چلا جاتا ہے' جو پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے' اس کے مطابق اس قوم کا مقام یا اس کی زندگی اور موت متعین ہوتی ہے۔ تعمیری کام زیادہ ہیں' تو تخریبی بھی ہوتے ہیں لیکن اگر تخریبی کاموں کا یہ پلڑا جھکا ہوا ہے تو ٹھیک ہے وہ قوم آمادہ بہ زوال تو ہو جائے گی' فوراً وہ تباہ نہیں ہوگی۔ یہ چھوٹی چھوٹی تباہیاں' یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں آتی جائیں گی' وارننگ (Warning) ملتی چلی جائے گی۔ اس پہ بھی اگر وہ نہیں سمجھتے اور اپنی تخریبی کارروائیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں تو اس کے بعد تو پھر وہ مقام آ جاتا ہے کہ جس کے لیے کہا: حذر اے چیرہ دستاں بڑی سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ سقوط ڈھاکہ کی صورت میں یہی ہوا۔ عزیزانِ من! بڑی سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

اندلس کے بعد سقوطِ ڈھاکہ کی مثال

یاد رکھیے! خدا کا اصول یہ ہے کہ فطرت کبھی کسی غدار کو معاف نہیں کیا کرتی۔ عزیزانِ من! وہ جو اس نے کہا تھا کہ یہ جہاں لا ابتدا ولا انتہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کائنات بڑی وسیع ہے۔ اس کی ابتداء اور انتہا کوئی بھی نہیں ہے لیکن بندۂ غدار را مولا کجا' غدار کو اس کائنات میں کوئی حفاظت نہیں دیتا' کوئی پناہ نہیں دے سکتا' کوئی اس کا مولا نہیں' کوئی اس کا آقا نہیں بن سکتا' پناہ دینے والا نہیں ہو سکتا۔ وہ دھوکے میں آ کے بھی' پناہ گاہوں کے اندر اپنے آپ کو سمجھ لیتا ہے کہ ''میں محفوظ ہو گیا ہوں صاحب!'' قطعاً نہیں۔ کسی ایک شخص سے بیوفائی تو کجا' چہ جائیکہ پوری کی پوری امت سے انسان غداری بھی کرے اور پھر اس کے اثر سے بچ کے نکل جائے' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (85:12) یاد رکھو! خدا کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے' ہڈیاں توڑ کے رکھ دیا کرتی ہے۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ تو یہ ہے پہلے عذابِ شدید۔

فطرت کی تعزیرات میں انقلابی مسرت کا پہلو

بات چھڑ گئی ہے۔ عزیزانِ من! تو پھر دل میں ابھرنے والا اگلا یہ جذبہ بھی کہہ دوں کہ میرے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہی نہیں ہے کہ فطرت کی تعزیر نے ایک غدار کا یہ انجام دکھایا ہے' اس میں ایک بہت بڑی انقلابی اور مسرت خیز چیز بھی ہے۔ اس کا اگلا حصہ ہے کہ جب وہاں ڈھاکہ کا انقلاب آیا تھا تو پہلی آواز خود ڈھاکہ کے اس زمانے کے قائم مقام صدر کی طرف سے تھی' کیونکہ مجیب الرحمٰن تو یہاں قید میں تھا۔ بات یہ تھی کہ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ دین کی بنیادوں پر مملکت قائم ہوا کرتی ہے اور قوم ایمان کے اشتراک سے بنتی ہے دوسری طرف اِس نظریئے کے مخالفین تھے جو شروع ہی سے کہتے رہے کہ یہ دعوٰی باطل ہے' یہ دعویٰ غلط ہے۔ اُن کی اس مخالفت کے باوجود یہ مسلمان نہیں مانے اور دیکھیے! تاریخ نے کس طرح ثابت کر دیا کہ واقعی وہ دعویٰ غلط تھا۔ اِن مخالفین کے بقول ہماری یہ کامیابی ہماری تحریک کی کامیابی نہیں ہے' ہمارے نظریئے کی کامیابی ہے۔ کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں نظریئے سے نہیں یہ ان راہ گم کردہ مسلمانوں کے

Marfat.com

نظریے کی شکست ہے۔ عزیزانِ من! بات نظریے کی تھی۔ اور اُدھر اندرا گاندھی نے بھی پارلیمنٹ میں اس کو دہرایا تھا جب اس کو مبارکباد دی گئی ہے۔ اس نے یہ بات کہی تھی کہ مبارکباد ٹھیک ہے' میں اپنی فوجوں کو بھی دیتی ہوں' تم مجھے بھی دیتے ہو' اصل مبارکباد اور ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ باطل کا نظریہ تھا جو ہمارے سمجھانے کے باوجود اس راہ گم کردہ مسلمان نے اختیار کر رکھا تھا۔ آج تاریخ نے یہ بات ثابت کر دی کہ ہم سچ کہتے تھے' ان کا نظریہ باطل ہے اور آج تاریخ نے ہی یہ بات ثابت کر دی۔

لیکن عزیزانِ من! پتہ نہیں یہ تبدیلی کیسے ہوئی۔ ڈھاکہ سے اس نئے صدر کا پہلا اعلان تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''دنیا پہلی بات یہ سن لے کہ ہم نے اس کا نام سیکولر جمہوریہ بنگلہ دیش کی بجائے اسلامیہ جمہوریہ بنگلہ دیش رکھ دیا ہے۔ آگے جا کے کچھ بھی کیوں نہ ہو' بات تو اس وقت صرف نام کی ہے۔'' عزیزانِ من! یہ صرف نام کی بات نہیں۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی جب ہم بچے کا نام عبدالرحمٰن رکھتے ہیں تو ہم اس وقت اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مسلمان گھرانے کا بچہ مسلمان حیثیت سے جیئے۔ پہلا اعلان وہاں سے یہ ہوا۔ میں کہتا ہوں: ''یہ انقلاب کی عجیب چیز ہے' رفتہ رفتہ بعد میں بھی یہ باتیں ہو سکتی تھیں۔'' یہ پہلا اعلان ہو رہا ہے۔ انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پہلا اعلان یہ کیا تھا۔ عزیزانِ من! نظر الاسلام کی طرف سے پہلا اعلان یہ ہوا تھا کہ باطل کے نظریے کی آج شکست ہوئی ہے کہ قومیں نظریہ کی بنیاد پر نہیں بنتیں جغرافیائی حدود پر بنتی ہیں۔ پہلا اعلان یہ ہو رہا ہے کہ یہ بالکل غلط تھا جو کہا گیا تھا کہ سیکولر سٹیٹ ہے' یہ اسلامیہ جمہوریہ ہے صاحب! عزیزانِ من! اجازت دیجیے کہ میں اس تبدیلی اور انقلاب پر آپ احباب کی خدمت میں مبارکباد عرض کروں اور انہیں بھی ہدیۂ تبریک پیش کروں کہ جن کے دل کے جذبے نے پہلے یہ الفاظ دنیا میں دہرائے کہ یہ کہا جا رہا تھا کہ نظریہ یہی صحیح ہے کہ مسلمانوں کی مملکت کو اسلامیہ جمہوریہ ہی ہونا چاہیے تھا۔

مسلمانوں کے تحت الشعور میں اسلام کا جذبہ

میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ ایک ہلاکت ہوتی ہے' ایک عذاب ہوتا ہے۔ اتنا عرصہ وہ قوم عذاب میں مبتلا رہی' غنیمت ہے ہلاکت کی آخری منزل پہ نہیں پہنچی اور غنیمت تر ہے کہ پہلا جذبہ ان کے اندر سے یہ ابھرا کہ ہمارے اس عذاب کی وجہ یہ تھی۔ ہم مسلمانوں کے تحت الشعور میں جو انتہائی عقیدت اور احترام کا جذبہ ہے' وہ اسلام کا جذبہ ہے۔ اور عزیزانِ من! یہ سن رکھیے کہ ہمارے عوام لاکھ گئے گزرے ہوں اسلام کی محبت ان کے تحت الشعور کے اندر اب بھی پیوست ہے۔ اس جذبے کو دبایا جا سکتا ہے' مٹایا نہیں جا سکتا اور دبائے ہوئے جذبات (Repressed Passions) جب ابھرا کرتے ہیں تو وہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح آیا کرتے ہیں صاحب! اسی لیے میں یہ چیز پچیس سال سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ وہ جو احترام اسلام کا جذبہ ہے' وہ جو مسلمان کے دل کے اندر محمد رسول اللہؐ کی محبت اور عقیدت ہے' خدارا اس کو نہ دبائیے' وہ محبت اور عقیدت مسلمان کے دل سے مٹے گی نہیں' کچھ عرصے کے لیے آپ دبا سکتے ہیں' مٹا نہیں

Marfat.com

سکتے۔ پھر جب یہ جذبے ابھرا کرتے ہیں تو ایسے ابھرا کرتے ہیں۔ اگر یہ بنگال کے مسلمانوں کے جذبات کا اظہار ہے' وہ قابل احترام ہے تو بہر حال شگون نیک ہے کہ انہوں نے اپنا نام تو اسلامیہ رکھا' آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ کہا: عَذَابًا شَدِيدًا (17:58)۔ شدید عذاب کے جھٹکے آیا کرتے ہیں۔ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (17:58)۔ یہ بات بھی ہم نے کتاب کے اندر لکھدی ہے' یہ بات بھی ہمارے قانون کی کتاب (Book of Law) میں ہے۔ یہ جو ہمارا Consitution ہے' جو ہم نے تمہیں انسانیت کے لیے دیا ہے' ہم نے اس میں لکھ دیا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے قانونِ مکافات کے ضابطہ (Code of the Law of Requital) میں درج ہے۔

کوئی قوم قدرت کی طرف سے وارننگ کے بغیر تباہ نہیں ہوتی

عزیزانِ من! وہ کیا ہے جو اس قانون مکافات کے ضابطہ میں درج ہے؟ وہ یہ ہے کہ پہلے قومیں اس طرح سے آمادہ بہ زوال ہوا کرتی ہیں۔ اگر اس ضابطہ سے وارننگ لیتی ہیں تو وہ بچ جایا کرتی ہیں۔ اگر اس میں بڑھتی چلی جایا کرتی ہیں تو پھر وہ اس طرح سے تباہ ہوا کرتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر ان کی صرف داستانیں باقی رہ جایا کرتی ہیں۔ کیا کہا ہے کسی نے کہ پھر ''ان کے چیتھڑے ہو جایا کرتے ہیں''۔ یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں قوموں کی داستانیں' ایسے نہ کرنا۔ باقی رہے ان لوگوں کے یہ مطالبات' جو آئے دن یہ کچھ کرتے رہتے ہیں کہ ہاں صاحب! کوئی معجزہ دکھا دیجیے' کوئی کرامت دکھا دیجیے' سوال یہ ہے کہ ''کیا معجزوں اور کرامتوں سے اقوام کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کا علاج ہو سکتا ہے؟''

کیا کرامتوں سے ڈوبتی ہوئی قوموں کا علاج ممکن ہے؟

ہم قانون کی بات کہہ رہے ہیں' مگر وہ شعبدوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ خیر تو فرض کرو کہ انبیاء کرام کا یہ دور گذر گیا۔ اب ہم اس کی جگہ یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ اولیاء کرام ہیں' وہ معجزے دکھاتے تھے' یہ کرامتیں دکھاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ جتنے بھی آپ کے ہاں کے اولیاء کرام بزرگ ہیں' جن کیطرف آپ کہتے ہیں کہ کرامتیں دکھاتے ہیں۔ اگر یہ کوئی کرامت اپنے ہاں دکھا دیں تو کیا خیال ہے ان کی اس کرامت سے یہ ڈوبنے والی قوم بچ جائے گی؟

1965ء کی جنگ میں جن کو کریڈٹ (Credit) جانا چاہیے تھا' وہ انہوں نے انہیں نہیں جانے دیا۔ یہ بھی بڑی سازش تھی۔ یہ کریڈٹ (Credit) ہمارے ان جوانوں کو جانا چاہیے تھا کہ جن کے متعلق وہ کچھ صحیح ہے' جو ان کے یادگار پہ لکھا ہوا ہے: ''اے ملتِ پاکستانیہ! ہم نے اپنا آج تمہارے کل کے لیے قربان کر دیا''۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا ''آج'' قربان کیا تھا تاکہ ہمارا ''کل'' محفوظ رہ جائے' کریڈٹ انہیں جانا چاہیے تھا لیکن یہ سازش تھی کہ فوج کا احترام قوم کے دل میں نہ پیدا ہو جائے' یہ کریڈٹ ان جیالوں کو نہ چلا

جائے' کہا: او' فلاں حضرت صاحب آئے ہوئے تھے جی! وہ راوی کے کنارے کھڑے تھے' انہوں نے آ کے جی! وہ جو اوپر سے ہوائی جہاز سے بم گرتا تھا' وہ اسے یوں ادھر پھینک دیتے تھے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ یہ کریڈٹ ان کا ہے جنہوں نے یکے بعد دیگرے یہاں جانیں دی تھیں۔ اس بم سے بچانے کے لیے ان جیالوں کے کوئی نام نہیں' بلکہ یہ حضرات کہتے یہی ہیں کہ وہاں حضرت صاحب کھڑے تھے۔ وہ بم آتا تھا' یوں پھینک دیتے تھے۔ ادھر سے آتا تھا یوں پھینک دیتے تھے' فلاں جگہ سے حضرت صاحب چلے اور ان سے پوچھا کہ صاحب! اتنی افراتفری میں' جلدی میں' کیا ہے' میری بات سنیے' کہنے لگے: ''نہیں کوئی ہیگا' اوتھے لڑائی لگی ہوئی ہیگی اے' فوج دے معرکہ جیہڑا اے او ماریا ہیگے' میں اوتھے جانڈیاں ہیگاں''❶ سبز عماموں والے اور سفید گھوڑیوں والے آئے اور آپ نے یہ 65ء کی جنگ جیت لی۔ یہ سب کرامات والے تھے۔ پانچ ہی برس کے بعد 1971ء کی جنگ بھی آپ کے ہاں ہوئی تو اس زمانے میں بھی یہ سارے موجود تھے اور پانچ برس میں تو کچھ اور بھی ساتھ مل گئے ہونگے۔ وہ سارے کے سارے جتنے تھے' ان کی گھوڑیاں' ان کے عمامے' ان کے یہ سارے کے سارے شعبدے نہ کسی نے دیکھے نہ سنے اور ہم سارے کے سارے شکست کھا کے آ گئے۔ ان کی کرامتیں عزیزانِ من! نہیں بچا سکتیں۔

صلاح الدین ایوبی کا عمل اور رچرڈ کی شمشیر زنی

عزیزانِ من! کرامت دکھائی تھی صلاح الدین ایوبی (C. 1137-93) نے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ریشمی کپڑے کو تلوار نہیں کاٹ سکتی۔ رچرڈ (Richard1:1157-99) نے صلاح الدین ایوبی کو چیلنج کیا۔ رچرڈ 1 نے تو یہ بات یونہی طنزاً کہی تھی کہ ''جاؤ' یہ رومال لے جاؤ'' وہ ریشم کا تھا۔ اور آپ حیران ہونگے کہ اس نے جو رومال پھینکا اور صلاح الدین ایوبی نے تلوار چلائی تو اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ کہا: ''رچرڈ سے کہو' یہ صلاح الدین ایوبی کی تلوار ہے' تمہاری تلوار نہیں ہے۔ یہ زرہ بکتر کے نیچے' تمہارے تانے ہوئے ریشم کے کپڑوں سے لے کر قلب تک چیر کے رکھ دے گی''۔ یہ تھی کرامتیں' ان کی تین سو سال تک کی لڑائیاں صاحب! ایک صاحب کرامت شمشیر بدست آتا ہے۔ یہ کرامتیں دکھاتا ہے۔ وہ جو صلاح الدین ایوبی کے عمل کی چیز تھی' یہاں بھی وہی صورت تھی۔ یہ تھے قرآن کے ماننے والے اور یہ تھے قرآن کے مطابق عمل کرنے سے رونما ہونے والے عام دنیا کی نظر میں معجزے۔ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ (17:59)۔ یہاں پھر عام ترجمہ کی غلطی ہے' جو غلط فہمی پیدا کر دیتی ہے۔ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ یہ معجزے مانتے ہیں۔ کہا کہ وہ ٹھیک ہے' معجزے دے سکتے تھے لیکن ہم نہیں دینا چاہتے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ ان سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ وہ پہلے بھی دکھائے تھے تو یہ لوگ کونسے ایمان لائے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ آپ کو پہلے پتہ نہیں تھا کہ یہ معجزے سے ایمان لانے کے نہیں ہیں؟ دراصل بات کرنے کا یہ ایک انداز ہوتا ہے' اسلوب بیان ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سوال ہی نہیں ہے کہ یہ جو اس وقت مطالبے کر رہے ہیں' انکا یہ بھی مطالبہ پورا کر دیا جائے گا' تو پھر یہ ایمان لے آئیں

❶ وہاں کوئی بھی مدافعت کے لیے موجود نہیں ہے۔ فوج مخالف کا گھمسان کا رن پڑا ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔

Marfat.com

گے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ ہے کہ وہ یہ بات نہیں ہے یہ یونہی کہتے ہیں اور اگر یہ بھی کر دیا جائے کہ تو یہاں سے آسمان پہ چڑھ جائے وہاں سے ایک کتاب لے آئے اور یہ سچ مچ اسے دیکھ بھی لیں۔ یہ سب کچھ کر بھی لیں، پھر بھی تم دیکھو گے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

انکار کی اصل وجہ اپنے خودساختہ نظام کا تحفظ ہے

اصل میں وہاں بتایا یہ ہے کہ ان کے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے خودساختہ نظام کا تحفظ چاہتے ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے یہ ایمان نہیں لا رہے۔ ساری بات یہ ہے کہ یہ بات خوب سمجھ گئے ہیں۔ اور یہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ اگر یہ نظام قائم ہو گیا، جس کی طرف یہ دعوت دیتا ہے تو جس قدر ہمیں یہ مفادات حاصل ہیں، وہ سب غتر بود ہو جائیں گے اور یہ سلب و نہب' Exploitation' یہ جھوٹی عزتیں، کعبے کی تولیت، یہاں سے وہاں تک قریش کے تجارت کے قافلے ان کے گلے میں ایک رسی سی باندھ دو، کوئی ان کی طرف نہیں دیکھ سکتا، انہیں پتہ تھا کہ اس نظام کے تابع یہ ساری جھوٹی چیزیں چھن جائیں گی۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ یہ بات پوری طرح سمجھے ہوئے ہیں۔ مگر یہ تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ ''صاحب! ایک باغ لگا ہوا ہونا چاہیے، اس میں ایک پیڑ لگا ہونا چاہیے، پیڑ کے اندر ایک پھل آ جانا چاہیے''۔ یہ اتنا کہتے ہیں۔ اتنی ہی بات نہیں ہے۔ اگر تو یہاں ان کے سامنے سیدھا آسمان پہ چڑھ جائے اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لے آئے اور یہ اس کو دیکھ بھی لیں کہ واقعی تم یہ لکھی لکھائی کتاب خدا کی طرف سے، آسمان سے لے کے اتر آئے تو اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لیے کہ یہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ یہ جو تو انقلاب لانا چاہتا ہے، اس میں ان کا حشر کیا ہو گا۔ یہ ہیں وہ معنی کہ کسی ایک بات میں خدا کے لیے مشکل کیا ہے، جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں لیکن ان کی تکذیب کا جذبہ محرکہ کچھ اور ہے۔ وہ یہ نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں اور یہ ہے وہ چیز جو قوم فرعون کے قصے میں قرآن نے بتائی کہ حقیقت ان کے سامنے آ چکی تھی، صداقت آ چکی تھی۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ دل کے اندر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ بات ٹھیک کرتا ہے لیکن شیطان، جو ان کا پندارِ نفس تھا، حقیقت میں وہ ان کو بات ماننے پر آمادہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ کیونکہ ان کی اتنی بڑی کبریائی، اتنی بڑی فرعونیت، اتنی بڑی مملکت چھن گئی تھی۔ اور پھر وہی جسے قرآن نے پندارِ نفس بھی کہا ہے، یہ انہیں ادھر نہیں آنے دیتی تھی۔

پندارِ نفس اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا معاملہ

عزیزانِ من! بہت سی سچائیاں ایسی ہیں کہ جن کا اعتراف تو آدمی دل کے اندر کر لیتا ہے لیکن وہ اس قسم کے جذبات ہوتے ہیں جو اس کو اس پہ آمادہ نہیں ہونے دیتے کہ وہ انہیں کھلے عام تسلیم کر لیں تو کہا: بات تو ساری اصل میں یہ ہے۔ اب ان کے سامنے کل کی بات ہے۔ مثلاً یہ خود جانتے ہیں کہ قومِ ثمود کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کے سرداروں اور حضرتِ صالح علیہ السلام کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ آپ کو ساری بات معلوم ہے کہ اس زمانے میں مویشی پالنا معیشت کا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ چراگاہیں سب سے بڑا ذریعہ تھیں۔ بڑے بڑے طاقتور

Marfat.com

سرداروں نے چشموں پہ چراہ گاہوں پہ اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔ وہاں کے غریبوں کمزوروں کے مویشی ان سے محروم رہ جاتے تھے۔ یہ بات کہنے کے لیے یہ آئے تھے۔ قرآن کے الفاظ میں کہ ''دیکھیے! یہ خدا کے جانور ہیں۔ یہ خدا کی زمین ہے۔ او بابا! انہیں اس زمین میں چرنے چگنے دو۔ تم خوامخواہ انہیں روک رہے ہو کہ ہمارے جانور جائیں گے ان کے نہیں جائیں گے۔ اوئے! یہ مویشی نہ تمہارے ہیں نہ ان کے ہیں۔ یہ ساری خدا کی مخلوق ہے یہ زمین نہ تمہاری ہے نہ ان کی ہے یہ خدا کی زمین ہے۔ خدا کی زمین میں خدا کی مخلوق کو چرنے چگنے دو''۔ تو وہ اس پہ آمادہ ہوئے۔ اس پہ معاہدہ ہوا۔ انہوں نے کہا: یہ ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''لیجیے یہ نشانی! یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ یہ کسی کی بھی ملکیت نہیں ہے نہ میری نہ تمہاری نہ غریب کی نہ امیر کی نہ سردار کی نہ کمزور کی۔ یوں سمجھیے کہ یہ کسی کی طرف منسوب نہیں ہے۔ یہ خدا کی ایک مخلوق میں سے ہے۔ خدا کی یہ زمین ہے اب اس پہ کوئی پابندی نہیں لگے گی''۔ انہوں نے کہا: ''ٹھیک ہے نہیں لگے گی''۔

نظامِ سرمایہ داری کی نظر میں غریبوں کی محتاجی سے بچنے کا حل

اب اس کے بعد انہوں نے ایک دفعہ پھر سوچا کہ اس کا نتیجہ تو پھر یہی ہوگا کہ یہ چراہ گاہیں کھلی چھوڑنی پڑیں گی۔ کھلی چھوڑنے کے بعد یہ جن کو ہم نے ایک ایک کام کے لیے اپنے قبضہ اختیار میں رکھا ہے یہ غریب تو ان کے محتاج ہیں۔ یہ تو ہمارے ہاتھ سے گئے۔ انہوں نے پھر کہا کہ پھر یہ ٹھیک ہے کہ اس اونٹنی کو بیچ میں سے ختم کرو صاحب! انہوں نے اسے ختم کر دیا۔ قرآن کہتا ہے: تمہارے سامنے یہ بات ہوئی تھی معجزہ دیکھنا تو ایک طرف رہا یہ باہمی معاہدہ تو اس سے زیادہ مؤثر تھا جو کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کونسا جذبہ تھا جس کے تابع وہ اس پر بھی کاربند نہ رہے۔ وہی مفاد پرستیوں کا جذبہ۔ قومیں اس طرح ڈوبتی ہیں اس طرح ہلاکت کی طرف بہہ جاتی ہیں۔ مفاد پرستیوں کے جذبات ان کو صداقت کی قبولیت کی طرف آنے نہیں دیتے۔ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً (17:59)۔ ہم نے قومِ ثمود کی طرف اونٹنی کو اسی قسم کی نشانی بنا کر بھیجا۔ یعنی ان سے کہہ دیا کہ اگر انہوں نے اس اونٹنی کو اس کی باری پر پانی نہ پینے دیا تو یہ اس امر کی نشانی ہوگا کہ وہ قانونِ خداوندی کی پاسداری نہیں کرنا چاہتے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں تھی کہ جو سمجھ میں نہ آتی۔ کیا بات ہے اس مبصرۃ کی کہ یہ ایک معاہدے کی بات ہے ایک علامت ہے ایک نشانی ہے ایک ایسی سمبل (Symbol) جو مبنی بصیرت تھی اس ایک بات کی کہ تم اپنے وعدے پہ پورا رہو گے۔ فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (17:59)۔ بجائے اس کے کہ وہ اس سے ڈر جاتے اور اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لیتے انہوں نے الٹا اس اونٹنی کو ہی مار ڈالا۔ اس طرح تباہی آتی ہے۔ ہوتا یہ ہے عزیزانِ من! کہ اس چیز کے لیے اس کے سامنے پہلے تو ابتدائی جھٹکے آتے ہیں۔ وہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون کو انتہا تک پہنچنے سے پہلے انہیں ایک وارننگ مل جائے اور یہ اس انجام سے ڈر جائیں جو اس طرح آنے والا ہے۔ اور جب یہ چیزیں بن کے رہ جائے تو پھر جو بات بھی کہو سچی کہو معقول کہو Reasonable کہو سمجھ میں آنے والی بات کہو مگر یہ اس کے الٹے ہی معنی لیں گے۔

Marfat.com

نبی اکرم ﷺ کی ہجرت اور مکہ کی اہمیت وحیثیت آپؐ کی نظر میں

کل ہی کی بات ہے نبی اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینے آ گئے کہ یہاں اس پروگرام کی عملی تشکیل کریں جسے آخرالامر ایک نظام کی شکل اختیار کرنا ہے۔ یہ جو نظام تھا' اس کے مرکز کے لیے پہلے سے طے تھا کہ وہ مکہ ہوگا۔ اس لیے کہ مکہ اس سے پیشتر عالمگیر شہرت اختیار کر چکا تھا۔ خدا اور اس کے انبیاء کی طرف سے جو تعلیم آتی ہے' اس کا مرکز اسے بننا تھا۔ کوئی اور وجہ تقدس نہیں تھی کہ ضرور رسول اللہؐ نے بھی مکہ کو ہی بنانا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے جب وہ تعمیر ہوا ہے تو اس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا۔ یہ دوسرا موضوع ہو جائے گا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے۔ قِيَـامًا لِّلنَّاسِ (17:59)۔ ہو جائے اور اس بناء پر یہ Universal شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے ذہن میں یہی تھا کہ مکہ کو ہی اس نظام کا مرکز بنایا جائے گا تو وہاں سے جب آپ مدینے تشریف لے آئے تو ذہن میں یہ بات تھی کہ نظام تو میں قائم کر رہا ہوں لیکن اُس نظام کا مرکز مکہ کو ہی رکھا جائے۔ مگر مکہ تو ان کی تولیت میں ہے' ان کے قبضے میں ہے۔ پھر کیا ہوا؟ یہ تھا آپ ﷺ کے ذہن میں بار بار اٹھنے والا سوال۔

رسول ﷺ خدا کی آخری آرزو اور اس کی تکمیل

دوسرے پارے کے اندر قرآن نے کہا ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو بار بار آسمان کی طرف تکتا ہے اور تیرے سینے میں یہ حسین آرزو مچلتی ہے کہ "بارِالٰہا! میرے نظام کا مرکز جسے بننا ہے وہ تو مخالفین کے قبضے میں ہے۔ کیا اس کی تولیت ہمیں ملے گی؟" تو وہاں کہا گیا تھا کہ "ہاں! ہم تمہارے اس جذبے کو جانتے ہیں۔ ہم اس آرزو کو جانتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسی کو مرکز بننا چاہیے اور یہ ہو کے رہے گا"۔ تو یہ آرزوئیں تھیں' جو دل کے اندر مچلتی تھیں۔ جوں جوں دن گذرتے چلے جاتے تھے' یہ آرزو پختہ تر ہوتی جاتی تھی۔ اور پھر قرآن میں تو یہ بھی ہے کہ رسول اللہؐ نے یہ کہا کہ "یا اللہ! اب تو زندگی آخری مرحلے میں پہنچ رہی ہے تو کیا میرے مقدر میں یہ ساری تگ وتاز ہی ہوگی اور وہ جو میرے ذہن میں میری انتہائی آرزو ہے کہ اس نظام کا مرکز بھی ہماری تحویل میں رہے' کیا وہ پوری نہیں ہوگی"؟ تو وہاں یہ کہہ دیا گیا: فَـاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَـلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ (13:40)۔ تیرا کام اس بات کو پہنچائے چلے جانا ہے' کوشش کیے جانا ہے۔ یہ نتائج کب برآمد ہوں گے یہ ہمارا کام ہے' یہ ہم دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ رسول اللہؐ کے دل میں یہ مقدس اور حسین آرزوئیں مچلتی تھیں' یہ حقیقت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا خواب

انسان کی یہی آرزوئیں ہیں' جو کبھی خواب بن کر راتوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ رسول اللہ نے بھی ایک خواب دیکھا کہ ہم مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس خواب کو صحابہ سے بیان بھی کیا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ذہن میں یہ آیا کہ وہ جو خدا نے وعدہ کیا

Marfat.com

تھا' اس کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو یہ فتح مکہ سے پہلے کی بات ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ تیرا خواب سچ کر دکھایا۔ یا یہ چیز ہو سکتی ہے کہ آپ کے ہاں صلح حدیبیہ ہوا تھا تو اس سال آپ مکہ نہیں جا سکے تھے' اگلے سال گئے۔ کوئی بھی بات تھی۔ جب یہاں مدینے میں اس خواب کا چرچا ہوا ہے تو یہ قریش' جو وہاں تھے' انہوں نے کہا: ملاحظہ فرمایئے' ذرہ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر' یہاں چار جنگیں تو جیت لی ہیں' اب یہ خواب آنے شروع ہو گئے ہیں کہ صاحب! ہم نے مکہ بھی فتح کر لیا ہے اور ہم اس میں داخل ہو رہے ہیں' نہایت عزت و شرف' شان و شوکت کے ساتھ۔ ملاحظہ فرمایئے صاحب' ! قرآن کہتا ہے حالانکہ یہ Circumstantial Evidence تھی۔ باہر کے حالات بھی دنیا کو یہ بتا رہے تھے کہ واقعی یہ چیز عنقریب ہو سکے گی۔ ہر قدم اس طرف اٹھ رہا تھا۔ سات سال تک اس قریش نے جتنی جنگیں لڑیں "ٹلاں لالیاں لپڑیاں آخری جنوں کیندے او"[1] انہوں نے ہر جگہ شکست کھائی اور ان کے قدم بڑھتے چلے گئے' مملکت وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ سرحدیں شام تک اور یمن تک چلی گئیں۔ اگر کوئی شخص خالی الذہن ہو کر' ان حالات کا مطالعہ کرتا' تو وہ سمجھ لیتا کہ اب ان کے لیے اس مکہ کو فتح کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

غلط جذبات انسان کو اعصابی طور پر تباہ کر دیتے ہیں

کہا کہ اتنی بیّن بات بھی انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آپ نے خواب بیان کیا۔ انہوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ "جب انسان کے جذبات اس طرح سے اس کے اعصاب پر سوار ہو جائیں تو ایسی بدیہی باتیں بھی ان کو نظر نہیں آیا کرتیں"۔ آپ کہتے ہیں کہ انہیں معجزہ دکھا کے قائل کر دیجیے مگر وہ تو معقول اور Reasonable بات سننے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ اس کے متعلق بھی صحیح نتیجے پہ نہیں پہنچتے۔ ابھی کل ہی تو تم نے وہ اپنا خواب بیان کیا تھا۔ کسی اور علم کی بناء پہ سمجھدار قوم ہوتی تو وہ یہ دیکھتی کہ ہاں صاحب! حالات ان کے سازگار چلے آتے ہیں اور کچھ نہیں تو خواب کو یہی کہتے کہ "ان کے دل کی بات ہم نے معلوم کر لی ہے کہ یہ مکہ بھی فتح کرنا چاہتے ہیں"۔ انہوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ وَاِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ (17:60)۔ ہم نے تمہیں یہ کہا تھا کہ ہم ان پر احاطہ کیے ہوئے ہیں' ان کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ ہم نے اسی بنا پہ یہ کہا تھا: "تم نے وہ خواب دیکھا تھا' ان کو اسی سے بات سمجھ جانا چاہیے تھا"۔ مگر بات سمجھنے کی بجائے۔ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (17:60)۔ یہ بات بھی ان کے لیے ایک فساد کا ہی موجب بن گئی' شرارت کا ہی موجب بن گئی' مذاق کا موجب بن گئی۔ پھر اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ اب تو اس دین کے اندر عزت اور شرف کے ساتھ آ سکتے ہیں' کل کو اگر انہوں نے شکست کھائی اور تمہارے سامنے آئے

---

[1] اپنے تئیں ان اہل قریش نے حتی المقدور' حتی الوسع' آخری کوشش تک کر دیکھی مگر۔

Marfat.com

تو یہ بڑی ذلت کی بات ہوگی۔ یہ عزت ہاتھ سے جاتی تو ہے' تو بہتر ہے کہ عزت سے خود ہی کیوں نہ کہہ دو کہ "ہاں صاحب! ٹھیک ہے آئیے! ہم آپ کو مکہ دیتے ہیں' نہ اسلام لائیے اپنی ہی حیثیت سے رہیے"۔

ذلت کی شکست کا تمثیلی بیان

لیکن اگر انہوں نے یہی کچھ کیا تو پھر قرآن جہنم کی تصویر کھینچتا ہے۔ کہنے لگے: اس تصویر میں جہنم کا تمثیلی انداز ہے۔ جس میں کہا ہے کہ پینے کو کھولتا ہوا پانی ملے گا' جس سے پیاس بجھنے کے بجائے اور زیادہ اٹھے گی' کھانے کو وہ غذا ملے گی جو بجائے جزو بدن بننے کے' ان کے معدے میں پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتی رہے گی۔ بتادیا کہ وہ غلامی اور محکومی اور قیدیوں کے کھانے ہیں۔ اس کے متعلق یہ کہا ہے کہ جہنم کا وہ کھانا نہ نگلا جائے نہ اگلا جائے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد ایسا بتادیا کہ جب وہ دیا جائے تو کہا جائے گا: ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ (44:49)۔ بہت بڑا بنا پھرتا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھتا تھا کہ بڑی قوتوں کا مالک ہیں۔ کھا! اب اس کو کھا۔ قرآن نے اسے شَجَرَۃَ الزَّقُّوْمِ (44:43) کہا ہے۔ قرآن نے' عام طور پہ جسے یہ مجازی معنوں میں تھوہر کا درخت کہتے ہیں' کہا کہ کیا وہ کوئی کھایا جاتا ہے؟ لیکن عربوں کے ہاں تو ایسی روٹی' اب نہ تو وہ رسمیں رہی ہیں' نہ الفاظ رہے ہیں' ذلت کی روٹی تھی' غلامی کی روٹی تھی۔

شکست خوردہ قوم کے لیے غلامی کی روٹی

شکست خوردہ قوم کے لیے غلامی کی روٹی کو فارسی میں نانِ تلخ کہتے تھے۔ "کوڑا وٹہ پنجابی اچ کیندے نیں"[1] جس کے ہاں کوئی مر جاتا تھا' اس میت والے گھر میں جو روٹی بھیجی جاتی تھی "وہ کوڑا وٹہ" کہلاتی تھی۔ یعنی کڑوی روٹی۔ یہ کڑوی روٹی بھی عجیب چیز ہے کہ کھائے بغیر بھی چارہ نہیں ہوتا تھا کہ کھانی تو پڑتی تھی۔ لیکن اگر یہ جوان میت گھر سے قبرستان میں بھیجی ہو اور وہ روٹی آئے تو پھر جس طرح سے وہ روٹی کھانی پڑتی ہے' قرآن نے اس روٹی کا اس قسم کا نقشہ کھینچا ہوا ہے' جو دوسری قوموں کے ہاتھوں ذلیل ہو کے قیدیوں کی طرح ملتی ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ "یہ وہ روٹی ہوتی ہے' جو حلق میں اٹک جاتی ہے' نہ کھائے بنتی ہے' نہ اگلے بنتی ہے' نہ نگلے بنتی ہے"۔ اور اس قیدی کے اوپر وہ نمبردار جو کھڑا ہوتا ہے جو جیل کا ہوتا ہے وہ اس میں ٹھونگ دیتا ہے: "کھا' وڈا بنڑیا پھرداسیں لاڈو خاں چوہدری"[2] قرآن کے عجیب الفاظ ہیں۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ (44.49)۔ بہت بڑا بنا پھرتا تھا۔ کہا کہ اس ذلت سے بچانے کے لیے ہم ان سے یہ کہتے تھے کہ یہ جو اپنے ہاتھوں شرف و مجد جاتا تھا' تو ذلت سے تو بچ جاؤ۔ کہا: وَالشَّجَرَۃَ الْمَلْعُوْنَۃَ فِی الْقُرْاٰنِ وَنُخَوِّفُھُمْ (17.60)۔ ہم تو یہ باتیں تمثیلاً بیان کر کر کے ان کو کہتے تھے کہ "بابا! اب بھی باز آ جاؤ' ذلت تو اٹھانی نہ پڑے"۔ ہوا کیا؟

---

[1] آج اسے پنجابی میں "کڑوی روٹی" کہتے ہیں۔

[2] کھاؤ اسے' تم بڑے لاٹ صاحب بنے پھرتے تھے۔

Marfat.com

ہم تو انہیں اس طرح ان پر آنے والی تباہی سے متنبہ اور خائف کرتے چلے آئے۔**فَمَا یَزِیْدُھُمْ اِلَّا طُغْیَانًا کَبِیْرًا** (17:60)۔ اگر وہ عقل وفکر سے کام لیتے تو بات سمجھ میں آ جاتی لیکن ہر بات میں جو سرکشی، گھمنڈ، بے باکی، یہ نخوت اور تکبر تھا، وہ یہ باتیں بھی سمجھ میں نہیں آنے دیتا تھا۔اب نتیجہ یہ ہے کہ مملکت گئی، کعبہ ہاتھ سے نکل گیا۔قریش کا وہ جو سفر اور معاہداتِ سامان تھے، وہ سارے ختم ہو گئے۔ قیدیوں کیطرح پابہ زنجیر تمہارے سامنے آ گئے۔انہی چیزوں سے ان کو وارننگ (Warning) دی جاتی تھی۔کہا جاتا تھا کہ یہی چیزیں ہیں کہ جن کو قوم سمجھ لے تو بچ سکتی ہے۔کرامات اور شعبدے سے کچھ نہیں بنتا ہے۔ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 60 تک آ گئے عزیزانِ من! 61 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

Marfat.com

بارھواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 61 تا 65)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ قَالَ
ءَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ﴿٦١﴾ قَالَ أَرَءَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ
الْقِيَٰمَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ
جَزَآءً مَّوْفُورًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ
وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَٰلِ وَالْأَوْلَٰدِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَٰنُ إِلَّا غُرُورًا ﴿٦٤﴾ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ
لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ﴿٦٥﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1975ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 61 سے ہو رہا ہے (17:61)۔

انسانی پیدائش کی ابتداء اور تورات کا بیان

انسان کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ یہ چیز عیسائیوں کے ہاں تورات میں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی طرح سے مٹی کا ایک پتلا بنا دیا۔ اس میں اپنی روح پھونک دی، جان پڑ گئی۔ اکیلا تھا، پسلی کو چیرا، اس میں سے اس کی بیوی اماں حوا کو نکالا اور جوڑا بن گیا۔ آگے تو اب بات ہی آسان ہوگئی۔ آج ہم ان باتوں کو پڑھتے ہیں تو ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ کس قسم کی کہانیاں ہیں، جو ان لوگوں نے اپنے ہاں بنائیں لیکن انسانی فکر کے سلسلہ میں اس چیز کو بھی تو نگاہ میں رکھیے کہ قرآن نے خود اپنے سمجھنے کے لیے یہ بتایا تھا کہ سَنُرِيهِمْ ءَايَٰتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِيٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یہ ٹھیک ہے کہ عربی زبان کا یہ قرآن ہے۔ اس نے زور دیا ہے کہ تصریفِ آیات سے بھی یہ مطالب کو واضح کرتا ہے لیکن ایک تیسری شرط بھی تو اس کے اندر ہے کہ ''اس خارجی کائنات میں اور خود انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر جو چیزیں، جو حقائق، پوشیدہ ہیں، وہ ہم باہر لاتے چلے جائیں گے۔ وہ باہر آتے چلے جائیں گے، بے حجاب ہوتے چلے جائیں گے، ان کے انکشافات ہوتے چلے جائیں گے اور جوں جوں ان کا انکشاف ہوگا، قرآن کے حقائق اسی شکل میں زیادہ وضاحت سے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے'' (41:53)۔ یہ جو تیسری

Marfat.com

شرط ہے یہ انسان کی علمی سطح سے متعلق ہے۔

انسان کی علمی سطح کی کیفیت

انسان کی علمی سطح کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اس میں تحقیقات وانکشافات کے ذریعے سے' ریسرچز (Researches) کے ذریعے سے' آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہر دور میں انسان کی علمی سطح، پچھلی سطح کے اوپر جو ایک ردا (Cover) رکھا ہوا ہوتا ہے' اسے اٹھاتی ہے اور اس کے مقابلے میں اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ غار کے زمانے کے انسان کو لیجیے اور آج کے انسان کو لیجیے' کہنے کو تو دونوں ہی انسان ہیں لیکن آپ دیکھیے یہ دونوں ایک نوع کے فرد نظر نہیں آتے۔ یہ کیا فرق ہے؟ یہ علمی سطح کا فرق ہے۔ تو قرآن نے خود ہی یہ تیسری چیز بتائی کہ انسان کی علمی سطح جس قدر بلند ہوتی چلی جائے گی تو اُس کی ہر علمی تحقیق کا انکشاف قرآن کی کسی نہ کسی حقیقت کی تائید کرتا چلا جائے گا یا اس کی وضاحت کرتا چلا جائے گا یعنی وہ بات سمجھ میں آتی چلی جائے گی۔ لہٰذا آج سے ہزار سال پیشتر کے انسان کی علمی سطح آج کے مقابلے میں بہت پست تھی۔ وہ اسی چیز پہ اکتفا کر سکتے تھے کہ جو آ رہی تھی اور ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ ان کتابوں سے ہماری طرف وہ چیزیں آئیں کہ جن میں تحریف ہو چکی ہوئی تھی' جن میں انسانی خیالات مل چکے تھے' مخلوط ہو چکے تھے۔ یعنی اس زمانے میں وہاں تورات ہی ایک کتاب تھی' جس میں وہ راہنمائی لے سکتے تھے تو اس کی وجہ سے یہ قصہ اس میں سے لیا گیا اور جس شکل میں یہ مشہور تھا یہ اسی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔

ہماری سوچ پر وضعی روایات کا اثر

اس باب میں ہماری بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے کسی ایک دور میں سمجھے ہوئے قرآنِ کریم کو حرفِ آخر سمجھ لیا اور بس یہ سمجھا گیا کہ اس کے آگے تو اب سمجھا ہی نہیں جا سکتا چنانچہ اب اس بنیادی غلطی کی بنا پر پھر بنیاد اس چیز پہ تھی کہ وہ جو کچھ ان سمجھنے والے مفسرین نے اپنے طور پہ لکھا' انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے ایسا سمجھا ہے بلکہ اس کی تائید میں وہاں کوئی نہ کوئی روایت درج کر دی۔ یہ روایات خود وضعی تھیں۔ اب جو بات آگے چلی تو جو کچھ انہوں نے اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق کہا تھا' وہ بات عقیدہ کی رو سے کہدی گئی کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا ہے اور جب کسی مسلمان کے سامنے یہ بات آئے کہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد ذہن میں یہ بات بھی آئے کہ میں اس سے الگ بھی سوچ سکتا ہوں یا کچھ اور کہہ بھی سکتا ہوں یا معاذ اللہ اس سے بھی بہتر کچھ اور کہا جا سکتا ہے۔

وضعی روایات کی روشنی میں پہلی لکھی جانے والی تفسیر طبری اور ہم

یہ جو آگے مزید سوچ کے دروازے تھے' وہ اس بات نے بند کر دیئے۔ آپ کی امت کے ساتھ جو گزر رہا ہے یہ بہت بڑا المیہ ہے' یہ

Marfat.com

بہت بڑا حادثہ ہے۔ اب جو طبری [1] کی پہلی تفسیر آپ کے سامنے مشہود شکل میں موجود ہے' اس میں انداز یہی اختیار کر لیا گیا ہے اور یہ وہی چیز تھی جو روک بن کے کھڑی ہوگئی کہ:

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

اس کے بعد ہم نے اس پہ مزید کسی قسم کی سوچ کو دخل ہی نہیں دینے دیا۔ اور یہی چیز آج مشکل سی چیز ہے کہ جہاں کہیں آپ اس قرآن کے متعلق ہی کوئی علمی بات کیجیے تو اس پہ اعتراض یہ نہیں ہوتا کہ علم کی بارگاہ سے یہ بات غلط ہے جو تم کہتے ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف کہتے چلے آئے ہیں' یہ اس کے خلاف ہیں۔ اسلاف بھی تو پیغمبر نہیں تھے لیکن اسلاف نے جو کہا ہے اس کی بنیاد پیغمبر کے قول پر بزعم خویش رکھ دی گئی حالانکہ وہ قولِ پیغمبر نہیں ہے۔

قصہ ابلیس و آدم اور قرآن

یہ چیز جو قصہ ابلیس و آدم میں بھی آ رہی ہے' ابھی تو معلوم نہیں انسان کی اس علمی تحقیق نے کہاں تک لے جانا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی جس سطح تک یہ پہنچی ہے' نظر آتا ہے کہ قرآن نے اس قصہ کو جو اتنی بار دہرایا ہے' یہ بڑا ہی اہم قصہ ہے۔ عزیزانِ من! اب اس کی اہمیت بڑی نمایاں طور پہ سامنے آنی شروع ہوئی ہے۔ عالمِ آفاق' خارجی کائنات' جسے آپ فزیکل ورلڈ (Physical world) کہتے ہیں' جو کچھ ہے اس کے متعلق بھی بہت سے حقائق ایسے آئے ہیں کہ جن سے قرآن کی یہ حقیقتیں یا دعاوی ثابت ہو کے سامنے آتے چلے گئے لیکن یہ بات قریباً تین چار سو سال سے شروع ہوئی ہے۔ خارجی کائنات کے متعلق Scientific Rresearch یورپ میں شروع ہوئی۔ ہمارے ہاں کا سائنسی دور تو مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا لیکن یہ پھر بھی ایک عرصہ سے شروع ہوا تھا۔ قرآن کے بہت سے حقائق ہیں جن کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہے' اس کی سائیکالوجی سے ہے اور اس سائیکالوجی نے اگرچہ اب بھی سائنسی حیثیت اختیار نہیں کی لیکن اس کے متعلق جو بھی ریسرچز Recently شروع ہوئی ہیں یہ عجیب وغریب چیز ہے کہ اس ساری تحقیق کا رخ بھی اس پہ جا رہا ہے جسے میں کہوں گا کہ قرآن کے الفاظ میں یہ قصہ ابلیس و آدم کے متعلق ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ساری ریسرچز بغیر نام لیے اس پہ ہو رہی ہیں کہ یہ ابلیس کیا ہے اور ان کی ریسرچ کی عجیب وغریب چیزیں آ رہی ہیں' جو میں سمجھتا ہوں کہ جنہیں شائد یہ معلوم بھی نہیں کہ قرآن کیا ہے' انہوں نے اسے کبھی دیکھا بھی نہ ہو' میں نہیں کہہ سکتا' لیکن ان کے ہاں کی تحقیق میں یہ

---

[1] محمد جریر ابن طبری ... ستان کے قصبہ امل کے رہنے والے ایرانی تھے۔ یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں پرورش پائی اور یہیں سے تحصیل علم کے لیے باہر نکلے۔ 44 برس تک تحصیل علم میں سرگرداں رہے۔ (شیعہ تھے لیکن) از روئے تقیہ سنی بنے رہے۔ ان کے دادا کا اصل نام رستم تھا۔ اسلام قبول کرنے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابن جریر خالص شیعوں کے لیے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لیے جو کتاب لکھتے تھے ان میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے۔ شیعہ حضرات انہیں شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہ 224ھ میں پیدا ہوئے اور 311ھ میں وفات پائی۔ (علامہ تمنا عمادی مرحوم)

بھی نہیں آتا ہے۔ جہاں تحقیق پہنچ رہی ہے وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعویٰ کی تصدیق کر رہی ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ ابلیس کیا ہے اور اب تو یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کیے چلا جا رہا ہے۔ یہ ابلیسیت کا مسئلہ آج سائیکالوجی کا بنیادی موضوع بن گیا ہوا ہے۔

علم نفسیات (Psychology) اور قرآن کا باہمی ربط: دنیائے دانش میں انقلابِ عظیم

عزیزانِ من! آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ میں نے بھی اپنی استعداد و فراست کے مطابق قرآن کو اسی طرح سمجھا ہے۔ جہاں میں نے قرآن کی لغات لکھی ہے' جہاں میں نے قرآن کا مفہوم لکھا ہے' جہاں میں نے قرآن کی اتنی جلدوں کے اندر تبویب کی ہے' وہاں اس کے ساتھ ساتھ اس سائیکالوجی میں خاص طور پر جو تحقیق ہوتی چلی جا رہی ہے' وہ بھی میرے پیشِ نظر رہی ہے اور رہتی ہے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا اور یہ جواب سائیکالوجی میں تحقیق آ رہی ہے' جس میں ان لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ جسے انسان کی فطرت کہتے ہیں وہ کیا ہے' اس کی نفسیات کیا ہے؟ اس میں جو چیزیں سامنے آ رہی ہیں' اس میں بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ یہ ابلیس و آدم کا قصہ ہے کیا؟ اور پھر پتہ چلتا ہے کہ صاحب! لاریب یہ انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ چودہ سو سال پیشتر کسی انسان کے حیطۂ فکر میں یہ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہمارے پاس تو فلاسفی کی ہسٹری اڑھائی ہزار سال سے چلی آ رہی ہے۔ وہ تو اس طرح ہمارے ہاں محفوظ چلی آ رہی ہے۔ اس میں کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ اور یہ آج کا سائیکالوجسٹ جو کہہ رہا ہے تو اس سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

میرے پاس ایک کتاب تھی' جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ پہلے تو وہی قرآن کی ان آیتوں کو ساتھ لیجیے' بات صاف ہوگی اور پھر آخر میں بتاؤں گا کہ اس بات پر کیا کیا ریسرچ ہو رہی ہیں اور دراصل بات کیا ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (17:61)۔ وہی بات آدم کی ہے۔ اس میں بات صاف ہوگئی کہ آدم کوئی Particular Individual نہیں' کوئی فرد نہیں۔ یہ آدمی کی داستان ہے' یہ انسان کی داستان ہے۔ یہ ملائکہ کائنات میں خارجی قوتیں ہیں جو خدا کے امر کو تدبیری شکل دے کر بروئے کار لا رہی ہیں۔ یہ صرف وہ ملائکہ ہیں جو عالمِ امر سے متعلق ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں' کس طرح کرتے ہیں' ہم نہیں جان سکتے۔ عالمِ خلق میں خدا کی یہ تخلیق کردہ قوتیں کس طرح کارفرما ہوتی ہیں' یہ ہے آپ کے ہاں وہ قانون جس کو قانونِ فطرت کہتے ہیں' Laws of Nature کہتے ہیں۔ یہ قوتیں کس طرح سے یہ Work کر رہی ہیں' یہ کس انداز سے خدا کے امر یا تدبیر کو بروئے کار لا رہی ہیں' یہ عالمِ خلق کے ملائکہ ہیں۔ یہاں ان کا یہ ذکر ہے۔ سارے قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان یہ سمجھتا تھا کہ یہ قوتیں مبہوت کن ہیں اور میں ان کے سامنے سجدہ گذار ہوں' ان کی پرستش کرنے والا ہوں۔ مثلاً بارش کا دیوتا' اگنی آگ کا دیوتا' برف' چمک' چاند' سورج' ستارے اور سیلاب حتیٰ کہ شیر اور سانپ' یہ ساری قوتیں تھیں جنہیں انسان سمجھتا تھا کہ یہ مجھ پہ غالب ہیں اور میں ان کے ماتحت مجبور ہوں' مقہور ہوں۔

Marfat.com

قرآن کا اعلان: کائنات کی یہ تمام قوتیں (ملائکہ) انسان کے سامنے سجدہ ریز ہیں

عزیزانِ من! قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی کہ یہ انسان کے سامنے مسجود ہیں۔ قرآن پاک نے کہا تھا کہ یہ سب تیرے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ مگر تو ان کے سامنے سجدہ ریز ہو رہا ہے' یہ شرفِ انسانیت کی کس قدر تذلیل ہے۔ قرآن نے سارے قصے کو الٹ کے رکھ دیا۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13)۔ تو یہی کائنات جو تمہارے سامنے ہے یہی نہیں ہے بلکہ وہ کائنات بھی جو ابھی ہے مشہود کائنات بن کر آگے آئے گی۔ یہ وہ کائنات ہے جو ابھی تمہارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں۔ اس میں بھی یہ جتنی قوتیں کارفرما ہیں' وہ ساری ہم نے تمہاری خادم بنادی ہوئی ہیں۔ اٹھو! ان سے کام لو۔ یعنی ایک فقرے میں سارے تصورات پلٹ کے رکھ دیئے۔ اتنا ہی کہہ کے مذاہب کی دنیا الٹ کر رکھ دی۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (17:61)۔ اتنی سی بات کے اندر عزیزانِ من! آپ کو معلوم نہیں کہ قرآن نے انسانی دنیا کے اندر کس قدر انقلاب برپا کیا ہے۔ یہ قوتیں وہ نہیں جن کے سامنے تو جھکے بلکہ یہ قوتیں وہ ہیں' جنہیں تو نے اپنے سامنے جھکانا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ سائنس کی دنیا کی تحقیقات نے یہ کتنی بڑی چیز بتادی کہ جس کے سامنے یہ قوتیں سجدہ نہیں کرتیں' سربسجود نہیں ہوتیں' وہ آدمی اس مقام آدمی تک ہی نہیں پہنچتا' مقامِ مومن تو بہت آگے آتا ہے۔ یہ جو یہاں ہمارے ہاں بحث چلی ہے' وہ ٹھیک ہے' وہ بیچارے کیا کرتے' یہی بحثیں تھیں کہ جی! ملائکہ سے کہا: سجدہ کرو' ابلیس نے نہیں کیا' حالانکہ وہ تو ملائکہ میں سے تھا۔ پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ جی! وہ تو ملائکہ کا بھی سب سے بڑا استاد تھا یعنی یہ سب کچھ' یہ سب افسانے' ہمارے ہاں عقیدہ سمجھے اور مانے جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اِلَّا کا استعمال

عربی زبان کے اہلِ علم جانتے ہیں کہ عربی زبان کے اندر بھی اِسْتِثْنَا Exception کا ''الا'' کیسے آیا کرتا ہے۔ سمجھنے کی ایک چیز تو یہ ہوتی ہے کہ ''اور تو سب آدمی آگئے لیکن وہ عبدالرحمٰن ابھی تک نہیں آیا۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عبدالرحمٰن ان میں سے ہی کا ایک فرد ہے مگر وہ نہیں آیا۔ اور ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ ''جو مہمان بلائے گئے تھے' ان میں سے مرد تو آگئے لیکن عورتیں نہیں آئیں۔'' تو یہ نظر آگیا کہ یہ مرد جو آئے ہیں وہ ان عورتوں میں نہیں ہیں' وہ عورتیں دوسری حیثیت کی ہیں۔ اس کے لیے بھی لفظ ''لیکن'' آیا ہے۔ وہ اس میں سے نہیں ہوتا' وہ دوسری نوع ہوتی ہے۔ یہ وہ ''الا'' ہے جو بتا رہا ہے کہ وہ ملائکہ میں سے نہیں ہے۔ یہ ان ملائکہ میں سے نہیں ہے کہ جن کو مسخر کر دیا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے کہ انہیں خدا کہے کہ سجدہ کرو اور وہ سجدہ نہ کریں۔ یہ ان میں سے نہیں ہیں۔ اب پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ لیکن بہرحال ہماری بحثیں اسی پہ چلیں کہ یہ جو ''الا'' ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ تو یہ ہے وہ کہ یہ ان میں سے نہیں ہے' یہ کچھ اور ہے۔ یہ بات آگے چلے گی۔ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (17:61)۔ یہ ایک چیز آئی ہے۔ قرآن نے دوسری

جگہ کہا ہے کہ پوچھا: بھئی! کیوں نہیں سجدہ کیا' تو اس نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اسے طین سے پیدا کیا گیا ہے' میری خلقت نار کی ہے' اور نار افضل ہوتی ہے۔ میں اس کے سامنے کیوں جھکوں؟ اس نے اس کے لیے Reason دیا ہے اور ان کے ہاں مذہب میں تو Reason حرام ہے۔ شرع کے اندر' تو عقل سے کام نہیں لیا جاتا۔ تو ہمارے ہاں اس بات کی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ عقل مردود ہے۔ اول من قاس ابلیس۔ جس نے اس بات کے لیے سب سے پہلے Reason دیا تھا' وہ ابلیس تھا۔ لہٰذا اب آپ کے ہاں جو بھی Reason دے گا' وہ ابلیس ہوگا۔ سو بات ختم ہوگئی۔ آپ کے ہاں یہ بحث چلتی ہے کہ جی! اس نے یہ Reason دیا تھا۔ میں بتاؤں گا یہ کیا چیزیں ہیں جو قرآن کہہ رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ''طین'' کے معنی گیلی مٹی ہوتا ہے۔ انسان کی تخلیق کے سلسلے میں قرآن نے جو سلسلہ ارتقاء Evolution بیان کیا ہے' وہ سائنس کی تحقیق کے عین مطابق ہے کہ سب سے پہلے Organic Matter' یہ مٹی پتھر' جس میں جان نہیں ہوتی' یہ تخلیق ہوا۔ اس کے بعد پانی ہے جس سے زندگی کی نمود ہوتی ہے' پانی اس مٹی کے ساتھ ملا' زندگی کی نمود ہوگئی۔ ساری تحقیق یہ ہے کہ پہلی زندگی کا جرثومہ جوہڑوں کے کناروں کے اوپر جو گیلی مٹی ہوتی ہے' اس میں ملا۔ یہ سائنس کی تحقیق ہے۔

طین اور طینت کا معنی

عزیزانِ من! اس گیلی مٹی سے جو لائف سیل (Life cell) پیدا ہوتا ہے' جو جرثومۂ حیات پیدا ہوتا ہے' وہ وہی ہے جسے قرآن طین یا طین لازب (37:11) کہتا ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ چیز بائیولاجیکلی (Biologically) ہے' جہاں ڈارون (Charles Robert Darwin :1809-82) پہنچا تھا۔ لیکن عربوں کے ہاں' یہ عجیب قوم تھی' یہ لفظ طینت تو آپ نے سنا ہوگا جیسے ''وہ بڑا بدطینت واقع ہوا ہے۔'' اسے وہ بدفطرت کے معنی میں لیتے ہیں یہی طین تو ہے' پتہ نہیں یہ قوم کیا بلا ہے' اس طین سے انہوں نے طینت بنائی اور اسے جبلت یا Instinct کے معنے میں استعمال کیا۔ بعینہٖ اس معنی میں آج کا سائیکالوجسٹ اسے استعمال کر رہا ہے۔ اور بحث ہی یہ چلا رہا ہے کہ انسان کی طینت کیا ہے' جسے پھر انسان کی فطرت (Nature) بھی کہا گیا ہے' اسے جبلت (Instinct) بھی کہا گیا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے ہاں بھی مروج ہیں۔ ہاں تو اسے Instinct کہا گیا ہے۔ میں ابھی آگے چل کے بات بتاؤں گا کہ یہ کیا ہے؟ یہ ساری بحث انسان کی اس خلقت پہ چل رہی ہے جو کہ طین سے ہوئی۔ قرآن نے کہا ہے: ''یہ طینت کیا ہے؟'' اور اس نے کیوں کہا تھا کہ اس کی طینت ایسی ہے کہ جس کے سامنے میں نہیں جھک سکتا۔ میں نے کہا ہے: آپ اسے جبلت (Instinct) کہہ لیجیے' فطرت (Nature) کہہ لیجیے۔

انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی

قرآن نے تو انسان کی فطرت (Nature of Man) سے انکار کیا ہے۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے' صاحبِ اختیار کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ اس پہ بھی آپ کے ہاں آج سائیکولوجسٹ (Psychologist) متفق ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ طینت کا وہی مسئلہ ان کے بھی زیرِ غور ہے۔ میں اسے یہاں یوں ہی بیان کرتا ہوا چلا جاؤں گا' جب یہ آیتیں ختم ہونگی تو پھر وہاں عرض کرونگا کہ یہ

Marfat.com

کیا انکشافات ہیں اور کیا بخششیں ہیں' جو آج چل رہی ہیں۔

آج اسی قصۂ ابلیس و آدم پر عجیب و غریب دنیا پیدا ہو رہی ہے' عزیزانِ من! ابلیس کیا ہے؟ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ (17:62) ۔ ''مٹی کا بنا ہوا آدم ہے اور مجھے کہا جا رہا ہے کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جا۔'' کیا انداز ہے ذرا دیکھیے تو سہی! یہ اب عام الفاظ میں کہیے تو ہمارے ہاں طین کو تو مٹی کا باپ کہا کرتے ہیں۔ جب ابلیس سے کہا گیا کہ تو سعادتوں سے محروم رہ جائے گا تو اس نے کہا کہ اگر تیرا ہی فیصلہ ہے کہ اس حقیر سی چیز کو مجھ پر فضیلت دی جائے یہ تو محض عجیب چیز ہے۔ آپ کے سامنے سائیکالوجسٹ کی یہ تحقیق آئے گی' کہ وہ کیا ''شے'' ہے جو نہیں جھکتی۔ یہ بحث آئے گی کہ ان دونوں' آدم اور ابلیس' میں سے واقعی واجب التکریم کونسی چیز ہے۔ آپ کے الفاظ میں آدم ہے یا ابلیس ہے؟ ان ماہرینِ نفسیات کے الفاظ میں تو میں آپ کو آگے بتاؤں گا کہ اس کا Reason کیا ہے یا اس کی جبلت کیا ہے۔ ابلیس نے کہا: کوئی بات نہیں' ٹھیک ہے' ہمیں اس آدم کی وجہ سے دھتکار دیا۔ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا (17:62)۔ آپ سے صرف اتنی چیز کی مہلت مانگتا ہوں کہ جب تک یہ آدم کرۂ ارض کے اوپر ہے' اس وقت تک کے لیے مجھے بھی زندگی بخشی جائے۔ پھر دیکھ کہ میں اس کی نسل کے ساتھ' بجز معدودے چند' کیا کرتا ہوں؟ یہ نہ ہو کہ جہاں میں اس کو ذرا دباؤں' نیچے گرانے لگوں' تو پتہ لگے کہ کسی نے میرا ہی گلا گھونٹ دیا ہے۔ یہ تو اب مہلت دینا آپ کے بس میں ہوگا۔ اس کی جبلت کو بھی چھوڑ دے' مجھے بھی چھوڑ دے۔ شرط صرف یہی ہے کہ جب تک یہ ہو' اس وقت تک میں بھی آزاد رہوں۔ یہاں یہ جو ابلیس والی چیز میں آپ کے سامنے کہہ رہا ہوں' یہ سائیکالوجسٹ کی بیان کردہ ہے کہ یہ ابلس والی چیز آدم کے عروج کے ساتھ ہی ہے۔ اس کا اندازِ بیان ہی ایسا ہے۔ محاکاتی بات یوں ہی سمجھ میں آ سکتی تھی' عرب کے بدو کے بھی اور آج ایرک فروم (Erich Fromm:1900-1980) کے بھی قرآن کے کیا الفاظ ہیں۔ عزیزانِ من! اس نے کہا کہ یہ قصہ آدم و ابلیس ان معنوں میں لے لیجیے۔ انہی معنوں میں تو عرب کا بدو سمجھتا ہے' اب آ کے ان کے مجازی معنوں میں تو آج ایڈنگٹن (Eddington 1882-1944) بھی ان کو یوں سمجھتا ہے۔ انہی الفاظ سے ایرک فروم (Erich Fromm) سمجھ رہا ہے عزیزانِ من! میں ایرک فروم کی بعض تحریروں کا ترجمہ کرتا ہوں تو اُچھل پڑتا ہوں۔ نہیں' وہ ترجمہ نہیں وہ جو اپنی (Term) ٹرم use کرتا ہے اور میں اسے پڑھتا ہوں تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے قرآن کے کسی لفظ کی تشریح ہوتی ہے۔ بات ہوئی' ناں زبان کے استعمال کرنے کی۔ اور پھر آگے جو چیز تھی' وہ ہے: كَرَّمْتَ عَلَىَّ (17:62)۔ میرے مقابلے میں اس (آدم) کے واجب التکریم ہونے کی۔'' کہا کہ یہ چھوڑ دو۔ وہ جو میں ایک لفظ لایا کرتا ہوں! قرآن وہ لفظ یہاں لایا ہے: لَاَحْتَنِكَنَّ (17:62)۔ مجھے بھی اس کے ساتھ برابر چھوڑ دے اور پھر اس کے بعد دیکھ کہ میں اس کی نسل کے ساتھ کیا کرتا ہوں! ''کس طرح اس کی نسل کی تھوتھنی کو رسی سے باندھ کر' جدھر چاہے' لیے لیے پھرتا ہوں۔'' اور ''کرتا ہوں'' کا مطلب میں نے بار بار سمجھایا ہے۔ آج پھر اس کو دہرادوں۔ اس میں بات کرمت والی تھی کہ جی! یہ واجب التکریم ہے' اس (یعنی آدم) حقیر سی چیز کو مجھ پر فضیلت دی ہے۔ یہ جو بہت بڑا عزت والا ہے' دیکھ! میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ بات تو اتنی کہنی تھی کہ:

رشتہ در گردنِ من افگندہ اوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہی اوست

میری گردن میں تو اس نے تاگہ باندھ دیا' ایک زنجیر باندھ دی' میں اس کا غلام ہوں' محکوم ہوں' جہاں جہاں جی چاہے' یہ لیے پھرے۔

انسان کے پست جذبات کا نتیجہ

یہ جو میرے پست جذبات ہیں' میں ان کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے چلا جا رہا ہوں' یہ جہاں بھی مجھے لے جائیں۔ لیکن یہاں قرآن کریم میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے' وہ ہے: کـرمـت ۔ یعنی یہ میرے مقابلے میں' صاحبِ فضیلت ہو لیکن ایسی ایسی شکل پیدا ہو کہ یہ لیے لیے بھی پھرے اور اس کے لیے اس طرح پھرنے کے اندر تذلیل کا اتنا بڑا پہلو بھی ہو۔ یہ ہے ایک لفظ کہ جس میں بات سمجھ میں آ جائے کہ اس کے معنی ''ذلت کے ساتھ لیے پھرنا ہیں۔'' جس کی بنیاد میں اس کے پست جذبات مضمر ہیں۔

کوتل ❶ گھوڑے کی شان کے بالمقابل ایڑیاں کبھی ❷ دیئے ہوئے ٹٹو کا مقام

کَـرَّمْـتَ کے مقابل میں جو لفظ اب میں استعمال کر رہا ہوں' وہ شاید آپ کو یاد ہی ہوگا۔ اگر یاد نہ ہو تو اسے دہرا دوں' اور وہ یہ ہے کہ ایک تو کوتل گھوڑے کو بھی آپ لیے پھرتے ہیں۔ اتنے کا یہ گھوڑا نہیں ہے جتنے کا اس کے اوپر سامانِ آرائش وسجاوٹ اور زین وزیور ہوتا ہے۔ زین تک چاندی اور سونے کی ہوتی ہے۔ لگام کے ساتھ دائیں بائیں دو خدام ہوتے ہیں۔ ایسے گھوڑے کو بھی آپ اپنی مرضی کے تابع ہی چلاتے ہیں' ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بہرحال کچھ گھوڑا ہی سہی' ایک وقار تو ہوتا ہے۔ اور ایک وہ ہوتا ہے جو گاؤں کے لڑکوں کے' لونڈوں کے' ہاتھ میں کوئی ٹٹو یا بچھیرا آ جاتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہی پانچ سات لڑکے ہوتے ہیں اور وہ ہوتا ہے۔ ایک ٹٹو۔ نہ زین' نہ لگام' نہ رکاب' کچھ بھی نہیں۔ یہ کرتے کیا ہیں؟ جو رسی ہاتھ میں ہے خواہ وہ مونجھ کی ہی کیوں نہ ہو' وہ اسے لیتے ہیں۔ یہاں ہمارے گاؤں میں بھی کرتے ہیں' آپ نے بھی کبھی گاؤں میں دیکھا ہوگا۔ شہروں میں تو اس قسم کی بات نہیں ہوتی۔ ہاں تو وہ گردن میں باندھنے کے لیے رسی (A Piece of rope) نہ تو اتنی بڑی ہوتی ہے اور نہ ہی اتنی مضبوط ہوتی ہے اور وہ ٹٹو یا بچھیرا قابو بھی نہیں آتا تو وہ اس کا نیچے کا جبڑا اس رسی میں ڈال کر ''وٹ چاڑھ دیندے نیں''❸ قابو کرتے ہیں تو اس طرح سے وہ قابو تو آ جاتا ہے لیکن آپ دیکھیے کہ اس کے بعد اس کو پکڑ کے جو اس کا حشر کرتے ہیں' اس کے اندر آپ دیکھیے کہ اس طرح اس کو چلانے میں کتنا تذلیل کا پہلو ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں پنجابی میں ''اینوں کھبی کیندے ہیگے نیں''❹ اور یہ ہمارے ہاں کا محاورہ ہوگیا ہے کہ جی! وہ اس کے ساتھ

---

❶ وہ گھوڑا جو امیروں کی سواری کے آگے' آراستہ وپیراستہ ہو کر محض سجاوٹ اور دکھاوے کے لیے رہے۔
❷ تھوتھنی کو رسی سے باندھنا' مراد انتہائی ذلیل وخوار کرنا۔
❸ خوب مضبوط اور تنگ کر کے بہت زیادہ بل دے دیتے ہیں۔
❹ اسے کَھبِیٔ دینا کہتے ہیں۔

Marfat.com

چلتا ہے اس کی مرضی سے پیدل چلتا ہے اور کبھی دیکھیں تو اس کے اندر تذلیل کا پہلو جبر کے ساتھ ہوتا ہے اس کو باندھا بھی جاتا ہے اور اس میں ذلت بھی ہوتی ہے۔ کوتل گھوڑے جیسا انداز نہیں ہوتا۔ وہی جیسے یکہ گاڑی میں گھوڑا جوتا ہوا ہوتا ہے وہ انداز اس کا نہیں ہوتا۔ تازی [1] کا انداز نہیں ہوتا کہ گردن کو یوں فراز لیے وہ جارہا ہے۔ وہ تو پوچھو نہیں وہ گھوڑا کتنا حسین ہوتا ہے! اس کے مقابلے میں کہاں یہ کھِبَی دیا گدھا، گاؤں کے لڑکوں کے ہاتھ آیا ہوا، وہ بھی چھوٹے چھوٹے لونڈوں کے ہاتھوں میں آیا ہوا۔ لہٰذا ابلیس کہتا ہے کہ اسے مونجھ کی کھبی دونگا یہ اس کی کیفیت ہوئی۔ اور پھر دیکھو کہ اسے میں کتنا تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ یہ ہے ''احتناک'' جو قرآن ''کرمت'' کے مقابل لایا ہے۔ عزیزانِ من! انسان جب بھی اپنے پست جذبات کے تابع مجبور و محکوم ہو جاتا ہے اور پھر جس ذلت کے ساتھ وہ اپنے مقاصد کا حصول کرتا ہے وہ تو پوچھو نہیں۔

انسان اور حیوان میں فرق صرف غیرت کا ہوتا ہے

اس میں پہلی چیز جو ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسان بے غیرت ہو جاتا ہے۔ اور غیرت ہی تو ایک چیز ہے جو حیوانوں اور انسانوں میں وجہِ امتیاز ہے۔ حیوان میں تو غیرت کا سوال نہیں ہوتا۔ یہ انسان کے اندر ہوتا ہے اور جب یہ اپنے پست جذبات کا محکوم ہو جاتا ہے تو غیرت بھی اٹھ جاتی ہے۔ میں ابھی بتاؤنگا۔ اور پھر جس حد تک یہ ذلیل ہوتا ہے اس کے لیے قرآن نے ایک لفظ کہا ہے جو اس آیت کے اندر ہے کہ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (17:62)۔ تو دیکھ پھر میں کس طرح سے اسے کھِبَی دے کے نچاتا ہوں۔ قَالَ اذْهَبْ (17:63) کہا: ٹھیک ہے، جاؤ۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ ہاں تم بھی منتظرین میں سے ہو، یہ بھی منتظرین میں سے ہوگا۔ تمہیں بھی چھٹی دی جاتی ہے اسے بھی چھٹی دی جاتی ہے۔ جاؤ۔ اور اس کے بعد یہ Fair Play ہوگی، Foul نہیں ہوگا۔ ہم نے دخل نہیں دینا۔ دونوں کو چھوڑ دیا جائے گا لیکن ابھی سے تمہیں بتادوں۔ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (16:63)۔ کہ جو بھی تیرے راستے پہ، تیرے پیچھے پیچھے چلے گا، وہ اپنے مفادات کے تابع ذلیل ہونا شروع ہو جائے گا اور پھر اس کا لازمی نتیجہ جہنم ہے۔

جہنم جہاں انسانیت جلادی جاتی ہے

آپ کو بتاؤنگا کہ جہنم [2] خود عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ یہ بیت المقدس کے کوہساروں [3] میں ایک وادی تھی، جہاں ایک دیوتا تھا، جس کے حضور زندہ انسانوں کو جلادیا کرتے تھے۔ اسے وادیٔ جہنم کہتے تھے۔ یہ وہ لفظ ہے اور یہ ہے وہ مقام کہ جہاں انسانیت جلادی جاتی ہے۔

---

[1] عربی نسل کا نہایت عمدہ گھوڑا۔

[1] یہ عربی الاصل ہے اور دو لفظوں کا مرکب ہے۔ جِیْ جس کے معنی وادی (Valley) ہیں اور ھِنُّوم جو کہ ایک آدمی کا نام تھا۔ یہ تھی وادی ھِنُّوم۔ یہ یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانہ قدیم میں مولوک (عَمُّوْ نِیِّیْنَ کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلاکر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہٰذا جِیُ ھَنُّوم سے مراد تھی وہ وادی جہاں انسان ذبح کیے جاتے تھے اور انہیں جلایا جاتا تھا۔ اسی جِیُ ھَنُّوم سے لفظ جہنم بنا۔ (بستان ۱۸۷۰)

[3] سلسلۂ کوہ (پہاڑ)

Marfat.com

میں کیا کیا کہوں کہ ابلیس انسانیت کو جلانے کے لیے کس کس انداز سے کیا کیا کرتا ہے اور اسے اس طرح سے کھبیٔ دے کے چلانے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کرتا ہے۔ اس سے پہلے یہ بات بھی ذرا نمایاں طور پہ سامنے نہیں آئی۔ اب ہمارے اس دور میں یہ بات یوں نکھر کے سامنے آ گئی ہے جیسے کہ کوئی ریڈیو سے اعلان کر رہا ہو۔ پہلا لفظ ہی ریڈیو کا ہوتا ہے: **بِصَوْتِکَ** (17:64)۔

صرف آواز کا حربہ

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِکَ (17:64)۔ ابلیس کے کہنے کے مطابق اس کا ایک حربہ یہ ہوگا کہ نہ میں لشکر استعمال کرونگا، نہ گھوڑے دوڑا کے لاؤنگا، نہ کہیں سے فوجیں لاؤنگا، نہ ان کے سامنے آؤنگا، کچھ نہیں۔ صرف آواز کے زور (Propaganda) پر ہی دیکھنا کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ یہ آپ کے ریڈیو پہ، آپ کے ٹیلیویژن پہ، وہی آواز صبح کے وقت سامنے آتی ہے۔ اس آواز نے قوموں کی قوموں کو تباہ کر کے رکھ دیا عزیزانِ من!

بِصَوْتِکَ (17:64)۔ خالی آواز سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ آواز سے کیا کیا انقلاب پیدا کیا جاتے ہیں، کس طرح قوموں کو جہنم رسید کر دیا جاتا ہے۔ کہا کہ جو ذرا سخت جان واقع ہونگے ان کے لیے مجھے اس کی ضرورت آئے گی کہ **وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِکَ وَرَجِلِکَ** (17:64)۔ ٹھیک ہے اگر ایسے پروپیگنڈے کے ذریعے سے وہ تسلیم نہیں کرے گا، میری مرضی کے مطابق نہیں چلے گا، ضرورت ہوگی تو فوج بھی لے آیا کرونگا۔ وہ کبھی کبھی ضرورت پڑے گی۔ پہلی چیز وہی قوت ہے، فوج تو مستقل نہیں رکھی جا سکتی کہیں، یہ تو وقتی چیز ہے، ہنگامی چیز ہے، ایمرجنسی کی چیز ہے۔ اتنی سی چیز ہے کہ جب یہ چیزیں قابو میں نہ آنے والی ہوں تو قوت کے ذریعے سے قابو کیا جائے۔ لیکن ہمیشہ قوت کے ذریعے اس کو کیسے قابو رکھا جائے۔ اسے کہا: اس کے لیے ہماری دوسری شکل ہوگی۔ اگلی بات کے لیے یہ کہا: **وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ** (17:64)۔ ان کی معشیت کو اتنا تباہ کر دونگا کہ اپنی روٹی کے لیے میرے محتاج ہو جائیں گے پھر مجھے فوج کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، پھر ہمارے پاس آ کے بھیک مانگتے پھریں گے۔ کبھی تو یہ صورت ہوگی کہ وہ اس پیسے کے لیے ہی ہمارے پاس آئیں گے۔ کبھی میں مخلوط قسم کی ایک اکانومی (Economy) کروں گا جس میں 49% تمہارے 51% ہمارے ہوں گے اور آگے آیئے ہم ایک بہت بڑا پلان بنائیں گے، ایک بہت بڑا کنسرن پیدا کریں گے۔ **شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ** (17:64)۔ باہمی مشارکت سے ایک کنسرن بنا لیا جائے گا۔ میں بھی اس میں اپنا پیسہ (Finances) لگا دونگا **وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ** (17:64)۔ ان کا پیسہ بھی اس میں لگوا لونگا لیکن دستِ غالب اپنا رکھونگا اور پھر اس زور کے اوپر آپ دیکھیے کہ کیا کیا کچھ اس سے کراؤنگا۔ یہ تو ان کی موجودہ قوموں کے ساتھ کروں گا۔ باقی رہیں ان کی آنے والی نسلیں، ان کے لیے کہا کہ **وَ الْاَوْلَادِ** (17:64)۔ ان کو تعلیم کے ذریعے سے اپنے قابو میں رکھونگا۔ اولاد سے یہ کچھ کرونگا۔ کہا کہ پھر اگر ان ٹیکٹکس (Tactics) کا انہیں علم ہو گیا تو کیا کرو گے؟

Marfat.com

شعبۂ تعلیم اور ابلیس کی کارفرمائی

پوچھا: جب تیری یہ چیزیں، تیری یہ چالیں، بے نقاب ہونی شروع ہو جائیں گی تو پھر کیسے فریب دو گے؟ کہنے لگا: اس کو فریب دینا تو بڑا آسان ہے۔ کہا: وَعِدْهُمْ (17:64)۔ وعدے پہ وعدہ دیئے چلا جاونگا، کیے جاونگا Promise پہ Promise۔ اور یہ دونگا اور وہ دونگا۔ اب ساتھ ہی کہا: وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (17:64)۔ وعدے سب جھوٹے ہونگے لیکن اتنے جاذب وعدے ہونگے کہ ان کے ہاں کا بڑے سے بڑا کنسرن (Concern) میرے کنٹرول میں ہوگا۔ یہ ہوگا آخری حربہ جو میں ان سے کرونگا۔ عزیزانِ من! کہو کسی سے چودہ سو سال پہلے کہ وہ یہ تصویر کھینچ کے بتادے کہ ابلیس کیا کرے گا؟ کہا: پھر اس طرح سے اس کے ساتھ یہ کچھ کروں گا، جناب نے اسے واجب التکریم جو بنایا ہے! كَرَّمْتَ (17:62)۔ میرے مقابلے میں، اسے فضیلت جو دی ہے۔ پھر دیکھو میں ان حربوں سے کھِبِّیْ دے کے، کس طرح سے اسے نچاتا ہوں۔ عزیزانِ من! اس کے لیے تو ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، اپنی ہی حالت کافی ہے۔ آج ہم کس ذلت کا ناچ ناچ رہے ہیں اور ایسی سوخت، کمبخت قوم ہیں کہ ان حربوں میں سے یہ نہیں ہے کہ کوئی یہاں ایک ہی حربہ استعمال ہو رہا ہو۔ یہاں تو سارے ہی حربے استعمال ہو رہے ہیں۔ کونسا حربہ تھا، جو ابلیس نے چھوڑ دیا ہے۔ اس نے ہمارے اوپر یورش کر دی ہے۔ اب یہاں وہ بات آئی ہے، جو میں نے آگے کہنی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ سائیکولوجی (علمِ نفسیات) وہ چیز ہے جہاں قرآن منفرد ہو کے سامنے آتا ہے، میں ابھی عرض کرونگا۔ کہا: یہ ٹھیک ہے، تم کر لو تمہاری بڑی قوتیں ہونگی۔

ابلیس کے ان حربوں سے کیونکر بچا جا سکتا ہے

سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا سارے انسان ایسے ہی ہونگے کہ جن پر یہ غالب آیا ہوا ہوگا اور ان میں سے کوئی بچ ہی نہیں سکے گا یعنی انسان ہونے کی حیثیت سے، ایک نوع کی حیثیت سے، کیا The Man ایسا ہی ہے کہ ابلیس اس کے اوپر اتنا غالب آجائے یا انسان کے اندر کوئی ایسی صورت بھی ہے کہ وہ اس کے باوجود اس پر غالب نہ آسکے۔ یہ ہے اصل نکتہ جہاں میں نے عرض کیا ہے کہ سائیکالوجی آج اس پہ پہنچی ہے۔ جہاں قرآن نے یہ بات کہی ہے، میں ابھی عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات تو میں نے یہ کہی تھی کہ قرآن نے یہ کہہ کے کہ کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) آدم کے سامنے سربسجود ہیں، آدم ان کا مسجود ہے، ایک انقلاب (Revolution) برپا کیا تھا۔ کائنات کے اندر آدم کو جو مقام دیا تھا، وہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ یہ ایک دوسرا چیلنج سائیکالوجی کا چیلنج ہے۔ یہ نفسیاتی چیلنج ہے۔ یہ آفاقی چیلنج تھا، نفسیاتی چیلنج یہ ہے، جسے قرآن نے بتایا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ انسان کی خلقت ہی ایسی ہے کہ ہر انسان ابلیس کے قابو آرہے گا۔ یہ بات نہیں ہے۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (17:65)۔ کہ تو ان سے اپنی معبودیت اختیار کرانا چاہتا ہے، ٹھیک ہے، قرآن نے کہا ہے کہ تم نے ان لوگوں کی حالت کو بھی دیکھا کہ جنہوں نے اپنے جذبات

Marfat.com

کو ہی اپنا الہ بنالیا ہوا ہے۔ ایک تو وہ ہوگئے جنہوں نے اپنے ہی جذبات کو اپنا الہ بنالیا، ابلیس ہی کو اپنا الہ بنالیا۔ اور دوسرے کون ہوئے؟

انسانی زندگی میں ایک دوسرا انقلاب

کہا: کہ دوسرے وہ ہیں جنہیں قرآن نے عبادی کہا ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے مجھے الہ تسلیم کرلیا ہے۔ وہ جو مجھے الہ تسلیم کریں گے، میری محکومیت اختیار کریں گے، ان پر تیرا غلبہ نہیں ہوسکتا۔ بات یہ بتائی ہے کہ انسان کے اندر یہ چیز موجود ہے کہ اگر وہ اس روش کو اختیار کرلے تو پھر اس پر ابلیس غالب نہیں آسکتا اور یہ ہے دوسرا انقلاب جو میں نے عرض کیا ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (17:65) ۔ ابلیس سے کہا کہ وہاں پہنچ کے تو دیکھے گا کہ اگر وہ اللہ کے "عباد" ہوگئے، جنہیں خدا نے "عبادی" کہا ہے تو اس کے بعد تو دیکھے گا کہ پھر انہیں اللہ پر اتنا کافی اعتماد و بھروسہ ہوگا کہ تو غالب نہیں آسکے گا۔ یہاں سے بات دیکھیے کہ کیا ہوئی؟

عیسائیت کا تصورِ حیات

عیسائیت نے ایک تصور دیا کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ اپنے اولیں ماں باپ کی معصیت کے گناہ کا بوجھ اپنی پشت پہ لادکے دنیا میں آتا ہے، ہر انسانی بچہ Without Exception گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ وہاں سے یہ مسلمہ ہوا کہ انسان کی فطرت ہی بد ہے کیونکہ پیدائش کے ساتھ ہی گناہگار پیدا ہوا۔ اگلا مسلمہ انہوں نے یہ کہا کہ یہ جو آلائش جسے ساتھ لے کے وہ بچہ پیدا ہوتا ہے، یہ اس کے اعمال، سعی وکاوش اور محنت سے مستقل طور پر دھل ہی نہیں سکتا۔ تو جو شے پیدائش کے ساتھ اس کے اندر ودیت کی گئی اور اسے اختیار ہی نہ ہو کہ وہ اسے الگ کر سکے، اسی کو ستم کہتے ہیں، تو یہ مسلمہ ہوگیا کہ انسان فطرتاً بد واقع ہوا ہے۔ Evil انسان کی نیچر کے اندر ہے۔ اب جب یہ چیز مستقل طور پہ ہوگئی تو ابلیس اس پر سوار ہوگیا جس کو اگر آپ (Evil) ایول کہیں گے تو ابلیسیت کے عقیدے کا تو یہ فطری نتیجہ نکلا۔

عیسائیت کے عقیدے کی بنا پر انسان مجبور قرار پا گیا

اس سے ہوا یہ کہ ایک تو یہ کہ انسان مجبور ہوگیا یعنی یہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ ایک کلین سلیٹ (Clean slate) لے کر آئے یعنی یہ کہ اس پہ پہلے سے کچھ نہ لکھا ہوا ہو۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہاں وہ پیدائش کے ساتھ ہی ایول (Evil) آیا۔ معاف رکھیے گا کہ اب اس بحث میں چند علمی سی Academic، سائیکالوجی، کی باتیں آئیں گی تو ان کا استعمال مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایول (Evil) 'شر' انسان کی نیچر کے اندر Inherited ہے۔ اور اس کے بعد ان کے ہاں اگلا عقیدہ Determination کا ہے یعنی عقیدۂ جبر کہ انسان کو اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اس شر ایول (Evil) کو الگ کر کے اس سے بچ سکے۔ یہ ہیں دو مسلے: Evil by Nature اور Determinism کہ فطری پور پہ نہ صرف یہ کہ بد ہے بلکہ مجبور بھی ہے صاحب! یہ

Marfat.com

تھا وہ تصور جو عیسائیت نے دیا۔ میں لمبی تفصیل میں نہیں جاتا کہ مجھے وقت اتنا زیادہ نہیں ملے گا کہ بتاؤں کہ عیسائیت نے بھی یہ عقیدہ کہاں سے لیا تھا اور کیسے لیا تھا۔ بہرحال' یہ عقیدہ جو دنیا میں پھیلا ہے' وہ عیسائیت کی رو سے پھیلا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور ایول (Evil) یعنی بدی اس کے اندر ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس سے انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے' انسان کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ مذہب کے عقائد Deep Rooted ہوتے ہیں' اور یہ کہ یہ کس قدر انسان کے تحت الشعور کے اندر جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ کہ انسان مجبور ہے' میں ابھی آپ کو بتاؤنگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ عقیدہ عیسائیت کے مذہب کا پیدا کیا ہوا تھا۔

یورپ کے سائنسدانوں کا عیسائیت سے چھٹکارا

یورپ کے سائنسدان اور مفکرین نے عیسائیت کو چھوڑ دیا۔ جب انہوں نے سائنس کی تحقیقات شروع کیں تو خود عیسائیت نے ان کو مرتد قرار دیدیا۔ بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر (Unbiased) ریسرچ کرتے تھے۔ ان کے ہاں یہ بالکل طے تھا کہ ہم پہلے سے کوئی عقیدہ اپنے ہاں ذہن میں نہیں رکھتے چونکہ ان کے ہاں اس کا کوئی Substitute نہیں تھا' اس عقیدے کا کوئی بھی بدل نہیں تھا' انہوں نے ذہنی طور پہ عیسائیت سے چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن اندر خلا موجود رہا۔ دوسرا اس کی جگہ انہیں کوئی بدل نہ مل سکا۔ اگر وہ اسے چھوڑ کے قرآن کے نظریۂ زندگی (Theory of life) پہ آ جاتے تو کیفیت کچھ اور ہوتی۔ وہاں خلا رہا اور آپ جانتے ہیں کہ خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں۔ کوئی چیز بھی خالی نہیں رہتی۔ آپ دیکھیے کہ اس عقیدۂ جبر کو چھوڑنے کے باوجود اور نظامِ عیسائیت کو چھوڑنے کے باوجود' دہریت اختیار کرنے کے باوجود' وہ عقیدہ کتنی گہرائی میں گیا ہوا تھا۔ وہاں مغرب میں آدمی سے متعلق سولہویں صدی سے ریسرچز (Reaearches) ہونی شروع ہوگئیں۔ ڈارون (Charles Robert Darwin 1809-82) نے سب سے پہلے یہ چیز کہی کہ ''انسان اس طرح پتلا'' بننے والی بات نہیں ہے۔

میں مختصر الفاظ میں یہ عرض کرونگا۔ وقت ہمارے پاس بڑا تھوڑا ہوتا ہے۔ ہم ازل سے جو سنتے چلے آ رہے ہیں' تا حال وہی چلا آ رہا ہے کہ انسان حیوان کی سطح پہ پہنچا۔ حیوان کی سطح کے بعد انسان کی سطح میں آیا۔ چلیے' ڈارون کا یہ خیال تھا۔ یہاں آنے کے بعد ڈارون نے کہا کہ انسان نے یہ پیکر تو اختیار کر لیا لیکن اس حیوانیت کی جو Instinct تھی' جو حیوانیت تھی' جو حیوانی جذبات تھے' جنہیں Animal Instinct کہتے ہیں' جو حیوانوں کے اندر پیدائش کے ساتھ ہوتی ہیں' جنہیں کوئی حیوان بدل نہیں سکتا' چھوڑ نہیں سکتا' وہ اس میں موجود رہی۔ اس نے یہ کہا کہ چونکہ یہ حیوان کی اولیں شکل ہے' اس واسطے حیوان کے وہ جذبات اس کے اندر موجود ہیں' وہ انہیں بدل نہیں سکتا۔ اس نے انہیں Determinism کہا۔ یہ وہی عیسائیت کا عقیدہ ٹھہرا۔ اس سے آگے ایک School of Thought آیا۔ اس نے

اس پہلو کو Behaviour کہا۔ اس مکتبِ فکر نے کہا کہ نہیں‘ یہ بات نہیں ہے کہ اس کے اندر حیوانی جذبات ہیں‘ ان کی وجہ سے یہ مجبور ہے۔ انسان ان کی وجہ سے مجبور نہیں ہے۔ انسان بچپن سے ہی کچھ عادات (Habits) اور کچھ Behaviours ‘فارم (Form) کر لیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین سال کی عمر تک بچے میں یہ سارا کچھ ہو جاتا ہے‘ جو کچھ اس نے بننا ہوتا ہے وہ بن جاتا ہے۔ یہ Habits جو اس میں فارم (Form) ہو جاتی ہیں‘ یہی اس کے عقائد ہوتے ہیں‘ یہی اس کا مسلک ہوتا ہے‘ انہیں یہ چھوڑ نہیں سکتا۔ جب وہ شعور تک پہنچتا ہے تو یہ اتنی پختہ (Mature) ہو جاتی ہیں کہ وہ اس Behaviourism کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر انسان مجبورِ محض ہوتا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں یورپ کا اپنی تہذیب کے اوپر کتنا دعویٰ ہے کہ ہم نے انسان کو مادر پدر آزاد کر دیا۔ ایسا بااختیار نظر آتا ہے کہ وہ کوئی قاعدہ قانون مان ہی نہیں رہا لیکن ان کے ہاں کی Scientific Researches انہیں اس نتیجے پہ پہنچا رہی ہیں‘ جہاں عیسائیت کے عقیدے نے پہنچایا تھا کہ یہ مجبورِ محض ہے۔ اینتھر وپولوجسٹ (Anthropologist) ‘ماہرین علم الانسان‘ کہتے ہیں کہ نہیں‘ پہلے دور کا غاروں کا رہنے والا جو انسان تھا‘ وہ مختلف نسل انسانی کی صورت میں جو چلا آ رہا ہے‘ ترقی کرتا کرتا آہستہ آہستہ یہاں تک پہنچا ہے۔ ٹھیک ہے‘ خارجی دنیا میں اس نے اپنے ہاں بڑی ترقی کر لی ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ اولیں غاروں والے انسان کے ہاں کی چیزیں Inheritcally انسانوں کے اندر ایسی چلی آ رہی ہیں‘ وراثتاً چلی آ رہی ہیں کہ یہ انہیں نہیں بدل سکتا۔ وہ پھر کہتے ہیں کہ وہ انہیں نہیں بدل سکتا۔ اس کے بعد اگلا طبقہ سوشیالوجی والوں (Sociologists) کا ہے۔ انہوں نے کہا: نہیں‘ جس قسم کے ماحول میں انسان پرورش پاتا ہے‘ جس قسم کی اس کی سوسائٹی ہوتی ہے‘ یہ اس قسم کا انسان بن جاتا ہے حتٰی کہ جسے آپ Human Consciousness کہتے ہیں‘ انسانی شعور کہتے ہیں‘ دلیلِ انسانی کہتے ہیں‘ اس کے لیے باہر کا معاشرہ خود اس کا نفسِ انسانی بن گیا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اسے اندر نگل لیتا ہے‘ Internalize کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ مکمل طور پر ماحول کا پیدا کردہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہی بات آ گئی کہ ’’یہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا۔‘‘ یہ مجبورِ محض ہے۔

ان کے ہاں پہلا سائیکالوجسٹ فرائیڈ (Sigmund Freud:1856-1939) پیدا ہوا۔ اس کی بڑی تحقیق تھی۔ اس نے کہا کہ نہیں‘ انسان میں ایک تو Consciousness ہوتی ہے اور دوسری Sub-consciousness ہوتی ہے۔ یوں کہیے کہ ایک نفسِ شعوریہ ہوتا ہے اور دوسرا نفس غیر شعوریہ یا نفس تحت الشعوریہ ہوتا ہے۔ نفسِ شعوریہ تو وہ ہے جو عقل سے‘ Reason سے‘ Rationalism سے‘ باتوں کے فیصلے کرتا ہے۔ نفسِ تحت الشعور یا نفسِ غیر شعوریہ خالص جذبات کا ہوتا ہے۔ اس کے اندر 9:10 تحت الشعور ہوتا ہے اور صرف 1:10 اس کا نفسِ شعوریہ ہوتا ہے۔ نفسِ تحت الشعور یا نفسِ غیر شعوریہ کے لیے فرائیڈ The Master of House کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک The Master of The House نفسِ تحت الشعور ہوتا ہے۔ نفسِ شعور تو اس کا خادم ہوتا ہے اور جو کچھ نفسِ تحت الشعور میں ہے اس کو نفسِ شعور بدل نہیں سکتا۔ پھر وہی بات آ گئی کہ انسان تو مجبورِ محض ہے۔ آگے آئے‘ تو مارکس (Marx:1818-83) ملا۔ اس نے یہ بات کہی کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں‘ یہ سب غلط ہے۔ جس قسم کا

Marfat.com

معاشی ماحول ہوتا ہے، جس قسم کی معیشت کسی معاشرے کے اندر ہوتی ہے اس کے مطابق انسان بن جاتا ہے۔ پھر وہی بات آ گئی کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ انسان مجبور ہوتا ہے۔ مارکس کے مطابق انسان کا معاشرہ معاشی ماحول سے ہی بنتا ہے۔ وہ خود اپنا معاشرہ نہیں بنا سکتا اور ایک فرد کے خود کچھ بن جانے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ معیشت کی تبدیلیاں کیسے ہوتی ہیں؟ کہتا ہے: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ اس نے ایک چیز Historical Necessity کی کہی کہ یہ تاریخ کی ایک Necessity ہے۔ یہ فلسفہ کی ایک ٹرم (Term) ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں کہ تم کچھ ہی کرلو، یہ ہو کے رہنا ہے۔ تو جب سوال یہ ہو گیا کہ تم کچھ ہی کرلو، یہ ہو کے رہنا ہے تو پھر وہی Determinism آ ئی: یہی کہ انسان تو مجبورِ محض ہے۔

ڈارون سے مارکس تک انسانی سوچ کا ماحصل

یہ ساری ریسرچز، یہ ساری تحقیقاتِ انسانی' یہاں تک پہنچی ہیں' کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ جب یہ مجبورِ محض ہوا تو پھر اسے کسی چیز کا بھی اختیار نہیں ہے۔ ڈارون سے لے لیجیے اور مارکس تک آ جائیے تو یہ سوال جو ابلیس نے کہا تھا کہ ''تم دیکھو پھر میں کیا کرتا ہوں'' تو وہ تو سارا انہوں نے اسی نتیجے کے اوپر پہنچا دیا۔

قرآن کا ایک بصیرت افروز انقلابی اعلان

قرآن نے آ کر یہ کہا تھا کہ یہ غلط ہے۔ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ (17:65). انسان صاحبِ اختیار ہے' صاحبِ ارادہ ہے' مجبور نہیں ہے۔ اور یہاں آ کے اس نے عزیزانِ من! ساری فکرِ انسانی کی بساط الٹ کے رکھ دی۔ کہا: تم اسے مجبور کہہ رہے ہو' مجبور ہونے کا اعتراف ابلیس کرتا ہے۔ ابلیس اور آدم دونوں کو ایک حکم دیا گیا۔ ابلیس سے کہا گیا کہ اس کو سجدہ کرو۔ اس نے انکار کیا' معصیت کی۔ آدم سے کہا گیا کہ لَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2:35). اس مشاجرت کے قریب نہ جانا۔ اس نے بھی اس سے انکار کیا۔ ابلیس سے پوچھا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ کہا: ہیں' آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

ابلیس کا اپنی غلطی سے انکار اور آدم کا اعتراف

عزیزانِ من! غور کیجیے گا۔ ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے۔ بڑی اہم چیز ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پہلی دفعہ سائیکالوجسٹ کے نکتہ نگاہ سے یہ باتیں آئی ہیں۔ ابلیس سے پوچھا کہ تو نے کیوں انکار کیا ہے؟ کہنے لگا: کیا میں نے انکار کیا ہے؟ میں تو مجبورِ محض ہوں۔ تیرے حکم کے بغیر یہاں ذرہ نہیں ہل سکتا' پتہ نہیں ہل سکتا۔ مجھ میں انکار کی اتنی بڑی قوت کہاں؟ 'تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ میں تو نہیں' خدا خود یہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس پر یہ کہا گیا کہ تو اپنے آپ کو مجبور بتا رہا ہے' مجبوری کا نتیجہ: جاؤ تم دھتکارے ہوئے ہو' درماندہ ہو' تمہاری اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ جو اپنے آپ کو مجبور قرار دیتا ہے' وہ اپنے کسی فیصلے اور عمل کی ذمہ داری قبول ہی نہیں کرتا اور جو ذمہ داری قبول نہیں کرتا' اس کی

اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہوسکتی۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ''وہ ابدی طور پہ راندہ درگاہ ہوگیا'' ''اے نہیں سی کہ اللہ تعالیٰ نوں بڑا غصہ آ گیا سی''۔[1] یہ اتنی بڑی نفسیاتی حقیقت (Psychological Fact) ہے کہ ''جو اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اور اپنے آپ کو مجبور کہتا ہے' اس کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی''۔ اصلاح اس کی ہوگی کہ جس سے غلطی ہوجائے تو جب وہ ذمہ داری کو قبول کرے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے یہ قبول کیا کہ میں نے خود یہ غلطی کی تھی۔ اس کو ندامت ہوگی' اس کا اعتراف کرے گا۔ ابلیس نے اپنی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا جبکہ آدم نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (7:23)۔ میں نے خود اپنے آپ پہ ظلم کیا ہے' کسی اور نے مجھ سے نہیں کرایا۔ میں ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ میں نے کیا ہے اور جب ذمہ داری کو قبول کیا اور اعتراف ہوا کہ غلطی ہوگئی' اشکِ ندامت آنکھ سے گرا' اور یہ وہی اشکِ ندامت تھے جن کے لیے ڈاکٹر محمد اقبال[2] (C. 1877-1938) نے کہا تھا کہ:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

ندامت کیوجہ سے میری پیشانی پہ جو پسینہ آیا ہے' اسے شانِ کریمی نے موتی سمجھ کے چن لیا۔ کہا: ٹھیک ہے' تم نے اعتراف کیا ہے تمہارے لیے اصلاح کا راستہ ہے لیکن ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَ (2:38)۔ تجھے میری بطیب خاطر اطاعت کرنا ہوگی۔ میری طرف سے فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38)۔ جب تمہیں راہنمائی ملے گی تو تمہیں سفرِ حیات اس راہنمائی کے مطابق طے کرنا ہوگا تو پھر میری طرف سے یہ ہوگا کہ ''خوف نہ کرو' حزن نہ کرو' یہ کچھ بات نہیں ہے۔ اس لیے حزن نہ کرو اور خوف نہ کھاؤ'' شادکام رہو گے۔

قرآن کی تعلیم کے برعکس سائنس اور مذہب دونوں نے انسان کو مجبور قرار دیا

یہ کیا بات آ گئی؟ عزیزانِ من! یہاں ایک اور اہم بات آ گئی۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے ساری فکرِ انسانی کی بساط الٹ کے رکھ دی۔ دنیائے مذاہب ہو یا دنیائے سائنس ہو' یہ دونوں انسان کو مجبورِ محض قرار دیتے تھے۔ دراصل یہ جذبات تھے کہ جنہیں یہ دونوں غالب قرار دے رہے تھے۔ قرآن نے آ کے انسان کو صاحبِ اختیار قرار دیا۔ چنانچہ اس طرح وہ بساط الٹ کے رکھ دی۔ پہلے آپ نے دیکھا تھا کہ اس نے کیسے خارجی کائنات میں بساط الٹی تھی کہ خدا کی یہ کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) تو انسان کے سامنے مسجود

---

[1] یہاں یہ بات نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ کو بڑا غصہ آ گیا تھا۔

[2] ڈاکٹر محمد اقبال۔ عالمِ اسلام کا ایک مسلم فلاسفر۔ کے سالِ ولادت کے لیے ملاحظہ ہو: گلزارِ اردو (حصہ دوم)' سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ' جام شورو سندھ' 1995' ص۔ 169۔

ہیں۔ اور یہاں پہنچ کر اس نے پھر انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر ایک تبدیلی پیدا کی۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان صاحب اختیار ہے، یہ تو تیں انسان کے اوپر صاحب اختیار نہیں ہیں۔ یہ جو انسان کے اندر سے ایول (Evil) نکلتا ہے، جو بدی نکلتی ہے، جو پھٹتا ہے، یہ کیا چیز ہے؟ یہ کیسے آتا ہے؟ اس کے لیے قرآن نے دو لفظ استعمال کیے ہیں: ایک ابلیس' دوسرا شیطان۔ یہ دونوں الفاظ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی ہے؟ عربی زبان کی رو سے ابلیس کے معنی ہیں: Frustrated' مایوس ہو گیا اور شیطان کے معنی ہیں: Aggressive' بس پھر وہ جسے آپ دھاندلی پہ اتر آنے والا کہتے ہیں۔ بظاہر یہ دو متضاد سی چیزیں نظر آتی ہیں۔ مایوس تو بڑا افسردہ سا ہوتا ہے اور دھاندلی باز تو بڑا سرکش اور متکبر ہوتا ہے۔

قصۂ آدم انسانی نفسیات کا ہی ترجمان ہے

قرآن جس قصے کا ذکر کرتا چلا آیا ہے، یہ دراصل انسان کی نفسیات کا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ عزیزانِ من! ابلیس جس کی باتیں ہو رہی ہیں، کوئی باہر کھڑا ہوا نہیں ہے۔ یہ آدم کا ہی ذکر ہو رہا ہے، جس کی کدوکاوش کا نتیجہ Frustration اور Hopelessness ہے اور اس کی کاہش وکاوش کا اگلا نتیجہ Aggressive ہونا ہے۔ یہ سارا مسئلہ انسان ہی سے متعلق ہے۔ جسے آپ ظلم، استبداد اور دھاندلی کہتے ہیں، یہ سارا Aggression پر آ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ کرتا ہے، جو قوتِ غالب یا غلبے کی قوت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور جس میں یہ قوت نہیں ہوتی تو پھر یہ کمزور پر Aggression کرتا ہے۔ یہ جو Aggressiveness ہے، یہ انسان کے اندر ہے، جس کا نتیجہ Destructiveness ہوتا ہے، تخریب ہوتا ہے۔ اس طرح قرآنِ پاک کا قصۂ آدم دراصل انسانی نفسیات کا ہی ترجمان ہے۔

سرکشی کا نتیجہ مایوسی اور مایوسی کی انتہا خودکشی

ہر Aggression کا نتیجہ تخریب ہوتا ہے۔ انسان Aggerssion کی حالت میں ہمیشہ توڑتا ہے، پھوڑتا ہے، پاگل ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ باہر کی دنیا کو توڑتا، پھوڑتا، انسانوں کو توڑتا پھوڑتا ہے اور جب مایوسی کی انتہا ہو جاتی ہے تو خودکشی (Suicide) کر کے اپنے آپ کو توڑتا ہے۔ ابلیس اور شیطان، مایوسی اور تشدد، استیلاء و تغلب Aggression کا مجسمہ ہیں۔ انگریزی زبان میں Aggression بڑا جامع لفظ ہے۔ اس میں Destructiveness ایک بڑی چیز ہے۔ قرآن میں ابلیس کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اب سائیکالوجی کی ایک برانچ آ گئی جو Aggression پر تحقیق کر رہی ہے کہ انسان کے اندر یہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ انہوں نے اسی کا نام ایول Evil (شر یا بدی) رکھا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک عجیب چیز بتائی ہے کہ جہاں بھی آپ کسی قسم کا ایول Evil (بدی یا شر) دیکھیں گے وہ Aggressiveness کی بنیاد پر ہوگا۔ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو، یہ Aggression ہی ہوتا ہے۔ تو اسی کو انہوں نے ایول (Evil) کہا ہے، اسی کو بدی کہا ہے، اسی کو شر کہا ہے، جو انسان کے اندر آتا ہے۔ یہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ ان کے ہاں کا ایک School of Thoght

Marfat.com

پیدا ہوا ہے۔ اس میں ایک سائیکالوجسٹ ہے۔ اس نے ان کے ہاں ایک تھیوری (Theory) دی تھی اور وہ تھیوری یہ تھی:

The existence of frustration always leaves to some form of aggression.

جہاں مایوسی ہوتی ہے وہ Aggression کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ابلیس اور شیطان کی ہی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ اس نے ایک بڑی عجیب چیز کہی ہے کہ انہوں نے حیوانات پر ریسرچ کی اور وہاں سے انسانوں تک آئے۔ یہ کہا کہ اگر آپ کسی کو اتنی آزادی دیتے چلے جاتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد کے بروئے کار لانے کے لیے مایوس نہیں ہوتا' وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اب کوئی راستہ میرے سامنے رہا ہی نہیں ہے' جو رکاوٹ پیدا کرے۔ اس طرح اگر آپ اس کے سامنے کوئی بھی راستہ کھلا رکھیں تو وہ کبھی Aggression پہ نہیں اتر سکتا۔ وہ اس وقت Aggression پہ اترتا ہے جب آپ تشدد کے ذریعے اس پر سے امیدوں کے سارے راستے بند کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیدا ہونے والی مایوسی کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے۔ یہ ایک School of Thought ہے جو اس پر ریسرچ کر رہا ہے کہ:

The existence of frustration always leaves to some form of aggression.

کیا آپ دیکھتے ہیں کہ درمیان سے یہ سارا قصہ کس پہ منتج ہوا؟ یہ منتج ہوا: Frustration اور Aggression پر۔ قرآن نے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ (2:38)۔ تو باہر کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے فرمایا۔ اور وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38)۔ اس لیے کہا کہ انسان ان باہر کے خطرات کے علاوہ اندرونی طور پر بھی کسی قسم کے نظرات سے Frustrate نہیں ہونگے۔ معاشرہ وہ ہوگا جس میں کوئی شخص اپنے آپ کو مجبور فلہذا مایوس نہیں پائے گا۔ اور اسی پہ ابلیس سے للکار کر کہا: اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (17:65)۔ یہ ہیں میرے وہ بندے جن پہ تیرا کوئی قابو نہیں ہوگا۔ وہ میرے قوانین کے مطابق چلیں گے' تمہاری تمام چالوں کا ان پر کوئی زور نہیں چل سکے گا۔

معقول جواب کا فقدان اور بہانہ سازی

ابلیس نے Reason دیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب میں کہا تھا کہ صاحب! اس کو تم نے طین سے پیدا کیا ہے' مجھے نار سے پیدا کیا ہے۔ بظاہر یہ ایک Reason تھا۔ اس نکتے پر بھی ان کے ہاں بحث شروع ہوئی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ کس قسم کی یہ باتیں سمجھاتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ایک Rational Reasoning ہوتا ہے اور دوسرا Irrational Reasoning ہوتا ہے' جس میں کوئی معقول بات سوجھتی ہی نہیں' اس کے باوجود وہ اعتراض نہیں کرتا کہ "ہاں صاحب! تم جو کہتے ہو ٹھیک ہے" قطعاً نہیں بلکہ وہ کچھ نہ کچھ "کئی تریا جاندا ہیگا اے۔"[1] بظاہر وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے کہ میں Reasoning کر رہا ہوں' Rational گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ درحقیقت اندر سے ابلیس کی پکار ہوتی ہے جو اپنے آپ کو Justify کر رہا ہے۔ قرآن

[1] وہ کچھ نہ کچھ کہے چلا جاتا ہے۔

Marfat.com

نے یہ کہا کہ بات یہ تھی کہ وہ اپنے جذبات کو Satisfy کر رہا تھا' Rationally جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کی Irrational Reasoning کا منطقی جواب ہے۔ کہا کہ اس Reasoning کے بعد پھر کیا ہوا؟ تو وہاں کہا ہے کہ "میں اس کو کیوں سجدہ کروں؟ میں اونچا ہوں' یہ نیچا ہے۔ میں یہ سب کچھ کیوں کروں"۔ اور اس کے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ "صاحب! میں نے کیا کیا ہے؟ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے"۔ تو آپس میں یہ متضاد باتیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو Irrational Reasoning کرتے ہیں' جب اس کے بعد یہ بات ان کے سامنے آجاتی ہے یا وہ بات نتیجہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ "اے بکدا کی ہیگا"[1] یہ جھوٹ بول رہا ہے اس طرح ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ پھر وہ اپنے آپ کو مجبور ظاہر کریں کہ نہیں صاحب! وہ بات اصل میں یہ تھی کہ میں تو واقعی اس وقت یونہی باتیں کر رہا تھا۔ بات اصل میں یہ ہے بھائی! کہ مجھے اس تھانیدار نے کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے وہاں سچ بول دیا تو تمہیں الٹا لٹکا دونگا"۔ یہاں بات یہ ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد اس کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ اپنے آپ کو مجبور ظاہر کرے۔ یہ جو اس کا پہلا Reasoning تھا' وہ اسی قسم کا Reasoning تھا کہ وہ حقیقت میں Rational نہیں تھا وہ اس لیے کہ جو معقول Reasoning دیتا ہے وہ آخر تک یہ نہیں کہتا ہے کہ "نہیں صاحب! بات یوں نہیں تھی" معقول بات وہ کہتا ہے کہ جو کہتا ہے کہ یہ بالکل ٹھیک بات تھی۔ وہ اس لیے کہ وہ معقولیت کے مقام پہ پوری اترتی چلی جاتی ہے۔[2]

مسئلہ تقدیر اقبالؒ کی نظر میں

اس قسم کی Reasoning جب معقولیت کی میزان پہ پوری نہیں اترتی تو کوئی اور جواب ہوتا نہیں سوائے اس کے کہ پھر انسان اپنے آپ کو مجبور ظاہر کرے۔ یہ کہنا ابلیسیت کی چیز ہے کہ "میں تو مجبورِ محض تھا۔ تو نے مجھ سے یہ کچھ کرایا۔" آدم نے وہ طریق اختیار ہی نہیں کیا کہ پہلے Reason دے اور Justify کرے' اپنے ایکشن کا جواز دے کہ "نہیں صاحب! میں نے یہ اس لیے کیا ہے" اور پھر جب کوئی بات نہ بنے تو اس کے بعد کہے کہ بات اصل میں یہ ہے کہ "میں مجبور ہی ہو گیا تھا"۔ اس نے کہا کہ بات یہ نہیں ہے' یہ تو ابلیسیت ہے۔

اقبالؒ بڑی عمدگی سے یہ بات' کہ ابلیس نے یہ کیا روش اختیار کی' کہہ گیا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ شعر میں باتیں کہہ کے گیا ہے۔ قرآن کی فراست نے اسے اس بات پہ پہنچایا ہوا تھا۔ "ضربِ کلیم" میں ایک نظم ہے۔ "تقدیر (ابلیس و یزداں)" اس کا عنوان ہے۔ اگرچہ اقبالؒ (1877-1938) ضربِ کلیم میں کہتا ہے کہ اس نے یہ محی الدین ابن عربیؒ سے لیا ہے' لیکن مجھے تو معلوم ہے کہ ابنِ عربیؒ اس سے ذرا مختلف تھا۔ اقبالؒ نے بڑے حسین انداز میں یہ بات کہی ہے۔ یہ ضربِ کلیم کی نظم ہے' بیالیس صفحہ[3] کے اوپر ابلیس خدا سے کہتا ہے کہ:

---

1. یہ کیا بک رہا ہے۔
2. اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے "مطالب الفرقان فی دروس القرآن النحل" مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ گلبرگ لاہور' 2003' عنوان "جذبات کا عمل" ص ص۔ 32 تا 33۔
3. ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد' 1996ء ص 69 پر یہ اشعار درج ہیں۔

Marfat.com

اے خدائے کُن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر

اس بیچارے سے میں نے بیر کیا کرنا!

آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دُور و دیر و زُود

وہ تو مجبورِ محض تھا صاحب! میرے لیے تو وہ باعثِ ذلت تھا کہ میں اس کو اپنا مدِ مقابل سمجھ کے اس سے یہ دشمنی کرتا!

حرف 'استکبار' تیرے سامنے ممکن نہ تھا

میں نے وہ جو تکبر کی بات کی ہے' وہ تیرے سامنے ناممکن تھی۔

ہاں' مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

مگر ہاں! یہ بات ہے کہ یہ کچھ تری مشیّت میں ہی نہ تھا۔ دراصل تیری مشیت میں ہی یہ میرا سجدہ کرنا ہی نہیں تھا' میں تو مجبور تھا۔

اقبال کا عزیزانِ من! بات کہنے کا انداز بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ یزداں اس سے کہتا ہے کہ:

کب کھلا تجھ پر یہ راز 'انکار سے پہلے کہ بعد؟

خدا اس سے کہتا ہے کہ تجھ پر یہ راز کب کُھلا : انکارِ سجدہ سے پہلے یا بعد؟

کب کھلا تجھ پر یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟

یزداں فرشتوں کی طرف دیکھ کے کہتا ہے:

پستیِ فطرت نے سِکھلائی ہے یہ حُجت اسے

کہتا ہے 'تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود'

زندگی کے معاملات میں انکار سے پہلے کی کیفیت

یہ جو بعد میں راز کھلنے کی بات ہے' اس پر خدا نے کہا کہ جب پہلے انکار کیا ہے تو کیا اس وقت اسے یاد نہیں تھا کہ میں مجبورِ محض ہوں؟ اس انکار کے بعد' جب اس کے Consequences 'اس کے نتائج' اس کے سامنے آئے تو کیا اس وقت یہ بات ہوئی کہ یہ کیا ہو گیا؟ اب کوئی اور شکل سامنے نہ آئی' تو اپنے آپ کو مجبورِ محض کہہ دیا کہ صاحب! میں کیا کر سکتا ہوں' آپ اسلام میں عقیدہ جبریت دیکھیے' آپ کے ہاں تقدیر کے مسئلے پہ اتنے والیوم Volume کے والیوم Volume لکھے ہوئے ہیں۔ انکار سے پہلے تو کبھی بھی کوئی انسان یہ نہیں کہتا کہ میں اپنی مرضی سے یہ نہیں کر رہا۔ جب اس کے (Consequences) اُس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو یزداں کے الفاظ میں:

کب کُھلا تجھ پر یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟

Marfat.com

پھر یزداں نے فرشتوں کی طرف دیکھ کر کہا:

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے

کہتا ہے 'تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود'

دیکھیے عزیزانِ من! پستیِ فطرت میں کیا حجت ہو رہی ہے؟ کہتا ہے کہ مجھے تو تیری مشیت کے تحت سجدہ کرنا ہی نہیں تھا۔

اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دینا شیطانؑ کا عمل ہے

عزیزانِ من! کیا شعر ہے!!

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام

شیطان نے کہا تھا کہ "میں آگ سے پیدا ہوا ہوں"۔ مصرعہ ملاحظہ فرمائیے:

ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا دُود!

اپنے شعلہ سوزاں کو دھواں کہہ رہا ہے۔ دیکھا آپ نے اس شخص کے بات کرنے کا کیا انداز ہے۔ یہ ہے وہ چیز کہ انکار تو اپنے ارادے سے کرتا ہے، اپنے فیصلے کے بعد جب اس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو Justify نہیں کر سکتا تو پھر یہ کہیں سے عافیت ڈھونڈتا ہے۔ یہ عافیت سوائے اس جبریت کے عقیدے کے کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ہے وہ چیز جو عیسائیت نے اختیار کی ہے۔

انسانی نفسیات پر ایرک فرام (Erich Fromm:1900-1980) کی تحقیق

یہ Determinism کا عقیدہ یعنی عقیدۂ جبر سارے یورپ کے اندر پھیل گیا ہے۔ ان کی اور سائنس کی ریسرچز (Researches) نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا کہ انسان بس مجبورِ محض، مجبورِ محض اور مجبورِ محض ہو کر رہ گیا۔ بہرحال انہی کے ہاں سے اب علم آگے بڑھا۔ انہی کے ہاں سے یہ سائیکالوجسٹ آگے بڑھے اور ایک School of Thought پیدا ہوا اور اس لائن پہ ریسرچز ہو رہی ہیں۔ ان میں سرِ فہرست امریکہ کے ایک سائیکالوجسٹ ایرک فرام کا نام آتا ہے۔ بڑا عظیم شخص ہے۔ اس کی Latest کتاب پچھلے سال آئی تھی [1] اور عجیب کتاب ہے: The Anatomy of Human Destructiveness آپ کتاب کا نام ملاحظہ فرمائیے: "انسان تخریب پہ کیوں اتر آتا ہے۔" اس نے انسان کی تخریب کاری کا تجزیہ یوں کر کے رکھ دیا۔ اس شخص نے صاحب! بڑی محنت کی ہے۔ وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے؟ کتاب تو بہت بڑی ہے، آخری باب کے چند الفاظ نیچے دے رہا ہوں۔ سوال یہ تھا کہ کیا انسان فطرتاً بد واقعہ ہوا ہے؟ (Human nature is evil) اس کے مقابلے میں دوسرے کہتے تھے:

---

[1] ۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں New York سے Holt, Rinehart and Winston کے ہاں سے طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

Marfat.com

نہیں فطرتاً نیک واقع ہوا ہے Human nature is good۔ قرآن جو کہتا ہے اس کا مفہوم اقبال(C.1877 -1938) نے اس شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان کلین سلیٹ (Clean Slate or tabula rasa) لے کے پیدا ہوتا ہے' میدانِ سعی وعمل سامنے ہوتا ہے۔ اُسے اختیار وارادہ (Choice and Will) دیا گیا ہے' نہ فطرت کی کوئی قوت ایسی ہے کہ اس سے بالا ہو جس کے تابع یہ آئے' نہ اس کے اندر کوئی چیز ایسی ہے کہ جس کے اوپر اپنے ایمان کی قوت کی رُو سے یہ غالب نہ آ سکے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ عبادی ہے۔ صرف اللہ کا ''عبد'' ہے۔ یہ ہے قوت اس کے اندر۔ ایک میری عبدیت اختیار کرنے کی قوت' مجھ پہ ایمان لانے کی قوت۔ اس سے یہ چیز پیدا ہوتی ہے کہ یہ مجبور نہیں رہتا' یہ بااختیار انسان بنتا ہے۔ ایرک فروم (Erich From) کہتا ہے کہ:

The statement` 'Human nature is evil' is not a bit more realistic than the statement' Human nature is good' .

یہ دونوں بیانات یکساں ہیں' ان میں کوئی بھی Saviour نہیں ہے۔

But the first statment 'Human nature is evil' is not easier to make any one who wants to prove man's evilness finds followers most easily

انسان کے اختیار میں تو اس کی مجبوری ہے۔ اس کی فطرت بد واقع ہوئی ہے تو چونکہ Majority 'بدوں' کی ہوتی ہے' اس لیے اس کا کہنا یہ ہے کہ اس مذہب والے کو بہت زیادہ مل جاتے ہیں' Easily مل جاتے ہیں' Readily مل جاتے ہیں۔ وہ بنے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ عقیدہ پھیلانا کہ ''انسان فطرتاً بد ہے'' بڑا آسان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

for he offers every body an enemy for his own soul

اس بنا پر اسے اپنے جرائم اور گناہوں کے متعلق ایک وجہ جواز' بنی بنائی ہوئی' مل جاتی ہے کہ انسان تو مجبورِ محض ہے۔ اس کی فطرت کے اندر یہ لکھی ہوئی ہے۔ اس طرح اور اس حالت میں ہوتا کچھ نہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو مجبور کہہ رہا ہوتا ہے صاحب!

اگر باطل کا نتیجہ ہمیشہ تخریب ہوتا ہے تو پھر تخریب ہمیشہ مایوسی کو جنم دیتی ہے

ایرک فرام مزید کہتا ہے کہ:

yet the spreading of irrational despair is in itself destructive

Marfat.com

اسے معلوم نہیں کہ اس سے جو مایوسی پیدا ہوتی ہے' یہ بجائے خویش تخریب ہے۔

as all untruth is destructive----

جس طرح ہر باطل تخریب ہوتا ہے۔ باطل کے تو معنی ہی تخریب کے ہیں عزیزانِ من! ہر تخریب میں ہوتا ہی یہ ہے کہ اس میں مایوسی کا عقیدہ' جبریت کا عقیدہ پھیلایا جائے۔ یہ اسی قسم کی ایک Untruth ہے۔ اس لیے Destructiveness ہے۔ بقول اس ایرک فرام کے

It discourages and confuses

ان کے کیا الفاظ ہوتے ہیں! یہ سوچ حوصلوں کو بھی پست کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر سوچنے کی قوت میں بھی گجلا پن اور کنفیوژن (Confusion) پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ:

Preaching irrational says or announcing false Messias is hardly rash distructive, it produces and then paralyzes

مایوسیاں عام کر دینا' پھر اس کے لیے The False قسم کے مسیحوں Messias کو معمور من اللہ اتار بھیجنا' یہ سب کچھ کرنا' وہ کہتا ہے کہ اس ذریعے سے جو Falsehood پھیلتی ہے' جو Untruth پھیلتا ہے وہ بجائے خویش تباہی ہوتی ہے اور اس سے انسان کی جرأتیں مفلوج ہو جاتی ہیں' اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد خود کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ چیز جو ابلیس کرتا ہے۔

قرآن کے ایک فقرے نے زندگی کی بساط الٹ دی ہے

عزیزانِ من! قرآن نے جب انسان سے یہ کہد یا کہ خارج کی کوئی قوت ایسی نہیں' جو تجھے مجبور کر دے بلکہ تیری نفسیاتی قوت اس پر غالب ہے۔ جس کو ابلیس کہا جاتا ہے یہ قطعاً ایسی قوت نہیں کہ یہ انسان پر غالب آ جائے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (17:65)۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من! کہ کس طرح قرآنِ کریم نے ایک فقرے میں دنیائے مذاہب اور دنیائے فکر دونوں کی بساط اُلٹ کے رکھ دی ہے: خارجی کائنات میں بھی' انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر بھی۔ اور ابھی تو یہ نفسیاتی تحقیق کی ابتداء ہے۔ میرے ذہن میں ہے' اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی اور فرصت دیدی' تو ابلیس کے اوپر میں سائیکوجیکلی (Psychologically) نفسیاتی نکتہ نگاہ سے' بتاؤنگا کہ قرآن نے یہ کیا Concept پیش کیا ہے۔ یہ بڑا بنیادی Concept ہے۔

❶ مگر واحسرتا! کہ آپ درسِ قرآن کا دوسرا دور تیسویں پارے کی سورۃ مطففین کی آیت ۲۶ تک ہی پہنچا سکے کہ آپ بیمار ہو گئے اور آخر کار' سورج کی شعاعوں سے وقت کشید کرنے والی شخصیت اور فکر قرآنی کا یہ روشن چراغ ۲۶ فروری ۱۹۸۵ء کی شام ملتِ اسلامیہ کو قندیلِ آسمانی کے علم سے مالا مال کرتا ہوا' جہانِ فردا کی پرنور اور حسین وجمیل وادیوں کی جانب کوچ کر گیا اور ابلیس پر نفسیاتی نکتہ نگاہ سے قرآن کریم کا یہ بنیادی تصور صفحہ قرطاس کے حوالے نہ کر سکا۔ ڈاکٹر منظور الحق

ابلیس و آدم کی کشمکش کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ ابلیس و آدم کی جو کشمکش قرآن نے بتائی ہے، یہ دراصل انسان کے اندر کی جبر (Determinism) اور اختیار (Choice and Will) کی کشمکش (Conflict) ہے، یہ عقیدے کی چیز ہے، جس میں یہ کشمکش ہے، یہ قرآن نے بڑے عجیب انداز میں بتائی ہے۔ ملخص یہ ہے کہ تو جو جی میں آئے کر دے، تجھے قیامت تک چھٹی ہے لیکن اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (17:65)۔ انسان کے اندر ایک چیز یہ ہے اور وہ اس کے ایمان کی قوت ہے کہ جب اس کے اندر وہ آتی ہے، تو پھر ابلیس کی کوئی قوت کارگر نہیں ہوتی، غالب نہیں آ سکتی کیونکہ ایسا انسان مایوس نہیں ہوتا۔ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (17:65)۔ اس کے ہاتھ میں خدا کا اتنا قابل اعتماد بھروسہ آ جاتا ہے۔ لَا انْفِصَامَ لَھَا (2:256)۔ کہ وہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ وہ محکم سہارا کبھی ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! جو رسی ٹوٹے ہی نہیں اس پہ مایوسی کیسے پیدا ہو جائے گی۔

میں نے تھوڑا سا زیادہ وقت بھی لیا، بڑا اہم موضوع تھا عزیزانِ من! اور آج ہی کہاں ختم ہوگا! اب آپ نے دیکھا کہ ابلیس و آدم کی یہ داستان قرآن نے اتنی بار دہرائی کیوں ہے۔ دراصل یہ کسی آدم کے پتلے کا اور ایک شیطان کا قصہ ہے ہی نہیں بلکہ عزیزانِ من! یہ تو انسان کی بہت بڑی گہری نفسیاتی کشمکش ہے۔ جس کی طرف قرآن لے آیا ہے اور اب اس دور میں اس پہ ریسرچز (Researches) شروع ہوئی ہیں۔ اور یہ وہاں ریسرچز شروع ہوئی ہیں عزیزانِ من! علم تو کہیں بھی ہو، وہ اپنا یا بیگانہ نہیں ہوتا۔ علم ایک حقیقت ہوتی ہے، جو ہر انسان کے لیے ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے فائدہ کون اٹھاتا ہے؟ عزیزانِ من! میں نے تو قرآن کو اس طرح سمجھا ہے۔ آج ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 65 تک آ گئے، 66 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

Marfat.com

تیرہواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 66 تا 75)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝٦٦ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ
اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝٦٧ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝٦٨ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا
مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝٦٩ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ
حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝٧٠
يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا
يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝٧١ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝٧٢ وَاِنْ كَادُوْا
لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝٧٣ وَلَوْلَآ اَنْ
ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝٧٤ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ
لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝٧٥

عزیزانِ من! آج اگست 1975 کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 66 سے ہو رہا ہے۔ (17:66)۔ سابقہ درس میں ایک آیت جو ہمارے سامنے آئی تھی اس کے آخر میں چیلنج کے جواب میں ابلیس کی تعدی کا کہا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم دیکھو میں اس کی ذریت کے ساتھ کیا کچھ نہیں کرتا' اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ ٹھیک ہے اگر انسان علی حالہ رہے گا تو تو واقعی اُسے مغلوب کر لے گا لیکن اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (17:65)۔ جو میری محکومیت اور اطاعت اختیار کر لیں گے ان پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہو سکے گا اور اس کے لیے آگے کہا تھا کہ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (17:65) ۔ یہ اطاعت میرے قوانین کی ہوگی اور وہ ایسے ہیں جن پہ پوری طرح سے بھروسہ کیا جا سکتا ہے' اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ توکل کے یہی معنی ہیں اور یہ قوانین ہی ایسے قابلِ اعتماد ہیں۔

Marfat.com

بلند اقدار اور انسان کے پست جذبات کی کشمکش

اب بات تو انسان کی نفسیاتی دنیا کی ہو رہی تھی کیونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو انسان کے اندر بلند اقدار کی اس کے پست حیوانی جذبات کی اس کے مفادات کی the beast in man کی اور انسان کی کشمکش ہے۔ اس کے مقابلے کے لیے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے انسان کے اندر اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے یا یوں کہیے کہ جب انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے تابع صرف کرتا ہے تو پھر یہ ابلیسی جذبات اس پر کسی صورت میں بھی غالب نہیں آ سکتے۔ وہ صلاحیتیں اور قوتیں تو انسان کے اندر وہی ہوتی ہیں ان کا صرف طریقِ استعمال یا مصرف ہے جو اتنا بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ سمجھانے کے لیے جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ وہی پانی دریا کے ساحلوں کے اندر گھرا ہوا چلے تو وہ آبِ حیات ہوتا ہے اور جب وہ ان ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو وہ عالمگیر ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ پانی وہی ہوتا ہے صرف اس کے استعمال کا اس کے اپنے آپ کو بروئے کار لانے کا فرق ہے جو تعمیر اور تخریب کے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہی صورت انسان کی ہے۔ اطاعتِ خداوندی کے ذریعے سے کہیں باہر سے کوئی چیز اس کے اندر نہیں آتی اس کے اندر کی اپنی صلاحیتیں ہیں ان کا رخ بدل دیا جاتا ہے ان کو پابندِ ساحل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے وہ ہلاکت کی بجائے تعمیری نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس کے لیے جو پہلے کہا کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی قابو نہیں چلے گا تو وہیں یہ بات کہہ دی کہ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا (17:65)۔ یہ وہ بات ہوگی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کریں گے اور وہ قوانین ایسے ہیں جن پہ پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

توکل کا قرآنی مفہوم اور ہمارا عمل

اصل چیز یہ ہے کہ جسے ''توکل'' کہتے ہیں وہ ہمارے ہاں اپنے اصل معنی کھو چکا ہے۔ ہمارے ہاں تو اب ہر لفظ اپنے معنی کھو چکا ہے۔ دین جب مذہب میں آتا ہے تو وہ اپنے معنی ہی کھو دیتا ہے۔ اب یہی صورتِ حال توکل کی ہے۔ ''توکل بخدا'' کے معنی تو آپ کو معلوم ہیں کہ کیا ہیں: بیٹھے ہیں اللہ پہ توکل کیے ہوئے یعنی جب کوئی اور طریقہ' تدبیر' سہارا نہ اختیار کیا جائے' تو اس کے بعد اسے کہتے ہیں توکل اور پھر یہ درویشی اور فقر کی انتہائی شان بتائی جاتی ہے کہ ''توکل علی اللہ بیٹھے ہیں۔''

آپ کو یاد ہوگا' ایک دفعہ طلوعِ اسلام میں بھی واقعہ شائع ہوا تھا۔ اس قسم کے واقعات تو ہر روز بیشمار ہوتے ہیں لیکن اس میں یہ تھا کہ ایک دفعہ مولوی غلام رسول صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ بیوی بچے گھر میں ہوتے تھے' وہ چھ چھ مہینے اللہ کی تلاش میں' جنگلوں میں' شہروں میں' صحراؤں میں' مارے مارے پھرتے تھے' واپس آ جایا کرتے تھے۔ پھر دو چار دن کے لیے دوسری سمت کو نکل جاتے تھے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو انہوں نے دیکھا کہ گھر میں سب طرح سے خیر خیریت ہے۔ انہیں حیرت ہوئی۔ ہونی چاہیے تھی۔ مقربِ بارگاہِ خداوندی کے

گھر میں خیر خیریت ہو تو اس سے زیادہ تعجب خیز یا باعثِ تشویش کیا بات ہو سکتی ہے کہ سب اسی طرح سے جی رہے ہیں۔ بیوی سے پوچھا کہ میں سب کچھ ختم کر کے گیا تھا' تم نے یہ اتنا وقت کیسے گذارہ؟ اس نے کہا کہ وہ ٹھیک ہے؟ اناج و ناج تو آپ اللہ کے راستے میں بانٹ گئے تھے' یہ بھینس ہمارے پاس موجود تھی۔ ہم نے اس کی بڑی خدمت کی۔ اس کا دودھ بیچا اور اس سے ہم گذارہ کرتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہاں! اب معلوم ہوا کہ اتنی محنتوں' مشقتوں' ریاضتوں کے باوجود میں خدا کو کیوں نہیں پا سکا۔ ابھی خدا پر توکل پورا نہیں ہوا تھا۔ گھر میں بھینس تھی' انہوں نے وہ بھینس لی اور اس کو ذبح کیا اور اس کے بعد پھر اللہ کی تلاش میں نکل گئے کہ اب ''توکل علی اللہ'' کامل ہو جائے گا اور اب دیکھیے اللہ کہاں جاتا ہے صاحب! توکل کے یہ معنی آپ کے ہاں ہو گئے۔

ابلیس کا اپنے شاگردوں کے لیے پروگرام

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

یہ ابلیس کا وہ مشورہ' وہ پروگرام تھا' جو وہ اپنے شتونگڑوں کو' جنود کو' بنا کے دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس امتِ محمدیہ کے تباہ کرنے کا راز اس میں ہے کہ یہ کہیں جاگ نہ اٹھے:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

تا بساطِ زندگی میں اس کے ہر مہرے ہوں مات

ان میں کا ایک حربہ ''توکل علی اللہ'' بھی ہے کہ ذریعہ کوئی نہ رہے اور جو حضرات توکل علی اللہ کہتے ہیں وہ سب سے اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ وہ صرف یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کماتے ہیں اور یہ اس پہ عیش اڑاتے ہیں۔ اس کا نام توکل علی اللہ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ذرا ان خدام کا' ان مریدوں کا' وہاں آنا جانا بند کر دیجیے پھر حضرت صاحب سے پوچھیے کہ وہ توکل علی اللہ چھپر پھاڑ کے کیسے دیتا ہے؟ خدا نے خود یہ کہا ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا نے رزق دینا ہوتا تو خود دیتا' قرآنِ کریم نے تو یہ کفار کا قول نقل کیا ہے کہ ان پاگل کے بچوں سے کہو کہ وہ چھپر پھاڑ کے خود آ کے نہیں دیا کرتا۔ عالمِ انسانیت میں' عالمِ اسباب سے اسباب اور وسائل کے ذریعے سے دیا کرتا ہے اور یہ ہیں کہ انہوں نے ہر قسم کے وسیلے اور سبب کو کاٹنے اور توڑنے کا نام توکل علی اللہ رکھا ہے جبکہ توکل علی اللہ کے معنی ہیں: خدا کے قوانین پہ اتنا کامل بھروسہ کرنا ہے کہ وہ ٹوٹا نہیں کرتے' دغا نہیں دیا کرتے۔

توکل کے سلسلہ میں خدا کے قانون کی ایک محسوس مثال

اب جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا: بات نفسیات کی ہو رہی تھی۔ دعویٰ یہ تھا کہ خدا کا قانون بھروسے کے قابل ہے۔ اسے کیسے سمجھایا جائے؟ اس کا انداز وہی ہے کہ اپنے ہر تدریجی دعوے کو یہ Extract کرتا ہے۔ جب وہ کوئی دعویٰ کرتا ہے جو محسوس اور مرئی

Marfat.com

نہیں ہوتا تو اس کو ہمیشہ محسوس طریقے پر سمجھا تا ہے۔اس کا عجیب انداز ہے۔رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا(17:66)۔ کہا: دیکھتے نہیں ہو کہ بڑی بڑی کشتیاں اتنا سامان لادکر کس طرح سمندر میں تیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم ان کے ذریعے تلاشِ رزق کر سکو۔اس کا یہ قانون کس قدر قابلِ بھروسہ ہے اور تمہارے لیے موجب رحمت بہ سامانِ نشوونما کا موجب ہے۔آج کی اِس مثال میں میں سمجھاؤں گا کہ تم اتنی باریک سی سوئی پانی میں ڈالو تو وہ اسی وقت ڈوب جاتی ہے۔ اس کے برعکس اتنا بڑا لوہے کا جہاز کہ جس کا اپنا خالی وزن بھی ہزاروں ٹن ہوتا ہے' نہ صرف یہ کہ وہ پانی کے اوپر تیر رہا ہوتا ہے' بلکہ آپ اس میں وزن لادتے چلے جاتے ہیں۔سامان لادتے چلے جاتے ہیں' لیکن پھر بھی وہ پانی پر تیرتا ہے۔اس کا قانون یہ ہے کہ اگر یہ اتنا پانی Displace کردے' ہٹادے تو اس Displacement کی حد تک یہ تیرتا رہے گا۔وہی پانی جو اس کے ڈوبنے کا ذریعہ تھا' وہ اس کی زندگی کا سہارا بن جائے گا۔ ہمارے اس قانون کا جہاز کے کپتان سے پوچھو۔اس کی نگاہ ہمیشہ اس لکیر پر ہوتی ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق کھینچی ہوئی ہوتی ہے کہ اگر اس حد تک پانی کے اندر اس جہاز پر اتنا بوجھ ڈالا جائے' تو پھر یہ جہاز نہیں ڈوب سکتا' تیرتا رہے گا۔طوفان آجانا اور بات ہے لیکن نارمل حالات میں جو اس کے قوانین ہیں' ان کی رُو سے یہی ہوتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ کبھی یہ بھی تم نے سوچا ہے کہ ایک لوہے کی سوئی تو پانی میں اسی وقت ڈوب جاتی ہے جبکہ اسی لوہے کا اتنا بڑا جہاز کس طرح بمعہ اپنے سامان بطخ کی طرح سینۂ بحر پہ تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔یہ خود بھی ہزاروں من کا ہوتا ہے۔یہ کیسے ہو جاتا ہے؟ تم کس طرح بھروسے کے ساتھ کشتی میں بیٹھ جاتے ہو اور کہتے ہو کہ ہاں بھئی چلو ٹھیک ہے؟ اگر تمہیں پانی میں ڈوبنے والی چیز لیے لیے پھرتی ہے' تم خود ہی ایسا نہ کرلو کہ اس میں اُس لکیر کے نیچے تک بوجھ لاددو۔یعنی اس کے قانون کی خلاف ورزی کرو کہ اس میں اتنے مسافر اور بٹھادو۔یہ کشتیوں کے جتنے حادثے ہوتے ہیں اس کے بعد یہی پتہ چلتا ہے کہ صاحب! اس میں بیس کی Capacity تھی اور اس نے اس میں تیس بٹھادیئے۔اس نے یہ قانون شکنی کی' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈوب جاتا ہے۔لیکن اگر اس کے قانون کے مطابق یہ کشتی اور اس کا وزن اس حد کے مطابق ہو اور سمندر میں کوئی غیر معمولی حادثہ نہ آجائے تو وہ کبھی نہیں ڈوبتی۔اسے توکل کہتے ہیں۔ یہ جو زمین پہ ایک کمرے کے اندر میز پہ بیٹھے ہوئے Calculation کرتے ہیں۔وہ انسان ہی نہیں بلکہ اتنے بڑے جہازوں کو چاند پہ بھیج دیتے ہیں اور اب تو مریخ پہ بھیج رہے ہیں۔وہ اس یقین کے ساتھ بھیج رہے ہوتے ہیں کہ اتنے بج کر اتنے سیکنڈ پر یہ وہاں پہنچ جائے گا۔ان کی Split of the Second تک Calculation ہوتی ہے: یہ وہاں پہنچے گا' پھر یوں جائے گا' پھر Direction اس طرح بدلی جائے گی' یوں اترا' یوں گیا۔یعنی یہ سب کچھ وہ یہاں بیٹھے ہوئے اس یقین کے ساتھ کنٹرول کررہے ہیں۔اس میں اس یقین کے ساتھ سوار ہو کے وہ چاند کی طرف' مریخ کی طرف' چلے جاتے ہیں اور پھر اس یقین سے وہ نیچے اترتے ہیں۔ ہم نے تو ان کا وہ اندازہ ٹی وی پہ دیکھا ہے۔جہاں سمندر میں اترتے ہیں اس کے قریب ہی دوسرے جہاز موجود ہوتے ہیں اور کبھی Clash نہیں ہوا۔یہ

خدا کا نظام ربوبیت' نشوونما Calculation کیا ہے؟ یہ قانونِ خداوندی کا مطالعہ ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (17:65)۔ دینے کا نظام' ان کی کارسازی کے لیے کافی ہے۔ یہ اس پر بھروسہ کریں گے تو وہ کبھی انہیں دغا نہیں دے گا۔ ان چاند پہ جانے والوں سے پوچھو کہ خدا کس طرح سے بہترین وکیل بنتا ہے' توکل کسے کہا جاتا ہے۔ صاحب! وہ آپ کو بتائیں گے۔ بھینس کو ذبح کر کے' بچوں کو ٹکڑے مانگنے کے لیے چھوڑ دینے کو توکل نہیں کہتے۔ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (17:60)۔ اس کا یہ قانون تمہارے لیے رحمت کا موجب (Cause of Nourishment) ہے۔ ان عام حالات میں تم نے اسے دیکھ لیا' اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوتے ہو اور ان میں تو خدا یاد بھی نہیں آتا۔

تدابیر کی انسانی کامیابی کا راز قانون خداوندی میں مضمر ہے

خدا یاد آتا ہے مگر کب؟ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ (17:67)۔ جب وہ کشتی کسی مصیبت میں گھر جاتی ہے تو اس وقت صرف وہی تدابیر کارگر ہو سکتی ہیں جو قانون خداوندی کے مطابق اختیار کی جائیں۔ اس کے خلاف کسی ایسی قوت کی تدبیر' جسے تم حالتِ سکون میں پکارتے ہو' کارساز نہیں ہو سکتی۔ وہ گیارہویں والے کی اور سترھویں والے کی'' ہمارے ہاں ڈوبی ہوئی بیڑی (Boat) مشہور ہے'' جو انہوں نے بارہ برس کے بعد نکالی۔ وہ بیڑی کشتی تھی۔ برات کے ساتھ ڈوب گئی تھی' پھر ان گیارہویں والے پیر صاحب' جو گیارہویں والے اس لیے ہیں کہ گیارہ سال کے بعد (وہ ایک پہلا سال تو چلا گیا تھا' اس کے گیارہ سال بعد) انہوں نے وہ کشتی نکال دی تھی۔ کہیں اسی طرح اِدھر اُدھر کے مسافروں کے ساتھ ایک کشتی ڈوبنے لگی تو اس میں ایک مسخرہ سا (Clown-like) بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لنگوٹا باندھ کے کودنے لگا' تو اس سے سواریوں نے کہا: کیا کرنے لگے ہو؟ کہا: ڈوبنے لگا ہوں۔ مسافر کہنے لگے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے پہلے سے ہی گیارہویں والے کی نیاز منت مان رکھی ہے' اس واسطے اس میں خطرے کی بات نہیں۔ اُس نے کہا کہ اس کے اوپر ہمیں بھی ایمان ہے کہ وہ نیاز منت آپ نے مان رکھی ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ گیارہ سال کے بعد بیڑی نکالا کرتا ہے۔ ''دو ہور مینوں کم' ذرہ کل ہی ہیگے' تے فیر میں بھروسے تے نئیں رہ سکدا۔''[1] قرآنِ کریم کہتا ہے: اس سے پیشتر تم جو بھی کیا کرتے تھے' جب وہ طوفان آیا کرتا ہے تو اس وقت سٹی گم ہو جاتی ہے۔ قانونِ خداوندی کے خلاف کی گئی تمام تدابیر کارگر نہیں ہوتیں۔ تمہیں خدا کے علاوہ سب بھول جاتا ہے۔ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ (17:67)۔ پھر جب وہ تکلیف Over ہو جاتی ہے اور مشکل سے نجات پا لیتے ہو' پھر تمہاری وہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ تم اس کے قوانین کو بھول جاتے ہو۔ یہاں کہا: وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (17:67)۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان اگر وحیِ خداوندی کو چھوڑ کر صرف اپنے جذبات وخیالات کے تابع چلے تو بڑا

[1] کل ہی مجھے تو دو ایک اور کام ہیں' میں تو پھر اس بھروسے پر نہیں رہ سکتا۔

Marfat.com

ناسپاس گزار ہوتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن میں الفاظ کے چناؤ کی! یہاں ''کفر'' سے جو یوں ''کفوراً'' کی بات کہی ہے! اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں تو یہ بڑے بڑے بھی کسی نہ کسی طرح سے اسے کچھ آوازیں دینے لگ جاتے ہیں لیکن اس کے لیے تو آپ کو وہ (ہندی) دوہا[1] جو سنایا کرتا ہوں، وہ سناتا ہوں، وہ بات بڑی کام کی ہے کہ:

دُکھ میں تو ہر کو بھجیں اور سُکھ میں بھجیں نہ کو
جو سُکھ میں ہر کو بھجیں تو دُکھ کاہے کو ہو

بہت اچھی بات کہی کہ ''دکھ میں ہر کو بھجیں''۔ ''بھجیں'' کے معنی پرستش کرنا ہوتا ہے اور ''ہر'' خدا کو کہتے ہیں۔ اس لیے دکھ یعنی مصیبت میں تو خدا کی پرستش ہوتی ہے، ان کے ہاں ہری ہری کا تصور ہے۔ اس لیے کہا کہ ''جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کاہے کو ہو۔'' دکھ میں تو ''ہر'' کو ''بھجیں'' اور سکھ میں ''بھجیں'' نہ کو۔

غلط معاشرے کی تباہی صحراؤں کی آندھی کی مانند ہوا کرتی ہے

زندگی کے ہر لمحے میں، ہر سانس میں، قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے اور اگر اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے رہا جائے تو پھر انسان کو کبھی بھی مشکلات اور مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اگر انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہوگی تو یہ چیز پوری ہو سکے گی۔ کہا کہ ٹھیک ہے، تمہاری کشتی ساحل پہ آ لگی، تم خشکی میں آ گئے اور اس کے بعد تم پھر قوانینِ خداوندی کو بھول گئے اور سمجھنے لگے کہ تم خدا کے قوانین کی زد سے باہر نکل آئے ہو۔ حالانکہ اس کے قوانین ساری کائنات کو محیط ہیں اور جو جس جگہ بھی ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہیں پکڑا جاتا ہے۔ اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ يَّخۡسِفَ بِكُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ يُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَكُمۡ وَكِيۡلًا (17:68) تو کیا وہی جھکڑ جو سمندر میں آیا تھا، وہ یہاں خشکی میں، اسی قسم کا طوفان نہیں آ سکتا کہ یہاں جھکڑ آئے، اس کے اندر آندھی آئے۔ یہاں ہمارے ہاں تو خیر اس جھکڑ میں ریت ہی ملی ہوئی ہوتی ہے، صحراؤں کے اندر جہاں بہت کھلا تیز جھکڑ چلتا ہے تو اس میں وہ پتھر کی کنکریاں بھی ساتھ لے کے چلا آتا ہے۔ وہاں کی بڑی ہلاکت آمیز آندھی ہوتی ہے۔ کہا کہ خشکی پہ بھی تو ایسا ہو سکتا ہے یعنی خشکی اور تری کوئی بھی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں اگر تم قوانینِ خداوندی سے بے نیاز ہو جاؤ تو وہاں کوئی اور ایسی چیز ہے جو تمہیں حفاظت دے سکتی ہے۔

قرآن کا تو انداز یہ ہے، جیسے میں نے کہا ہوا ہے کہ وہ بات سمجھانے کے لیے، کبھی ان اسباب کا ذکر کرتا ہے جو براہِ راست ہوتے ہیں کہ آندھی نے تمہیں ہلاک کر دیا، کبھی وہ خدا کے قوانین کے تابع خود خدا کے متعلق کہتا ہے کہ خدا اس طرح سے ہلاک کر دیا کرتا ہے۔

[1] دو مصرعوں کا ہندی شعر۔

کہا کہ یہ کیفیت بھی تو وہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ (17:69)۔ تو کیا پھر یہ دوبارہ نہیں ہو سکتا؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ سمندر کے طوفان سے ایک دفعہ بچ نکلنے پر تم ہمیشہ کے لیے محفوظ اور مامون ہو گئے۔ یہ غلط ہے۔ تم نے ایک ہی بار تھوڑا سمندر میں' دریا میں' یا کشتی میں جانا تھا۔ یہ سواریاں' یہ سامان لادنے والے تو شاید ایک دوبار جاتے ہوں مگر ان کشتی والوں' جہاز والوں کا تو کام ہی یہی ہے۔ وہ ساری عمر ادھر سے وہاں' وہاں سے یہاں' چلتے رہتے ہیں تو کہا: ایک دفعہ اگر تم نے اس طرح سے حفاظت پالی' امن میں آ گئے اور پھر اس کے قوانین کو بھلا دیا تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب دوبارہ تمہارا جہاز جائے تو ویسی ہی صورت پیدا ہو جائے' سخت ہوا کا طوفان آئے جو تمہاری کشتی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ پھر وہاں ڈوب جاؤ' اس لیے کہ تم نے اس کے قانون کی کسی شق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ اسی لیے ہے کہ جب ساحل پہ بھی جہاز آ جائے تو پھر بھی اس کے قوانین کی حفاظت کرو۔ دیکھو کہ تمہارے جہاز میں کوئی نقص تو نہیں پیدا ہو گیا ہے' کوئی خرابی تو کہیں نہیں پیدا ہو گئی۔ اسی لیے یہ جہازوں والے بندرگاہ میں آتے ہیں تو اتنا ہی کام نہیں ہوتا کہ وہ وہاں سے سامان کو اتارتے ہیں' دوسرا سامان لادتے ہیں۔ سامان والے تو یہ کر رہے ہوتے ہیں' مگر جہاز کے پرزوں کو بھی دیکھتے ہیں کہ کہیں اس کے قانون کی کسی شق کو تو نظر انداز نہیں کر دیا گیا۔

سفرِ زندگی میں ہر آن قانونِ خداوندی کی نگہداشت

ان کے ٹیکنیشنز (Technicians) اس جہاز کے ایک ایک کل پرزے کو پھر سے Examine کر رہے ہوتے ہیں' ٹیسٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ اب تو وہ صرف کہنے کی ہی بات رہ گئی ہے' ورنہ ریلویز (Railways) میں بھی تو یہ انتظام ہوتا ہے۔ ریل میں ایگزامنیر (Examiner) کا مستقل عملہ ہوتا ہے اور ان کا یہ کام ہوتا ہے کہ ہر گاڑی چلنے سے پہلے ہر ڈبے کے متعلق وہ اطمینان کریں اور ان کو ایک سرٹیفکیٹ دینا پڑتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اب تو وہ سرٹیفکیٹ اسی قسم کے ہو جاتے ہیں کہ گھر سے خط آیا ہے کہ کل ان کا چہلم ہو گیا ہے۔ ان کا پائنیر (Pioneer) لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ اب یہ جتنے ٹرین ایگزامنر اور اس قسم کے لوگ سرٹیفکیٹ دیتے ہیں' وہ سب گھر میں بیٹھ کے دیتے ہیں کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے اور ادھر گاڑی لاہور سے چل کر شاہدرہ کے سٹیشن پر پٹڑی سے اتری ہوئی ہوتی ہے۔ اس نے کہا ہے: جب تمہارا طوفان سے بچاؤ ہو جائے' جہاز یا کشتی ساحل پہ آ جائے تو اب اس کے بعد اس اطمینان میں نہ ہو جاؤ کہ نہیں صاحب! ان قوانین کے متعلق دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے: دیکھیے تو سہی' ہماری کشتی کنارے آ لگی۔ کہنے لگے: اس کشتی نے دوبارہ بھی پانی میں جانا ہے' اس لیے یہاں خشکی میں آ کر بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہو جاؤ۔ دیکھو کہ آیا اب قوانینِ خداوندی کے مطابق اس کی ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں۔ یہاں اگر خشکی میں ٹھیک کر لو گے تو پھر یہ سمندر میں جا کے بھی درست رہے گی۔ یہ ہے وہ چیز کہ جب تم بظاہر حفاظت میں ہو' کوئی خطرہ بھی نہ ہو' تو اس وقت بھی اس کا خیال رکھو۔

Marfat.com

آج کی دیکھ بھال کل کی حفاظت کی ضامن ہے

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132)۔ زندگی کے ہر سانس میں موت تک اپنے آپ کو مسلم رکھو۔ اپنے آپ کو اس کے قوانین کے تابع رکھو۔ ہماری بہت سی مصیبتیں اور خاص طور پہ بیماریاں تو اسی لیے آتی ہیں کہ جب ہمیں مرض سے آرام مل جاتا ہے' شفا ہو جاتی ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی ایسا نقص بھی ہے جس سے یہ بیماری یا مصیبت آئی۔ اس لیے مسلسل پرہیز کرنا چاہیے اور دوائی بھی جاری رکھنی چاہیے۔ شفا کے بعد یا مصیبت کے ٹل جانے کے بعد آدمی بھول جاتا ہے۔ اس وقت بھول جانے کا نتیجہ ہے کہ جب دوبارہ حملہ ہوتا ہے تو پہلے سے زیادہ شدید حملہ ہوتا ہے تو یہ جو اس نے کہا ہے کہ جب طوفانوں سے باحفاظت ساحل پہ آ جاؤ تو اس وقت بھی قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو کیونکہ تم نے دوبارہ بھی انہی پانیوں کے اندر جانا ہے۔ یہ ایک مثال تو وہ انہیں دے رہا ہے' تو زندگی کے ہر شعبے میں یہ ہے کہ جب بظاہر تم یہ سمجھو کہ بالکل حفاظت ہے' امن امان ہے' خیر خیریت ہے' اس وقت بھی یہ دیکھتے رہو کہ فی الواقعہ حفاظت ہے' خیر خیریت ہے۔ اس وقت بھی تم قوانینِ خداوندی کو نظر انداز نہ کرو۔ یاد رکھیے' دوبارہ وہی صورت پیدا ہو گئی تو پہلے سے زیادہ شدید حملہ ہو جائے گا۔

انسان کا طبعی شعبہ ہو یا انسانیت کا' دونوں قوانینِ خداوندی کے محتاج ہیں

کہا کہ یہ دیکھو' ہو سکتا ہے کہ تم اسی ابتلاء و آزمائش میں دوبارہ جاؤ اور پھر وہی صورتِ حال ہو جائے۔ یہاں پھر وہ لفظ آیا: فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ (17:69)۔ پھر ''کفر'' کا لفظ ہے۔ دیکھتے ہیں کفر کیا کیا ہے؟ کشتی یا جہاز کے متعلق یہ ٹیسٹ نہ کرنا کہ وہ اس کے قوانینِ طبعی کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں' یہ کفر ہے۔ وہ تو زندگی کا طبعی شعبہ ہو یا انسانیت سے متعلق کوئی معاملہ ہو' جہاں بھی اس کے قوانین نگاہوں سے اوجھل ہوئے' تم نے ان سے بے اعتنائی برتی' وہ کفر ہو گا' یا تم نے ان سے سرکشی برتی پھر وہ تو انتہا درجے کا کفر ہے۔

کشتی کی بات ہو رہی ہے۔ طوفانوں سے نکل کے وہ سلامتی میں آ گئی ہے۔ یہاں خشکی پر جو تمہیں دوبارہ جانے کا وقت دیا ہے' اس کے لیے جو مہلت کا وقفہ (Respite) ملا ہے' وہ کہتا ہے: اس مہلت کے وقفے میں بھی دیکھو کہ یہ کشتی اس قابل ہے کہ اگر اسے دوبارہ پانی میں ڈال دیا جائے تو یہ قوانین خداوندی کو نظر انداز تو نہیں کرے گی؟ كَفَرْتُمْ (17:69)۔ اور اس طرح یہاں آ کے بھی تم نے کفر اختیار کیا تو جب یہ دوبارہ پانی میں جائے گی تو ڈوب جائے گی۔ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا (17:69)۔ تو یاد رکھو! یہ ہم کوئی مذاق کی بات نہیں کہہ رہے۔ جب بھی تم نے ہمارے قانون کے خلاف ایسا کیا اور کشتی پھر پانی میں ڈال دی' پھر تو ہمارا قانون اس کو ڈبو دے گا اور کوئی ایسا نہیں ہے' جو ہماری پیروی کرتا ہوا مقدمہ لڑے' ہمارے خلاف اپیل ہو جائے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا؟ ہمارے ان

Marfat.com

قوانین کے خلاف کہیں اپیل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سب سے بلند تر عدالت ہے۔ کہا: اس چیز کو دیکھیے اور اسی سلسلے میں کشتیوں کی مثالیں دیں۔ اس کے قوانین سے انکار کی مثالیں دیں۔

بنیادی حقوقِ انسانیت

کہا کہ یہ چیزیں، جو ہم نے بیان کی ہیں، یہ کوئی خاص قسم کے انسان نہیں جن کے متعلق یہ باتیں کی جا رہی ہیں۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ جتنے بھی بنی آدم ہیں، انسان ہیں، جنہیں ہم اپنے محاورے کی رو سے آدم کی اولاد کہا کرتے ہیں، انسانی بچے ہیں، انہیں ہم نے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ بات کوئی پیدائش کے ساتھ نہیں ہے کہ انہیں عیسائیت کے عقیدے کے مطابق پیدا ہی مجرم کیا گیا ہو، پیدا ہی گناہگار کیا گیا ہو۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ جرم یا گناہ یا جسے سِن (Sin) کہا جاتا ہے وہ تو خود انسان کرتا ہے، جب خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ورنہ پیدائش کے اعتبار سے بنی آدم، ہر بچہ، خدا کے نزدیک واجب التکریم ہوتا ہے: كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ یہی وہ چیز ہے جو میں بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ آپ جسے بنیادی حقوقِ انسانیت کہتے ہیں، اسے تو قرآن نے سرِ فہرست رکھا ہے: كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ یعنی صرف آدمی کا آدمی ہونے کی جہت سے تکریم اور احترام سرِ فہرست ہے:

اصل تعظیم احترامِ آدمی

آدمیت احترامِ آدمی

ہر انسان کے مدارج کا تعین اس کے اعمال کے مطابق

اس کا انسان ہونا، اسے تمام انسانوں کے برابر تعظیم و تکریم دے دیتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے کہ کسی انسان میں انسان ہونے کی جہت سے کوئی فرق نہ کیا جائے، پیدائشی نسبت سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔ اس کے بعد کہا: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ (6:133)۔ اب ہر ایک کے اعمال کے مطابق ان کے مدارج مقرر ہونگے۔ ہر انسان کی بنیادی تکریم اور عزت یکساں ہوگی۔ اس کے خلاف یا اس کے مطابق، جو چیزیں اسے بعد میں دی جائیں گی، وہ اس کی سیرت اور کردار اور اعمال کے نتیجے میں ہونگی۔ خالی سلیٹ والا انسان (Clean Slate Man) یکساں واجب التکریم ہے۔ ہر انسانی بچہ یکساں واجب التکریم ہے اور اسی لیے میں نے لکھا بھی ہے کہ یہ Constitution کا خاصہ ہے، یہ مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی دستور ہے کہ اس میں اگر کوئی چیز بغیر کسی جرم و خطا کے کسی انسان کے لیے وجۂ تذلیل ہو جائے، تو وہ مملکت کبھی اسلامی نہیں ہو سکتی، خواہ کسی طرح سے بھی کسی انسان کو ذلیل کیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ ذلیل کرنے کی تو مختلف نوعتیں ہوتی ہیں۔

Marfat.com

قابلِ نفرت بنانا مجرم کا جرم ہوتا ہے، انسان قابلِ نفرت نہیں ہوتا

عزیزانِ من! کسی کو قابلِ نفرت بنا دینا جرم ہے۔ یہ اس بنیادی حقِ انسانیت کے خلاف چلا جائے گا، جس میں قرآن کہتا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا اور اس بنیادی حق میں تو مومن اور کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے۔ مجرم تو بات ہی اور ہو جائے گی اور جب میں آگے چل کے جزا اور سزا (Reward and Punishment) پہ آؤنگا تو وہاں تو عجیب چیزیں آئیں گی اور یہ چیز صرف قرآن میں ہی آپ کو ملے گی کہ ''مجرم کا صرف جرم ہی قابلِ نفرت ہوتا ہے، وہ انسان قابلِ نفرت نہیں ہوتا۔'' یہ فعل جو اس سے سرزد ہوا ہے، وہ قابلِ نفرت ہے۔ جب وہ اسے چھوڑ دیتا ہے تو اس کی عزت برقرار ہو جاتی ہے صاحب! یہ فرق کرنا ہے، ورنہ انسان کی حیثیت تو وہی رہتی ہے۔ اس سے صرف یہ ایک جرم سرزد ہو گیا ہے، جرم کی سزا دیجیے۔ ٹھیک ہے، سزا دی گئی باقی انسان رہ گیا، وہ دھبہ دھل گیا۔ یہ انسان رہ گیا۔ یہ صورت نہیں ہے کہ وہ انسان قابلِ نفرت ہو گیا، وہ تو اب بنی آدم ہو گیا۔ اس کے ساتھ یہ جتنی چیزیں ہیں، یہ اضافی (Relative) ہیں۔ اس لغزش کے باوجود، آدم آدم ہی رہا تھا جب اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23)۔ بارِ الٰہی! مجھ سے اپنی ذات میں کمی ہو گئی، میں اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھا۔ ٹھیک ہے وہ صاف ہو گیا۔ وہ آدم پھر آدم ہی تھا، وہ ذلت کا موجب نہیں بن گیا ہے۔ وہ بنی آدم رہا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ اور وہ واجب التکریم ہی رہا۔ پھر یہاں اس طبعی زندگی کے اندر انسان کی بات ہو رہی ہے، صرف مومن کی نہیں۔ اس انسان کو قوانینِ طبعی کا وہ علم دیا گیا ہے جس کی بنا پر وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (17:70)۔ خشکیوں اور تریوں میں جتنی بھی فطرت کی قوتیں ہیں، وہ اس کے تابعِ تسخیر کی ہوئی ہیں۔ اسے کس قدر خوشگوار سامانِ حیات دیا جا رہا ہے۔ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (17:70)۔ یہاں ایک بات آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو ہم نے فضیلت دی ہے۔ یہ بات بڑی غور طلب ہے۔ ہم نے جو کچھ پیدا کیا ہے، جو بھی خدا کی Creation ہے، اس میں سے اکثر پر اسے فضیلت اور برتری دی ہے۔

صرف انسان ہی اشرف المخلوقات نہیں

آپ کو معلوم ہے کہ یہ انسان کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں اور یہ ایسے ہی کہہ دیتے ہیں جیسے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک مسلمہ ہے۔ کبھی کسی نے اس بات کو چیلنج ہی نہیں کیا یعنی مخلوقِ خداوندی میں سب سے زیادہ شرف اور فضیلت کے مالک ہونے کے تصور کو کسی نے چیلنج ہی نہیں کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ واجب التکریم ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (17:70)۔ ہماری مخلوق میں کثیر ایسی ہے جس پر اسے فضیلت دی

ہے۔ اس نے سب پہ نہیں کہا۔ خدا کی مخلوق کا تو ہم احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔ ہاں! یہ تو ہو سکتا ہے اور غالباً ہے کہ اس کرۂ ارض پہ جو مخلوق ہے اس پہ تو اسے افضلیت حاصل ہے لیکن مخلوقِ خداوندی کرۂ ارض تک ہی تو محدود نہیں ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ اجرامِ فلکی میں بھی متنفس ہیں

قرآن تو یہ بتاتا ہے کہ یہ جو اجرامِ فلکی ہیں، جو تمہیں تیرتے ہوئے (Spheres) نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی دآبہ موجود ہیں۔ یہ کس قسم کے ہیں، یہ خدا نے نہیں بتایا اس لیے کہ وہاں انہیں انسان یا حیوان یا مویشی نہیں کہا، انہیں متنفس کہا ہے: سانس لینے والے، چلنے والے کہا ہے۔ معلوم نہیں کس کس نوعیت کے، کس کس کرے کے اندر، اور کہاں کہاں یہ چیز ہوگی۔ خدا کی کائنات Universe کا تو احاطہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو آج تک تصور میں بھی نہیں آ سکی۔ یہ ہمارے ہاں جو بڑے بڑے Scientists ہیں، وہ اس کا تصور نہیں کر سکے۔ کہتے ہیں کہ یہ جو لامحدود ہے، وہ تو رہا ایک طرف، یہ جسے آپ کہکشاں (Galaxy) کہہ رہے ہیں، اس کے متعلق بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کتنی دنیائیں آباد ہیں۔ وہ ہمیں تو نیچے سے ایسے ہی نظر آیا کہ جیسے ہمارے ہاں کے شاعر نے یہ لکھ دیا: ''اور کہتا تھا کہکشاں، جیسے کچی زمین کے اوپر سے گھاس کا ایک گٹھڑ ہو اور اس کو کوئی کھینچ کے لیے جا رہا ہو، تو پیچھے جیسا نشان بن جاتا ہے۔'' ہمیں تو بس اتنا ہی پتہ چلا ہے۔

خدا تعالیٰ نے تو اس کائنات میں لاکھوں ملک اور اربوں شہر آباد کر رکھے ہیں

کسی ماہرِ فلکیات سے پوچھیے، کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس وقت تک، جو ہم نے بڑی سے بڑی دوربین Telescope بنائی ہے، اس میں اس کہکشاں کا ایک انچ ٹکڑا بھی نہیں سماتا اور اس قسم کی لاتعداد دنیائیں ہیں، جنہیں تم ''کھینچی ہوئی گھاس'' کہہ رہے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ابھی کچھ شے ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ جو مِمَّنْ خَلَقْنَا (17:70) ہے یعنی اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہنا ہے، یہ تو اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنتے جانا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نے تو وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (17:70)۔ کہا ہے کہ ''ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق پر فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔'' کیا بات ہے قرآن کی!

موجودہ ہیئتِ انسانی کی فضیلت کے بعد کی رفعتیں اور وسعتیں

عزیزانِ من! یہ تو رہے یہاں کے طبعی قوانین اور اس طبعی کائنات میں انسان کا یہ درجہ۔ کہا کہ انسان اسی طبعی جسم کا ہی نام نہیں ہے۔ یہاں کی مخلوق میں تو اس کو ہم نے اکثریت پر افضلیت دیدی تو اب یہ افضلیت اسی اعتبار سے ہے کہ اس بنی آدم کو واجب التکریم بنایا اور پھر اکثر مخلوق پہ ہم نے اسے فضیلت دیدی تو کیا اب یہ سمجھ لے کہ بس پھر ہم جو جی میں آئے کریں ہماری یہ افضلیت اور شرف و مجد

Marfat.com

یہاں بھی اور اگلی زندگی میں بھی قائم رہے گا۔ کہا: یہ بات غلط ہے۔ یہ تو تمہاری طبعی زندگی کی گفتگو ہو رہی ہے۔ جہاں تک تمہاری انسانی زندگی کا تعلق ہے جس میں عمل سے جنت بھی اور جہنم بھی بنتی ہے تو اس میں تو تمہارے اعمال' جو تم نے انسان ہونے کی جہت سے کیے ہیں' کے مطابق جو درجہ بنتا ہے' ان کے مطابق اس شرف وجد کے مدارج کا تعین کیا جائے گا۔

عربی میں لفظ امام کا مفہوم اور عمل کی اہمیت

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ (17:70)۔ جب اعمال کے نتائج کے ظہور کے وقت ہر انسان کو اس کے اعمال نامے کے ساتھ بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہے وہ تمہارا اعمال نامہ؟ یہاں کیا لفظ ہے ''امام کا''!! امام تو وہ ہے جو آگے چلنے والا ہوتا ہے۔ ایک تو آپ کو یاد ہوگا کہ عرب ''امام'' کا لفظ کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں' کہ جب معمار (Mason) دیوار بناتے ہیں تو وہ جو ان کے پاس ''ساہل یا ساہول یا شاقول'' (Plumb-Line) ہوتا ہے' وہ نیچے بٹی اور اوپر بڑا Simple سا تاگا ہوتا ہے۔ اسے ہم اوزار بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہوتا ہی کیا ہے؟ تاگا اور لٹو' لیکن دیوار کی صحت دیکھنے کے لیے کہ آیا وہ سیدھ میں جا رہی ہے یا کہ نہیں' اس کا سارا دارومدار اس کے اوپر ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسے انہوں نے اوپر اینٹ سے باندھ کے لٹکا رکھا ہوتا ہے۔ اس میں ذرا سی ٹیڑھ آتی ہے' اس سے اسی وقت ان کو پتہ چل جاتا ہے اور وہیں ٹھیک کر لیتے ہیں۔ وہ ''ساہل'' یہ دیکھنے کا پیمانہ ہوتا ہے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے یا نہیں۔ جماعت میں افراد کی حیثیت ان اینٹوں کی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گویا بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (61:4) ہے' ایک ایسی دیوار جسے سیسہ پلا کر مستحکم کر دیا گیا ہو۔ قرآن نے اسی لیے اس جماعت کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کہا ہے۔ تو اس دیوار کا سیدھا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس جماعت کے ماپنے کا کہ آیا یہ جماعت سیدھی جا رہی ہے یا غلط رو ہے یہ ''ساہل'' ایک پیمانہ (Measure) ہے۔ وہ ''ساہل'' کیا ہے؟ جماعت کا یہ رہنما' اس کا یہ امیر' اس کا یہ مرکز' دراصل اس کا امام ہے' جس سے یہ ماپا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ اس کو سیدھا ہونا کتنا ضروری ہے۔ اگر اس لٹو (Top) میں ذرا سی ٹیڑھ آ جائے تو کوئی دیوار سیدھی اٹھ ہی نہیں سکتی۔

عزیزانِ من! اُن لوگوں کی بڑی اہمیت ہے جنہیں آپ رہنما کہتے ہیں۔ اسی جہت سے لفظ امام ہے۔ اب تو ہمارے ہاں بس مسجد میں نماز پڑھانے والا صرف میاں جی ہوتا ہے' امام تو بڑی چیز ہے۔ ایک تو وہ اس قسم کا معیار (Standard) ہوتا ہے' پھر اسے آگے چلنا ہوتا ہے کہ وہ پیچھے سے آنے والوں کا راستہ متعین کرتا ہے۔ کہا کہ انسان کی اگلی زندگی کے اندر یہ راستہ متعین کرنے والی چیز کونسی ہوگی؟ اب یہ وہ انسان نہیں ہوگا جو یہاں امامت کرتا تھا' جو یہاں ان سب كُلَّ اُنَاسٍ (17:70) کی راہنمائی کرتا تھا۔ یہ کس چیز کے ساتھ امامت یا رہنمائی کرتا تھا؟ کہا: بِاِمَامِهِمْ (17:70)۔ ان کے ''امام'' کے ساتھ رہنمائی کرتا تھا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر یہ ''امام'' کیا ہوگا؟

Marfat.com

انسان کا اعمال نامہ ہی اس کا امام ہوگا

قرآن نے ''اعمال نامہ'' کو بھی امام کہا ہے اور عجیب چیز ہے اس کی صاحب! اس نے کہا تھا: وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ (59:18)۔ ہر شخص کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ میں نے اپنے آنے والے کل (Tomorrow) کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ جو آج (Today) انسان کرتا ہے' وہ اس کے اپنے مستقبل کے لیے ہے۔ اپنے کل کے لیے اسے دیکھنا چاہیے کہ وہ کام کل (Tomorrow) کو اسے کیا دیتا ہے۔ یہی آج کا کیا ہوا کل کو اس کا وہ امام بنتا ہے' اس کے لیے راستہ متعین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ 'پیچھے پیچھے لگا آ' اگر وہ کام انسانیت سوز ہیں تو وہ جہنم کی طرف لیجانے کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ اگر وہ کام انسانیت ساز ہیں تو وہ جنت کی طرف لیجانے کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ تو یہ جو ''اس زندگی میں اس کے اعمال کے نتائج ہیں'' انہیں وہ امام کہتا ہے کیونکہ یہ آگے آگے چلتے ہیں اور ان کی کسی خاص متعین منزل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں وہ اعمال نامہ کہا گیا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ کس کس انداز سے قرآن بات کرتا چلا جاتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ جب ہر انسان کو اس کے اعمال نامہ کے ساتھ آواز دی جائے گی۔ آپ دیکھتے ہیں ہر مقدمے میں اندر آواز پڑتی ہے تو اس کے ساتھ اعمال نامہ ہوتا ہے جس کے مطابق وہاں فیصلہ ہونا ہوتا ہے۔ آواز دیجائے گی۔ فَمَنۡ اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقۡرَءُوۡنَ كِتٰبَهُمۡ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا (17:71)۔ جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں ہوتا ہے (کہ یہ یمن سعادت کا نشان ہے) تو یہ لوگ اسے خوشی خوشی پڑھتے ہیں اور اس میں اپنے تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ (Reward) موجود پاتے ہیں۔ اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوتی۔ بات سمجھانے کے لیے' قرآنِ کریم نے دایاں ہاتھ اور بایاں ہاتھ کہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ سچ مچ دائیں ہاتھ میں کچھ کاغذ دیدیئے جائیں گے۔ عام طور پر دنیا کی ہر زبان میں ''یمن'' دائیں ہاتھ کو کہتے ہیں' اسے ''سعادت کا یمنہ'' بھی کہتے ہیں۔ انسان زیادہ کام اسی سے کرتا ہے۔ ویسے یہ دائیں اور بائیں کا فرق کچھ فرق نہیں ہے۔ طبعی طور پر ہمارے ہاں کھبچو (بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے: (Left-handed) بھی تو ہوتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو' بچپن ہی سے بچے کو دونوں ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت ڈال دی جائے تو دونوں ہاتھوں سے یکساں طور پر بھی کام کیے جاتے ہیں لیکن زبان کے اعتبار سے اور پھر قرآن تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے' ان کے ہاں بھی دایاں ہاتھ یمین کہلاتا تھا کیونکہ یمن برکت یا سعادت کو کہتے ہیں۔ تو یہ ہوا برکت اور سعادت والا ہاتھ یعنی وہ بابرکت اور باسعادت انسان ہوگا جس کا اعمال نامہ اس کے اس ہاتھ میں ہوگا' یوں کہہ دیجیے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سعادت بخش اور سعادت مند ہوں گے۔ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا (17:71)۔ وہاں کسی سے کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ ذرہ برابر بھی کسی سے زیادتی نہیں ہوگی' کسی کے عمل کے اندر کمی نہیں ہوگی' کسی کے خلاف زیادتی نہیں ہوگی۔ وہ اَصۡحٰبُ يَمِيۡنِ (56:27) ہونگے۔ وہ یوں کہہ دیجیے کہ وہ یمن وسعادت کے مالک ہونگے۔ مگر یہ بات تو وہاں کی ہو رہی ہے۔

Marfat.com

سوال یہ پیدا ہوا کہ کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جو یہاں معلوم ہو جائے' پہلے ہی معلوم ہو جائے' دنیا میں ہی معلوم ہو جائے کہ وہاں یمن و سعادت والے کون ہونگے؟ وہاں کامیاب کون ہونگے؟ یہ بڑی بات ہے' ورنہ یہاں تو یہی کہا گیا ہے کہ یہ بونے (Sow) کی چیز ہے' یہاں اس کھیتی میں پھل' کس قسم کا آئے گا' وہاں جا کے پتہ چلے گا۔ ہوسکتا ہے کہ جسے تم یہاں انگور کی بیلیں کہو" اوتھے تر کونے ای لگے ہون۔" ❶ کیا یہاں بھی معلوم ہوسکتا ہے؟ جی ہاں معلوم ہوسکتا ہے: یہاں "حضرت صاحب" نے معیار مقرر کیا ہوا ہے اور وہ معیار ہے: بھوکا' ننگا' مفلس اور مفلوج ہونا' جسے دنیا اپنے پاس نہ آنے دے۔

قرآن ہے عزیزان من! یہاں "اعمیٰ" ہونا کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں یہاں اندھا ہونا۔ دیکھیے قرآن کیسے وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ کہا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے' ہم اس کی معیشت (Economy) تنگ کر دیتے ہیں' یہاں اس کی روٹی تنگ کر دیتے ہیں۔ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ یہاں اکانومی Economy کا ترجمہ ہی معیشت کیا جاتا ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ ہمارے قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں وہ قوم روٹی کے لیے بھی محتاج ہو جاتی ہے۔ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124)۔ اور اسے پھر قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھایا جاتا ہے۔ اب آ گئے اندھے کے معنی کہ جسے کہا تھا۔ وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى (17:72)۔ اس کے معنی کیا ہو گئے؟ کہا: اندھا وہ ہوا جو مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124) ہوگا' جس کی معیشت تنگ ہوتی ہے۔ جس کی معیشت (روزی) تنگ ہوتی ہے وہ یہاں کا اعمیٰ ہوتا ہے اور جو یہاں کا اعمیٰ ہے' وہ وہاں کا بھی اعمیٰ ہوگا۔ جسے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201)۔ (اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں) کی قبولیتِ دعا حاصل نہیں ہے' اسے فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ (اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی) کیسے مل سکیں گی؟ زندگی تو جوئے رواں است و رواں خواہد بود۔ کیا یہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے اوپر والے پل کے اوپر تو پانی ہو لیکن نہر میں کچھ بھی نہ ہو' اور اگر آپ ذرا نیاز بیگ ❶ میں جائیں تو وہاں وہ نہر لبالب بھری ہوئی چلی جا رہی ہو۔ اس میں پانی' وہاں اپنے منبع سے لے کے آخر تک' رواں جانا چاہیے۔ یہ ہے قرآن کا بتایا ہوا معیار۔

قرآن کے نزدیک قوموں کا باہمی فرق

اب قرآن نے دوسرے مقامات پہ خود ہی تین قسم کی قوموں کا فرق کر دیا ہے: ایک تو وہ قومیں ہیں جنہوں نے صرف فطرت کے قوانین (Laws of Nature) کو مسخر (Harness) کیا تو طبعی زندگی (Physical Life) کی ساری آسائشیں (Comforts) خوشگواریاں (Happy Tidings) اور مادی ترقیاں (Material Gains) حاصل کر لیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس بات میں مومن اور کافر میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ یہ طبعی قوانین ہیں جو قوم بھی طبعی قوانین کے تابع محنت کرے گی' اس کو اس کے پھل

❶ شہر لاہور میں ایک جگہ کا نام ہے۔

Marfat.com

مل جائیں گے صاحب! كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ (17:20) یہ اگر مومن ہے تو بھی ہم اس کی مدد کرتے جاتے ہیں اور جنہیں ہم تم کافر کہتے ہیں' اس کی بھی مدد ہوتی جاتی ہے۔ جو قانون کے مطابق ہل چلاتا ہے' کھیتی کرتا ہے' اس کھیتی کی حفاظت کرتا ہے' وہ ہرنام سنگھ کا کھیت ہو یا عبدالرحمٰن کا کھیت ہو' اُس میں ہمارے قانون کے مطابق فصل اُگتی ہے۔

انسانیت سے متعلق قوانینِ خداوندی کے انکار کا نتیجہ

اس طرح اقوام عالم میں ایک اقوام تو وہ ہوگئیں جنہوں نے یہ خوشگواریاں حاصل کیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اگر انہوں نے انسانیت سے متعلق جو قوانینِ خداوندی تھے' ان کا انکار کیا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان خوشگواریوں کے باوجود' یہاں بھی ان کی معاشرتی زندگی جہنم کی زندگی ہو جائے گی' انہیں امن و سکون نہیں مل سکے گا' اطمینان حاصل نہیں ہو سکے گا' اضطراب کی آگ ہوگی جو ان کے سینوں میں بھڑک رہی ہوگی' اگرچہ ان کو مادی خوشگواریاں ضرور نصیب ہونگی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ وہ اقوام ہیں کہ پھر جن کا آخرت کی خوشگواریوں میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں یہ ہے کہ یہ لوگ وہاں جا کے کہیں گے کہ صاحب! یہاں سے کچھ تو ملنا چاہیے' وہاں ہم نے کچھ تو نیکی کے کام کیے تھے' کچھ اچھے کام کیے تھے۔ قرآن کہتا ہے: ان سے کہا جائے گا کہ وہ طیباتِ دنیا کا جو حصہ تھا' وہ حصہ تو تم نے وہیں لے لیا تھا۔ ہم تم پہ ظلم نہیں کررہے۔ یہ تو یہی ہے کہ تم نے کہا تھا کہ یہیں دے دیجیے' ہم نے یہیں دیدیا' اب یہاں تمہارا حصہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ تو ایک تو ہوگئی یہ قوم: یہاں مالی لحاظ سے خوشحال' مگر آخرت میں تباہ حال۔

دوسری قسم کی قوم

ایک دوسری قسم کی قوم ہوگی' جس نے یہاں' ان طبعی قوتوں کو' یہاں کے طبعی سامان کو' مسخر کیا۔ انہیں یہاں کی زندگی کی ساری خوشگواریاں میسر ہوئیں اور انسانیت سے متعلق قوانینِ خداوندی کا بھی اتباع کیا تو یہاں کی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوگئی' کل کا' Tomorow کا' بھی اطمینان ہوا۔ ساتھ ہی اشرفِ انسانیت بھی حاصل ہوا۔ یہ وہ قوم ہے کہ جب آگے چلے گی تو پھر مستقبل میں بھی اسے خوشگواریاں ملیں گے۔ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں گی اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔

تیسرے درجے کی قوم

تیسرا درجہ ان اقوام کا ہے کہ جنہوں نے یہاں بھی فطرت کے قوانین کی اتباع و اطاعت نہ کی تو یہاں کی خوشگواریوں سے بھی محروم رہ گئے۔ جب یہاں کی خوشگواریوں سے محروم رہے تو قرآن نے یہی فیصلہ کردیا کہ یہ اقوام اپنے متعلق ابھی سے سمجھ لیں۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:105)۔ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے ترازو کھڑا کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑے جس کے تحت آخرت میں ان کا کوئی حصہ ہی نہیں ہوگا۔ وہ اپنی بے مائیگی کی شہادت آپ ہوں گے۔ اس لیے کہ

Marfat.com

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) جس کی مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124) معیشت کی تنگی (Economic Morass) اس دنیا کے اندر ہوگی' آخرت میں اس کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ یہ اقوام کی تیسری کیٹگری (Category) ہوگئی۔

ان تین اقسام کی مزید وضاحت

پہلی کیٹگری (Category) میں تو آپ اقوامِ یورپ کو رکھ لیجیے۔ یہ وہ اقوام ہیں' جو آج کی دنیا میں دنیاوی ترقیاں حاصل کرتی ہیں۔ دوسری کیٹگری میں وہ اقوام ہیں جن کی یہ زندگی بھی شادمان جس میں ترقیوں اور خوشگواریوں کا دور دورہ' اور پھر آخرت میں مومن کی زندگی یعنی جماعتِ مومنین کی وہ زندگی' وہ عزو شرف' جو ہمیں صدرِ اول کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد تیسری کیٹگری میں وہ اقوام جو یہاں بھی ذلیل و خوار' لہٰذا وہاں بھی ذلیل و خوار۔ اب اس دنیا میں ان کا نام سوائے اس نام کے اور کوئی نہیں ہے یعنی مسلمان رکھ لیا جائے' اور کیا کہا جائے! کوئی دوسری قوم تو اس کیٹگری میں اب نظر نہیں آتی۔ کل تک یہ کچھ یہودیوں کے متعلق کہا جاتا تھا کہ بہت ذلیل وخوار تھے۔ قرآن نے بھی کہا تھا لیکن انہوں نے بھی جب اس کے قوانینِ طبعی کی اطاعت کی۔ حَبْلِ اللّٰهِ (3:102) یا حَبْلِ النَّاسِ (3:111)۔ بڑی بڑی طاقتوں کے سہارے بھی ڈھونڈ لیے تو پھر انہیں بھی کچھ مل گیا ہے۔

دنیا بھر کا مسلمان یہودیوں کے شکنجے میں

عزیزانِ من! وہ جنہیں آج بھی ہم اپنے ہاں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (1:7)۔ کی تفسیر میں محراب ومنبر سے یہ کہتے ہیں کہ مغضوب علیھم سے مراد یہودی ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ وہ آپ کے قلبِ اسلام کے اندر اتنا سا ٹکڑا ہے' وہ بھی آپ لوگوں سے چھینا ہوا ہے۔ وہاں کی مسلمان آبادی کو دھتکار کے باہر پھینکا ہوا ہے اور یہ غریب فلسطینی مہاجر اتنے عرصے سے باہر' انہیں کے ساتھ' اسی سرزمین کے اوپر جھونپڑیوں کے اندر رہ رہے ہیں جبکہ یہودیوں نے ان کے اندر اپنے آپ کو Establish کیا ہے۔ آج اگر زیادہ نہیں تو دنیا میں کوئی ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بتائے ہی جاتے ہیں۔ [1] دنیا میں اور زیادہ پھیلے ہوئے تو چھوڑ یئے' پندرہ بیس پچیس کروڑ تو انہی ممالک کے اندر وہ سارے مسلمان ہیں۔ تیس سال سے یہ سارے ساٹھ ستر کروڑ [2] ''ٹلاں لا کے مر گئے ہیگے نیں۔'' [3] لیکن اس کے باوجود ان مغضوب علیہ یہودیوں کو وہاں سے نکال نہیں سکے۔ ان کے اندر انہیں ذرا سی جنبش دینے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ یہ اور محکم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ مسلمان کیا کرتے ہیں: حج کی تقریب میں جاتے ہیں' بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ امسال بفضلہٖ تعالیٰ چودہ لاکھ کے قریب حاجی ہیں۔ [4] بہت اچھا جی پھر کیا کیا؟ جب جبلِ رحمت میں پہنچے اور حج قبول ہوا' وہاں پہ

---

[1] اس وقت یہ تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ کی ہے۔
[2] اب ایک ارب سے بھی زیادہ
[3] انتہائی کوشش کے باوجود ناکام رہے ہیں۔
[4] اس وقت تقریباً 30لاکھ کی تعداد میں ہیں۔

Marfat.com

چودہ لاکھ نے دعائیں مانگیں کہ یا اللہ! ان اسرائیلیوں کی حکومت کو تباہ کر دے۔ تیس سال سے دس بارہ چودہ لاکھ تو وہاں مسلمان اور ان کے اتباع میں ہر مسجد کے اندر یہی دعائیں۔ ہوا آج تک بھی کچھ نہیں۔

مسجد اقصٰی کے جلا دینے کا اقصٰی ڈے

اب تو تین چار سال سے، جب سے انہوں نے مسجدِ اقصٰی جلائی ہے، اقصٰی ڈے (Day) منایا جا رہا ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے اقصٰی ڈے منایا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قوم کس قدر خود فریب ہو جاتی ہے، جو سعی و عمل سے بے گانہ ہو کر صرف رسومات کی ادائیگی میں لگی رہتی ہے۔ آپ دیکھیں کہ انہوں نے مسجدِ اقصٰی کو جلایا ہے۔ اس جلانے کے بعد بھی ان کے لیے اتنی ہی تدبیر باقی ہے کہ اس کا ڈے (Day) منا لیا کریں۔ وہ یہودی بھی کچھ عرصہ یہی کیا کرتے تھے، سال میں ایک ڈے منایا کرتے تھے۔ آپ نے یہ جملے سنے ہوں گے: ''بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، اس کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ یونہی کوئی ایک دیوار کی چند اینٹیں کھڑی رہ گئی تھیں، وہ بھی کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی۔'' یہودیوں نے جس زمانے میں مسلمانوں پہ قبضہ کیا تو عیسائی مسلمانوں کے تابع تھے۔ وہ انہیں وہاں نہیں آنے دیتے تھے۔ انہوں نے تباہ کیا تھا۔ عیسائیوں نے ہی تو مسلمانوں کی مملکت سے درخواست کی کہ یہ جو ذرا سی دیوار بچی ہوئی ہے، اسے صاف کر دیجیے۔ اور یہودیوں نے کہا تھا کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم سال میں ایک دفعہ اسے آ کے دیکھ جایا کریں۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، آ جایا کرو۔ تو سال کے بعد وہ وہاں جاتے تھے۔ اس دیوار کا نام ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) تھا۔ وہ وہاں جاتے تھے اور دہائی دیدے کے رویا کرتے تھے کہ ''پھر سے یروشلم بن جائے۔ اے دیوار تو پھر سے اپنے خدا کے نام پہ وہ مقدس ہیکل بن جا۔'' اور پتہ نہیں کس کس کے نام پہ وہ دہائی دے کر رویا کرتے تھے اور دعا مانگا کرتے تھے۔ یہ سب ویسے ہی تھا جیسا کچھ ہم حج کے اندر دعا مانگتے ہیں۔ مانگتے چلے گئے۔ یہ روتے رہے، دعائیں مانگتے چلے گئے۔ دیوار اتنی کی اتنی ہی رہی، نہ وہ دیوار مٹی، نہ بڑھی۔ جب انہوں نے وہ طریق اختیار کیا جو فطرت کے قوانین کے مطابق تھا، آج اس کا نتیجہ آپ کے سامنے موجود ہے۔

خود فریبی کی انتہا

آپ نے پھر وہی ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) کی طرح اپنے ہاں اقصٰی ڈے رکھ لیا۔ آپ اسے ایک دن منا لیتے ہیں اور پھر سارے کے سارے روتے ہیں۔ بڑی بڑی دعائیں ہوتی ہیں کہ صاحب! دیکھیے، یا اللہ! ان کو ذلیل کر، جنہوں نے تمہارے دین کو، دینِ محمد ﷺ کو ذلیل کیا: اور اس کے بعد، خود فریبی ہے، عمل سے تہی دامنی ہے۔ عزیزانِ من! وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ (59:19)۔ دیکھنا، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ یعنی قوانینِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (59:19)۔ ''خود ان کی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی'' اس طرح وہ

قوم خودفریبی میں مبتلا ہوگئی۔ یہ صحیح ترجمہ ہے عزیزانِ من! آپ سیلف ریسرچ Self Research کریں' یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مذہب پرست قومیں مذہب میں جتنی شدید ہوتی چلی جاتی ہیں' اتنا ہی زیادہ خودفریب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! وہ اعمال کے محسوس نتائج مانتی ہی نہیں' وہ ان محسوس نتائج کو مانتی ہی نہیں۔ مذہب پرست طبقے کی طرف سے انہیں فریب میں رکھا جاتا ہے۔ ان کا اعمالنامہ مرتب ہو رہا ہے۔ اعمال نامے میں لکھا جا رہا ہے: ''ہوتے چلے جاؤ یہاں ذلیل۔ یہاں کا جتنا ذلیل ہوگا' وہاں اتنا ہی زیادہ مقربِ الٰہی ہوگا۔''

کتنی بڑی ہے یہ خودفریبی عزیزانِ من! مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72)۔ ''جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے' وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔'' یہ خدا کا بتایا ہوا معیار ہے عزیزانِ من! یہ میرا یا آپ کا کہا ہوا نہیں ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72)۔ جو اس دنیا میں اندھا ہے' وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ وہاں اس سے بھی زیادہ بدتر حالت ہوگی اس لیے کہ وہاں کی تو خوشگواریاں بھی یہاں کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ خوشگوار اور وہاں کی تباہیاں بھی یہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ تباہ کن ہوں گی۔ اس لیے وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72)۔ وہ جو یہاں کا ذلیل ہوگا' یہاں سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا۔ اس سے نکلنے کا طریقہ وہی خالص خداوندی قوانین پر اعتماد ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (17:65)۔ یہ ان قوانینِ خداوندی پر بھروسہ کریں گے تو وہ انہیں کبھی دغا نہیں دیں گے۔

قانونِ خداوندی کے اندر مصالحت کا' لچک کا' مفاہمت کا' نتیجہ

اس بات کا یقین محکم ہے کہ سب کچھ قوانینِ خداوندی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ قوانین بڑے ہی قابلِ اعتماد ہیں۔ اب جب کسی قانون کے اتنے زیادہ قابلِ اعتماد ہونے پر آپ کا ایمان ہوجائے تو پھر اس قانون کے متعلق کسی سے مصالحت' مفاہمت (Compromise)' لچک' پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے اس میں ذرا سی مفاہمت کی' سارا نقشہ ہی بگڑ گیا۔ تمہاری سمجھ میں تو یہ بات آ ہی نہیں سکتی۔ یہ پوچھیے امریکہ کی لیبارٹری والوں سے' جو ان لوگوں کو چاند پہ بھیجتے ہیں۔ وہ اگر اپنے اُس قاعدے میں' جو خدا کے قانون کے مطابق ہے' کہیں بھی کسی اور قاعدے' قانون' اصول' کے ساتھ Compromise کرلیں' ذرا سی مفاہمت کرلیں کہ ''اچھا کوئی بات نہیں۔ یہاں تک تو وہ بات اس قاعدے کے مطابق چل رہی ہے' اچھا بھئی' ناراض کیوں ہوتے ہو؟'' بتاؤ؟ کیا کہتے ہو؟ میں چاہتا ہوں: ''تین نہیں وہاں ساڑھے تین ہونا چاہیے صاحب!'' اوبھئی! تین۔ میں کہتا ہوں: نہیں صاحب!'' ٹھیک ہے بھئی! وہ جو تم Calculation کر رہے ہو' میاں صاحب ناراض ہو رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ اتنی سی بات میں فرق بھی کیا پڑے گا: تین نہیں اس کے ساتھ Compromise کرو۔ ساڑھے تین سہی۔ اس کو کہو: وہاں ساڑھے تین لکھا کرے''۔ تو پھر پوچھو: یہ چاند پہ جانے والے کہاں پہنچتے ہیں۔ جب تک قانون Uncompromiseable نہیں ہوگا' قانون نہیں کہلائے گا۔ آپ نے اس میں ذرا سا بھی

Marfat.com

کے Compromise کیا' مفاہمت کی' وہ قانون گیا۔ جہاز کی جس لائن تک پانی رکھنے کا کہا ہے' اگر پانی وہاں تک ہے تو یہ جہاز پانی کے اندر تیرے گا۔ اگر آپ اسے ایک انچ بھی زیادہ لے گئے' تو وہ جہاز پانی میں ڈوب جائے گا۔ اسے توکل کہتے ہیں۔ اس میں ذرا سا بھی Compromise نہیں ہوسکتا۔

دین نام ہی اس چیز کا ہے یعنی خدا کی Uncompromiseable چیز۔ اگر سورج نکل رہا ہو اور اسے کہا جائے کہ ''او خدا کا نام مان' آج نیند پوری نہیں ہوئی ذرا پانچ منٹ ٹھہر کے یا ذرا دس منٹ ٹھہر کے نکلنا'' وہ سنتا ہی نہیں ہے۔ اور اگر آپ صبح چار بجے اٹھ کے بیٹھ جائیں تو کیا وہ آپ کی خاطر صبح آ جائے گا کہ جی اچھا! آپ جاگ اٹھے' میں بھی آ جاتا ہوں۔ دینِ خداوندی Uncompromiseable ہوتا ہے' ناقابلِ مفاہمت ہوتا ہے۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا (17:73) ۔ان کی کوشش یہ ہے کہ کچھ تھوڑی سی مفاہمت کر لے۔ ذرا ان کے ساتھ کچھ Compromise کر لے اور پھر وہ تمہارے دوست بن جائیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ جن اصولوں پہ یہ چل رہا ہے' اگر ان میں کسی طرح ذرا سی بھی لچک پیدا کرا دی جائے تو پھر یہ یوں گیا۔ یہ پہلے ٹکراؤ کی کوشش تھی۔ اس میں ناکامی ہوئی تو پھر Compromise کی کوشش شروع ہوتی ہے' مفاہمت کی صورت شروع ہوتی ہے۔ یہی کچھ تو پاکستان میں بھی ہوا۔ دین کے نام پہ فریب دیا گیا۔

پاکستان میں دین کے نام پر فریب دہی

قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پہ یہ چیز کہی گئی ہے۔ اسے آپ آج کی اصطلاح میں میکاؤلی سیاست (Machiavellian Politics) کہتے ہیں۔ یہ میکاؤلی حکمتِ عملی (Machiavellian Strategy) کہلاتی ہے' اسے سیاسی ضروریات کا تقاضا کہتے ہیں۔ دراصل سیاست میں یہ ڈپلومیسی میکاؤلی (Machiavelli:1469-1527) کی حکمتِ عملی تھی۔ جب دین میں یہ چیز آ جائے تو آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یہ بار بار کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں دین کے راستے سے ہٹ کر فریب دہی آئی تو اس نے اسے تباہ کر دیا۔ خالص سیکولرزم بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ اگر یہی آتی تو اس سے کم از کم زندگی کی طبعی خوشگواریاں تو مل جاتیں۔ دین کے نام پہ جو فریب دہی کی چیزیں آ کر اسے تباہ کر رہی ہیں' ان کے لیے مجھے پھر وہی مثال دینا پڑتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ 1956ء میں جماعتِ اسلامی کے اکابرین کی ایک جماعت اس سے الگ ہوئی۔ یہ نیچے کے طالبعلم نہیں تھے' ان کے ہاں کے اکابرین تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب بھی تھے' جو امیر جماعتِ اسلامی رہ چکے ہوئے تھے۔ جب وہ الگ ہوئے ہیں تو ان کی Statements چھپ گئیں' رسالے چھپے' کتابیں چھپیں' تو پتہ چلا کہ ان کے ساتھ کیا جھگڑا ہوتا رہا ہے۔

Marfat.com

اصول پرستی کے مقابلے میں حکمت عملی

انہوں نے مودودی صاحب کو Accuse کیا تھا کہ آپ نے جب یہ جماعت بنائی تھی تو اس زمانے میں آپ نے ہمیں کچھ اصول دیئے تھے اور کہا تھا کہ یہ دین کے اصول ہیں' جو اٹل ہیں' ان کے مطابق چلنا ہے۔ ہم اس لیے ساتھ ہوئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب آپ اقتدار کے پیچھے جا رہے ہیں' اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو آپ ان اصولوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ ساتھ نہیں دیتے۔ ان کا جواب موجود ہے۔ آج تک یہ اسی مشہور جواب پہ چلے آ رہے ہیں کہ ''صاحب! یہ اصول اپنی جگہ پہ ٹھیک ہیں لیکن حکمتِ عملی بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ اصول آج بھی وہی اصول ہیں لیکن یہاں کی سیاست کے جو تقاضے ہیں' ان کی رُو سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ان اصولوں کے اندر کچھ لچک پیدا کریں''۔ یہ حکمتِ عملی کہلاتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر بہتان (معاذ اللہ)

اگر یہیں تک یہ کچھ ہوتا تو ان کی سیاست ہوتی لیکن ہماری بدبختی' ہماری بدقسمتی' یہ ہے کہ یہ لوگ جو کچھ اپنی حکمتِ عملی کے طور پر اپنے مفاد و تقاضوں کے لیے کرتے ہیں' جھٹ سے یہ اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں کہ جن کے متعلق قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے سب قسم کی تکلیفیں برداشت کیں مگر اپنے اصولوں میں ذرا سی لچک نہیں پیدا ہونے دی۔ یہ کہتے یہ ہیں کہ تم دیکھتے نہیں ہو۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ کہ رسول اللہؐ اپنی مکی زندگی کے اندر' مذہبی زندگی میں مساواتِ انسانیہ کا اصول پیش کرتے چلے آئے' جب مملکت بن گئی تو آپ نے یہ کہہ دیا کہ یہ مملکت الحکم من قریش ہے۔ یہ مملکت میرے خاندان کے اندر رہے گی' قریشیوں کے اندر رہے گی۔ کہاں گیا مساواتِ محمدیؐ کا اصول جسے حضورؐ تیرہ برس مکے میں قائم کرتے چلے آ رہے تھے؟ یہ جواب دیا گیا ہے عزیزانِ من! پھانسی دیدو' اس پرویز [1] کو کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ اپنی اس روش کو جائز ثابت کرنے کے لیے' بازی بازی باریش' او سوچو تو سہی' کس مقام پہ' کس ہستی پہ ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس کا مقام جبریل سے بھی اونچا ہے۔ کہہ رہے ہو کہ اس صلعم نے بھی اصولوں کو چھوڑ کے حکمت عملی اختیار کر لی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا' یہ سازشیں کر لی تھیں کہ کسی طرح سے تو اپنے اصولوں کے اندر ذرا سی لچک پیدا کر لے۔ ان کے سامنے تھوڑی سی مفاہمت اور Compromise کر لے۔ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡکَ خَلِیۡلًا (17:72)۔ تو یہ تمہارے دوست بن جائیں گے۔

قرآن بار بار کہتا چلا آ رہا ہے عزیزانِ من! سنتے رہو یہ دو چار آیتیں۔ یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ اصولوں میں بالکل لچک نہیں ہوتی۔ یہاں کسی قانون کے اندر تھوڑی سی لچک پیدا کر کے اس کا تماشا دیکھیے کہ کیا بنتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔

---

[1] جی۔ اے۔ پرویز (۹ جولائی ۱۹۰۳ء تا ۲۶ فروری ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَایَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (10:15)۔ تُو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ بھئی! بات یہ ہے کہ آؤ! بیٹھ کے بات کرلیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ قرآن جو تم Constitution کے طور پہ دیتے ہو' ہمیں Acceptable نہیں ہے۔ اس کو چھوڑ دو اور آؤ مل جل کر اسے ایک بنالیں یا جیسا ہم کہتے ہیں' اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا کردو' کچھ Compromise کی صورت پیدا ہونی چاہیے۔ قُلْ (10:15)۔ ان سے کہہ دو کہ سربراہ مملکت تو میں ہوں۔ تمہارے آج کے انداز کے مطابق مجھے Sovereignty حاصل ہے' میرے اوپر کسی کا اقتدار نہیں۔ تمہارے ذہن میں یہی ہوگا کہ میں جیسے جی چاہے کرسکوں گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ Constitution میں تبدلیاں ہوتی جارہی ہیں۔ اندرا گاندھی کیا کررہی ہے؟ یہی کہ وہ آئین میں تبدیلیاں کررہی ہے اور یہی ڈیموکریسی ہے۔ جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ آپ اپنے ہاں اکثریت لے آئیے۔ آئین میں جی چاہے' جب جی چاہے' ترمیم کرلیجیے صاحب! وہ غیر آئینی ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ ہے یہاں کا میکاؤلی نظام (Machiavellian System)۔ یہ کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ وہ Constitution بھی ان کا اپنا ہی بنایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: وہ ہمارا بنایا ہوا ہے اس لیے ہم مجاز ہیں' جب جی چاہے' اس میں ترمیم کرلیں۔ بات بڑی ٹھیک ہے' یہ عین جمہوریت ہے۔ اس کا جواب بھی یہی ہے' اور دنیا میں کوئی بھی اٹھ کے یہ نہیں کہتا کہ نہیں' یہ Undemocratic ہے۔ یہ جمہوریت ہے۔ ترمیم کا بل (Bill) پارلیمنٹ میں پیش کیا' اکثریت نے وہاں منظور کرلیا۔ کیوں کردیا؟ اس لیے کہ یہ انہی کا بنایا ہوا تھا' وہ اس میں ترمیم کرسکتے تھے۔

میں کون ہوں کہ جو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی کروں

عزیزانِ من! دیکھیے' قرآن کہاں بات کرتا ہے! قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو: قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (10:15)۔ میں اس میں تبدیلی تو اس صورت میں کروں' جب یہ میرا اپنا بنایا ہوا ہو۔ یہ تو میرا بنایا ہوا ہی نہیں ہے۔ یہاں تو Constitution ہی خدا کا دیا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں مجھے Sovereignty حاصل ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یہ دیا گیا ہے کہ اس Constitution (آئین) کے مطابق کام کرو۔ میں خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ جب یہ میرا بنایا ہوا نہیں ہے' میں اس میں کیسے تبدیلی کرسکتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ ذرا سی لچک پیدا کرلو۔ کہا: اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (6:15)۔ اگر میں اس میں ذرا سی بھی مفاہمت اور لچک کروں تو خدا کے اس عذاب سے ڈرتا ہوں کہ جو بڑا سخت ہوتا ہے۔ سنتے ہیں جواب! فرق یہ ہے عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ جس کو اسلامی حکومت کہتے ہیں یہ کس طرح سے سیکولر سے منفرد ہے؟

Marfat.com

اسلامی حکومت کا آئین انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہوتا

ایک لفظ کا جواب ہے عزیزانِ من! کہ اسلامی حکومت کا Constitution (آئین) انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ انہیں خدا کی طرف سے بنا بنایا ملتا ہے۔ اس لیے یہ تو ایک پارٹی کی اکثریت ہے۔ ساری دنیا کی اکثریت بھی اس میں تبدیلی نہیں کرسکتی۔ کیوں نہیں کرسکتی؟ اس لیے کہ یہ انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ کیا جواب ہے؟ ''میں کیسے کرسکتا ہوں۔ یہ تو میرا بنایا ہوا ہی نہیں ہے۔ یہ No Compromise ہے''۔ دوسری جگہ ہے: وَلَا تَرۡكَنُوۡۤا اِلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ اَوۡلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ (11:113)۔ وہاں نبی اکرمﷺ سے بات ہو رہی تھی۔ حضورﷺ سے ہی کہا گیا تھا۔ یہاں یہ پوری کی پوری جماعتِ مومنین جوامتِ مسلمہ ہے، جو مسلمان ہیں، ان سب سے کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! ''ان کی طرف ذرا سا بھی نہ جھک جانا' ان کے ساتھ کوئی Compromise نہ کرنا۔ اگر یہ کیا، اگر تم ذرا سے جھکے تو جہنم میں چلے جاؤ گے، جس میں یہ سارے جائیں گے، یہ تباہی کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوں گے۔ اس تباہی سے بچانے والا صرف خدا کا قانون ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی حامی و ناصر نہیں۔ اگر اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔'' اس لیے کہ اصول میں ذرا سی تبدیلی کی اور پھر وہ ساری کی ساری تو کیا، اس نے تو اس سارے اصول کا ہی بیڑہ غرق کر دیا۔

دین میں Compromise (مفاہمت) شرک ہے

میں نے کہا ہے کہ آپ کے جو بچوں میں سے پانچویں، چھٹی جماعت کا بچہ حساب کا سوال نکال رہا ہوتا ہے اگر وہ کسی جگہ ضرب تقسیم کے کسی ایک ہندسے کے اندر تھوڑی سی غلطی کر دے یا Compromise (مفاہمت) کر جائے تو پھر دیکھیے کہ آخر تک سارا ہی سوال غلط ہو جاتا ہے۔ اس سوال میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ جو ایک Digit (ہندسہ) غلط ہوا ہے اس کے اتنے نمبر کاٹ دیئے جائیں تو پھر سارے سوال پہ ہی لکیر لگ جاتی ہے۔ دین میں تو Compromise کی کوئی صورت نہیں ہوتی ہے۔ ہاں، ایک ریفرنس لے لیجیے یہ آپ کے کام آئے گا۔ پتہ نہیں ''تبویب القرآن''[1] کب آئے۔ اس میں آپ کو یہ سب کچھ ملے گا۔

فَلَا تُطِعِ الۡمُكَذِّبِيۡنَ وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَيُدۡهِنُوۡنَ (68:8-9)۔ بڑی کوششیں کریں گے کہ تجھے اپنے مقام سے پھسلا دیں۔ یہاں لفظ مداھنت ہے۔ یہ لفظ خوب ہے۔ ''دوھنیت'' ''پھسلنا'' ہوتی ہے۔ ویسے تو یہ پھسلنا ہر جگہ خطرناک ہوتا ہے لیکن اگر اس قسم کا فرش ہو اور اس پہ کہیں تھوڑا سا تیل گر جائے یا ویسلین (Vaseline) گر جائے یا کیوں نہ ذرا سا دودھ ہی گر جائے تو وہ جو پھسلنے والی روغنیت کی چیز ہوتی ہے، وہ اگر اس پہ ہو، اور پھر آپ پھسلیں تو جو حشر ہوتا ہے، وہ آپ خوب دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ کیا لفظ ہے

[1] اب یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

قرآن کا! کہا کہ یونہی چند قطرے تیل کے اس فرش پر گرائیں گے' اگر تم نے یہ تسلیم کرلیا کہ ہاں میں اسی پہ پاؤں رکھ کے چلوں گا تو پھر اس کے بعد جو پاؤں پھسلے گا' سوائے اس کے کہ جہنم میں جاکے تمہارا ٹھکانہ ہوگا' اس سے ورے بچ ہی نہیں سکو گے۔ یہ لوگ اس قسم کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ ذرا سی پھسلن ہے۔ یہ تو ایک جگہ' ایک مقام' سے پھسلے تو پھسلنے کے بعد پھر پتہ نہیں کہ کہاں تک پھسلتے چلے جاؤ گے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کی کوششیں یہ ہیں کہ یہ ایسا کچھ کریں۔ اس طرح کچھ تم اپنے مقام سے ہٹو' کچھ یہ نرم پڑیں اور اس طرح تم دونوں میں مفاہمت (Compromise) کی شکل پیدا ہو جائے۔ اس لیے ان کی بات بالکل نہ ماننا۔

قرآن کے اصول پر جم کر کھڑے ہونے کا نتیجہ ثبات ہے

یہ قرآنِ کریم ہے عزیزانِ من! اگلی آیت آئی: وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (17:74)۔ اگر خدا کی اس کتاب' قرآن' نے تمہیں اپنے مقام کے اوپر ثابت قدم نہ رکھا ہوتا' تو ہوسکتا تھا کہ تم ان کی باتوں میں آ کے کچھ تھوڑا سا Compromise (مفاہمت) کر لیتے۔ یہ قرآن ہے' جو تمہیں تھامے ہوئے ہے۔ قرآن کیسے تھام لیتا ہے؟ یہ ایمان ہے کہ اس قرآن کی ذرا سی بات کے خلاف بھی میں نے کوئی بات نہیں کرنی۔ اس ایمان کی وجہ سے قرآن تھام لیتا ہے۔ یہ ثبات اس کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ یہاں نبی اکرمؐ سے یہ کہا گیا کہ اس کی وجہ سے ثبات حاصل ہوا ہے۔

قرآنی اصولوں کو بتدریج نازل کرنے میں حکمت

اس ثبات حاصل ہونے کے بھی دو چار ریفرنسز دیکھ لیجیے۔ ایک اور حوالہ ہے: وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (25:32)۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن بنا بنایا' لکھا لکھایا' ایک ہی دفعہ کیوں نہ دیدیا گیا۔ کہا: انہیں پتہ نہیں ہے۔ کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا (25:32)۔ ایک ایک اصول' ایک ایک حکم' ہم نے تئیس سال کے عرصے میں آہستہ آہستہ' آہستہ آہستہ اتارا' تاکہ ایک اصول پر عمل کرنے سے تمہارے پاؤں جم جائیں تو پھر اگلا اصول دیا جائے۔ قدم بقدم 'بتدریج (Gradually) جیسے بچوں کو چلنا سکھایا جاتا ہے' پہلے ہی دن ان کو دوڑنا نہیں سکھا دیا جاتا۔ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے لیے بڑی تدریج چاہتا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! نبی اکرمؐ کے متعلق جو یہاں کہا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب بھی غیر قانونی معاشرے سے قانونی معاشرے کی طرف چلیں گے' آپ کو بتدریج ہی چلنا ہوگا لیکن اس تدریج میں اصول یہ سامنے رہے کہ جس اصول پہ آپ نے عمل کرنا ہے' اس میں کسی کے ساتھ Compromise نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک ہے بتدریج چلیے۔ یہاں ایک دوسرے مقام پہ نبی اکرمؐ سے کہا: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (16:102)۔ اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ یہ روح القدس تیری طرف نازل کیا ہے۔ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (16:102)۔ تاکہ یہ ان کے' جو اس کا یقین رکھنے والی قوم ہے' کے پاؤں میں لغزش نہ

Marfat.com

آنے دے'ان کو ثبات حاصل ہو تو قرآن ہی سے ثبات ہو سکتا ہے۔ یہ کیا بات ہے' جو اس سے ثبات ہو سکتا ہے! کہا: ثبات' یہی چیز ہے کہ یہ قانون ہمارا وضع کردہ نہیں ہے' یہ قانون ہم نے نہیں بنایا' پہلے ہی دن یہ فیصلے کر لو کہ یہ Constitution (آئین) ہمارا نہیں ہے۔ ہم اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اب بھی جب یہ کہتے ہیں کہ وہ Constitution Central گورنمنٹ (مرکزی حکومت) کا ہے۔ اس میں پراونشل (صوبائی) گورنمنٹ کا گورنر دخل نہیں دے سکتا۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ یہ کچھ Within my Power نہیں ہے۔ یہ ان کا ہے اور جب یہ پوری جماعتِ مومنین بمعہ رسول کے یہ کہے کہ یہ ہمارا نہیں ہے' یہ خدا کا ہے' تو وہ ان میں سے کوئی بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ ہے جسے ثبات کہتے ہیں۔

کلمۃ طیبۃ کا مفہوم

یہی ہے جسے قرآن نے کلمۃ طیبۃ کہا ہے۔ دوسری جگہ کہا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24)۔ قرآن کی مثال' ایک نظریہ حیات' کلمہ طیبہ' خوشگوار نظریہ حیات کی ہے' جس میں پھل لانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس درخت کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں پاتال [1] میں ہیں' اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ تمہاری مادی دنیا کے اندر اس کی جڑیں ہیں لیکن اس کا اپنا سانس عرشِ الٰہی سے ملنے والا کلمہ طیبہ ہے۔ آگے اس کلمہ طیب کے متعلق کہتے ہوئے' قرآن میں آیا ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (14:27)۔ یہ ہے وہ قولِ ثابت' وہ محکم نظریۂ حیات' جس کی وجہ سے جماعتِ مومنین کو ثبات حاصل ہوگا' یہ ثبات و استحکام اس نظریہ کی وجہ سے ہوگا۔ ثبات کہاں حاصل ہوگا؟ کہا: قیامت میں جا کے نہیں بلکہ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (14:27)۔ یہیں ہوگا' اسی دنیا میں حاصل ہوگا۔ وَفِي الْاٰخِرَةِ (14:27)۔ اور وہاں آخرت میں بھی ہوگا۔ پہلے فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہوگا' قرآن کے ساتھ انتساب [2] کا پہلا نتیجہ یہاں ثبات ہے: فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور ثبات تو بڑی چیز ہے' جس قوم کو ثبات حاصل ہو جائے' وہی قوم زندہ رہتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ کسی قوم کے ساتھ اپنے اصولوں میں Compromise (مفاہمت) کرنے کی صورت نہ کرو عزیزانِ من! کہا کہ اگر قرآن تمہیں بھی ثابت نہ رکھتا تو ہو سکتا تھا کہ یہ مملکت کے تقاضے' مفاد پرستیاں' مصلحت گیریاں' حکمتِ عملی تمہیں اس چیز پہ آمادہ کر دیتیں کہ کچھ تو تھوڑا سا Compromise (مفاہمت) کر لو: کچھ تم بڑھو' کچھ ہم جھکتے ہیں تو اس طرح معاملات دگرگوں ہو جاتے۔

---

1. تحت الثریٰ' زمین کا سب سے نیچے کا برت۔
2. لگاؤ' تعلق

Marfat.com

رسول کو عام لوگوں سے دگنی سزا

سنیے عزیزانِ من! اس کی یہ ذمہ داریاں کہ جو قرآن کو ہاتھ میں لے کے اپنی امت یا اپنی قوم کے لیے رہبر بنتا ہے' کہا: اگر اے رسول! تم نے ایسا کرلیا ہوتا: اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ (17:75)۔ تو یاد رکھو اس زندگی میں بھی تجھے عام لوگوں سے دگنی سزا تجھے ملتی' آخرت میں بھی تجھے دگنی سزا ملتی۔ عام افراد کی جو لغزش ہوتی ہے' جو جرم ہوتا ہے' اس کے اثرات اس کی ذات تک رہتے ہیں۔ یہ جو سربراہ یا لیڈر یا راہنما یا قائد ہوتا ہے' عزیزانِ من! اس کی جو ذرا سی لغزش ہے' وہ بڑی متعدی ہوتی ہے' قوموں کی قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ اے رسول! اگر تو بفرضِ محال اس اصول کے اندر ایسا Compromise کر لیتا' لچک پیدا کر دیتا تو یاد رکھو! اس زندگی میں بھی تمہیں دگنی سزا ملتی' قیامت میں بھی دگنی سزا ملتی' اور یہ وہ سزا تھی کہ ثُمَّ لَاتَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا (17:75) ۔ ہمارے خلاف کوئی تیری مدد نہ کر سکتا۔ یہ کچھ رسول اللہؐ سے کہا جا رہا ہے' عزیزانِ من! یہ ہے دین' یہ مذاق نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 75 تک آ گئے' 76 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❀❀❀❀

چودھواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 76 تا 81)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَٰفَكَ
إِلَّا قَلِيلًا (76) سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (77) أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ
الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (78) وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً
لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا (79) وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ
صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا (80) وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ
زَهُوقًا (81)

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 76 سے ہو رہا ہے۔ 17:76 ۔سابقہ آیات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی تھی کہ اس نئے نظام کی مخالفت کرنے والوں کا پہلا حربہ یہ تھا کہ چونکہ یہ جماعت بڑی کمزور سی تھی' اس لیے ان پر بڑے مظالم ڈھائے گئے تاکہ یہ لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں۔ وہاں بھی انکو سخت ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد اس جماعت کو تقویت حاصل ہوتی گئی' یہ مؤثر ہوتی چلی گئی تو پھر انہوں نے دوسرا یہ حربہ اختیار کیا کہ ان سے کچھ مفاہمت کر لی جائے' کچھ Compromise کر لیا جائے۔ سابقہ آیات میں یہی کہا گیا تھا اور حضور ﷺ سے تاکید کی گئی کہ ان سے Compromise (مفاہمت) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظام' ایک وہ کہ جس کی تم دعوت کو لے کر اٹھے ہو اور دوسرا وہ کہ جس پر یہ کار بند ہیں' باہم دگر متضاد ہیں' متخالف ہیں' ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک حق ہے' دوسرا باطل ہے۔ ایک صحیح ہے' دوسرا غلط ہے تو ان دونوں میں Compromise (مفاہمت) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ Compromise (مفاہمت) وہاں ہوتا ہے' جہاں ایک شخص خود اپنے مصالح' اپنے مفادات' اپنی Configuration کی بناء پر ایک بات کہے' دوسرا اپنی خواہش اور اپنے مصالح کی بات کہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپس میں Compromise (مفاہمت) کرنے کے لیے کچھ وہ چھوڑ دے' کچھ یہ آگے بڑھے۔ دوکاندار کسی پانچ روپے کی چیز کی قیمت دس روپے بتائے گا اور یہ اسے چار روپے دے گا تو پھر ٹھیک ہے' باہم مصالحت ہو جائے گی۔ وہ نیچے اترے گا' یہ آگے بڑھے اور اگر کہیں کسی میں' آپ اسے اصول سمجھ لیجیے' Policy سمجھ لیجیے' کی بنیاد پر قیمت مقرر ہوتی ہے تو پھر اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ گاہک کی طرف سے' دوکان کی طرف سے' کوئی نیچے اتر جائے کیونکہ یہاں معاملہ قیمت کا نہیں' اصول کا ہے' حق کا ہے۔

Marfat.com

حق کی تعریف

حق تو اپنے مقام پہ اتنا اٹل ہوتا ہے کہ وہ حق ہوتا ہی اس وقت ہے جب اپنے مقام پہ قائم رہتا ہے۔ جب وہ اپنے مقام کو چھوڑ دیتا ہے تو اسے حق کہا ہی نہیں جاتا' یہ بس یہی اک صورت ہے۔ جب یہ اپنے مقام کو چھوڑ دیتا ہے' یہ اسی وقت باطل ہو جاتا ہے۔ جیسے جو سوال غلط ہوتا ہے تو وہ ہمہ وقت' ہمہ جہت' ہمہ نسبت' غلط ہوتا ہے' ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ اس میں نسبت 9:10 ہو تو صحیح ہو لیکن 1:10 ہو تو غلط ہو۔ یا وہ غلط ہے یا وہ صحیح ہے' بس یہی ایک صورت ہے۔ تو حق تو مصالحت اور مفاہمت جانتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہ لوگ یہاں بھی ناکام رہے۔

اس کے بعد اگلا طریقہ پھر یہ ہوا کہ یہ دھاندلی پہ اتر آئے کہ اگر یہ نہیں ہوتا تو انہیں یہاں اتنا تنگ کیا جائے کہ اس تصادم اور ٹکراؤ سے یہ اس ملک کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں اور اس کے بعد ان کی جتنی بھی کوششیں تھیں' وہ یہ تھیں کہ Compromise (مفاہمت) ہی ہو جائے۔ کہا گیا کہ آپ انہیں دیکھ لیجیے۔ یہ کوئی مذہب کا' پوجا پاٹ کا' رسومات کا' معاملہ نہیں تھا۔ اس میں کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی' یہ جسے مذہبی آزادی دینا کہتے ہیں' یہ ساری مملکتیں اپنے اپنے مفاد' اپنے اپنے مصالح' کو محفوظ کر لیتی ہیں پھر اس کے بعد مذہبی آزادی Declare کر دیتی ہیں:

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹہ
سنکھ ہائے صدا گونجتی ہے ہر روز برادر

یہ ٹھیک ہے: تم سنکھ [1] بجاتے رہو' یہ اذانیں دیتے رہیں۔ تم گھنٹے بجاتے رہو' تم بتوں کے سامنے جاکے پوجا کر لو۔ یہ گرجے میں چلے جائیں۔ تم مسجد میں چلے جاؤ۔ اس سے کسی کا کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے۔ بگڑتا تو وہاں ہے جہاں کوئی کسی دوسرے کے معبود کو' کسی دوسرے کے مقدس بزرگوں کو' گالیاں دے' ان کی توہین کرے۔ بگاڑ کی یہ چیز وہیں جا کے ہوتی ہے اور قرآن نے تو ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ چیز کفر کی ہے۔ اس لیے کہ ان کے بتوں کو کہیں گالی تک نہ دینا۔ یاد رکھیے! یہ مقابل میں آ کے اسی طیش میں خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں گے تو جھگڑا پیدا ہو جائے گا۔ دین پیچھے رہ جائے گا اور تم اسی میں الجھ کے رہ جاؤ گے تو انہیں یہ تاکید کی گئی کہ ان کے معبودوں کو گالی تک نہ دو۔ باقی رہے ان کے بزرگ جنہیں وہ اپنے انبیاء کرام مانا کرتے تھے' خواہ وہ یہودیوں کے تھے یا عیسائیوں کے' حتیٰ کہ عرب کے بھی جو مورثِ اعلیٰ تھے' حضرتِ ابراہیمؑ یا حضرت اسماعیلؑ جن کی وہ اولاد تھے' یہ مسلمان تو ان سب کو خدا کے رسول مانتے تھے اور رسولوں کی صورت یہ تھی کہ پہلے ان پہ ایمان لاؤ اور پھر محمد رسول اللہؐ پہ ایمان لاؤ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136)۔ رسول ہونے کی جہت سے ان سے کسی میں' کوئی تفریق نہ کرو۔

---

[1] ناقوس' کوڑی' خرمہرہ۔

Marfat.com

ان کا جزوِ ایمان یہ تھا کہ باطل کے معبودوں کو اور ان کے بتوں کو کسی طرح سے بھی خراب نہ کرو ان کی شان میں گستاخی نہ کرو ان کے بزرگوں میں سے ہر ایک کو رسول سمجھو۔ تو سوال یہ تھا ہی نہیں کہ وہ اس بات پہ ان کے مخالف ہوں کہ صاحب! تم ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے ہو ہمارے بزرگوں کی شان میں گستاخیاں کرتے ہو۔ یہ بات تھی نہیں۔ اب بھی غیر مسلم اپنے ہاں، جس طرح جی چاہے اپنی اپنی پرستش کریں، عبادت کریں، پوجا پاٹ کریں، ان سے کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ یہ مزاحم اس وقت ہوتے ہیں جب وہ بزرگوں کی شان میں، نبی اکرمؐ کی شان میں، گستاخی کریں۔ تو وہاں مسلمانوں کے ہاں اس طرح کی کوئی بات تھی ہی نہیں تو پھر یہ لوگ کیوں اس قدر تصادم پہ اتر آتے تھے؟ کس بات پہ یہ ٹکراؤ اتنا زیادہ تھا؟ کیا یہ معاملہ مذہب کا تھا؟ اس تصادم کی اصل وجہ کیا تھی؟

اس تمام تر مزاحم کی وجہ مذہب نہیں، دین تھا

عزیزانِ من! یہ مذہب کا معاملہ تھا ہی نہیں۔ یہ دین کا معاملہ تھا۔ یہ زندگی کے نظام کا معاملہ تھا۔ ایک نظام ان کا تھا جس میں انہیں سارے مفادات حاصل تھے اور وہ مظلوم، کمزور، ضعیفوں کی آبادیوں کا استحصال کرتے تھے، Exploit کرتے تھے۔ ایک یہ ان کا نظام تھا، جو ان کے ہاتھوں سے اقتدار اور Sovereignty چھینتا تھا اور ان کمزوروں اور مظلوموں کو ان سلب ونہب کرنے والوں کی سطح پہ لا رہا تھا۔ یہ دو نظاموں میں ٹکراؤ تھا اور یہ وہ چیز ہے، جسے وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ غالب نظام والے، جن کا نظام متمکن ہوتا ہے، یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ کہیں کوئی ایسا نظام مسلط ہو جائے، جو ان کے اس نظام کی شکست کا باعث بن جائے۔ یہ آپس میں ٹکراؤ کی بات تھی۔ اس میں یہ کہا گیا کہ کسی قسم کی کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی تو دوسرا حربہ یہ تھا کہ انہیں یہاں اتنا تنگ کرو کہ یہ ملک چھوڑ کے چلے جائیں۔ یہ قرآن کے الفاظ میں یوں ہے کہ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ (17:76)۔ اب پھر کوشش یہ ہوگی کہ تمہیں اتنا تنگ کیا جائے کہ تم ملک چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔ جو شخصیت ایسا انتظام کر رہی ہو، جو کسی اصلاح (Reformation) کے لیے اٹھی ہو، اس کے پروگرام کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سرزمین کو چھوڑ کے دوسری جگہ چلی جائے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اب جو لوگ اس نظام کے حامل ہیں، وہ اس درجہ پہ پہنچ چکے ہیں کہ اب یہاں ان کی بقاء اور زندگی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور وہ انہیں اسی طرح چھوڑ جاتا ہے جیسے ایک ڈاکٹر اس وقت مریض کی چارپائی سے اٹھ جاتا ہے، جب وہ اس کے علاج کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائے۔ یعنی کسی مریض کی صحت یابی کی، جب آس ٹوٹ جائے، تو معالج اٹھ جاتا ہے۔

ہجرت کا مفہوم

بالکل اسی طرح کسی قوم کی اصلاح کے سلسلہ میں جب ان کی بقاء اور زندگی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی، وہ نبی اس مقام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پہ چلا جاتا ہے، جس کی فضا اسی پروگرام کے لیے سازگار ہوتی ہے۔ کسی نبی کا یہ عمل ہجرت کہلاتا ہے۔ یہ اس پروگرام

Marfat.com

میں بڑا اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ فرار نہیں ہے' یہ Escape نہیں ہے' بھاگ جانا نہیں ہے' میدان چھوڑ جانا نہیں ہے بلکہ یہ اعلان کر کے اٹھ جانا ہے کہ اب تمہارے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور تم ہلاک ہوا چاہتے ہو' میں تمہارے ساتھ ہلاک نہیں ہونا چاہتا' اب تم بچ نہیں سکتے اور یہ لو میں اب گیا۔ یہ کہا کہ وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (17:76) ۔ اگر اس نے ایسی صورت پیدا کر دی تو پھر تمہارے چلے جانے کے بعد یہ بھی جیتے نہیں رہیں گے' تمہارے یہاں ہونے سے تو پھر بھی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے' ان میں اصلاح ہو' یہ بدل جائیں' اس مریض کی بالیں [1] سے تمہارے اٹھ کے چلے جانے کے معنی یہ ہونگے کہ اب انہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیسا انداز ہے کہ بزعمِ خویش تو یہ سمجھیں گے کہ ہم نے میدان مار لیا' وہ بھاگا۔ انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ بھاگنا نہیں ہے۔ یہ تمہاری تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے لیے نئے مقام پہ چلے جانا ہے۔ تم اب نہیں بچ سکو گے تو قرآن نے کہا ہے کہ اے رسول! یہ بات صرف تمہارے ہی ساتھ نہیں ہو رہی' یہ تو سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (17:77) ۔ ہر رسول کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا رہا۔ ان Stages سے ہر ایک کو گذرنا پڑا تھا۔ ہمارے قوانین اور دستور اٹل ہوتے ہیں تو ان میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔

ذاتی مفاد پرستی کے بالمقابل نوعِ انسانی کی منفعت کا نظام

دو نظاموں کے درمیان یہ ایسی کشمکش ہے' جو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ ایک طرف انسان کا ذاتی مفاد پرستیوں کا نظام ہوتا ہے' اس کے مقابلے میں مَا يَنْفَعُ النَّاسَ (13:17) کا نظام ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت چاہتا ہے۔ پہلے دن سے آخر تک انبیاء کرامؑ اور ان کی تعلیم کا یہی سلسلہ رہا ہے۔ انبیاء کرام محض پرستش سکھانے کے لیے' پوجا پاٹ کے طریقے بتانے کے لیے' نہیں آیا کرتے تھے۔ ایک نظام کو الٹ کے اس کی جگہ خداوندی نظام قائم کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ تو اس لیے ہر رسول کی مخالفت ہوتی تھی اور قرآن کہتا ہے کہ ان Stages سے ہر ایک کو گذرنا ہوتا تھا۔ آخر میں یہ سٹیج آ جاتی تھی جب وہ اس مقام سے' اس بستی سے مایوس ہو کر' کسی ایسی دوسری جگہ چلے جاتے تھے جہاں وہ مطمئن ہوتے تھے۔ کہا: یہ تو طریق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ (17:77) ۔ یہ جتنے رسول بھی تم سے پہلے آئے' انہیں لوگوں نے اسی طرح تنگ کیا۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (17:77) ۔ ہمارا دستور اٹل رہا۔ لوگوں کی بھی یہی روش رہی اور ہماری بھی یہی روش رہی۔ اس کے بعد جب بھی یہ دیکھا گیا کہ اب ان کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے تو رسول اپنی اس جماعت کو لے کے وہاں سے نکل آیا ہے۔ اس کے بعد وہ قوم تباہ ہو گئی ہے۔ کسی معاشرے کے اندر' اصلاح کرنے والے پُر خلوص افراد کا' اس مایوسی کی حالت پہ پہنچ جانا کہ اب تو ان کے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے' اس قوم کے لیے ایک بڑا جانگداز مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ ان حق بات کہنے والوں کو کبھی اس مقام تک نہیں پہنچا دینا

---

[1] سرہانہ۔ سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت خدامِ ادب بولے: ابھی آنکھ لگی ہے

Marfat.com

چاہیے کہ وہ ان کیطرف سے مایوس ہو کر اٹھ کے چلے جائیں۔ پھر وہ قوم باقی نہیں رہتی۔

رسول آنے بند ہو گئے' یہ ٹھیک ہے لیکن سنۃ اللہ تو اسی طرح سے جاری و ساری ہے۔ رسول کا دیا ہوا پیغام تو قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔ اگر کسی جگہ بھی اس پیغام کو پہنچایا جائے گا تو اس کے مقابل میں ردِعمل یہی ہو گا کہ ان کا گلا گھونٹ دیا جائے' ان کے پیچھے ڈگڈگی لگا دی جائے' کوئی ان کی آواز نہ سننے پائے حتیٰ کہ انہیں اتنا مجبور کر دیا جائے کہ اگر یہ ملک نہیں چھوڑتے تو آواز دینا بند کر دیں۔ تو یاد رکھیے! یہ ان کی شکست نہیں' یہ شکست ان کی ہے جو ان کا گلا گھونٹنے کی یہ آواز دیتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہلاکت کے دن قریب آ چکے ہیں کہا کہ: وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (17:77)۔ ہمارا یہی طریق چلا آ رہا ہے۔ ہمارے قوانین اور دستور اٹل ہوتے ہیں اور تم خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب ایک طرف تو یہ کہا کہ ان کے ساتھ Compromise کی شکل بھی ختم ہو گئی۔

کفار کی آئے دن مدینے پہ یورش کی وجہ

یہ بھی ہے کہ اگر یہ بات مکہ میں ہوئی تھی تو حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے تھے۔ مدینے میں آنے کے بعد بھی ان مکہ والوں کی' ان قریش کی' اور خود مدینے کے ان یہودیوں کی' جو یہاں کے رہنے والے تھے اور اس کے علاوہ ان منافقین کی' یہ بھرپور کوشش تھی کہ آپ کو یہاں مدینے میں بھی ایسی شکست دی جائے کہ یہ اس سرزمین کو بھی چھوڑ کے چلے جائیں۔ یہ مکہ والے جو ہر تیسرے دن یورش کر کے آ جاتے تھے' مدینے پہ چڑھائیاں کرتے تھے' کاہے کے لیے کرتے تھے؟ اب تو وہاں انہیں' ان کی پرستش کو' ان کی بت پرستی کو' روکنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ یہ کیوں چڑھائیاں کر کے یہاں مدینے میں آتے تھے؟ اس زمانے کا تین سو میل کا سفر کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ یہاں روز چڑھائیاں کرنے کے واسطے آتے تھے کہ یہاں کہیں ان کا یہ نظام متمکن نہ ہو جائے۔ اگر یہ ایک جگہ متمکن ہو گیا تو پھر یہ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ اس بات کا انہیں خوب اندازہ تھا۔

پروگرام کی تکمیل کے لیے اور زیادہ سرگرمِ عمل ہونے کی تاکید

تو یہ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ اگر مدینے میں آنے کے بعد بھی وہی صورت ہو تو بھی حضور ﷺ سے یہ کہا کہ Compromise (مفاہمت) کی بات نہیں ہے۔ ان سے کبھی Compromise (مفاہمت) نہیں کرنا لیکن اب تصادم بڑی سختی اختیار کر جائے گا۔ اس کے لیے اب دوسری طرف سے آپ کو یہ تاکید کی گئی کہ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (17:78)۔ اب تم کیا کرو؟ یہ تو تمہاری مخالفت میں اور زیادہ کوششیں کریں گے' فوجیں اکٹھی کریں گے' اپنے ہاں اسلحہ اکٹھا کریں گے' کاوشیں کریں گے۔ تم کیا کرو؟ تم اس پروگرام کو مستحکم کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ سرگرمِ

Marfat.com

عمل ہو جاؤ۔ اس کا لفظی ترجمہ تو عام یہ کیا جاتا ہے کہ "تم دلوک الشمس سے غسق الیل تک صلوٰۃ کو قائم کرو اور صبح کے وقت قرآن کا مطالعہ بڑا مشہود ہوتا ہے۔" یعنی اتنا عظیم پروگرام' اتنی بڑی مخاصمت' تصادم' ٹکراؤ اور اس کے بعد یہی کہ زیادہ نمازیں پڑھا کرو۔ یہ تو وہی ہے جو ہم کرتے ہیں' تو پھر بھی تباہیاں آتی ہیں۔ اس پر تو وہ دو تین چار قسم کی اور نمازیں ہیں جن کو پڑھا دیا جاتا ہے کہ اب یہ کچھ اور نمازیں پڑھا کرو' کوٹھے پہ کھڑے ہو کے اذانیں دیا کرو۔ یہی کچھ ہو جاتا ہے۔ تو آپ سمجھتے ہیں کہ خدا نے پروگرام دینا تھا' انہیں یہ کرنے دو' تم کچھ اور زیادہ نمازیں پڑھا کرو۔

عزیزانِ من! میں نماز کی تنقیص نہیں کر رہا' اس کی اہمیت کم نہیں کر رہا۔ بتا یہ رہا ہوں کہ یہ صلوٰۃ ہے۔ میں ابھی اس کے معانی بتاتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے' میں نے بتایا ہوا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے صلوٰۃ دین کا پورا نظام ہے' جسے متمکن کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ بڑی جامع اصطلاح ہے اور اسی نظام کے لیے' یہ جو آپ کے ہاں اجتماعات ہوتے ہیں' جنہیں آپ وقتی نماز کہتے ہیں' یہ اس پروگرام کے اندر اجتماعات (Gathering Meetings) ہیں۔ ہر نظام کے لیے' ہر پروگرام کے لیے' آپ کو اکٹھا بیٹھ کے سوچنا پڑتا ہے۔ قرآن نے جہاں کہا ہے: اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38)۔ وہاں صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ تو صلوٰۃ کا قیام کرو اور معاملات کو باہمی مشورے سے طے کیا کرو۔ تو وہ صلوٰۃ تو کوئی ایسی چیز ہے کہ جس میں باہمی مشاورت سے کچھ معاملے طے کرنے پڑتے ہیں' جبکہ نماز کے وقت میں تو آپس میں بولنا ہی نہیں۔ یہ تو اس نظام کی بات ہے۔ پھر سن لیجیے کہ اس نظام کے اجتماعات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اکٹھے بیٹھ کے' مشورہ کر کے' کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یہ جو اس صلوٰۃ میں' جسے اب وقتی نماز کہتے ہیں' یہ وہ اجتماعات ہیں' جو اس نظام کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لیے' باہمی مشاورت کے لیے' اکٹھا ہوا جاتا ہے۔ تو جہاں یہ قیامِ صلوٰۃ کی چیز آئے گی' اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس نظام کو قائم کرنے میں پہلے سے زیادہ سرگرمِ عمل ہو جاؤ۔ یہ کہا کہ اگر پہلے کچھ تھوڑا سا وقت دیتے تھے یا کچھ وقت بچا لیتے تھے' تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں اس نظام کے لیے جو کوشش کرنی ہے۔ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ (17:78)۔ اس کے لیے تمہیں اب سورج نکلنے سے لے کر سورج غروب ہونے تک پورے کا پورا دن' سارا دن' سارا وقت' اس میں لگانا پڑے گا۔

قرآن پر غور و فکر کے لیے صبح اٹھنے کی تاکید کی ہے

اب رہی سورج کے نکلنے سے پہلے کی بات' اس کے لیے قرآن کریم نے کہا: وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا (17:78)۔ قرآن میں اور مقامات پہ بھی یہ بات آئی ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا۔ قرآن بہت صبح اٹھنے کے لیے کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اٹھنا ہی بہت صبح چاہیے۔ یہ کہا کہ جب دن چڑھ جائے' دن نکل آئے تو اس کے بعد تو تمہارا عملی پروگرام شروع ہو جائے گا' سارا دن تگ و تاز میں لگے رہو گے۔ اس پروگرام کے شروع کرنے سے پہلے تو یقیناً بیٹھ کے سوچنا ہوگا کہ آج کیا کیا جائے' ہمیں کیا ہدایت ملتی ہے۔ کہا کہ اس سے پہلے جو فجر کا وقت ہوتا ہے' وہ سکوت کا وقت ہوتا ہے' سکون کا وقت ہوتا ہے۔ اس میں اٹھ کے سب سے

Marfat.com

پہلے تو یہ دیکھو کہ قرآن تمہیں اس کے لیے کون سی ہدایت دیتا ہے' آج کیا پروگرام کرنا ہے۔ ہر نظام میں آپ دیکھیں گے کہ دن بھر میں جو کچھ کرنا ہوتا ہے' اس کے لیے پہلے صبح صبح اس پروگرام پر بیٹھ کے آپ غور وفکر کرتے ہیں کہ ''ہاں بھئی! آج کیا کرنا ہے' آج یہاں راج مزدور لگانے ہیں۔'' ان کے لیے' ان کے کام کرنے کے لیے تو آپ پہلے بیٹھ کے سوچتے ہیں کہ ''ہاں بھئی! آج کیا کیا کام کرنا ہے؟'' ہر کارخانے میں یہ ہوتا ہے' ہر نظام میں یہ ہوتا ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے یہ چیز Discuss کی جاتی ہے' غور وفکر کیا جاتا ہے کہ آج کیا کرنا ہے۔ یہ تھی وہ آج کیا کرنے والی بات جس کے لیے کہا کہ قبل شمس سے تم نے وہ شروع کر دینا ہے' اس پروگرام پر عملاً یہ کچھ کرنا ہے اور اس سے پیشتر اس کے متعلق سوچنا ہے کہ آج کرنا کیا ہے۔ یہ ہے قران الفجر۔ تو کہا کہ اس وقت بالکل سکوت وسکون ہوگا کہ ابھی زیادہ شور شرابا نہیں ہوگا' اس شور وغوغا قسم کی سرگرمیاں شروع نہیں ہوئی ہونگی' وہ سکون کا وقت ہوگا۔ اس وقت جو قرآن پہ غور وخوض کرو گے' قرآن نے اسے مشہود کہا ہے صاحب! تو اس کے جو بھی چھپے ہوئے حقائق ہیں' جو بھی مضمر حقائق ہیں' اس وقت سکون کے ساتھ ان پہ غور کرو گے تو وہ بالکل مشہود شکل میں تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ غور وفکر کے لیے جو علی الصبح کا وقت ہوتا ہے' جب ابھی لوگ بھی جاگے ہوئے نہیں ہوتے' معاشرے میں بھی ابھی اس قسم کی تگ ودو شروع نہیں ہوئی ہوتی' وہ بڑا عجیب وقت ہوتا ہے۔ اس وقت کسی چیز پر بڑے سکوت اور کامل ارتکاز Concentration سے غور وفکر ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ اس وقت کا قرآن تو یوں سمجھو جیسے ایک محسوس شکل میں نکھر کے سامنے آ جاتا ہے۔

استغفار کا قرآنی مفہوم

قرآن کریم میں اور مقامات پہ مومنین کے پروگرام کے متعلق یہ خصوصیات بتائی ہیں: اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ (3:16)۔ ان کی یہ خصوصیات ہیں: ثابت قدم رہنے والے' نہایت صداقت پہ جم کر کھڑے ہو جانے والے' خدا کے قوانین کے مطابق اپنی توانائیاں صرف کرنے والے' اس کے لیے جو کچھ دینا پڑے اس کے لیے اپنے تجوری کھلی رکھنے والے اور وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:16)۔ اب ہمارے ہاں تو اس کے یہ ترجمے ہوتے ہیں کہ ''وہ صبح کے وقت استغفار کرنے والے ہیں یعنی وہ استغفار کی تسبیح کرتے ہیں۔ صبح تہجد کے بعد اٹھ کے نماز پڑھتے ہیں اور اس کے بعد استغفرالله ربی من کل ذنب و اتوب الیہ ہوتی ہے۔'' اب ہمارے ہاں تو استغفار کی یہی تسبیح رہ گئی ہے۔

استغفار کے معنی ہوتے ہیں: ''حفاظت چاہنا''۔ سحر کے معنی ہوتا ہے: ''کسی پروگرام کے شروع کرنے کا وقت''۔ پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس راستے میں جو خطرات آتے ہیں' ان سے حفاظت کی کیا تدابیر کی جائیں۔ وہ پہلے سوچ لیتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ سوتے سوتے اٹھے اور یا علی مدد کہا: ''تے ٹوٹ پئے'' جناب![1] اور جب مشکلات سامنے آئیں تو پھر آنکھیں بند

[1] تو پھر پل پڑے' دفعتاً حملہ آور ہوئے یا کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

Marfat.com

کر کے لیٹ گئے۔ کہا: چادر دے بیجیے۔ یہ ان کے ٹوٹ پڑنے کی بات غلط ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ وہ پروگرام شروع کرنے سے پیشتر ہی حفاظت کے سامان کے متعلق سوچ لیتے ہیں کہ کس کس قسم کے خطرات ومشکلات کا امکان ہے اور اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ پوچھیے ان نبرد آزماؤں سے، جنہوں نے اس کے بعد جنگ کرنا ہوتی ہے کہ وہ اس میدان میں جانے سے پیشتر اپنے ہاں کیا کیا سوچتے ہیں اور اس میں سب سے بڑی سوچ یہ ہوتی ہے کہ دشمن سے بچنے کی کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ پہلی سوچ یہ ہوتی ہے۔ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:16)۔ یہ ہے وہ جو یہاں قران الفجر ہے۔ اب اس کے بعد آیا ہے۔ بِالْاَسْحَارِ (3:16)۔ یہ وہ چیز ہے جو پروگرام شروع کرنے سے پہلے سوچ لیا جائے کہ خطرات ومشکلات کے کیا کیا امکانات ہیں اور خاص طور پر یہ کہ ان خطرات سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن سے راہنمائی لینا ہوگی

عزیزان من! بات ہی یہ ہے کہ قرآن سے ساری راہنمائی لینی ہے۔ کوئی معاملہ سامنے آئے، اس کتاب کو کھول کے دیکھ لیجیے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے بندوں سے کہہ دو کہ یہ بھی جب مجھے پکاریں گے، میں اس کا جواب دونگا۔ یہ جواب دیتا ہے کہ جو مشکل سامنے آ گئی ہے، اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے وہ یہ کہتا ہے کہ اپنے پروگرام سے پہلے تم صبح ہی یہ چیز کرلو۔ نبی اکرمؐ کے متعلق جو کہا ہے: اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (73:7)۔ اب یہاں آپ کے ہاں سبح کے معنی تسبیح کر دیا گیا اور کہا کہ تیرے لیے پورے دن میں سَبْحًا طَوِيْلًا آ گئی۔ لمبی لمبی تسبیحیاں آ گئیں۔ تو بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ جب کہ کہا یہ تھا کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجوم پُر بلا کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ لہٰذا جن امور کے لیے قدرے سکون وثبات کی ضرورت، ان کے لیے وقت ہی نہیں مل سکتا۔

تسبیح کا مروجہ تصور اسلام میں ہے ہی نہیں

سَبَّح یا تسبیح کے معنی ہوتا ہے: ''کسی کام کی تکمیل کے لیے، کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے، انسان کا اس قدر سرگرمِ عمل رہنا، سرگرداں پھرنا کہ وہ ہر وقت اس کے لیے اپنی پوری توانائیاں صرف کرتا رہے''۔ اہلِ عرب گھوڑے کے اس عمل کو بھی سَبَّح یا تسبیح کہتے ہیں: ''جب وہ تیرنے والوں کی طرح اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کے بھاگتا ہے'' نیز تیراک جو تیراکی کے وقت اپنے پورے ہاتھ پھیلا دیتا ہے'' اور اس طرح تیرنے والے کو السَّبَّاح کہتے ہیں۔ التسبیح ''خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔'' تسبیح کا مروجہ تصور ہی اسلام کا نہیں تھا۔ صدرِ اول میں اس کا کہیں نشان تک نہیں ملتا۔ یہ بدھ مت والوں (Bud-dhists) کے ہاں تھی۔ ان سے عیسائیوں نے لی، پھر وہاں شام کی خانقاہوں سے مسلمانوں میں آئی اور اب آپ کے ہاں تسبیح اور مصلّٰی عبادت کا ہی نشان بن گیا کہ صاحب! لیے بیٹھے رہو عمل سے غافل،

Marfat.com

نہیں بلکہ عمل سے عاری۔ یہ بڑی عظیم آیتیں ہیں صاحب! تو یہ کہا: اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (17:78)۔ تسبیح کے اس تصور کے برعکس' غور وفکر کے بعد' مشہود طریقوں سے' یہ بات تمہارے سامنے آ جائے گی کہ آج کیا کرنا ہے۔

اہلِ قرآن کے فرقے کا ردِعمل

میں یہاں ایک چیز عرض کر دوں کہ یہ جو ہمارے ہاں پہلے سے ہی مختلف فرقے تھے' ان فرقوں کی پھیلائی ہوئی خلافِ قرآن گمراہیاں کم نہ تھیں۔ یہ ایک چیز تھی قرآن وصلوٰۃ۔ انہوں نے کتاب قرآن کو چھوڑا' سارے جگ میں روحِ قرآن کو چھوڑا' روایات کو لیا' حدیث کو لیا' تفسیروں کو لیا' فقہ کو لیا' ان سے یہ سارے تفرقے' یہ سارا الجھاؤ' اور یہ سب کچھ پیدا ہوا۔ ہمارے دور میں ایک چیز اٹھی جس نے کہا تھا: "جی! ہم اہلِ قرآن ہیں۔ ہم ان تمام چیزوں کو چھوڑتے ہیں۔ ہم قرآن پہ آتے ہیں صاحب! جب یہ کچھ ہو جائے تو پھر آخری چیز قرآن ہی ہوتی ہے۔ پھر صورت یہ ہوئی کہ آخری چیز جو قرآن رہ گیا تھا' اس کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا' جو پہلوں نے بھی نہیں کیا تھا صاحب! آپ کے ہاں اُس نے ایک فکر دی: مولوی عبداللہ چکڑالوی ان کا نام تھا۔ یہ ان کا حدیث کے خلاف ردِعمل تھا۔ پہلے وہ اہلِ حدیث تھے۔ انہوں نے ان تمام احادیث کو اٹھا پھینکا۔ ان پہ اعتراض ہونے شروع ہو گئے: ان حدیثوں کو نہیں مانتے' تو بتاؤ ہم نماز کیسے پڑھیں گے؟ روزے کیسے رکھیں؟ قربانیاں کیسے دیں؟ انہوں نے کہا: نہیں' حدیث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ سب قرآن کے اندر موجود ہے۔

ہاں عزیزانِ من! یہ صحیح ہے کہ قرآنِ کریم تو قیامت تک کے لیے' ساری دنیا کے لیے' تمام اقوام کے لیے' تمام ممالک کے لیے' ایک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا جو ایسا ابدی ضابطہ ہو' اس کی صورت ہی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں زندگی کے صرف بنیادی اصول ہی دیئے ہوئے ہوں اور اگر ان اصولوں کی جزئیات بھی کسی ایک وقت میں متعین کر دی جائیں' تو زمانے کے حالات تو بدلتے چلے جاتے ہیں تو پھر ان حالات میں ناممکن ہو جاتا ہے کہ ایک وقت کے اندر جو جزئیات Details متعین کی تھیں' وہ ہر دور میں قابلِ عمل ہو سکیں' کیونکہ دوسرے وقت میں تو حالات بدل جاتے ہیں اور اس بنا پر وہ متعین کی گئی جزئیات قابلِ عمل نہیں رہتیں۔ آپ کو کوئی فقہ کی کتاب دی جائے' کوئی مسائل کی کتاب دی جائے' تو وقتی طور پہ تو وہ ٹھیک رہے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ابدی طور پہ اِس کی یہی صورت رہے گی تو پھر تو انسان چل ہی نہیں سکتا۔

اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود متعین کرنا ہونگی

قرآن نے قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات دیا' اس نے اصول دیئے ہیں۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ یہ بجز چند احکام کے صرف اصول دیتا ہے۔ ان اصولوں پہ عمل کرنے کے طریقے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہر دور کی امت سے کہتا ہے کہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کے' جو ان اصولوں پہ عمل پیرا ہونے کا قابلِ عمل طریق ہو' اسے اختیار کر لو۔ یہ اصول تو غیر متبدل رہیں گے' یہ تو قیامت تک

Marfat.com

نہیں بدل سکتے۔ ان کے اندر رہتے ہوئے تم اس کی جزئیات کا جو طریق اختیار کرو گے وہ بدلتے جاؤ۔

اس نے کہا: اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ ایک اصول دیا ہے کہ یہاں ڈکٹیٹر شپ (Dictatorship) نہیں ہوگی' مشاورت سے یہ معاملات طے ہونگے۔ مشاورت کا طریق کیا ہوگا؟ مشینری کیا ہوگی؟ یہ مشاورت کیسے ہوگی؟ یہ کچھ اس نے خود نہیں بتایا کیونکہ خود بتایا گیا وہ طریقہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نا قابل عمل ہو جاتا ہے۔ ایک بستی کے اندر جو طریقہ ہوگا' وہ دوسری میں زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے نا قابل عمل ہوگا کیونکہ آج کی دنیا میں جہاں ایک ملک کی آبادی پچاس پچاس کروڑ ہو جاتی ہے' تقاضے بدلتے ہیں۔ اس لیے وہ طریقہ نا قابل عمل رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اصول دیا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہیں عدل کا حکم دیا جاتا ہے۔ عدل کے لیے کون سا طریق ہوگا' قرآن خود یہ نہیں بتاتا۔ یہ طریق بدلتے چلے جائیں گے' اصول وہی رہے گا۔ مثلاً پنچائیت میں بھی عدل ہو سکتا ہے۔ یہ ہے قرآن کا اسلوب اور یہ اس لیے ہے کہ اس کتابِ عظیم نے آخر تک' آخری انسانوں تک' بطور ضابطۂ حیات رہنا ہے۔ اب کسی اور رسول' نبی نے آنا نہیں ہے' کوئی اور کتاب آنی نہیں ہے اور انسان کی تو ابھی عمر ہی کیا ہے' پتہ نہیں اس نے کہاں تک جانا ہے۔ ابھی تو انسانیت کی جوانی کے ابتدائی دن شروع ہوئے ہیں' تو ان کو اس طرح سے جزئیات کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔

جزئیات کے سلسلہ میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی ناکام کوشش

جب جزئیات کے سلسلے میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کے ذہن میں ایک نظریہ آیا کہ قرآن کے اندر ایک ایک چیز کی جزئیات موجود ہیں تو اب انہیں قرآن کے اندر ڈھونڈنے لگے۔ قرآن کریم کے اندر تو یہ جزئیات ہیں نہیں۔ تو اب سوچیے کہ اس تلاش کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ چھوٹی سی چیز ہے۔ اُن سے پوچھا تھا: نماز کیسے پڑھیں؟ مولوی عبداللہ چکڑالوی صاحب نے کہا کہ سب قرآن کے اندر ہے تو قرآن کے اندر سے نماز کے وقت مقرر کرنے شروع کیے' نماز کی رکعتیں مقرر کرنی شروع کیں' نماز کی جزئیات مقرر کرنا شروع کیں۔ مقرر کرنا ہی نہیں شروع کیا بلکہ تلاش کرنا بھی شروع کیا۔ اب وہ ہوں تو کہیں سے ملیں۔ اب لگے کھینچنے صاحب! ادھر اُدھر سے آیتیں۔ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ چار رکعتیں ہیں' ایک رکعت میں دو سجدے بھی ہوتے ہیں۔ کیا پڑھنا چاہیے؟ اب یہ مشکل پیش آ گئی صاحب! یہ آج کل جو کچھ پڑھا جا رہا ہے' انہوں نے کہا: یہ حدیثوں کی رو سے امت میں چلا آ رہا ہے اور اب انہوں نے نیا تجویز کرنا شروع کر دیا: یہ آیت ہے' یہ پڑھنا چاہیے' یہ یہ پڑھنا چاہیے۔ ارے صاحب! آپ کو یہ اتھارٹی کس نے دی ہے؟ رسول تو یہ کہتا ہے کہ خدا نے کہا ہے: تم یہ کرو۔ اب دوسرا طریقہ مشاورت کا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ تو اس کو یہ اختیار کس نے دے دیا کہ صبح اٹھ کے کہے کہ آج تو ہماری امت اس طرح کی نماز پڑھے گی۔ او بھئی! تمہیں یہ کہنے کا اختیار کس نے دے دیا؟ میں ایسی نماز پڑھونگا' یہ تمہاری سب

Marfat.com

کی نمازیں باطل ہیں' وہ نماز جو میں کہتا ہوں' وہی صحیح ہے۔ انہیں مرے ہوئے' چار دن ہوئے' ان کے متبعین (Fellowers) یہاں اٹھ کے بیٹھ گئے۔ یہاں' آپ کے ہاں لاہور میں موجود ہیں۔ کہنے لگے: اس نے بھی یہ سب کچھ قرآن سے ہی ثابت کیا تھا۔ بزعمِ خویش یہ پانچ وقت کی نماز' چار رکعتیں' دو سجدے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن سے تین وقت کی نماز ہے۔ ایک نماز میں دو رکعتیں ہیں' ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ہے' نہ اذان نہ سلام۔ درمیان میں کیا پڑھنا چاہیے؟ ان میں بھی دو فرقے ہوئے۔ ایک فرقے نے ایک ہی نماز بتائی تھی اس میں ایک ہی سجدہ کرنے کو کہا تھا۔ اب ان کے ہاں یہ ایک نماز شروع ہوگئی۔ ان سے پوچھو کہ آپ کو یہ اختیار کس نے دیدیا؟

قرآن کو سب سے زیادہ نقصان' اہلِ قرآن نے پہنچایا

میں کہہ رہا تھا کہ جتنا نقصان انہوں نے قرآن کو پہنچایا ہے' اس سے پیشتر ہزار سال میں کسی نے نہیں پہنچایا تھا۔ ان کے ہاں اگر اختلاف ہوتا تھا تو اس بات پہ کہ صاحب! اس حدیث میں یہ آیا ہے' اُس حدیث میں یہ آیا ہے۔ حدیثوں میں اختلاف تھا' فلاں امام کا یہ قول ہے' دوسرے امام کا یہ قول ہے۔ یہ فکر انسانوں کی ہے' خدا کی بات تو نہیں تھی۔ یہاں ان کا ایک شخص یہ کہہ رہا ہے' جن کے یہ متبع ہیں: پہلا' ہی ان کے ہاں کا امام کہ قرآن کی رو سے خدا نے فرمایا ہے: قرآن شریف سے چار رکعتیں اور دو سجدے ہیں۔ اسی کے متبعین کہتے ہیں: خدا نے قرآن میں یہ کہا ہے کہ تین وقت نماز اور دو رکعتیں اور ایک سجدہ ہے۔ تو اب قرآن کے متعلق یہ جتنے بھی غیر مسلم ہیں کیا خیال کریں گے؟ قرآن میں خدا نے کہا تھا کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں آئے گی۔ تم اس میں کوئی بات بھی متضاد نہیں پاؤ گے۔ تو یہی قرآن پانچ وقت بھی بتائے اور یہی قرآن تین وقت بھی بتائے' یہی قرآن آپ کو چار رکعتیں بتائے' یہی قرآن دو رکعتیں بتائے' یہی قرآن ایک رکعت میں دو سجدے بتائے' یہی قرآن ایک سجدہ بتائے' یہی قرآن یہ کچھ پڑھنے کے لیے بتائے' یہی قرآن یہ کچھ پڑھنے کے لیے بتائے۔ آپ سوچیے! اس قرآن کے متعلق دوسروں کے ذہن میں کیا آئے گا۔ اب تک تو بحث کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جب بھی وہ مسلمانوں کے اختلافات کو گناتے تھے تو ان سے کہا جاتا تھا کہ صاحب! یہ اختلافات ان وضعی روایات نے پیدا کیے ہیں' فقہ نے پیدا کیے ہیں' انسانوں کی فکر نے پیدا کیے ہیں' تو خدا تو بچا رہتا تھا' قرآن تو محفوظ ہوتا تھا۔ اب وہ بھی ختم ہوا۔ کہا یہ ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے۔

نماز کے بعد حلال وحرام کا قصہ

یہ تو میں نے ایک نماز کا کہا ہے۔ یہ حلال ہے' وہ حرام ہے' یہ جائز ہے' وہ ناجائز ہے۔ اس کی تو انہوں نے ایک لسٹ مرتب کی ہے تو دوسرا اسی قرآن سے ایک دوسری لسٹ مرتب کیے چلا جا رہا ہے:

اک دسترس سے تیری' حالی بچا ہوا تھا [1]
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا (حالی)

[1] مولانا الطاف حسین حالی (1837-1914ء)

قرآن وہ کتاب مبین ہے کہ جس میں کوئی تضاد نہیں

ان مسلمانوں کے ہاتھوں سے خدا کی یہ کتاب بچی ہوئی تھی۔ ہمارے دور میں آ کے اس کو بھی انہوں نے ختم کر دیا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ قرآنِ کریم کے اندر جو کچھ دیا ہوا ہے' اگر وہ جزئیات یا Details دی ہوئی ہیں تو وہ اتنی صاف اور واضح ہونگی کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دو شخص اسی قرآن سے ان کو الگ الگ لیں۔ قرآن دو قسم کی متضاد چیزیں دے ہی نہیں سکتا۔ اگر اس نے یہ بات کہی ہے کہ دو بہنیں بیک وقت ایک کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں' اس قرآن میں سے ہزار آدمی ہزار مختلف جگہ دیکھے گا' یہی بات ملے گی۔ اگر اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ ورثہ میں فلاں کا اتنا حصہ ہے' لاکھ آدمی' لاکھ مقام پہ اس قرآن کو دیکھیں انہیں یہی ملے گا' یعنی جس بات کی اس قرآن نے خود تفصیل دی ہے اس میں کسی صورت میں تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر اس میں تضاد واقع ہو جائے تو معاف رکھیے گا' اس سے زیادہ ناقص کتاب دنیا میں کون سی ہو سکتی ہے اور وہ کتاب کہ جو یہ نہ بتا سکے کہ پانچ وقت کی نماز ہے یا نماز کے تین وقت ہیں' اسی سے ایک پانچ ثابت کرے' اسی سے ایک تین ثابت کرے تو اس خدا کے متعلق کیا تصور ہوگا۔ یہ ہے اس قرآن کے متعلق آپ کا دعویٰ کہ یہ انسانوں کے لیے قیامت تک ضابطہ ہدایت ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے یہ بھی پتہ نہ چلے کہ پانچ وقت کی ہے یا تین وقت کی' ایک نماز میں دو رکعتیں ہیں یا چار رکعتیں' دو سجدے یا ایک سجدہ۔ خدا کو یہ بھی کہنا نہیں آتا۔ معاذ اللہ۔ یہ ہے وہ چیز جس کا نام آپ اہلِ قرآن کہہ رہے ہیں۔ ہم ''صرف قرآن سے یہ سب چیزیں ثابت کرتے ہیں۔'' اس طرح تو یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ قرآن ہے کیا؟

دراصل یہ قرآن فکر (Thought) کی بڑی بلند سطح چاہتا ہے' عزیزانِ من! جب ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی تو قرآن سے جزئیات نکالنے لگے۔ تباہ کر کے رکھ دیا' ہمارے پاس قرآن ہی ایک بچی ہوئی چیز تھی' پوچھیے ان کو کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے مخالفین قرآن کے متعلق کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ نکتہ چیں اس بات کے اوپر کیا کہہ رہے ہیں کہ آج تک تو آپ ہمیں یہ کچھ کہتے تھے کہ صاحب! یہ اختلاف ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ خدا کی کتاب وہ ہے کہ جس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ اب خدا کی یہ کتاب تمہارے ہاں یہ بتا رہی ہے' اسے یہ بھی نہیں کہنا آتا کہ ایک رکعت میں دو سجدے ہیں یا ایک سجدہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے' جو کسی کے جی میں آئے کہے' میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہ سب کچھ طلوع اسلام [1] میں بھی آ گیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور کی طرف سے شائع کردہ ''قرآنی فیصلے جلد اول (ایڈیشن سوم۔ مارچ ۱۹۹۲ء۔ بلا ترمیم) اور ''قرآنی فیصلے'' کی ہی جلد دوم ایڈیشن سوم۔ دسمبر ۱۹۹۳ء۔

قرآن یہاں تو نظامِ صلوٰۃ کی بات کرتا ہے

میں یہ بات اس لیے کہہ رہا تھا کہ اسی آیت (17:78) سے بھی وہ نمازیں ثابت کرتے ہیں۔ وہ پانچ وقت کی نماز والا بھی اسی سے ثابت کرتا ہے' تین وقت کی نماز والا بھی اسی سے کرتا ہے۔ اب یہ کیسے کرتے ہیں؟ دیکھیے' وہ کہتے ہیں کہ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (17:78)۔ ایک نماز فجر ہوگئی۔ اس نے کہا: طلوع شمس سے غسق الیل تک۔ یہ چار اور ہوگئیں۔ انہوں نے کہا: نہیں' دو اور ہوگئیں۔ صاحب! اب یہ چیز لمبی بحث میں چلی جائے گی۔ آپ ''لغاتِ قرآن'' سے دیکھ لیجیے کہ ''دلوک'' کے معنی کیا ہیں اور ''غسق'' کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں: ''طلوع آفتاب سے رات شام تک کا پورا وقت۔'' اس کے لیے نماز کے یہ اوقات ہیں ہی نہیں۔ یہاں اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز کے اوقات نہیں دیئے ہوئے۔ یہاں نظامِ صلوٰۃ دیا ہوا ہے اور کہا یہ گیا ہے کہ اب تو اس پروگرام میں یہ ایک گھڑی ایسی آ گئی ہے جس کے لیے پورا وقت اسے دینا پڑے گا۔ مخالفتیں یورش کر کے آ گئیں۔ جب مفاہمت یا Compromise کی بھی جو کوششیں ہوتی ہیں ناکام رہ جاتی ہیں۔

قرآنی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے صبح و شام سرگرمِ عمل رہو

عزیزانِ من! اس پروگرام کے اندر بڑی سخت نازک گھڑیاں آتی ہیں اور جب ان کی سازش میں پروگرام یہ ہو کہ انہیں یہاں سے نکال باہر کیا جائے' تو اس لیے اب تو اور مشکل وقت آ گیا ہے۔ پہلے بھی تم اس میں سرگرمِ عمل رہنے کی کچھ کمی نہیں کر رہے تھے اور اب تو یہ ہے کہ صبح سے شام تک پورا وقت اس کے لیے دینا پڑے گا۔ صبح اٹھو تو پہلے قرآن سے یہ دیکھو کہ آج یہ ہدایت دیتا ہے' اب کیا کرنا چاہیے اور پھر دلوک الشمس سے غسق الیل تک' صبح سے شام تک' ہمارے ہاں بھی محاورۃً کہتے ہیں کہ صبح سے شام تک تمہیں یہ کام کرنا چاہیے۔ اس کے معنی ہوتا ہے: مسلسل کرنا چاہیے۔ اب تمہیں لگاتار یہ کرنا چاہیے: صبح صبح اٹھو اور باہمی مشاورت کرو۔ پھر صبح سے شام تک یہ کرو اور یہ سب کچھ کر کے گھروں کو چلے جائیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ تم آرام کرو' تمہیں پھر بھی کچھ اور جاگنا پڑے گا۔ تو یہ لوگ کچھ اور بھی ''جاگنا پڑے گا'' سے یہاں تہجد کی نماز لیتے ہیں۔ فَتَهَجَّدْ بِهٖ (17:79)۔ تو میں نے کہا ہوا ہے کہ قرآن کے کسی ایک لفظ پہ بھی آ کے یوں نہ بیٹھ جایئے' کھڑے ہو جایئے وہاں ''تہجد'' تو ٹھیک ہو گیا ''جاگنا'' ہے۔ یہ بِهٖ کیا ہے؟ وہاں تو ''قرآن الفجر'' ہے۔ انہوں نے آنا ہے' آپس میں مشورہ کرنا ہے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد بھی اس کو لے کے بیٹھ جا نَافِلَةً (17:79)۔ اس پروگرام میں تیری ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ یہ اضافہ ہیں جو ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ صبح اٹھ کے انہوں نے آنا ہے۔ قرآن کے متعلق مشورہ کرنا ہے تو پہلے سے ہی رات اس کو لے کے بیٹھ جا: یہ تھی عزیزانِ من! تہجد' اب ہمارے ہاں تہجد گذار ہے اور تہجد کے بعد تسبیح پھیرتے ہیں۔ کیا کیا بتایا جائے۔ سنیے! یہ پروگرام تھا۔ دین کا نظام یونہی قائم نہیں ہو جاتا۔ نمازیں پڑھنے سے ہو جاتا تو بگڑتا ہی کچھ نہیں۔

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے۔

Marfat.com

میں نماز کا استحصال نہیں کر رہا

میں پھر عرض کر دوں کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے کہ میں نماز کا استحصال کرتا ہوں۔ صلوٰۃ کے یہ اجتماعات بڑے ضروری ہیں۔ کوئی پروگرام نہیں چل سکتا جب تک کہ آپ اس کے سوچ و بچار کرنے کے لیے اجتماعات مقرر نہ کر لیں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ پھر اوقات کی کیا صورت ہوگی۔

لفظ مزمل کا مفہوم

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''او کملی اوڑھنے والے پیارے 'اٹھو'!' کیا جاتا ہے۔ جو مزمل آیا ہے اس کا ترجمہ ''کملی اوڑھنے والے'' کیا جاتا ہے۔ پوچھیے عربوں سے کہ وہ لفظ ''مزمل'' کس طرح استعمال کرتے تھے۔ ان کے ہاں تو ہمیشہ سفر کے لیے قافلے چلتے تھے۔ اونٹوں کے قافلے ہوتے تھے۔ اونٹوں کے قافلے میں بوجھ لادنے اور سواریاں بٹھانے کے لیے دیکھنے کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ بوجھ اس طریقے سے لدا ہوا ہے کہ اسمیں دونوں طرف عدل قائم ہے' دونوں طرف کے بوجھ میں توازن قائم ہے' ایک طرف سے جھکا ہوا نہیں ہے اور دوسری طرف سے اٹھا ہوا نہیں ہے اور ان کی رسیاں ٹھیک بندھی ہوئی ہیں۔

کجاوے میں بیٹھنے والی سواریوں کی خصوصیت

یہ بھی دیکھنا ہے کہ چلتے ہوئے سامان ادھر اُدھر تو نہیں گر جائے گا۔ اونٹ کے ایک کجاوے میں دو دو سواریاں بیٹھی ہوتی تھیں۔ سواریوں کے متعلق بھی وہ دیکھتے کہ آیا وزن کے اعتبار سے ہم وزن ہیں اور اس کے بعد یہ کہ ان سواریوں نے بالآخر بت بن کے تو بیٹھے نہیں رہنا' آپس میں باتیں بھی کرنی ہیں' مشورے کرنے ہیں۔ دونوں سواریوں کا ہم رنگ' ہم مزاج' ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ کے ہاں صاحب! ریل کا سفر کرتے ہیں اگر کہیں دوسری ناجنس سواری' اسی صوفے میں بیٹھی ہو تو یہ اس کے لیے عذاب ہو جاتا ہے۔ میر تقی میر (1810-1721) تو آدھے ہی راستے میں ایک دن اتر بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں یکے [1] چلتے تھے۔ دہلی کا یکہ لیا۔ غریب تھے' سالم یکہ تو لے ہی نہیں سکتے تھے۔ اسمیں بھی دو سواریاں بیٹھتی تھیں۔ ان میر تقی میر صاحب کے ساتھ ایک اور سواری بیٹھ گئی۔ اب وہ چل پڑا۔ راستے میں اس نے اپنی ''کرخنداری تکان'' شروع کی۔ میر تقی میر صاحب زبان کے معاملے کے اندر اتنے نازک مزاج تھے کہ ذرا سا کہیں تلفظ بگڑا تو ان کے ماتھے پہ شکنیں پڑنے لگیں ۔۔۔ وہ کرخندار' جو ساتھ بیٹھا ہوا دیہاتی ذرا زبان دراز تھا۔ میر تقی میر صاحب کہنے لگے: آپ مجھ سے یہ پورے کا پورا کرایہ لیں' خدا کے لیے مجھے اتار دیجیے۔ یکے والا کہنے لگا کہ جی! کیا ہوا؟ اور یکہ تو چل پڑا۔ ''اچھا چل رہا ہے۔''

---

[1] ایک گھوڑے کی رتھ نما گاڑی' یکہ (ایک گھوڑے کی گاڑی)' تانگہ۔

کہنے لگے: ''میں تمہارے یکے کے متعلق نہیں کہہ رہا' گھوڑے کی بات نہیں کر رہا' یہ جو'' ساتھ'' آپ نے مجھے باندھ دیا ہے' میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ آگے تک رہا تو ساری زندگی کی' جتنی شاعری میں نے کی ہوئی ہے' سب ختم ہو جائیگی۔ اس کمبخت کی زبان وہ سب کچھ تباہ کر جائیگی۔ میں اس سطح کے اوپر سفر نہیں کرنا چاہتا۔'' عزیزانِ من! صحبتِ ناجنس سے یہ چیز ہوتی ہے۔ کسی ایک اونٹ کی سواری کے ساتھ اس قسم کے میر تقی میر اور اس کے ساتھ اس قسم کے کرخندار کو بٹھا دیا' تو دیکھیے پھر ہوتا کیا ہے؟ تو اِسے بھی سالارِ کارواں کو دیکھنا چاہیے۔

یہ جو میر کارواں ہوتا ہے' جو قافلۂ سالار رہوتا ہے' اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ بھی دیکھے کہ میرا قافلۂ اونٹ' جو چل رہا ہے' اس میں سب ٹھیک ہیں' سامان درست ہے' خاص طور پر یہ جو سواریاں بیٹھ رہی ہیں' یہ ایسے انداز کی ہیں کہ انکا سفر اس طرح سے کٹے کہ ان میں موافقت ہو' مطابقت ہو۔ چنانچہ اس عمل کے لیے جو کچھ قافلۂ سالار کو کرنا پڑتا تھا' اسے عرب والے ''عملِ تزمیل'' کہتے تھے اور جو سالارِ کارواں اس قسم کے چناؤ میں بہت زیادہ ماہر Expert ہوتے ہیں' انہیں وہ مزمل کہتے ہیں۔ کہا ہے: يَـــآ يُّهَـــا الْمُـزَّمِّلُ (73:1)۔ اے کاروانِ انسانی کو منزلِ مقصود تک باحفاظت لے جانے والے ذمہ دار! یہ ہے حضور کا مرتبہ' یہ تھی ذمہ داری' یہ تھا مزمل! اور پھر ایسے ایسے قافلے تیار کیے۔ عزیزانِ من! کہ جہاں پھر کہیں اختلاف نہ ہوا' کہیں تضاد نہ ہوا' کہیں آپس میں مزاحمت نہیں ہوئی۔ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29)۔ آپس میں بڑے ہی نرم دل اور ہمدردی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ یہ تھا مزمل۔

قافلے میں چلنے والے مسافروں کی ذمہ داری بڑی تھوڑی سی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہی لوٹے' اپنے ہی بستر' اپنا ہی کچھ توشہ باندھتے ہیں۔ بس ان کی اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے۔ باقی سارا کچھ قافلۂ سالار کے سر ہوتا ہے۔ اسکو تو بڑی فکر ہوتی ہے۔ پتہ نہیں اسے کتنا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ جماعت۔ یہ تھا تشکیلِ جماعت کا اولیں مرحلہ' جسمیں عملی تزمیل یوں کرنا پڑ رہی تھی۔ دن بھر یہ سارے قافلے کی دیکھ بھال اور جب قافلے والے آرام سے سو جائیں تو پھر یہ تزمیل والا بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ کہاں نقص رہ گیا ہے' مجھے کیا کرنا ہے' کل کا پروگرام کیا ہے' کیسے طے کرنا ہے؟ یہ سارا کچھ کرنے کے لیے وہ ساری ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ آپ نے منبروں Pulpits سے سنا ہوگا کہ صاحب! ساری رات عبادت میں کھڑے رہتے تھے' پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں اس کے سوا کچھ اور آتا ہی نہیں ہے۔ جب بھی ان کے ہاں پوچھیے' کہتے ہیں: صاحب! بڑا عبادت گذار ہے۔ اسکے معنی ہیں کہ رات بھر نفل پڑھتا رہا ہے۔ عبادت کے اندر اطاعت احکام اور خداوندی محکومیت کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ رسول اللہؐ ساری ساری رات کھڑے رہتے تھے۔ کیا کرتے تھے؟ نفل پڑھتے رہتے تھے اور کچھ پتہ نہیں۔ اُف! ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

ہمارے ہاں عبادت کا مفہوم اور حضور اکرمؐ کی مصروف زندگی

قرآن نے بتایا ہے: یَآ اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ دیکھیے مخاطب کس بات پہ ہو رہا ہے؟ حضورؐ کی کئی اور صفات بھی تھیں، مگر یہ تو وہ تھے کہ جسے اتنا بڑا کارواں تیار کرنا ہے! اب کچھ سوچنا پڑتا ہے، دن بھر کے تھکے ماندے قافلے والے سو گئے۔ یہ ہے جو جاگ رہا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے کہ وہ مشفق ماں کمرے کے باہر سے گذرے اور امتحان دینے والا بچہ، جو دن بھر اور آدھی رات تک بیٹھا ہو: "او ننھے تو ابھی تک جاگ رہا ہے۔ او بیٹا! سو بھی جا، تھوڑے وقت کے لیے، صبح تم نے امتحان دینا ہے۔" کہا: "امی! میں اسی لیے تو جاگ رہا ہوں۔"

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (73:2)۔ اے مزمل! تجھے کو جاگنا تو پڑتا ہے، جاگا کر، بھئی! تھوڑا جاگا کر، صرف آدھی رات تک جاگ لیا کر، اس کے بعد کچھ سو لیا کر، کچھ آرام کر لیا کر، اس لیے کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (73:5)۔ تیرے سامنے بڑا بھاری پروگرام ہے، بڑا مشقت طلب پروگرام ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ راتوں کا جاگنا سہل انگاری کے جذبات پر قابو پانا ہے۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا (73:6)۔ اس سکوت میں سکون سے بڑے اچھے اچھے پروگرام بنتے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچ کہ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (73:7)۔ ارے دن بھر بھی تو تیرے سامنے سارے دن کا جو پروگرام ہے، بڑا لمبا پروگرام ہے، وہ بھی تو تم نے ہی پورا کرنا ہے۔ یہ تھا پروگرام عزیزانِ من! وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ (17:79)۔ یہ پروگرام قرآن الفجر سے شروع ہوا، دلوک شمس سے غسقِ الیل تک پورے کا پورا یہ پروگرام رہا۔ یہ تھے مزمل کے معنے۔ یہیں سے آگے ایک عالمگیر انقلاب کا پروگرام ہے جو تیرے پیشِ نظر ہے، جو تجھے برپا کرنا ہے۔

سورۃ المزمل کی ایک دو آیتیں اور بھی تو دیکھ لیجیے۔ بڑی عجیب چیزیں ہیں۔ قرآن انسانی مزاج و طبائع پر کتنی رعایت برتتا ہے! حقائق پہ نگاہ رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ تیرے ساتھ یہ جو قافلے والے چل رہے ہیں، کبھی ان کی کیفیت بھی دیکھی ہے۔ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ (73:20)۔ او بھئی! ایک گروہ جو تمہارے ساتھ ہے، ان کی کیفیت یہ ہے کہ مِنْکُمْ مَّرْضٰی (73:20)۔ ان میں کمزور بھی ہیں، کچھ ان میں مریض بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ مختلف انداز کے ہیں۔ اگر یہ چیز سب کے لیے مقرر کر دی جائے کہ دن بھر اس مسافت میں، اس پروگرام میں، اس طرزِ عمل میں، رات بھر یہ کچھ کرنے کے لیے کہا جائے، جاگا جائے، تو مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے رات بھر ان کے لیے یہ نہ کہا جائے اور پھر دوسری بات یہ کہ تمہیں، تمہارے دوستوں میں دیکھ دیکھ کے یہ بھی یہی کچھ کرنے لگ جائیں تو یہ کام نہیں چل سکے گا۔ یہ قرآن کہہ رہا ہے۔ جماعت میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا بھی خیال رکھو۔ تم جاگو گے تو یہ بھی جاگنا شروع کر دیں گے۔ تھوڑے وقت کے لیے سو جایا کرو، ان کو بھی سو جانے دیا کرو، صبح اٹھ کے پھر کوشش شروع کر دیا کرو۔ یہ تھا جو یہاں کہا گیا۔

Marfat.com

امت کے باہمی مشورے کی اہمیت

میں اتنی بات عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم نے متعین طور پر یہ چیز' یہ میکینزم Mechanism ' یہ طریق کار' یہ کچھ کرنے کا ڈھانچہ خود تجویز نہیں کیا' یہ امت پر چھوڑا ہے لیکن یہ بھی کہہ دوں کہ یہ کچھ کرنا انفرادی چیز نہیں ہے۔ اس کا حق کسی پرویز کو' کسی عبداللہ چکڑالوی کو' کسی محمد علی کو نہیں دیا گیا۔ اگر یہ حق اس طرح کسی کو دے دیا جائے تو اتنا خلفشار پیدا ہو جائے صاحب! کہ بس میں اپنے طریقے کی نماز پڑھوں۔ وہ اس کے طریقے کی نماز پڑھے۔ وہ اس طریقے کی نماز پڑھے۔ ہم میں سے ہر ایک یہ کہتا ہوا سنائی دے کہ صاحب! یہ خدا کی تجویز کردہ ہے۔ آپ کے ہاں یہ کہنے والا تو ایک آیا تھا کہ خدا نے یہ کہا ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ اس زمانے میں قادیانیوں نے کتنا خلفشار مچا دیا۔ وہ خلفشار یہی کہہ کے مچایا کہ ''خدا نے یہ کہا ہے''۔ وہ بھی اگر یہ کہتا کہ ''صاحب! یہ میرا اپنا خیال ہے'' تو ہم کہتے کہ ''ہوتا رہے تمہارا خیال'' کیا تمہارا خیال' ہم پہ کوئی Binding ہے؟ یہ بات کہ ''خدا نے ایسا کہا ہے'' بڑی دور رس نتائج کی بات ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ خدا نے کہا ہے کہ یہ چار رکعتیں ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ دو رکعتیں ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ دو سجدے ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ ایک سجدہ ہے۔ اور اگر یہ اختیار ہر ایک کو دے دیا جائے' تو اس صورت میں ہر ایک کو اختیار ہو گا کہ جو چاہیں کہیں یا کریں' آپ انہیں کیسے روک سکتے ہیں۔ تو آپ سوچیے کہ یہاں کیا کچھ ہو جائے' خواہ وہ ڈیڑھ اینٹ کی اپنی الگ مسجد ہو۔ وہ انہوں نے بنا تو لی ہے' امت میں خلفشار رچ گیا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کس کا فریضہ ہے؟ یہ کس کا حق ہے؟

یہ خلافت علیٰ منہاج رسالت کا ہی فریضہ ہو گا

اس لیے عزیزانِ من! یہ بات سن رکھیے' یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ یہ چیز صرف خلافت علیٰ منہاج رسالت جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں' کا حق اور اختیار ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے' باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں تو یہ ان سے کہا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ (22:41)۔ جنہیں زمین میں تمکن حاصل ہو گا' زمین میں مملکت حاصل ہو گی۔ یہ جو اس مملکت کے اربابِ حل و عقد ہونگے' یہ جو جماعت ہو گی' یہ حق اس کو حاصل ہو گا اور اس کو بھی یہ حق خود نہیں ہو گا بلکہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ امت کے مشورے سے یہ لوگ اس بات کو طے کرینگے کہ نماز کے اجتماعات کا کونسا وقت ہونا چاہیے' کیا Details ہونی چاہئیں' کیا طریق ہونے چاہئیں۔ یہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ یہ کچھ کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ اہلِ قرآن والے' یہ اعتراض کرنے کے لیے جنہیں نہ سمجھ ہے' نہ بُوجھ ہے' بس یونہی بیچاروں نے کہہ دیا کہ جی! قرآن نے کہا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4:103)۔ صلوٰۃ تو ایک موقد فریضہ ہے۔ جس میں وقت پر شریک ہوا جائے۔ ٹھیک ہے' کتابِ موقوت ہے' اس کا قانون ہے' جو وقت اس کے لیے مقرر کیا جائے گا

Marfat.com

اس میں تم کو آنا پڑے گا۔ نظام چلتے ہی اسی طرح سے ہیں۔ اس نظام میں باہمی مشاورت سے اجتماع کا جو وقت طے کر لیا تو وہ اس اجتماع کے لیے مقرر وقت ہوگا۔ قرآن نے تاکید کی ہے کہ یاد رکھو کہ جب اس کے لیے وقت کا تعین کر دیا جائے تو اس وقت پر تمہیں اس میں جانا ہوگا۔ یہ نظام چل ہی اس طرح سکتا ہے۔ یہ کتابِ موقوت ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے طور پر کہیں کہ کوئی بات نہیں صاحب! وہ وہاں کا اجتماع ہوتا رہے: ''اسیں اپنے گھر اچ ای چار بندے جمع ہو جانے ہیگے آں' کوئی گل نہیں' اللہ اللہ ای کرنا اے ناں' اللہ اللہ تسی کلے وی کر سکدے او جنگل اچ وی کر سکدے او''۔ ❶

اس وقت اسلامی مملکت کی غیر موجودگی میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

یہ کتابِ موقوت ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے' اسے سن رکھیے جو میں کہتا ہوں' اب جبکہ وہ خلافت علیٰ منہاج رسالت نہیں ہے' اب جبکہ اسلامی مملکت کہیں نہیں ہے' اس وقت امت کیا کرے؟ یا تو یہ انتشار پیدا کرے کہ ہر ایک کو اختیار دیدے کہ صاحب! جس نے کہا ٹھیک ہے' وہ اپنے طور پر کہہ لیجیے صاحب! کہ قرآن سے یہ ثابت ہو گیا ہے اور کرتے چلے جایئے۔ اس سے اتنا انتشار' اتنا خلفشار مچ جائے گا کہ امت کے اندر دو آدمی بھی اکٹھے نہ رہ سکیں گے۔ میں نے قرآن سے یہ مقصد لیا ہے کہ بھئی! اب جب کہ صورت یہ ہے کہ وہ نظام قائم نہیں ہے تو یہ امت جس طریق سے کرتی چلی آ رہی ہے' اس کو اسی طرح سے قائم رکھا جائے' اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ اپنے اپنے طریقے کو مختلف فرقے ہی سہی' ایک فرقے کے لوگ تو بہرحال اپنے کسی مقام پر ہم رنگ ہیں' تم نے اگر اور شروع کیا تو ایک نیا فرقہ وجود میں آ جائے گا۔ امت کی وحدت تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے' تم اس میں اور اضافہ کرتے چلے جاؤ گے۔ میرا مقصد یہ ہے' سن رکھیے کہ جس جس طریق سے امت ان چیزوں پہ عمل پیرا ہوتی چلی آ رہی ہے' بشرطیکہ اس میں سے کوئی بات قرآن کے خلاف نہ جاتی ہو' اسے کرتے چلے جایئے۔ لیکن بہرحال یہ جو کوئی نماز روزے وغیرہ کے طریقے یا جزئیات ہیں' جن پہ مسلمانوں کے مختلف فرقے عمل پیرا ہیں' ان میں کوئی بات شرک کی تو ہے نہیں۔ یہ تو ہے نہیں کہ کسی ایک فرقے نے بت سامنے رکھ کے اس کو پوجنا شروع کر دیا ہے۔ اتنا سا ہی فرق ہے کہ کوئی ہاتھ یہاں باندھ لیتا ہے' کوئی یہاں باندھ لیتا ہے' کسی کا وقت ذرا پہلے شروع ہو جاتا ہے' کسی کا ذرا بعد میں شروع ہو جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم ان میں سے کسی سے بھی مخالفت نہ کرو' کوئی جھگڑا نہ پیدا کرو۔ تم جس فرقے میں پیدا ہوئے ہو' وہ جس قسم کا تمہارا جی چاہتا ہے اس کے مطابق تم ان کو ادا کرتے چلے جاؤ۔ کوئی نیا طریقہ وضع نہ کرو' موجودہ طریقوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرو' ایسا کرنے سے انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح سے یہ کرتے چلے جاؤ۔ ابتداء میں ہو سکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں بھی یہ چیز

---

❶ ہم اپنے ہی گھر میں چار افراد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ اجتماع کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو تو اللہ اللہ ہی کرنا ہے نا' یہ تو آپ اکیلے ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی بات نہیں یہ اللہ اللہ تو آپ جنگل میں بھی کر سکتے ہیں۔

چلی ہو' اسی طرح یہ مقرر کئے گئے ہوں۔ جس طرح سے بھی یہ ہوئے ہیں' یہ ان چھوٹے پیمانے پہ فرقے ہیں' فرقوں کے اندر کچھ تو وحدت باقی ہے۔ اس میں مزید خلفشار نہ پیدا کرو۔ تو یہ ہے میرا مقصد کہ ان میں کوئی تبدیلی نہ کرو' اسی طرح سے رہنے دو لیکن ان میں باہمی مناظرے' مباحثے' جھگڑے' فساد برپا نہ کرو۔ قطعاً ایسا نہیں ہے کہ ہاتھ باندھنے والا کافر اور ہاتھ چھوڑنے والا کافر' یہ دونوں مسلمان ہیں۔ یہ ہے جو میں تبلیغ کرتا ہوں' جو میں تلقین کرتا چلا آ رہا ہوں۔

لاہور میں اردو میں نماز: ایک نیا فتنہ

جہاں بھی کوئی نئی بات وضع کرتا ہے میں سب سے پہلے اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ہی ایک شخص نے شروع کر دیا کہ نماز اردو میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ میں نے کراچی میں بیٹھے ہوئے' اس کے خلاف قدِ آدم پوسٹر لاہور میں لگوائے کہ نیا فتنہ پیدا ہو رہا ہے' اس کو روکیے' حالانکہ وہ کہنے والا ذاتی دوست تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے کہا: امت میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو گیا۔ کیا پہلے ہی ہم ان کے ہاتھوں سے کچھ کم دکھے ہوئے ہیں' جو یہ نیا فرقہ بن گیا ہے؟ ہم فرقہ بندیوں کے ہاتھوں سے صدمے اٹھا رہے ہیں' اب یہ ایک اور فرقہ پیدا ہوا ہے۔

قرآن کے الفاظ کا کوئی متبادل نہیں

میں نے یہ لکھا کہ نماز میں قرآن کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ قرآن عربی زبان کے اندر ہے۔ عربی زبان کے قرآن کے الفاظ کا متبادل کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اردو زبان میں نماز نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ کچھ کہا کہ یہ اہلِ قرآن جو فتنہ اٹھا رہے ہیں' یہ امت کے اندر سخت فتنہ ہے۔ یہ تین وقتی نماز اور دو رکعتیں اور ایک سجدہ بالکل غلط ہے۔ امت جیسے کرتی چلی آ رہی ہے' بالکل اسی طرح سے کرتی چلی جائے تاوقتیکہ امت میں پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ میں نے کہا کہ میں خود اسی طرح سے اسی پہ عمل پیرا ہوں' اسی طریق سے نماز پڑھتا ہوں' اسی طریق پہ روزے رکھتا ہوں۔

میرے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا

آپ کو معلوم ہے کہ تین برس سے میرے خلاف پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ میرے متعلق کیا ہو رہا ہے؟ یہ کہا جا رہا ہے صاحب! کہ یہ شخص کہتا ہے کہ تین نمازیں اور نو دن کے روزے اور ایک سجدہ اور اردو میں نماز ہے۔ یہ میرے متعلق کہا جا رہا ہے۔ ذرا سوچیے: یہ کون کہہ رہا ہے؟ **اقامتِ دین** کی سب سے بڑی جماعت' جماعتِ اسلامی' اس نے یہ کچھ سارے ملک کے اندر پھیلایا ہوا ہے۔ ان کے پاس پروپیگنڈے کی مشینری اتنی بڑی ہے کہ ہر مسجد ان کے قبضے میں ہے' پریس ان کے اپنے ہیں' اپنے ہزاروں آدمی یہ کچھ کہنے والے کہے چلے جا رہے ہیں۔ بیس برس سے ان چیزوں پر سینکڑوں ہزاروں صفحات لکھ چکا ہوں کہ میں ان کی مخالفت کر رہا ہوں۔ اپنے ہاں کہا

Marfat.com

یہ گیا ہے کہ طلوع اسلام کو اگر کسی نے ہاتھ لگا دیا تو ایمان جاتا رہے گا۔ وہ اس لیے کہ یہ چیزیں اس میں موجود ہیں۔ ''اس کے قریب نہ جاؤ' اس کے درس میں نہ جاؤ' جادوگر ہے''۔ یہ جادوگر نہیں ہے۔ بات سچی کرتا ہے۔ مگر ان کا پروپیگنڈہ ہے کہ چل رہا ہے۔ اور وہ امت چل رہی ہے' ان کے پیچھے لگ رہی ہے' آپ لوگوں نے بھی تین نمازوں کا میرے متعلق سنا ہوگا۔ آپ کسی جگہ دیہات کے کسی ملاں کی مسجد میں چلے جائیے۔ وہاں بھی دیکھیے' لوگ کہیں گے صاحب! ایک فتنہ پرویزی اٹھا ہے' یہ نیا فرقہ ہے۔ بھئی! کیا کہتا ہے؟ تین نمازیں ہیں' دو دو رکعتیں ہیں' ایک سجدہ ہے' نو دن کے روزے ہیں' اردو میں نماز پڑھنی چاہیے اور فرقہ پرویزی۔ صد حیف! دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات۔ 'تم نے مجھے نماز پڑھتے بھی دیکھا ہوگا۔ کہیں اتفاق ہوا ہو' میری فوٹو کھینچیے اور یہ چیزیں جو ہزاروں صفحات پہ لکھی ہوئی ہیں' کوئی شخص نہیں جو اٹھ کے انہیں سامنے سے یہ کہہ دے کہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے۔ قوم کو یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ جاننے والے کہتے ہیں: جی کون ان کے ساتھ سر مارے' بھڑوں کے چھتے میں کون اینٹ مارے۔ ٹھیک ہے جی' غریب کی جورو سب کی بھابھی۔ وہ پرویز! اور یہ اس کی کتاب! جس کے متعلق جو جی میں آئے کہتے چلے جاؤ۔ تم جانتے ہوئے یہ کہتے ہو کہ ''صاحب! کون ان کے ساتھ چھیڑ خانی کرے''۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ وہ اپنے ایک مقصد کے لیے یہ سب کچھ کہتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ اس ملک میں ان کے کذب وافتراء کو' ان کی تمام حکمتِ عملی کو' ان کے رنگ کو' توڑنے والا صرف طلوع اسلام ہے۔ عزیزانِ من! کوئی دوسرا ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ انہوں نے ایسے ایسے سب کو ہائی جیک (Hijack) کر دیا ہے اور یہ سب کچھ اس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے کہ ان کے کذب وافتراء کا بھید نہ کھلے' اس لیے اس کو اتنا فتنہ پرداز بنا دو کہ جونہی کسی نے کہا: پرویزی فرقہ ہے' ہر طرف سے یہ صدا گونجے کہ جی تین نمازیں' نو دن کے روزے' دو رکعتیں' ایک سجدہ۔ اور یہ پروپیگنڈہ بدستور' مسلسل' چلا ہوا ہے۔ نہ کوئی اس سے آکے پوچھتا ہے نہ کوئی چٹھی Letter ہی لکھتا ہے۔ کوئی خط ہی لکھ کے پوچھ لے کہ تم ایسا کہتے ہو۔ کچھ نہیں۔ بس وہ تو ایک ہی لکھا ہوا ہے کہ اسے ہاتھ نہ لگاؤ' ہاتھ لگانے والے کا ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ کہ دنیا میں مذہب کی آڑ میں کیا ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے' عزیزانِ من! اور شہادت تو ایک طرف رہی' ہزاروں کی تعداد میں' پمفلٹ چھاپ کے میں نے شائع کر دیا ہوا ہے' اس کے باوجود وہ پروپیگنڈہ جاری ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ ہمارے دور میں قرآن کے نام کے ایک ایسی چیز اٹھی ہے۔ یہ ایک ایسا فتنہ اٹھا ہے کہ کم از کم قرآن تو اس الزام سے بچا ہوا تھا کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اس کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا (17:78)۔ تمہارا پروگرام یہ ہونا چاہیے کہ علی الصبح ''طلوع آفتاب'' سے پہلے' قرآنی حقائق پر غور و فکر کرو اور دیکھو کہ معاملاتِ پیشِ نظر کے متعلق وہاں سے کیا راہنمائی ملتی ہے۔ علی الصبح اس لیے کہ فجر کے سکوت افزا سمے میں' انسان کے خیالات میں' اس قدر یکسوئی ہوتی ہے کہ اس سے قرآنی حقائق' محدود مشہود شکل میں سامنے آسکتے ہیں اور ''دل ان کی صداقت کی بے اختیار گواہی دے دیتا ہے۔ یہ

Marfat.com

پروگرام دیا۔عظیم پروگرام دیا ہے: صبح کے وقت قرآن کو سامنے رکھو،مشاورت سے دیکھو کہ اس پروگرام کے لیے دن بھر میں کیا کرنا ہے۔

تلاوت کا مفہوم قرآن کی پیروی کرنا ہے

عزیزانِ من! ہم بھی تلاوتِ قرآن انفرادی طور پہ سہی' کرتے تو ہیں۔ہم میں ابھی یہ روش باقی ہے۔ہمارے ہاں کم از کم بڑے بوڑھوں اور بڑی بوڑھیوں میں تو ابھی تک گھروں کے اندر یہ روش ہے۔غنیمت ہے کہ یہ صبح کے وقت اٹھ کے قرآن کھول بیٹھتے ہیں' اگرچہ وہ جو اس کا مقصد تھا وہ نہیں رہا۔اگر وہ مقصد والی چیز ہو جائے تو دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ تلاوت کے معنی پڑھنا نہیں ہیں' تلاوت کے معنی ''پیروی کرنا ہیں''۔ صبح کے وقت کی یہ روش ہمارے ہاں ابھی تک جاری ہے' یہ بڑی حسین روش ہے۔عزیزانِ من! اگر آپ صبح کے وقت اٹھ کے دیکھ لیں کہ قرآن آج میرے لیے کیا پروگرام دیتا ہے اور پھر دن اس سے شروع کریں بسم اللہ پڑھ کے دیکھیے اس کے اندر کتنی برکت ہوتی ہے۔اور اگر اجتماعی طور پہ آپ کے ہاں یہ چیز ہو جائے کہ کوئی عملی پروگرام' جو آپ نے طے کرنا ہے' اس کے لیے نظری طور پہ بیٹھ کے پہلے سوچیں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور یہ سوچنے کے بعد پھر دن اس سے شروع کریں۔دلوک الشمس سے غسق الیل تک اس پروگرام پر عمل پیرا رہیں۔آپ گھروں کو چلے جائیں لیکن سربراہ کی کیفیت وہی ہو جو ہمارے نبی کریم کو کہا تھا کہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (17:79)۔ اگر حالات کا تقاضا ہو تو تم اس مقصد کے لیے رات کے کچھ حصے میں بھی جاگتے رہو اور معاملات پر مزید غور و فکر کرو۔مگر یاد رہے کہ یہ خصوصیت نَافِلَةً لَّكَ یہ صرف تیرے لیے ہے کہ بیٹھ کے سوچ کہ اب کیا کرنا ہے۔

اس پروگرام پر عمل کرنے کا نتیجہ مقامِ محمود ہو گا

یہ سارا کچھ کرنے کے بعد' عزیزانِ من! کیا کہا؟ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ سنیے عزیزانِ من! نتیجہ کیا ہو گا؟ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79)۔ تُو دیکھے گا کہ اس پروگرام پہ عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تجھے مقامِ محمود حاصل ہو جائے گا۔محمود کے معنی یہ ہیں کہ ''جب تُو اس نظام کو قائم کرے گا تو ساری دنیا تیری شان میں ستائش اور حمد کے کلمے پڑھنے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ کہے گی کہ اس شخص کی کیا بات ہے' کیا عالمگیر نظام دے گیا ہے''۔تُو نے تو مقامِ محمود پر کھڑا ہونا ہے' برادرانِ عزیز! آپ نے کبھی ان الفاظ پر غور نہیں کیا' ہم کیا غور کریں گے! نعتوں کے اندر محبوب کی زلفوں اور خد و خال کا ذکر جو آ جاتا ہے۔

حمد کا مفہوم

عزیزانِ من! ایک لفظ سے کتاب اللہ شروع ہوئی' خدا کا کلام شروع ہوا' وہ لفظ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (1:1)۔ ایک لفظ ہے حمد اور ''ال'' اس کے اوپر ہے۔عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ عام حیثیت سے جو حمد ہے' یہ خدا کے لیے ہے۔یہ کتنی بڑی چیز تھی! اور حمد آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ترجمہ تعریف نہیں ہے' Praise نہیں ہے۔اسکا یہ ترجمہ بالکل ناکافی ہے۔حمد تو ہوتا ہے کسی تحسین و

Marfat.com

ستائش (Appreciation) کے دلی جذبات کا اظہار' جو مصور کے' کسی تخلیق کرنے والے کے' نادر شاہکار کے لیے ہو' جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا گیا ہو۔ عربوں کی لغت کے اندر یہ سب شرطیں حمد کی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بلا کی قوم تھی۔ تخلیق کرنے والے کا نادر شاہکار' جو منفعتِ عامہ کے لیے وجود میں لایا گیا ہو' اس طرح مکمل یافتہ ہو کہ جو دیکھے' بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ آہا! اس شاہکار کا خالق کتنا عظیم اور برتر ہے۔ اس کو حمد کہتے ہیں۔ اس حمد کی کیا بات ہے! یہ تھی حمد' خدا کے لیے۔ اور محمود کہتے ہیں جس کی حمد کی جائے۔ یہاں رسول اللہ کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں' اس نظام کے متعلق کہہ رہے ہیں' اس جماعت کے متعلق کہہ رہے ہیں' کہ تمہیں مقامِ محمود حاصل ہونا ہے۔ وہ الحمد جو خدا کے لیے ہم نے وہاں مخصوص کی تھی' اس حمد کا پرتو اس کے اندر نظر آئے گا۔

عزیزانِ من! اب حمد خدا کے لیے ہے۔ مقامِ محمود یہاں حاصل ہو رہا ہے۔ اور حضورؐ کے تو اسمِ گرامی یا محمد ہیں یا احمد ہیں۔ مقامِ محمود ہے صاحب! وہ حمد ہی حمد ہے۔ جو دیکھے بے ساختہ پکار اٹھے۔ اب بھی عزیزانِ من! حضورؐ کی وہ سوانح حیات جو مستشرقین کی لکھی ہوئی ہیں' آج بھی موجود ہیں۔ وہ مخالفت بھی کرتے ہیں لیکن یہ کہنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے جو نظام یہ شخص پیدا کر گیا ہے' اس سے بہتر نظام نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ کو محمود کہنے کے لیے مجبور ہیں۔ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79)۔ تُو یہ کر اور پھر دیکھ کہ کس طرح سے تجھے مقامِ محمود حاصل نہیں ہوتا؟ اور جسے مقامِ محمود حاصل ہوتا ہے اس کے لیے دنیا بے ساختہ پکار اُٹھی ہے کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف دعوت دینے والے کا مقام فی الواقعہ ایسا ہی قابلِ حمد و ستائش ہونا چاہیے۔

مملکت اسلامیہ کا سربراہ صفاتِ محمود کا حامل ہونا چاہیے

عزیزانِ من! جو محمود ہوتا ہے' اسی کو آپ کے اسلامی نظام کے برسرِ اقتدار رہنے کا حق ہے۔ جہاں کوئی چیز بھی کسی سے جبراً نہ کرائی جائے' وہاں ہر شخص کی زبان پہ اس کے لیے تعریف ہی ہوتی ہے۔ اگر اس کے برعکس ہو' کسی سے مجبوراً تعریف کرائی جائے تو اس کو مجبور ہو کے کر گذرتا ہے' اس کو مان بھی لیتا ہے۔ تھانے والے جو روز کہتے ہیں کہ صبح آ کے حاضری دیا کرو' تو وہ حاضری تو دے آتا ہے۔ کیا اس کے بعد گھر آ کے وہ اس کی شان میں قصیدہ بھی پڑھتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ یہ صرف اس قسم کی اطاعت ہے۔ یہ وہ شے نہیں ہے' جس سے تعریف و ستائش دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ وہ تو اس قسم کا ایک نظام قائم کرنا ہے کہ جس میں ہر شخص بے ساختہ اس کی تعریف کرنے پہ مجبور ہو جائے کہ کیا بات ہے! یہ تھا وہ نظام جو حضورؐ نے قائم کیا اور یہ تھا مقامِ محمود جو اس نظام کے قائم کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے اور یوں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین کہا ہے۔

Marfat.com

رحمت کا مفہوم

رحمت کے معنی ہیں ''نہایت نرمی سے' سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا''۔ نہایت نرمی سے سامانِ نشو ونما پہنچانے کی شرط ہے۔ یہ جیل خانے کے داروغے کی طرح روٹی دینا نہیں۔ یہ اس طرح کا سامانِ نشو ونما پہنچانا ہے' جس طرح ماں اپنے بچے کی پرورش رحم (Womb) کے اندر کرتی ہے۔ رحمت تو رحم سے ہے اور اس پرورش کی بنیاد یہ ہوتی ہے۔ ماں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے اور اس کوشش کا Process یہ ہے کہ وہ اپنا آپ انڈیل کے بچے کے اندر داخل کرتی چلی جاتی ہے تو جس سے یہ پرورش پاتا چلا جاتا ہے' خواہ آپ کمزور ہوتی چلی جائے۔ ''اودیاں خیراں روز منگدی ہیگی اے' چن میرا وڈا ہویگا' سوھنا ہویگا' بھاگ لگن گے' سہرے لگن گے' دلہن آئیگی۔''[1] یعنی اس کے مستقبل کے متعلق' یہ سب کچھ کرے گی۔ وہ جو کچھ کھائے گی' وہ صرف اس لیے ہوگا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ دودھ بنے' اس کے اندر وہ انڈیل دے تاکہ اس کی پرورش ہو۔ یہ جو طریق ہے' اسے رحمت کہتے ہیں۔ یہ رحم (Womb) سے ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کو رحمت کہا ہے۔ وہ جو عیسائیت کا ''صابر'' کا تصور تھا' وہ تصور قرآن نے نہیں دیا۔ عیسائیت کے اس تصور کی رو سے پرورش اور انداز کی ہوتی ہے' اس کے برعکس ماں جو پرورش کرتی ہے وہ اور انداز کی ہوتی ہے۔ جس محبت سے یہ گلے سے چپکا کے بچے کو دودھ پلاتی ہے' باپ میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اپنے بدن کا جز دوسرے کو دیتے چلے جانا' اور محبت سے دیتے چلے جانا' شفقت سے دیتے چلے جانا' یہ ہے وہ چیز جس سے مقامِ محمود حاصل ہوتا ہے۔

خدا کی حمد اسی لیے ہے کہ وہ رب العلمین ہے

یہاں بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (1:1) کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) کہا ہے اور وہ اس لیے برسرِ حمد وستائش ہے کہ ربوبیتِ عالمینی کرتا ہے' ورنہ جو ربوبیت عالمینی نہیں کرتا' وہ حمد وستائش کا مستحق ہی نہیں ہوتا۔ اور یہاں مقامِ محمود حاصل ہو رہا ہے۔ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79). قرآن کا کیا ہی عجیب پروگرام ہے! کیا کڑیاں سونے کی مالا کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ پروئی ہوئی چلی آ رہی ہیں! دیکھا کہ یہ پروگرام میں مفاہمت ومصالحت چاہتے ہیں۔ حق پر رہنے والا مصالحت نہیں کرتا۔ ''جواب دیدوان کو۔'' جواب دیا ہے' تو اب ٹکراؤ ہوگا' بڑی شدت کا ٹکراؤ ہوگا۔ ٹکراؤ کے لیے کیا صورت ہوگی۔ پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صبح سے شام تک سرگرمِ عمل رہنا ہے اور اس کے بعد راتوں کی تنہائیوں میں جاگ کے تمہیں پھر غور کرنا ہوگا۔ یہ سارا پروگرام تم کرو گے تو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ مقامِ محمود حاصل ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی اس میں set back ہوتا ہے' کبھی انسان آگے بھی بڑھتا ہے' کبھی پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ یہ ساری چیزیں Strategy چاہتی ہیں۔ اس کے لیے کہا کہ کوئی بھی صورت ہو' تمہیں صبح سے شام تک اور رات کی تنہائیوں میں بھی اس پروگرام کے لیے سرگرمِ عمل رہنا ہے۔

---

[1] روزانہ اس کی بھلائی چاہتی ہے: میرا چاند بڑا ہوگا' بلا کا خوبصورت ہوگا' اس کے بخت ثمر وبار لائیں گے' سہرے سجیں گے' دلہن آئیگی۔

دعا میں ہمیشہ خیر کا پہلو مضمر ہو' حق وصداقت کا پہلو ہو

سنیے اگلی کڑی' عزیزانِ من ! وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (17:80)۔ آرزو یہ کرو' دعا یہ مانگو کہ یا اللہ! اگر میں کہیں آگے بڑھوں' تو پھر بھی حق وصداقت کا پرچم ہاتھ میں لیے ہوئے آگے بڑھوں۔ یہ نہ ہو کہ غلبہ حاصل ہو رہا ہے تو اس وقت پھر میں عدل کو' انصاف کو' صداقت کو چھوڑ دوں۔ صدق کے ساتھ آگے بڑھنا ہے اور اگر کہیں پیچھے ہٹنے کی ضرورت پیش آئے تو پھر بھی حق وصداقت کو ہی لے کے ہو۔ وہاں تمہارے اوپر کہیں مایوسی اور قنوطیت نہ چھا جائے۔ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (17:80)۔ مجھے غلبے کی ضرورت ہے۔ قوت کی ضرورت ہے۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے باطل کی طرف نہیں جھکنا' نہ کہیں اور سے مدد لینی ہے۔ مجھے مدد دینی ہے تو تُو نے دینی ہے' مجھے تُو نے غلبہ عطا کرنا ہے۔ اے اللہ! مجھے تُو اپنی طرف سے غلبہ عطا کر' مجھے اس مقصد کے لیے ان کا محتاج نہ بنا دینا۔ ہم تو اس پروگرام میں کسی ایسے شخص کی مدد بھی نہیں لے سکتے عزیزانِ من! جو اس پروگرام کے ساتھ متفق نہ ہو' ہم تو ان کے ساتھ اتحاد نہیں کر سکتے اور کہا کہ تم یہ کچھ کرو' نہی Do`s اور Dont`s کے مطابق سرگرم عمل رہو۔

اعلان ہو تو یہ ہو کہ حق آ گیا' باطل چلا گیا

اس کے بعد اعلان کر دو۔ کیا اعلان ہے؟ کہو کہ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81)۔ ان کے سامنے اعلان کر دو: ''وہ آ گیا حق' وہ گیا باطل''۔ اعلان کر دو کہ حق آ گیا' باطل چلا گیا۔ بھئی! یہ باطل چلا گیا' کیا خود ہی چلا گیا؟ کہا: نہیں صاحب! اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ باطل تو اس وقت تک رہتا ہے' جب تک حق نہیں آتا۔ تاریکی اس وقت تک ہوتی ہے' جب تک روشنی نہیں آتی۔ کتنا ہی تاریک ترین کمرہ کیوں نہ ہو' بجلی بجھ جاتی ہے تو اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کتنی تاریکی چھا جاتی ہے! بالکل تاریکی ہی تاریکی۔ اس میں ایک دیا سلائی جلا لیجیے' اسی میں آپ دیکھتے ہیں کہ باطل کی تاریکی گئی۔ موم بتی جلا دیجیے اس میں بھی یہ چیز ہو جاتی ہے۔ اندھیرا نہیں ہوتا' روشنی کم سہی۔ جونہی سورج کی پہلی شعاع نکلی' تاریکی گئی۔

رات کے ماتھے کی سیاہی کے نشان' صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہیں

وہ اپنی اپنی گدڑی لپیٹ کے' وہ بھاگیں رات کی ساری تاریکیاں! رات کی ساری تاریکیاں! کہا: اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ باطل کا جو شر ہے اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ تو دراصل یہ حق کا عدم ہے' جو باطل ہے۔ حق کا نہ ہونا ہے' جو باطل ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ دوہرا پروگرام ہوتا ہے کہ پہلے حق کو لاؤ' یہاں اس کو بسا کے' ہاتھ میں ڈنڈا لے کے بیٹھو' پھر تت تت کر کے باطل کو نکالو۔ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ یہ ایک ہی پروگرام ہے۔ بس تم حق کو لے آؤ۔ حق کے آنے کی' جب صورت ہو جائے تو اسکے وجود کا فطری

Marfat.com

نتیجہ یہ ہے کہ باطل نہیں رہے گا۔ باطل کے ساتھ مفاہمت کر کے کسی طرح سے بھی آپ باطل کو نہیں نکال سکو گے' اس سے تو تم نے صلح کر رکھی ہے کہ ٹھیک ہے تم بھی رہو' ہم بھی رہیں گے:

تم جانو' تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

(غالب)

لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ حق آئے گا' باطل باقی نہیں رہے گا۔ یہ ہے وہ پروگرام' عزیزانِ من! جو دیا گیا ہے اور اس پروگرام کی اصل' اساس اور بنیاد کیا ہے؟ کہا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (17:82)۔ قرآن نے اسے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ لیکن آج وقت ہو گیا ہے' بات ذرا لمبی چلی جائے گی: شفاء ہے' مومنین کے لیے رحمت ہے۔ اس کے اندر ظالمین کے لیے بڑی تباہی ہے۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 81 تک ہم آ گئے۔ 82 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

Marfat.com

پندرھواں باب: سورة بنی اسرائیل (آیات 82 تا 93)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا ہُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ وَ لَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَ اِذَاۤ
اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِہٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَـُٔوۡسًا ﴿۸۳﴾ قُلۡ کُلٌّ یَّعۡمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ ؕ
فَرَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ہُوَ اَہۡدٰی سَبِیۡلًا ﴿۸۴﴾ وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ
مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾ وَ لَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡہَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِہٖ عَلَیۡنَا وَکِیۡلًا ﴿۸۶﴾
اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ فَضۡلَہٗ کَانَ عَلَیۡکَ کَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾ قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا
بِمِثۡلِ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ وَ لَوۡ کَانَ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ ظَہِیۡرًا ﴿۸۸﴾ وَ لَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ ہٰذَا
الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوۡرًا ﴿۸۹﴾ وَ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ
الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ﴿۹۰﴾ۙ اَوۡ تَکُوۡنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡہٰرَ خِلٰلَہَا تَفۡجِیۡرًا ﴿۹۱﴾ۙ اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ
کَمَا زَعَمۡتَ عَلَیۡنَا کِسَفًا اَوۡ تَاۡتِیَ بِاللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیۡلًا ﴿۹۲﴾ۙ اَوۡ یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰی فِی
السَّمَآءِ ؕ وَ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیۡنَا کِتٰبًا نَّقۡرَؤُہٗ ؕ قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ ہَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا
رَّسُوۡلًا ﴿۹۳﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ بنی اسرائیل کی آیت 82 سے ہو رہا ہے۔ 17:82۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ آپ ﷺ یعنی نبی اکرمؐ جو دعوت اور نظام پیش کر رہے ہیں، اس میں یہ لوگ اب اس سٹیج پہ آ گئے ہیں کہ انہوں نے تمہاری قوت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ کہیں گے کہ آپ کے ساتھ کچھ Compromise کر لیا جائے، کچھ مفاہمت کی جائے، کچھ مصالحت کی جائے، کچھ یہ بڑھیں، کچھ تم پیچھے ہٹو۔ کہا کہ حق تو کسی کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ حق جب اپنے مقام پہ اٹل ہوتا ہے تو حق ہوتا ہے اور اگر ذرا بھی اپنے مقام کو چھوڑ دے تو باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہا کہ پھر اس کے بعد ان کی اگلی صورت یہ ہوگی کہ یہ جب مایوس ہو جائیں گے کہ مفاہمت بھی نہیں ہو سکتی تو اس کے بعد یہ ایک آخری ہلہ بولیں گے کہ تمہیں اس ملک سے ہی باہر نکال دیا جائے تو یوں یہ فتنہ ختم ہو۔

Marfat.com

دوسروں کے لیے مذہب تو قابلِ برداشت ہوتا ہے' دین نہیں ہوتا

یہ چیز آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ یہ بات صرف مذہب کی نہیں تھی۔ مذہب کو تو سب برداشت کر لیتے ہیں۔ بات دین کی تھی' بات ایک نظام کی تھی۔ ایسا نظامِ زندگی متمکن کرنا چاہتے تھے' جسے الاسلام کہا جاتا ہے' جس سے ان مفاد پرستوں کی تمام مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی تھیں اور یہ تھی ان کی وجہِ مخاصمت' ورنہ اپنے تصور کے مطابق صلوٰۃ کی اجازت تو حضرتِ شعیبؑ کو ان کی قوم نے بھی دیدی تھی لیکن اس کے بعد جب انہوں نے کہا تھا کہ شعیب ہم تو کچھ صلوٰۃ کو نماز ہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بات ہی کچھ اور نکلی۔ تم کہتے ہو کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی سے صرف نہیں کر سکتے تو یہ تو ایسی بات نہیں کہ جس کی ہم تمہیں اجازت دیں۔ ہم تمہیں اپنے گاؤں سے نکال دیں گے۔ قرآن نے کہا ہے۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا (17:77)۔ کہ یہ کوئی نرالی بات یا انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ تو شروع سے ہی ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مخالفت کی قوتیں یہی کچھ کرتی چلی آ رہی ہیں۔ یہی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اب ان کا اگلا حربہ یہ ہوگا کہ اسے یہاں سے نکال دیا جائے اور پھر اس کی مدافعت کے لیے آپ کو میدانِ جنگ میں بھی آنا پڑے گا اور اب وہ بڑا سخت مرحلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلے کی تیاری کے لیے کہا کہ بھئی! اب تو صبح سے شام تک اس پروگرام کے لئے تمہیں منہمک اور سرگرداں رہنا ہوگا اور رات کو تمہارے یہ ساتھی' جو اس پروگرام سے تھک تھکا کے گھر بھی چلے جائیں تو تم تو سربراہ ہو' تمہاری ذمہ داریاں تو ان سے بڑی زیادہ ہیں' تم نے تو کل کا پروگرام بھی چاک آؤٹ کرنا ہے۔ اس لیے وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (17:79)۔ تمہیں رات بھی جاگنا پڑے گا اور یوں یہ پروگرام ایسا آئے گا کہ جس میں پھر وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81)۔ کہ وہ حق آ جائے گا۔ اعلان کر دو' تم پہلے ہی اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ باطل ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ تو اس وقت تک ٹھہرتا ہے جب تک حق نہیں آتا۔ اندھیرے کا اپنا وجود نہیں ہوتا۔ روشنی کے نہ ہونے کا نام اندھیرا ہے۔ لہٰذا عزیزانِ من! یہاں سے تو یہ بھی نظر آ گیا کہ یہ جو ہم رونا روتے رہتے ہیں: جی! غلط رسوم' غلط معاشرہ' غلط اخلاق' غلط سیاست' غلط معیشت' یہ سب غلط' یہ سب باطل ہے تو یہ باطل اس لیے ہے کہ ہم حق کو لا نہیں رہے تو باطل کے ہاتھوں روتے رہنے سے باطل نہیں جائے گا۔ پہلی شرط جَآءَ الْحَقُّ (17:81) کی ہے تو وہ تو حق کے لانے سے یہ باطل نیست و نابود ہوگا۔

شمعیں روشن کیجیے' اندھیرا فوراً کافور ہو جائے گا

اندھیرے میں بیٹھے ہوئے روتے رہیے' اندھیرا چلا نہیں جائے گا۔ آپ کو دیا سلائی جلانی پڑے گی' موم بتی جلانی پڑے گی' شمعیں روشن کرنا پڑیں گی' قمقموں کی تابندگی بڑھانی پڑے گی۔ یہ کیجیے' اندھیرا چلا جائے گا' مگر یاد رکھیے' یہ از خود نہیں جائے گا۔ رونے سے نہیں جائے گا' اسے کافور کرنے کے لیے آپ کو حق کو لانا ہوگا۔ یہ ہے آپ کے لیے مثبت قدم' جو آپ کو اٹھانا ہوگا۔

Marfat.com

فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً (17:79)۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کا ایک ایک لفظ دیکھیے' اس پہ غور کیجیے۔ کہا: اس قرآن کے ساتھ تمہیں رات کو جاگنا پڑے گا۔ اب راتوں کی تنہائیوں میں اسے Consult کرو' مشورہ کرو اور پھر دیکھو کہ اب آئندہ وہ تمہیں کیا پروگرام دیتا ہے۔ تمہیں جو مسائل درپیش ہیں' تمہیں ان کا حل ملے گا۔ ہم نے کہہ رکھا ہے کہ ہمیں پکارو' ہم جواب دیں گے۔ تم پکارو تو قرآن صحیح جواب دے گا' تمہاری ہر مشکل کا حل بتائے گا۔ اس کے بعد کہا ہے کہ تم دیکھو: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ (17:82)۔ یہ سب کچھ قرآن کی رو سے ہوگا تو بات صاف ہوگئی کہ فَتَهَجَّدْ بِهٖ جو ہے' وہ تو یہ قرآن ہے' جس کے لیے یہ سارا کچھ کہا جا رہا ہے کہ اس کو Consult کرو اور اس پہ غور و فکر کرو۔ دیکھو! یہ کیا کہتا ہے۔ ہم نے قرآن کو نازل ہی اس لیے کیا ہے۔

مریض کا پہلا سوال

اب یہ دیکھیے عزیزانِ من! اس کے اندر دو چیزیں آ گئیں۔ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ یہاں دو خصوصیاتِ کبریٰ بتائی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خصوصیات اتنی جامع ہیں کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مریض کے لیے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا مرض سے شفا حاصل ہو جائے گی؟ کیا مرض جاتا رہے گا؟ پہلی چیز یہ ہے کہ مرض جاتا رہے لیکن صرف مرض کے چلے جانے سے تو وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں آ سکتا۔ اس دوران مرض نے جو اس کی توانائیاں کم کر دی ہیں' کمزوریاں پیدا کر دی ہیں' ان کا رفع کرنا بھی تو اس کے بعد ضروری ہوگا۔ آپ دیکھیے کہ آپ جتنے بھی علاج کراتے ہیں' ان میں ایک چیز تو اس مرض کے ازالے کے لیے ڈاکٹر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ بھئی! اب اس کے بعد ہمیں کچھ Tonics بھی دینے چاہئیں تاکہ وہ کھوئی ہوئی توانائیاں' جو مرض نے سلب کر لی تھیں' وہ بھی تو واپس آئیں۔ وہ جو اتنے دنوں ان امراض کی وجہ سے تمہاری زندگی کے ہر شعبے کی صلاحیتوں کی نشو و نما رک گئی تھی' وہ دور ہو۔ انحطاط تو کہتے ہی اسے ہیں' زوال تو ہوتا ہی یہی ہے کہ اس میں کمی آ جاتی ہے۔ ان امراض کی وجہ سے جو کمی آ گئی ہے' ان کے دور کیے جانے کی بھی ضرورت ہے۔ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ یہ جتنے روگ ہیں سنیے! یہ ان کو دور کرے گا اور ان بیماریوں نے جو کمزوریاں' جو نقاہتیں' جو زوال و انحطاط و ہبوط پیدا کر دیا تھا' یہ ان کے لیے ٹانک بھی ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بتایا تھا کہ رحمت اس طرح کی نشو و نما ہے' جس میں لوچ ہو' لچک ہو' تقاضے کے مطابق ہو۔ یہ بالکل اسی طرح کی ہے۔ جیسے رحمِ مادر میں بچے کو نشو و نما ملتی ہے۔

رحمِ مادر میں بچے کو کبھی بدہضمی نہیں ہوتی

اب غور کیجیے' قرآن میں کیا لفظ آیا ہے! بیماری رفع ہونے کے بعد مریض خود اتنا کمزور ہو گیا ہوتا ہے کہ اگر آپ اسے پہلے دن پلاؤ کھلا دیں تو وہ بدہضمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ جو بیماری سے دوسرے ہی دن اٹھ کے کھانا شروع ہوتا ہے' تو آپ کو پتہ ہے کہ اس سے

بہت سے مریض پھر مریض ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسے جو دوبارہ توانائی دینی ہوگی' وہ رحمت کے طریق پہ دینی ہوگی۔ رحمِ مادر میں بچے کو کبھی بدہضمی نہیں ہوتی۔ وہ تو ہم جو ٹھونستے ہیں اس سے یہ بچہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ کیا ہے' جو کھوئی ہوئی توانائی کو پھر نہیں واپس لاتا؟ یا تو اس کو اس تقاضائے وقت کے مطابق ٹانک نہیں دیتے یا جو کچھ مریض کو ملتا ہے' وہ یوں ہی ختم ہو جاتا ہے' جزوِ بدن نہیں بنتا' دینے والے دیتے ہیں تو ان میں تناسب اور توازن نہیں ہوتا۔ یہ جو ڈاکٹر دوائی کی خوراک Dozes مقرر کرتا ہے' یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اسے آپ اوزان کہتے ہیں۔ رحمت میں یہ چیز ہوتی ہے کہ جس حالت میں کوئی ہے' اُسے اس حالت کے مطابق سامانِ نشوونما دینا' جس میں لچک اور لوچ کا پہلو رکھا جائے' اس کے اندر صلابت اور کرختگی نہ ہو۔ قرآن نے یہ دونوں چیزیں بتائیں۔ تو پہلے شفاء کہہ دیا۔ یہ تو حصہ ''لا'' ہو گیا۔ یہ جتنے غلط اعتقادات' رسومات' یہ بندھن' اغلاط' سلاسل' یہ سارے جتنے بھی ہیں' ان سب کو پہلے رفع کرنا ہوگا۔ شفاء نام ہی اس چیز کا ہے۔ پہلے تو ان تمام کو دور کرنا پڑے گا۔

مَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256)۔ پہلے طاغوت سے انکار کرنا پڑے گا' اس سے کفر برتنا پڑے گا۔ پھر خدا پہ ایمان آ سکتا ہے۔ اور ہم ہیں کہ یہ سارا کفر اور شرک برقرار رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ نمازیں پڑھتے چلے جاتے ہیں اور روزے رکھے چلے جاتے ہیں۔ ہم پہلے ''لا'' کا حصہ پورا ہی نہیں کرتے' جس کی وجہ سے ہمارے یہ اعمال نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہمیں پہلے کفر کے حصے کو دُور کرنا ہوگا۔ اسے تو دُور ہی نہیں کیا جاتا۔ پہلے ''لا الہ'' ہے' پھر ''الا اللہ'' آتا ہے۔ شفاء کا وہ پہلا حصہ ''لا'' کا ہے۔ مرض کو دُور کرو۔ بدہضمی (Indigestion) کے دوران دودھ پلائے جایئے' تو بدہضمی نہیں جائے گی۔ آگے یہ آتا ہے کہ پھر وہ دودھ کیا کرے گا۔ تو یہ پروگرام' یہ پروسیس Process بڑا ضروری ہے' عزیزانِ من! یہ جو پہلا حصہ ''لا'' ہے' اسے پہلے دُور کیا جائے تو یہ شفا ہو گئی۔ یہ پہلی چیز ہے۔ اس کے بعد پھر جو ''الا'' کا حصہ آئے گا کہ یہ کرو' اس سے کھوئی ہوئی توانائیاں آپ کو ملیں گی۔ افراد میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے' اقوام میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

سب سے پہلے غلط نظام کو بدلنا ہوگا

جب تک قومیں اپنے پہلے سے قائم شدہ باطل نظام' غلط نظام کو' نہیں بدلیں گی یعنی غلط نظام کی سلیٹ کو صاف نہیں کریں گی' اس سے انکار نہیں کریں گی' اس سے کفر نہیں برتیں گی' اس سلیٹ پہ کچھ اور لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ ذہنوں کو اور سوچ کو بدلے بغیر اسلام قطعاً نہیں آ سکتا۔ حصۂ لا میں بڑی جراٗتوں کی ضرورت ہے' عزیزانِ من! بڑی جراٗتوں کی ضرورت ہے۔ دوائی پلانا بہت مشکل ہے' اس کے بعد ٹانک پلانا تو آسان ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں متوارث چلی آ رہی ہیں' وہ پہلا حصہ ہیں۔ مثلاً وہ جو بچھڑے کی محبت کا قرآن نے کہا ہے کہ ان گئوسالوں کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ جو متواتر چیزیں آ رہی ہوتی ہیں' وہ جو قوموں کے اندر غلط چیزیں

Marfat.com

متوارث آ رہی ہوتی ہیں' وہ تو جز وِزندگی بن جاتی ہیں' عین ایمان بن جاتی ہیں۔ ان کا نکالنا بڑا مشکل ہے۔ اس کے لیے بڑی ہی جرأت کی ضرورت ہے۔ بس یہ ہے مرحلہ جو جرأت طلب ہے۔ حقیقت میں ان کا مٹانا' ان سے الگ ہونا' بڑی جرأت طلب ہے اور یہی جو باطل کی قوتیں ہیں' ان کا سارا زور اس پہ ہوتا ہے کہ ان غلط چیزوں کو اس قدر اچھا' مقدس اور صحیح بنا کے پیش کیا جائے کہ یہ انہیں دل سے دور نہ کر سکیں۔ کوئی ذرا سا دل میں خیال آئے کہ یہ تو کچھ غلط ہیں تو چاروں طرف سے' دھوم دھام سے' ان کے متعلق ان کی اتنی وعظیں' نصیحتیں اور ہدایتیں آتی ہیں کہ وہ انہیں پختہ سے پختہ تر کیے چلے جاتے ہیں۔

قرآن ان تمام بیماریوں کے لیے نسخہ کیمیا ہے

قرآن کا پروگرام تو يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ (2:28) ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ ایمان باللہ سے پہلے لا الہ ضروری ہے۔ الا اللہ تک پہنچنے سے پہلے ''لا الہ'' ضروری ہے۔ قرآن شفاء ہے۔ یہ بیماریاں کیسے دور ہوں؟ اس کے لیے قرآن ایک کسوٹی (Criterion) ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس کو سامنے رکھ لے اور پرکھتا چلا جائے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' کرتے چلے آ رہے ہیں' اس میں سے کیا کیا صحیح ہے اور کیا کیا غلط ہے؟ ڈاکٹر صاحب! کھاؤں کیا؟ کیا نہ کھاؤں؟ بھئی! اس وقت یہ بھی چھوڑ دو۔ یہ بھی چھوڑ دو' یہ رہنے دو۔ وہ شخص اس کا کیسے فیصلہ کر رہا ہے؟ اس کے پاس ایک قانون ہے کہ مرض یوں جائے گا۔ قرآن شفاء دیتا ہے۔ یہ بتائے گا کہ تمہارے امراض کیا کیا ہیں اور وہ کیسے رفع ہوں گے۔ یہی وہ جرأتیں پیدا کرے گا' عزیزانِ من! کوئی دوسری چیز یہ کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔ اور وہ یہی چیز ہے جس کے قریب یہ نہیں آنے دیتے۔ یہ جتنے بھی غلط مناسک' مناہج اور مسالک کے مدعی و دعویدار و علمبردار ہیں' وہ یہی چیز نہیں ہونے دیتے۔ الا اللہ کا اگلا حصہ تو بڑی دور جا کے آتا ہے۔ یہ پہلا حصہ کفر بالطاغوت کا ہے' وہ قوموں کو اس پہ آنے نہیں دیتے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ ان کے اپنے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ میں یہ مثال ہی کے طور پہ کہتا ہوں' ہر معالج یا ہر حکیم یا ہر طبیب یا ہر ڈاکٹر کے متعلق نہیں کہتا۔ اس قسم کے بدنہاد بھی ہوتے ہیں' وہ ہمارے تجربے میں ہیں کہ ذرا سا دیکھا کہ اچھی جیب والا مریض پھنس گیا ہے۔ بس اس کے ساتھ یہ کیا کہ پہلے دن تو ایسی دوائی دی کہ آدھا مرض جاتا رہا' وہ سبحان اللہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ مرض کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جب دیکھا کہ مرض بظاہر 10% رہا ہے تو پھر ایک ہی دن کچھ ایسا انجیکشن (Injection) دیا کہ چل پھر اس کو اسی کے اوپر چلائے جا رہے ہیں۔ یہ کیوں اس کو اچھا ہونے دیں؟ دراصل ان کی جیب انہیں اچھا ہونے نہیں دیتی۔ اس کے مرض کے ساتھ ان کے مفاد وابستہ ہو گئے ہیں کہ یہ اچھا ہو گیا تو میری روزی گئی۔ اگر وہ اس کو مایوس کر دیں تو پھر بھی وہ چلا جائے گا۔ نہیں' ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں لیکن ان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مریض اچھا نہ ہونے پائے۔ یہ ان کے مفاد ہوتے ہیں جو وہ اچھی جیب والے مریض سے وابستہ رکھتے ہیں۔

Marfat.com

میں تمہارے علاج کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر رسول کی دعوت میں یہ کہا ہے۔ عَبْدَ اللّٰهِ (13:36)۔ پہلی بات یہ کہ خدا کی محکومیت اختیار کرو اور اسی سانس میں اگلی بات یہ کہ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (26:109) میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ بھئی! یہ شفا ہی اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔ اب تو ہمارے ہاں کا نظام واقعی باطل ہے اگر معاوضہ نہ لیں تو یہ معالج' یہ بے چارے ڈاکٹر' کھائیں کہاں سے؟

معالج کے لیے اس کی روٹی کا انتظام

اچھے نظام کے زمانے میں ان کے لیے جائیدادیں وقف کر دی جاتی تھیں کہ تم یہاں سے کھاؤ اور اس کے بعد مریضوں سے کچھ نہ لو۔ دلی کے شریف خوانی خاندان' حکیم اجمل خان صاحب کے خاندان' ان سب کے نام جائیدادیں وقف تھیں۔ یہ مفت علاج کرتے تھے' یوں فائدہ ہوتا تھا۔

چین والوں کے ہاں مشروط فیملی ڈاکٹرز کا رواج تھا

یا پھر وہ طریق تھا' جو پرانے زمانے میں چین والوں نے اپنے ہاں اختیار کیا تھا۔ بڑے پرانے زمانے کی بات ہے' وہاں فیملی ڈاکٹرز ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کی تنخواہ مقرر ہوتی تھی۔ جتنے دنوں کوئی شخص بیمار رہتا تھا اتنے دنوں کی تنخواہ کاٹ لیتے تھے۔ دیانتدار ڈاکٹر آدمی یہ چاہے گا کہ اس کا مریض جلد صحت یاب ہو۔ میری نگاہوں کے اندر ایسے بھی طبیب ہیں' جو دوائی بھی دیتے ہیں اور واقعی تنہائی میں دعا بھی کرتے ہیں کہ اس مریض کو اچھا ہو جانا چاہیے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ باطل کے نظام میں کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طاغوت کے پنجے سے نکلنے ہی نہیں دیتے اور اس منزل کے اندر یہی سخت مرحلہ ہے صاحب! یاد رکھیے! مذہب سے نکل جانا اور دین کی طرف آنا بڑا مشکل ہے۔ شفاء یہ ہے کہ وہ جو آپ کا پہلا مرحلہ ''کفر بالطاغوت'' کا ہے' پہلے اس سے نکلے اور یہ تو قرآن ہی نکال سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان

وہ جو اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے ہاں ایک فقرہ لکھا ہے' کہنے کو تو وہ ایک ہی ہے لیکن بہت اہم فقرہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ اس امت کی بیماریوں کا علاج صرف ایک ہے کہ ان میں کوئی مردِ قلندر اور مردِ درویش' جسے وہ کہتے ہیں جرأتوں کا مالک' عمرؓ کی روح لیے ہوئے اٹھے کہ جس نے نبی اکرم ﷺ کی حیات کے آخری سانس میں یہ کہہ دیا کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ۔ کہا کہ ''امت کو شفاء وہ شخص دے سکے گا۔ جو حسبنا کتاب اللہ کہنے کی جرأت کرے گا۔'' ٹھیک ہے بڑی مخالفت ہوگی' بڑے کفر کے فتوے لگیں گے' بڑی ڈگڈگیاں بجیں گی صاحب! یہ سب کچھ ہوگا لیکن یہ تو اسی صورت میں ہو سکے گا کہ وہ اس قرآن پر چلے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہی قوم' جو آج اس کی مدعی ہے' اپنا نام مسلمان رکھے ہوئے ہے' قرآن کو یونہی دہرائے چلے جا رہی ہے' وہ یہی قوم ہو۔ قرآن تو قوموں سے واسطہ ہی نہیں رکھتا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر

تم ان قوانین سے اعراض برتو گے تو کوئی بات نہیں' ہم تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئیں گے۔ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38)۔ پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ عزیزانِ من! سوال مسلم یا غیر مسلم کا نہیں ہے۔ قرآن تو ذکر للعالمین ہے۔ دنیا جب بھی تنگ آئے گی اور اس وقت اپنے غلط معاشرے اور نظام سے بڑی تنگ آئی ہوئی ہے' اس قرآن کی تعلیمات اور نظامِ زندگی کی طرف لپکے گی۔

اہلِ یورپ کی رقصِ بسمل اور ہماری حالتِ زار

آپ یورپ کے مفکرین کی کہیں آج کل کی کیفیت کا مطالعہ کیجیے' چیخ رہے ہیں جسے اقبالؒ (1877-1938) نے ان کا رقصِ بسمل کہا ہے کہ:

اکرم و جراحت ہائے پنہاں بسمل استاد است

ان کی یہ کیفیت ہو چکی ہے: تڑپ رہے ہیں' راستہ نہیں مل رہا۔ راستہ تو ہم نے دینا تھا جو قرآن کے مدعی تھے۔ ہم ہی باطل کے کفر سے نہیں نکل رہے' ہم انہیں کیا راستہ دکھائیں گے۔ میرا اندازہ یہ ہے عزیزانِ من! اگر میری جرأتیں معاف کی جائیں تو میں بلا خوف و خطر کہوں گا کہ مذہب پرست قوم سب سے آخر میں قرآن کی طرف آئے گی۔ اس لیے کہ انہیں غلط عقائد' غلط مناسک کے اندر ایسا مگن کر دیا جاتا ہے کہ یہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ وہ اس لیے چیخ رہے ہیں اور ڈھونڈ رہے ہیں غلط عقائد اور غلط مناسک سے نکلنے کا راستہ۔ انہوں نے پہلے سے ہی یہ افیون' یہ مذہب تو چھوڑ دیا تھا' سیکولرازم پہ آ گئے ہوئے تھے۔ اس میں ان کو بڑا وقت لگا تھا۔

آپ ذرا یورپ کی تاریخ پڑھ کے دیکھیے کہ کلیسا اور چرچ سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان کو کن کن کٹھن مراحل سے گزر کر نکلنا پڑا تھا۔ لیکن بہرحال' تین چار صدیاں ہو گئیں وہ وہاں سے نکل گئے۔ اس لیے اس راستے کی تلاش کے اندر وہ ہم سے آگے ہیں' جبکہ ہم اپنی ڈگر پر مطمئن ہیں' چپ بیٹھے ہیں۔ اگر ان کی کہیں کراہنے کی کوئی آوازیں بھی آتی ہیں تو ہم کہتے ہیں: دیکھا چھری کانٹے سے کھانے کا مزہ یعنی ہماری یہاں تک ہی نگاہ جاتی ہے۔ جسے ہم تاریخِ مغرب کہہ کے پھٹکارتے رہتے ہیں تو وہ پتلون' ٹائی' چھری' کانٹا' میز' کرسی ہے۔ اس سے آگے ہماری نگاہ ہی نہیں جاتی' یعنی ان کی نگاہ صرف ان چیزوں تک جاتی ہے جو یہ خود نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک تو بس تہذیبِ مغرب اتنے ہی حصے تک ہے' باقی سب جائز اور حلال ہے۔ سوال یہ تو نہیں عزیزانِ من! طاغوت نے تو ہر غیر قرآنی نظریہ دیا ہے اور دین کے خلاف تصور دیا ہے۔ یہ قومیں تو اپنی اس بے سکونی کی حالت سے جلدی سے نکل سکتی ہیں۔ نظر یہ آتا ہے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں تڑپ رہی ہیں۔ اور اسی طرح میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ جب آپ باطل کے امراض سے کفر برتیں گے' تو مرض سے شفاء ہو جائے گی اور پھر وہ کھوئی ہوئی توانائیاں حاصل ہونگی۔ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ یہ تو اس طرح ہوگا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا' بدہضمی کے زمانے میں اگر آپ پہلے معدے کو تقویت بہم نہیں پہنچائیں گے اور اس کے مرض کو دور نہیں کریں گے تو اس مریض کو دیا جانے والا وہ دودھ' جس نے توانائی دینی تھی' وہ مرض کو اور بڑھاتا چلا جائے گا۔ اگر اس دوران میں یہ چیزیں جنہیں آپ ٹانک کہتے

Marfat.com

ہیں' بخار کے دوران دیدی جائیں' وہ دورانِ خون کو تیز کردیں گی تو اس سے تو پھر سرسام (Delirium tremens)[1] ہو جائے گا۔ کہا کہ یہ چیز ہے' جو نقصان رساں ہے۔ مومنین کے لیے تو یہ ہوگا کہ جس طرح طلوعِ سحر شب کی تاریکی کے لیے موجبِ ہلاکت ہوتی ہے' اسی طرح صدق وعدل پر مبنی نظامِ خداوندی کے قیام سے' ظلم وستم کی قوتوں کی تباہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ یاد رکھو: وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (17:82)۔ وہ جو اس ظلم وستم کو ساتھ رکھتے ہوئے چلے گا' وہ ظلم وستم کی راہ اس کو الٹا نقصان پہنچائے گی۔

مومن ظالم نہیں ہوسکتا

کیا بات ہے قرآن کی! عزیزانِ من! یہاں کہا ہے۔ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ اس کے تقابل ومقابلے میں قرآن لایا ہے: وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِيْنَ (17:82)۔ قرآن بالاضداد (By Juxtaposition) بات کو واضح کرتا ہے۔ مثلاً یہ نور کے مقابلے میں ظلم اور دھوپ کے مقابلے میں سایہ لاتا ہے۔ اضداد سے بات بڑی صاف ہو جاتی ہے' واضح ہو جاتی ہے۔ روشنی کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ اندھیرا نہیں ہوتا۔ اس سے بات بڑی صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں وہ مومنین کے بالکل مقابل ظالمین لایا ہے۔ بات صاف ہوگئی کہ ظالم مومن نہیں ہوسکتا۔ مومن ظالم نہیں ہوسکتا۔ قرآن تو انہیں ایک دوسرے کی ضد کہہ رہا ہے۔ یہاں ہمارے ہاں تو صرف مومن اور کافر کے ہی لفظ تھے۔ کافر کا بھی وہ تصور اپنے ذہن میں تھا' جو ہمارا نہیں تھا' وہ تو ہندو کا تھا' جو وہ وہاں انڈیا (India) میں ان کو چھوڑ آئے' یعنی کفر تو بس وہاں پر رہ گیا۔ مگر دیکھیے یہاں قرآن مومنین کے مقابلے میں کیا لایا ہے؟ وہ لایا ہے: وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (17:82)۔ جو لوگ سرکشی برتیں گے اور ظلم وستم کی راہ اختیار کریں گے' ان کے سامانِ ہلاکت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ظلم کا مفہوم

عربی زبان میں ظلم اسے کہا جاتا ہے کہ ''جو شے جہاں ہونی چاہیے' وہ وہاں نہ ہو''۔ تو یہاں اس آیت میں ظالم اور مومن کو ایک دوسرے کی ضد بتایا گیا ہے۔ اس سے قرآن اور خدا کا منشاء یہ ہے کہ چیزوں کو یوں ہونا چاہیے اگر ''وہ چیزیں جہاں ہونی چاہئیں وہاں نہیں ہیں''۔ تم نے غلط جگہ رکھی ہوئی ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ حق آجائے' قرآن سے شفا اور رحمت مل جائے' تو اس طرح کبھی شفاء اور رحمت نہیں مل سکتی۔ پہلے ان چیزوں کو اپنے اپنے ٹھکانے کے اوپر رکھیے' یہ ظلم کو ختم کردیں گے۔ اس طرح چیزوں کو اپنے مقام پہ رکھ کر پہلے ظلم کو ختم کرو۔ اس کے بعد قرآن کے ہاں سے تمہیں شفاء بھی ملے گی اور رحمت بھی ملے گی۔ اِلَّا خَسَارًا ۔ ورنہ سامانِ ہلاکت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ خسرانِ مبین ہوگا۔ لیکن کہا کہ انسان کی تو کیفیت یہ ہے' جو بار بار دہرایا کرتا ہے کہ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰبِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا (17:83)۔ جب انسان اپنے سامنے زندگی کا نصب العین یہی مادی اسباب ہی رکھے تو یہ نہیں ہے کہ یہ مادی اسباب قابلِ نفرت ہیں۔ نصب العین کے معنی ہوتا ہے کہ جس طریقے سے بھی یہ حاصل ہو جائے۔

[1] Qorland, 1989, p. 164

Marfat.com

دراصل مقصدِ حیات ہی ان کا حصول ہو۔ جب یہ کیفیت ہو جائے تو امید کے، دین کے، مایوسی کے، خوشی کے، اورغم کے، سارے کے سارے پیمانے (Measures) دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔''بیٹھے ہوئے ہیں صاحب! صف بچھا کے۔''ارجی کیا ہوا؟ سنیے عزیزان من! چار کارخانے بھی ہیں۔ دس بزنس ہاؤس بھی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ او بھئی! کیا ہوا ہے؟ کہ''جی وہ بھاؤ بہت گر گیا ہے''۔ کا ہے کا بھاؤ گر گیا ہے''؟ وہ جو کچھ سٹاک (Stock) کر کے رکھا ہے: اندر غلہ ہے، کاغذ ہے، سونا ہے۔ کہیں پتہ چلا ہے کہ امریکہ میں بھاؤ گر گیا ہے، یہاں ان کا دل ڈوب رہا ہے۔

زندگی کا نصب العین جب مادی قرار پا جائے تو پھر یہی حال ہوتا ہے

ان چیزوں کے اندر اضافہ ہوتے چلے جانا' ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ یہ ان کی ضرورت (Need) نہیں تھی، ضرورت کی تو اپنی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے بڑے بڑے دولت مند جب اس ہوس کے اندر اس قدر زیادہ ہوتے جاتے ہیں تو پاگل ہو جاتے ہیں' ان کا معدہ ہی جواب دے جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ روٹی (Loaf) کے پیچھے جو اس کا چھلکا سا ہوتا ہے، وہ اسے یونہی پانی میں ڈبو کے کھا رہے ہیں۔ کچھ ہضم ہی نہیں ہو رہا۔ اس لیے کہ ان کی ساری توانائیاں تو ہر وقت اس جال کے اندر صرف ہو رہی ہیں۔ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ (17:83)۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ جب یہ چیزیں مل جاتی ہیں تو اس کے بعد کہاں کی اقدار' کہاں کے اصول' کہاں کے قوانینِ خداوندی' کہاں کی شرافت' کہاں کی مروت! اَعْـرَضَ وہ ہر ایک سے گریز کرتا ہے، پہلو تہی کرتا ہے، پیٹھ موڑ کے چل دیتا ہے۔ یہاں قرآن نے اس چیز کو اسی لیے مضمر رکھا ہے، تفصیل نہیں بتائی کہ کس چیز سے اعراض برتتا ہے: ہر وہ چیز جسے آپ باعثِ شرفِ انسانیت کہہ دیتے ہیں وہ اس سے اعراض برتتا ہے' اور پھر اپنے آپ کو باقی معاشرے سے مستغنی سمجھتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُسًا (17:83)۔ ذرا سا کہیں گھاٹا آ جاتا ہے، ہارٹ (Heart) فیل ہو جاتا ہے۔ یہ جو آپ ہارٹ فیل ہونے کی داستانیں سنتے ہیں' وہ یہی کچھ ہوتا ہے۔ بھوکوں کے ہارٹ فیل نہیں ہوتے۔ بھوک سے تو کبھی کسی کا ہارٹ ہی فیل نہیں ہوتا۔ دھکا یہ لگتا ہے کہ''جی! بھاؤ گر گیا''۔ کروڑوں روپے جمع ہیں۔ بھاؤ ''گر گیا'' ایک دم سے وہ بھاؤ نہیں گرتا' اس کا قلب گرتا ہے۔ ہارٹ فیل ہو رہا ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُسًا (17:83)۔ جب ان سے مال و دولت چھن جاتا ہے' ان پر مایوسیاں چھا جاتی ہیں' ان کی کیفت یہ ہے۔ یہ کیوں ہے؟ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں بھی ہے۔ لیکن اس کے اندر آنے والے ایک لفظ مشاکلت کے غلط معنوں نے ایک الجھن پیدا کر رکھی ہے۔

ہمارے ہاں مشاکلت کے لفظ کا غلط استعمال

عزیزانِ من! پھر یہاں وہی بات آ جائے گی، جس کے غلط مفہوم یا ترجمے نے بالکل قرآن کے خلاف ایک چیز پیش کر دی ہوئی

ہے اور بڑی عظیم چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84)۔ عام ترجمہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز اپنی اپنی ''مشاکلت'' کی رو سے کام کرتی ہے۔ تمہارا خدا جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے۔ مشاکلت ایک لفظ ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''فطرت'' ہو گیا ہے ''طینت'' ہو گیا ''طبیعت'' ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے کسی سے کچھ بات ہی نہ کہو، ہر شخص اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی طبیعت کے مطابق کام کرتا ہے۔ میاں ٹھیک ہے: یہ رام بھی وہی اور رحیم بھی وہی ہے۔ مشاکلت کا ترجمہ فطرت کر کے انہوں نے آدمی کو 'انسان کو' بااختیار سے مجبور بنا دیا۔ ''طبیعت'' یعنی وہ چیز جس پہ آدمی کا اپنا اختیار نہیں، یہ تو بنی ہوئی چیزیں آتی ہیں۔ بڑا گرم مزاج واقع ہوا ہے۔ ''واقع ہوا'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے یہ مزاج خود نہیں بنایا، اس نے وہ مزاج پایا ہی ایسا ہے۔ کیا کیا جائے؟ یہ وہی ہے جسے ''طبیعت'' کہتے ہیں۔

نیکی علم کا نام ہے

''نیکی علم کا نام ہے''۔ بڑی عجیب غلط چیز ہے جو یہ شخص کہہ گیا ہے۔ یہاں اس نے خود ہی تردید کی ہے۔ مشہور و معروف یونانی فلاسفر سقراط (Socrates: C.469-399 B.C) نے کہا تھا کہ ''نیکی علم کا نام ہے۔'' کہا تھا کہ اگر کسی چیز کے متعلق علم ہو، معلوم ہو تو انسان بدی نہیں کرتا۔ یہ اس کا غلط نظریہ تھا۔ معلوم ہونے کا تعلق دماغ سے ہے۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ معلوم ہو کہ شراب نقصان دہ ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے لیکن صرف یہ جو علم ہے، یہ اس چیز کے لیے کافی نہیں کہ انسان اس سے اجتناب بھی کرے۔ آج کسے معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، تباہ کن ہے۔ یہی نشہ آور چیزوں کو لیجیے۔ اسی شراب کو لیجیے۔ میں تو طبعی چیزوں کی بات کر رہا ہوں۔ کسے علم نہیں ہے کہ یہ نشہ آور چیزیں بڑی نقصان دہ ہیں۔ کسی کی بات نہیں بلکہ اس نے [1] تو خود ہی اپنے آپ کو یہ کہہ کے الگ کر لیا کہ ''جانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔'' تو پھر آپ کیوں نہیں رکتے؟ کہ ''جی! طبیعت ادھر نہیں آتی۔''

''طبیعت ادھر نہیں آتی'': مشاکلت کا مفہوم

چل بھئی! یہ ہمارے ہاں کے جتنے شاعر ہیں، یہ سارے کے سارے اس میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ''طبیعت ادھر نہیں آتی'' اور جو طبیعت ہے یہ اپنی بنائی ہوئی نہیں ہوتی۔ کیا کیا جائے؟ طبیعت ادھر نہیں آتی۔ معاملہ ختم ہو گیا صاحب! مشاکلت کے معنی کہیں فطرت، کہیں طبیعت، کہیں طینت کیا۔ کہا کہ بدطینت واقع ہوا ہے، نیک طینت واقع ہوا ہے۔ یعنی اس میں اس کا اپنا کوئی دخل نہیں، حالانکہ قرآن بات بڑی عجیب کہہ گیا ہے۔ پھر وہی باتیں آ جاتی ہیں۔ میں تو جب عرب قوم کی اس چیز پہ آتا ہوں کہ انہوں نے یہ زبان کیسے بنائی تھی تو میں نے کہا ہے کہ مجھے تو لغت [2] مرتب کرنے کے عمل نے اس قوم کا گرویدہ کر دیا ہے کہ ایک ایک لفظ، اس کے ایک ایک مادے پر مجھے دنوں مہینوں غور کرنا پڑا کہ یہ بات کیسے آ گئی۔ اب میں یہ بتاؤں کہ یہ بات انہیں کہاں سے ملی۔

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869): جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی [2] لغات القرآن

Marfat.com

یہ لفظ ہے مشاکلت۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میدان میں گھاس واس بہت ہوتی ہے تو عام طور پہ اس میں گھوڑے باندھ دیتے ہیں۔ وہ ایک رسی لے کے گھوڑے کے پاؤں میں باندھتے ہیں۔ کہیں ایک کیلا ٹھوک دیتے ہیں اور اسی رسی کا دوسرا سرا اس کیلے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ اب وہ رسی جتنی لمبی ہوتی ہے' وہ گھوڑا اسی دائرے کے اندر چلتا ہے۔ اسے انگریزی میں Tether کہتے ہیں۔ یہ جو گھوڑے کو اس ایک رسی سے باندھ دیتے ہیں' جس کا دوسرا سرا (End) اس کیلے سے' کھونٹے سے بندھا ہوتا ہے' اس گھوڑے کے چلنے سے جو ایک امکانی دائرہ بنتا ہے' یہ لوگ اسے ''مشاکلت'' کہتے تھے۔ یہ بڑی عجیب چیز تھی جو انہوں نے کہہ دی۔ پھر وہی بات کہ اس لفظ کا مادہ (Root) ''ش ک ل'' ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ اس سے ''شکل'' کا لفظ بنتا ہے تو آپ حیران ہونگے کہ وہ وہاں سے یہ بات کیسے لے آئے۔ اس کو کیسے مشاکلت کہا؟

عربوں نے مشاکلت کا یہ لفظ کیسے بنایا؟

عزیزانِ من! یہ بالکل اَن پڑھ قوم تھی۔ تہذیب وتمدن تو ایک طرف رہا' ابھی اس قوم میں لکھنا پڑھنا تک نہیں آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں مکہ' جو ان کے ہاں کا مرکزی شہر تھا' اس میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ کیا قوم تھی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ان کا ابن الحکمت کہاں سے آ گیا تھا۔ ارسطو (Aristotle: 384BC-322 BC) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ مانا جاتا ہے کہ اس نے شے کی Definition کی تھی کہ ''کوئی شے تصور (Concept) سے بنتی ہے۔ پھر وہ تصور' فارم (Form) اختیار کر لیتا ہے' ایک شکل اختیار کرتا ہے۔ اصل چیز فارم (Form) بنی' یہ شکل ہے اور شکل کے معنی ہوتا ہے کسی حدود کے اندر آ جانا۔'' آپ دیکھتے ہیں ڈرائینگ کے اندر کسی بچے نے بھی لائن یوں کر کے کھینچی تو طوطا بن گیا۔ صاحب! یہ صرف لائنیں ہوتی ہیں۔ ان میں یوں کیا تو انہوں نے بکری بنا دی۔ تو لائنوں کو بدلتے چلے جاتے ہیں' حدود کو بدلتے جاتے ہیں' مختلف شکلیں اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ''فارم (Form) اصل چیز ہے۔'' یہ جو لائنیں کھینچتے ہیں' ان کو بڑی اہمیت ہے۔ ان کے ہاں بھی جو شکل تھی' یہ اَن پڑھ قوم اس پہ غور کر رہی ہے: شکل کیسے بنتی ہے اور وہ بنتی ہے حد بندی سے۔ جہاں جہاں بھی کسی چیز کی انہوں نے حد بندی تھی' اس مادے (Root) ''ش ک ل'' سے الفاظ بنائے۔ اسی سے ''مشاکلت'' بنا۔ اس فارم نے بھی اس کی حد بندی کر دی: کہاں شکل اور فارم؟ کہاں وہ گھوڑے یا اونٹ کی وہ رسی؟ لیکن چونکہ حد بندی کا بنیادی روٹ (Root) اس کے اندر موجود ہے' اس لیے انہوں نے اس کو ''مشاکلت'' سے تعبیر کیا۔ عزیزانِ من! اور قرآن کا اعجاز ہے۔ دنیا کی یہی زبان تھی عزیزانِ من! جو قرآن کے حقائق کی متحمل ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک بھی جو دنیا کی زبانیں ہیں' کسی زبان میں بھی قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عربوں کی بنائی ہوئی زبان اور خدا کا کیا ہوا انتخاب' کیسا عمدہ ہے! اور کیسا عمدہ ہے مشاکلت! سوال یہ پیدا ہو گیا کہ گھوڑے کو رسی تو ہم نے باندھی ہوئی ہوتی ہے' حد بندی ہو گئی۔ اسی دائرے کے

Marfat.com

اندر وہ چر سکتا ہے۔ یعنی اس کا میدانِ عمل محدود ہو گیا' یوں کہہ لیجیے۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہو گئے کہ یہ میدانِ عمل خود خدا نے محدود کر دیا ہے؟ قرآن پاک نے عَلٰی شَاكِلَتِهٖ (17:84) کہا ہے۔

انسان خود ہی اپنے پاؤں کو مختلف رسیوں کے ساتھ باندھ لیتا ہے

قرآن نے کہا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لیے خود پاؤں میں کچھ رسیاں باندھ لیتا ہے اور خود ہی اپنے "اختیار" پہ "جبر" کا پہلو غالب کر لیتا ہے اور پھر کہتا ہے: "میں کیا کروں صاحب! میری تو رسی ہی اتنی بڑی ہے"۔ اللہ اکبر' سارا راز اس میں ہے عزیزانِ من! یہ جو ہم نے اپنے پاؤں میں آپ رسیاں باندھی ہوئی ہوتی ہیں' بڑی غور و فکر کی چیزیں ہیں۔ افراد' کچھ اپنی ہی باندھی ہوئی رسیوں میں گرفتار ہیں۔ یہ ان کی اپنی رغبتیں' اپنی خواہشیں' اپنی آرزوئیں' اپنے مقاصد' اپنے انفرادی مفادات ہیں۔ ذرا اس سے آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی رسیاں بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو باندھ رکھا ہوتا ہے۔ ان کا جو منشاء اور یا للعجب جو مفاد ہوتا ہے اس کے مطابق اس "گھوڑے" کے پاؤں میں رسی باندھتے ہیں۔ ہم آگے بڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ غلط مذہب کی دنیا آتی ہے' اس کی مشاکلت! اُف وہ معاشرے میں تو زیادہ سے زیادہ رسی ہی باندھتے ہیں لیکن یہ مذہب تو زنجیریں باندھتے ہیں۔ یہ ہے مشاکلت۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں' یہ حدیں' تیرے لیے فائدہ مند ہیں اور وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہیں۔ ان نقصان رساں حدوں کی وضاحت خود کر دی اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ جس کا جی چاہے اِس کو اختیار کرے' جس کا جی چاہے اُس کو اختیار نہ کرے۔ جہاں تک اس کا جی چاہتا ہے' وہ کرتا چلا جائے۔ اس عمل کرنے کے میدان کو ہم نے وسیع کر کے رکھ دیا ہے۔ اب وہ جہاں تک اپنی رسی کو چاہتا ہے' اپنے پاؤں میں آپ باندھتا رہتا ہے اور پھر خود ہی اس کا ذمہ دار (Accountable) بنتا ہے۔

حدود اللہ کا مقصد تو انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے

باقی رہا یہ کہ یہ جو خدا نے حدود یا حد بندیاں کی ہیں' ان کے متعلق بھی یہی کہا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286)۔ ہم جو کسی کو یہ کہتے ہیں کہ "یہ کرو اور اس سے آگے نہ بڑھو" تو یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس سے اس کے عمل کی وسعتیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ میں وہ مثال دیا کرتا ہوں کہ جب نہر میں سست رفتاری پیدا ہو جاتی ہے' تیزی سے نہیں چلتی تو اس کے راستے میں پتھروں کی ایک ٹھوکر بنا دیتے ہیں۔ وہ ٹھوکر (Fall) اس نہر کا راستہ روکنے کے لیے نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی روانی میں' اس کی رفتار میں اور تیزی پیدا کر دے۔ یہ نہریں' یہ ندیاں' سمندر تک اس طرح سے پہنچتی ہیں کہ راستے میں یہ ٹھوکریں لگائی جاتی ہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286)۔ ہم نے جو انسان کی ندی کے راستے میں' جگہ جگہ کچھ تھوڑی سی' جائز و ناجائز کی' حرام و حلال کی

حد بندیوں کی ٹھوکریں لگائی ہیں تو یہ اس لیے ہیں کہ ہر ٹھوکر سے اس کی امکانی وسعتیں اور زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی مشاکلت کی رسی اور بڑھ جاتی ہے صاحب! نبی اکرمؐ کا ہے کے لیے تشریف لائے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157)۔ کیا منصب نبوت؟ عزیزانِ من! یہی منصب ہے۔ جس کی بناء پہ حضورؐ رحمت للعالمین قرار پائے ہیں۔ کیا کہا ہے حضورؐ نے چار لفظوں میں؟ کہا کہ وہ جو بڑی بڑی بوجھل سلیں جو انسانوں نے اپنے سر پر خود ہی رکھی تھیں اور نیچے بیٹھ گئے کانپ رہے تھے کہ صاحب! رو رہے ہیں اٹھانہیں جا سکتا اتنی بوجھل چیزیں۔ کہا: یہ رسول ﷺ انسانیت کو حریت کا سبق دینے کے لیے آئے اس نے ان تمام سلوں کو اٹھا کر پھینک دیا صاحب! وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157)۔ اور انہوں نے جو اپنے اپنے پاؤں میں اس قسم کی مشاکلت کی رسیاں خود ہی باندھ رکھی تھیں اس رسول نے انہیں کاٹ کے پھینک دیا۔ یہ ہے عزیزانِ من! رسالت کا مرتبہ! بعض خدا کی متعین کی ہوئی حدود باقی رہیں اور وہ اسی لیے رکھی گئیں کہ اس کی سعی و عمل کی رفتار اور تیز ہو جائے اور باقی ساری رسیاں کاٹ دیں باقی ساری سلیں اٹھا کے پھینک دیں صاحب! حریتِ انسانیت کا سبق دینے کے لیے قرآن آیا تھا اور آپ دیکھیے قرآنِ کریم میں میں نے کہا ہے کہ یہ رسیاں تو خدا نے خود تجویز کر کے پاؤں میں نہیں ڈال دی تھیں۔

دیکھیے سورۃ مدثر 74 ایک دفعہ تو ہم ان سورتوں سے گذر چکے ہوئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جلدی جلدی یہ سامنے آ جائیں۔ قرآن کے آخری پارے کی یہ سورتیں تو پوچھو نہیں کیا ہیں! نچوڑ ہیں ساری تعلیم کا۔ بہر حال یہ کہا ہے: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37)۔ یہ سب اس لیے ہے کہ "تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔" کیا بات ہے! لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ (74:37)۔ مشیت انسان کی کام کر رہی ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں کھلا ہوا میدان دیدیا ہے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37)۔ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جتنا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پھسڈی رہے پیچھے رہ جائے۔ بھئی یہ کس طرح سے ہوگا؟

ہر انسان اپنے اعمال کے ہاتھوں آپ گروی ہوتا ہے

سنیے عزیزانِ من! اگلے چار لفظ ہیں: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے ہاتھوں اپنے آپ کو گروی دار کر دیتا ہے گروی (Mortgate) رکھ لیتا ہے ہر شخص اپنے ہی اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے۔ کیا لفظ ہے صاحب! رهين: اپنے آپ کو گروی (Mortgage) رکھ دیتا ہے۔ گروی رکھ دینے کی یہ بدترین شکل ہوتی ہے یعنی ویسے ہی بیچ دیا جائے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ رہن رکھی ہوئی چیز ملکیت تو اسی کی ہوتی ہے قبضہ وغیرہ اس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا اختیار کچھ نہیں ہوتا۔ ملکیت بدستور موجود ہے ملکیت تو رہے گی مگر اس پر اپنا اختیار و اقتدار نہیں رہے گا۔ اختیار اس کو کوئی نہیں ہے: "رھینۃ"

Marfat.com

عزیزانِ من! اس سے تو اچھا تھا: بک جاتا مگر یہ تو اپنے اعمال کے عوض اپنے آپ کو گروی رکھتا ہے۔ اگر بک جاتا تو ''سیاپا تے مکدا''[1] قصہ ختم ہو جائے گا، مگر نہیں، ہرگز نہیں۔ ملکیت تو رہے گی مگر اس پر اپنا اختیار و اقتدار نہیں رہے گا۔

رہن رکھا مال تو بک نہیں سکتا

بکتا نہیں ہے، اپنے آپ کو رہن رکھتا ہے۔ اپنے آپ کو اپنے اعمال کے عوض گروی رکھتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ گروی رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں تو میں سمجھتا ہوں کہ فارسی والوں نے یہ بہت اچھا لفظ لیا ہے۔ آپ نے کبھی غور بھی فرمایا ہوگا گروی کا لفظ تو ہمارے ہاں روزانہ استعمال ہوتا ہے۔ گروی تو کسی چیز کا گرویدار ہونے کو کہتے ہیں، اور گرویدار تو آپ سمجھے ہیں کہ گرویدہ ہو گیا یعنی ''میں تو اسی کا ہو گیا''۔ گرویدہ ہو گیا۔ انتہائی رغبت کو کہتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو گرویدہ کیسے کر لیتا ہے؟ کوئی مطلب، کوئی مقصد، کوئی خواہش، کوئی آرزو، اتنی شدت اختیار کر جائے کہ ہم کہیں کہ وہ اس کا گرویدہ ہو گیا ہے صاحب! اس نے اپنے آپ کو گروی رکھ دیا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ اپنے آپ کا آپ مالک ہے، لیکن آپ مالک نہیں ہوتا۔ انہوں نے بھی یہ گرویدہ سے گروی کا لفظ بہت اچھا رکھا ہے۔ قرآن ہی سے لیا ہے: رهینۃ اس کے ہاں رہن کا لفظ ہے۔ کن چیزوں سے یہ رسیاں کھینچی ہوتی ہیں؟ جن چیزوں کی رغبت، جن چیزوں کی خواہش اور آرزو شدت سے آپ پیدا کر لیں یعنی یہ اپنے جو مفادات ہیں، ان کی وجہ سے جتنے شدید ہوتے چلے جائیں گے انسان اپنے آپ کو ان کے پاس رہن رکھتا چلا جائے گا۔ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ اب کوئی دوسرا تو چھڑا نہیں سکتا۔ رہن رکھے ہوئے مال کے پیسے تو آپ کو ہی ادا کرنے پڑیں گے، اور جتنا لمبا عرصہ ہوتا چلا جائے، سود بڑھتا چلا جائے گا عزیزانِ من! یہ ہے مشاکلت: بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ اپنے آپ کو رہن رکھ دینا، کسی نے سو روپے میں رہن رکھ دیا، کسی نے ہزار روپے میں رکھ دیا، کسی نے دس ہزار میں رکھ دیا۔ یہ تو ساری بات، ساری اس رقم کی ہوئی۔ رہن اور گروی کر دینا تو یکساں ہوتا ہے۔

بظاہر مالک خود ہیں لیکن قبضہ دوسرے کا ہے

سوچیے عزیزانِ من! ہم نے اپنے آپ کو کس کس شکل میں گروی رکھا ہوا ہے۔ کسی نے کتنے پہ رکھا ہوا ہے، کسی نے کتنے پہ۔ آج ہر شخص ہم میں سے گروی ہے۔ بظاہر ہم مالک ہیں لیکن قبضہ کسی اور کا ہے۔ اس کے تابع ہم چلنے پہ مجبور ہو رہے ہوتے ہیں۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ ہر شخص اپنے ہی اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے اور انہی کی وجہ سے اس پر مصیبت آتی ہے۔ انہی اعمال کے ہاتھوں گروی رہتا ہے۔ اسی طرح غلط کار الگ بھی مصیبتوں میں گرفتار۔

---

[1] مصیبت تو ٹلتی، معاملہ تو ختم ہو جاتا ہے، جان تو چھوٹ جاتی۔

سعی و عمل کے میدان کو انسان خود وسیع کرتا ہے

سعی و عمل کے میدان کو انسان خود وسیع کرتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی یہ عرض کیا کہ رسول اللہؐ کی بعثت اور ان کے توسط سے قرآن کا نزول تو ہوا ہی اسی لیے تھا کہ انسان حریت کے راستے میں ڈلی ہوئی زنجیریں کاٹ کے پھینک دے۔ اس طرح اس بعثت رسول اللہ نے تو آزاد کر دیا لیکن قرآن نے مختلف مقامات پہ جحیم کی بات بھی کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس لفظ جحیم کے مادے میں ''روک'' کا مفہوم و معنی ہیں۔ یہ لفظ ''ج ح م'' سے ہے۔ اس کے معنی روک ہوتی ہے' رُک جانا ہوتا ہے۔ یہ جو رکاوٹیں ہم اپنے راستے کے اندر کھڑی کر لیتے ہیں' یہ ہم انفرادی طور پہ کرتے ہیں' یا غلط معاشرہ' غلط نظام آپ کے راستے میں کھڑی کر دیتا ہے' کچھ بھی ہو' یہ جو آپ کے لیے آگے بڑھنے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں' وہ جحیم ہے عزیزانِ من! اب اس کے مقابلے میں دوسری چیز ''جنت'' آنی چاہیے۔ اس میں کیا کیفیت ہوتی ہے۔ سورۃ المطففین (83) کی آیات 22 تا 28 اس کی غماز ہیں۔ جن کی آگے بڑھنے کے راستے میں کھڑی رکاوٹیں نکل جائیں گی وہ ''ابرار'' ہوں گے' بڑی وسعتوں کے مالک' زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے بہرہ یاب' طمانیتوں کی پیدا کردہ شگفتگی و شادابی چہروں سے ہویدا' اختیارات و اقتدارات کے تختوں پر متمکن۔ انہیں زندگی کی توانائیوں کے لیے بادۂ خالص ملے گا۔ وہ اپنے اندر صفات خداوندی کو (علی حدِ بشریت) منعکس کریں گے۔ ان کے لیے بادۂ رحیق ہوگا۔ یہ بادۂ رحیق ہے جسے عام زبان میں شراب ہی کہتے ہیں۔ بہر حال یہ تو ہمارے ہاں کی شراب ہے۔ عربوں کے ہاں تو ہر پینے والی چیز ہوگی۔ اپنی زبان میں اس کو شراب کہا جائے گا۔ لفظ مشروبات (Refreshments) کو تو ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں معنی پینے والی چیز کے ہوتے ہیں۔ لیکن اب تو شراب اصطلاحی لفظ بن گیا ہے۔ اب یہ اسی کے لیے ہے جسے ہم شراب یا وائن (Wine) کہتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں یہ صرف اِس شراب یا وائن (Wine) کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔

عربی میں ہر اس چیز کو' جو پینے کے لیے ہو' شراب کہتے ہیں

یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس میں پینے والی وہ چیزیں ہونگی جن سے تقویت ملے گی ''نشہ'' ہوگا۔ لیکن یہ چیز وہ نشہ آور ہونا نہیں ہے جس سے انسان کی رہی سہی توانائیاں' حرکت' قوتِ عمل' بھی مغلوب ہو جاتی ہے: ''بیٹھے ہوئے ہیں منہ اٹھا کے''۔ اگر ایسا نہیں تو کوئی دوسری چیز کھائی جاتی ہے جس سے وہ کیفیت پیدا کی جاتی ہے: ''جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن''۔ اسی نشے میں کہتا ہے کہ بہت فرصت چاہتا ہے کوئی بڑے کام کرنے کے ہونگے' ہاں! فرصت کہ رات دن کوئی اور کام نہ ہو۔ فرصت کے رات دن؟ کہ بھئی وہ کاہے کے لیے؟ کیا کرو گے؟ ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''۔ [1] فرصت کے رات دن ''افیم کھان واسطے چھید ے ہیگے نیں'' [2] کہا کہ یہ نہیں۔ اس میں تقویت بخش مرکب ہیں۔ یہ وہ نشہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی ہوتی ہے جسے ہم مشک

---

[1] دیوان غالب میں یہ شعر یوں نقل ہوا ہے: جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

[2] وہ فرصت کے رات دن جو کہ افیون (Opium) کھانے کے لیے چاہیے ہیں۔

Marfat.com

کہتے ہیں' جس کے متعلق طبیب آپ کو بتائیں گے کہ یہ دورانِ خون میں انتہائی تیزی پیدا کرنے کے لیے' عمل کی قوتوں میں زیادہ گردشیں پیدا کرنے کے لیے ہے۔ ہمارے ہاں طب میں ایک جزوِاعظم ہوتا ہے' یہ طبیب اسے مشک کہتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ نے سنا ہوگا کہ کمبخت یہ بڑی تیز چیز ہوتی ہے۔ آج تو آپ کے ہاں اس کا سوال ہی نہیں ہے ''ہن تے تہانوں ہر چیز وچ مُشک آندی ہیگی اے۔'' اب تو گھوڑے کی لید کو مشک کہتے ہیں'' ❶ لیکن جس زمانے میں کہیں سے یہ مشکِ خالص مل جاتی تھی' مجھے اس کا تجربہ ہے' ذرا سی مشک شیشی کے اندر ڈال کے جیب میں رکھی' تھوڑے عرصے کے بعد ناک سے خون آنا شروع ہوگیا۔ یہ ایسی تیز تھی۔ یہ چیز ان عربوں کے ہاں حرکت میں تیزی لانے والی' زیادہ متحرک کرنے والی اور زیادہ سرگرمِ عمل کرنے والی سمبل (Symbol) ہے۔ قرآن نے کہا کہ جحیم تو روک ہے۔ یہ مضمحل کرنے والی چیز اور پھنسا دینے والی چیز ہے۔ یاد رکھیے' جنت اور جہنم کے سلسلے میں یہ سارے بیانات تمثیلی ہیں۔ وہ سچ مچ پیالے میں کچھ نہیں ڈالا ہوا ہوتا لیکن تمثیلات کے درجے میں قرآنِ کریم اس پینے والی چیز کو کہتا ہے کہ **خِتٰمُهٗ مِسْكٌ** (83:26)۔ اس کے اندر کیا چیز ہوگی' اسے تو چھوڑ دیجیے۔ بادۂ رحیق کو جو ہم نے مشک سے سربند (Seal) کیا ہے۔ اس میں کیا چیز ہے؟ **وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ** (83:26)۔ اس میں وہ شے ہے' جس سے جو جتنا آگے جانا چاہے' جاتا جائے' چلتا جائے' بڑھتا چلا جائے۔ یہ جنت کی تمثیلی کیفیت ہے۔ تو مشاکلت خدا کی باندھی ہوئی کوئی رسی ہے۔ **وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ** (83:26)۔ اسمیں زندگی اور توانائی کو بڑھانے کے اسباب وعناصر ہیں جن کے حصول کے لیے تمہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جنت کی تشبیہات کی اہمیت

اور آگے ہی بڑھنا نہیں' ان آبگینوں کی مہریں (Seals) بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہوں گی۔ **وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ** (83:27)۔ ایک تو یہ کہ اسے سلسبیل کہا ہے بلکہ یہاں بھی اگر آپ آئیں گے تو بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ ایک تو یہ کہ اس میں مزاج کافور کا ہو اور دوسرا مزاج یہ کہ اس میں حرکت لانے والی چیز ہے جسے طبیبوں کے ہاں زنجبیل اور طب میں ادرک کہتے ہیں۔ یہ زنجبیل بڑی حرکت لانے والی چیز ہوتی ہے۔ دورانِ خون کو کم سے کم تر کرنے والی چیز ان کے ہاں کافور ہوتا ہے اور حرکت لانے والی چیز زنجبیل ہوتی تھی۔ اب بھی معجونِ زنجبیل ہوتی ہے۔ طب میں جوارش تیز کرنے والی ہوتی ہے اس سے آگے مشک والی بات ہوتی تھی۔ سلسبیل ہوتی ہے' جس میں ہموار راستوں کے اندر روانی کا سوال ہوتا ہے' برادرانِ عزیز! قرآن کی یہ اصطلاحیں یا جنت کی تشبیہات نیک اعمال ہیں۔ یہ انسان کے دوسروں کی کمیوں کو پورا کرنے والے کام' انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ حسنات ہیں۔ دراصل یہ

---

❶ ۔اب تو آپ کو ہر چیز میں مشک یعنی بدبو آتی ہے' یہاں تک کہ اب گھوڑے کی لید کو بھی مشک کہنے لگے ہیں۔

Marfat.com

اُس سلسبیل کی مانند ایک ندی ہے' دروازوں کے آگے سے گذرنے والی ایک جوئے رواں ہے' جو پکارتی' راستہ کاٹتی ہوئی' پوچھتی چلی جائے:" بھئی! پانی دی کنوں لوڑ ہیگی اے لے لو"① پوچھتی ہے' دروازوں سے گذرتی ہوئی' آوازیں دیتی جائے گی کہ " لے لو جس کو جتنی ضرورت ہے۔" لیکن یہ تو پھر بھی ہموار راستے پہ چلنے کی بات ہے۔ کہا: مِزَاجُهٗ تَسْنِيْمٍ (83:27)۔ یہ جو پہاڑوں سے گرنے والی' یہ جو بلندیوں سے آنے والی چیز ہوتی ہے' اُسے تسنیم کہا جاتا ہے۔ دیکھیے اس میں رفتار کی تیزی ہوتی ہے اور ارتقاء اور بلندیوں کی طرف لیجانے والا رخ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے خدا کو رب ذِی الْمَعَارِجِ (70:3) کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا' نشوونما دینے والا۔ نشوونما صرف صحن کے اندر ہی نہیں دیتا' وہ ہر حال میں دیتا ہے۔ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26)۔ جس نے آگے بڑھنا ہے' بڑھتا چلا جائے اور دوسری جگہ (5:48) میں اس کو مسابقت بھی کہا ہے۔ احتیاطاً باتیں سامنے آ رہی ہیں' لکھتے چلے جائیے۔

يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (23:51)۔ طیبات کرو' عملِ صالح کرو۔ اس سے کیا ہوگا۔ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (23:61)۔ اس سے یہ ہوگا کہ خیرات اور عطیات سے تمہارے اختیارات میں مزید وسعتیں آتی چلی جائیں گی۔ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ (23:61)۔ اور اس میں سبقت کرتے چلے جاؤ گے' بڑھتے چلے جاؤ گے۔ لہٰذا انسان کے لیے میدانِ عمل کھلا چھوڑ دیا عزیزانِ من! اس نے رکاوٹوں کی رسیاں کاٹ کے رکھ دیں۔ قرآن نے یہ چیزیں نشوونما کے لیے دیں۔ وہ اس لیے دیں کہ بڑھتے چلے جاؤ۔ جس نے جہاں تک بڑھنا ہے' وہ وہاں تک بڑھتا چلا جائے اور جس کا جی چاہے' اپنے پاؤں میں آپ مشاکلت ڈالتا چلا جائے۔ سوال تو یہ ہے کہ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (17:84)۔ انسان نے اپنے پاؤں میں جو زنجیریں پہن رکھی ہیں' یہ انہی کا گرویدہ ہو کے رہ جاتا ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84)۔ پھر ہم جانتے ہیں کہ کون کس راستے پر چل رہا ہے۔ جبکہ انسان تیز رفتاری کے ساتھ منزل تک پہنچنے کے لیے غلط راستے پر بھی تو چلتا رہتا ہے۔ راستے کا صحیح ہونا بھی تو ضروری ہے۔ یہ راستے کی صحت ہی تو سبیل کہلاتی ہے۔

غلط راستے پر چلنے کے لیے انسان بڑا تیز واقع ہوا ہے

اپنے اپنے اختیارات کے مطابق سب چلتے ہیں۔ یہ تو علمِ خداوندی' قانونِ خداوندی ہے' جو جانتا ہے کہ چلنے والا' صحیح راستے پہ بھی چل رہا ہے یا غلط راستے پہ چل رہا ہے۔ باطل کے معاشرے کے اندر حرکت تو بہت ہوتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ پاگل ہوئے ہوئے پھرتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ "صحیح راستے پر گامزن ہیں یا غلط راستے کے اوپر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔" غلط راستے پہ جتنی تیزی سے دوڑے گا' اتنا ہی زیادہ منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84)۔

---

① او بھائیو! جنہیں پانی کی ضرورت ہے' وہ لے لیں۔

Marfat.com

اس کا علم خدا کو ہوتا ہے کہ ان میں سے کون زندگی کی سب سے زیادہ سیدھی راہ پر چل رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ قوانین خداوندی پر چلتے ہیں، وہ زندگی کی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں اور یہ جو قرآن ہے، یہ جو ہدایت کا راستہ ہے، یہ وحی کے ذریعے ملا ہے۔ یہاں وحی کی بات آ گئی، قرآن کی بات آ گئی۔ ذہن میں فوراً سوال پیدا ہوا کہ وحی کی حقیقت کیا ہے؟

ہمارے ہاں روح کا عام تصور

وحی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (17:85)۔ ہمارے ہاں اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے روح کی بابت پوچھتے ہیں۔ اور پھر ہمارے ہاں روح کا تصور تو یہ ہے کہ روح انسان کے اندر ہے۔ یہ ہر ایک کہتا ہے اور یہاں اس کا یہی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے یہ معنی کیے جاتے ہیں کہ یہ تم سے روح کی بابت پوچھتے ہیں۔ لہٰذا بظاہر اس میں دکھائی یہ دیتا ہے کہ یہاں آیات میں کوئی باہمی ربط نہیں رہا، کیونکہ یہاں باتیں تو قرآن میں وحی کی ہو رہی تھیں، راستے کی ہو رہی تھیں اور اس میں چلتے چلتے یہ روح کی بابت پوچھنے کا کہاں سے آ گیا۔ لیکن ایسا تو ہے نہیں کہ ''جیدا جی چاہے جو مرضی پوچھ لیا اے، توں ایدی گل کر۔'' ❶ نہیں بات یہ ہے ہی نہیں۔

روح کا مروجہ تصور یونان کا دیا ہوا ہے، قرآن کا نہیں

جسے ہم روح کہتے ہیں، جس کا انگریزی میں ترجمہ Soul ہوتا ہے، جس کو انگریزی میں Spirit بھی کہتے ہیں، یہ سارے ان لوگوں کے یونانی تصورات تھے، قرآنِ کریم تو جو تصوراتِ روح ان لوگوں نے پیدا کئے تھے ان میں روح سے گفتگو ہی نہیں کرتا۔ اس کے لیے تو اس نے اپنے ہاں ایک لفظ ''نفس'' استعمال کیا ہے، جسے آپ ذات کہتے ہیں، شخصیت کہتے ہیں، Self کہتے ہیں، Personality کہتے ہیں، روح کا مروجہ تصور غیر قرآنی ہے۔

روح کے لیے خودی کی اصطلاح درست نہیں، اصل مفہوم نفس ہے یا انسانی ذات یا پھر وحی ہے

آج کی اصطلاح میں اقبالؒ (1877-1938) نے خودی کہا ہے۔ عام طور پہ یہ خودی Personality کہی جاتی تھی۔ یہ بڑا غلط تصور ہے۔ اس کے لیے تو قرآن کے ہاں ''نفس'' کا لفظ ہے، جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جو جسم کے ساتھ فنا نہیں ہوتی، مرتی نہیں، آگے جاتی ہے۔ روح کے مروجہ تصور سے تو پھر درمیان میں کئی ایک افسانے Fictions آ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں روح کا لفظ وحی کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسکے بنیادی معنی توانائی (Energy) کے ہوتے ہیں۔ یہ اس قسم کی توانائی ہوتی ہے جو حواس کے اندر ہوتی ہے۔

---

❶ جس کا جی چاہا، جو مرضی میں آیا، پوچھ لیا۔ اور کہا کہ اس کی بات کرو۔

Marfat.com

بہرحال‘ اس لفظ کو قرآن حکیم نے اپنے ہاں اصطلاح کے طور پہ‘ وحی کے لیے‘ استعمال کیا ہے کیونکہ وحی سے مقصود یہی ہے جو ہم ابھی تک گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ انسان میں عمل کی قوتوں کو بڑھاتی ہے‘ یہ صحیح راستے پہ لگا دیتی ہے‘ توانائیاں زیادہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے خدا نے اس لفظ کو وحی کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس کے لیے دو ایک ریفرنسز (References) دیکھ لیجیے اور جب تبویب القرآن ❶ چھپ کر آ ئے گی تو اس میں آپ یہ ریفرنسز دیکھیں گے۔ سورۃ النحل کی دوسری آیت ہے۔ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (16:2)۔ یہ خدا ملائکہ کو ''روح'' کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل کرتا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کریں۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے اوپر ملائکہ کے ذریعے جو نازل کرتا تھا وہ وحی تھی۔ اسی طرح سے یہاں تو بات اور بھی واضح ہو گئی ہے۔ (42:52) دیکھیے‘ پیچھے سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ خدا انسانوں میں سے اپنے رسولوں کے ساتھ کلام کرتا تھا‘ وحی دیتا تھا‘ ان کو پیغام پہنچاتا تھا۔ اس کے کیا کیا طریقے تھے؟ کیا انداز تھا؟ میں اس آیت کو چھوڑتا ہوں‘ لمبی بات ہے۔ بات یوں ہے: وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (42:52)۔ اس طرح سے ہم نے اے رسول! تیری طرف وحی کیا ہے اپنی روح کو‘ اپنے امر کے ذریعے سے۔ اگلی آیت میں ہے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (42:52)۔ تو تو اے رسول! اس سے پہلے جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں‘ ایمان کیا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مَیں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ جس کو وحی ملتی تھی اس میں اس کی اپنی سعی و عمل‘ کسب و ہنر‘ محنت و کاوش‘ فکر و خیال‘ کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ ❷ خالص علمِ خداوندی تھا جو اس کے اوپر نازل ہوتا تھا۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہاں روح کے معنی وحی ہیں۔ تو اب اس آیت میں بات ہو رہی ہے کہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ تو قرآن کی بات کر رہا ہے‘ سیدھے راستے کی بات کر رہا ہے‘ تو وحی کی بات ہے کہ ''یہ جو مجھے وحی کے ذریعے سے ملا ہے'' تو وہ وحی کے متعلق پوچھتے ہیں۔

وحی کی ماہیت اور کیفیت وغیرہ کو غیر از نبی جان ہی نہیں سکتا

اب دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وحی کیا ہوتی تھی؟ کیسے ملتی تھی؟ کیفیت کیا تھی؟ ملنے کا طریقہ کیا تھا؟ قرآن نے کہا ہے کہ اس ساری ماہیتِ وحی کی باتوں کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے دو عالم کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو خدا کا وہ عالمِ امر ہے‘ جہاں یہ ساری چیزیں اپنی Direction کے مطابق‘ اس کے پروگرام کے مطابق‘ اس کی پلاننگ کے مطابق‘ طے پاتی ہیں۔ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ہے: یہ کیسے ہوتا ہے‘ کس طرح سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد دوسرا عالمِ خلق ہے۔ یہ ہماری دنیا ہے‘ جس میں اس کے فیصلے

---

❶ یہ کتاب ۳ ضخیم جلدوں میں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

❷ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل‘ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ گلبرگ لاہور‘ 2003ء ص۔ 4 اور 5‘ عنوان: روح کا قرآنی مفہوم‘ قرآن میں انسان کے لیے روح کے بجائے نفس کا لفظ آیا ہے اور قرآن میں روح کا لفظ وحی کے لیے ہے۔

Marfat.com

آتے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ہم ہر چیز کو سمجھتے ہیں کیونکہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31)۔آدم میں صلاحیت دیدی گئی ہے کہ یہ ان کا علم حاصل کرلے۔وحی کی ماہیت یا کیفیت کیا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ یہ کس طرح آتی ہے؟ کہا کہ اس کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور وہ عالمِ امر یہ ہے کہ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (17:85)۔اس کے متعلق تو تمہیں علم نہیں اور یہ جو تمہارا' انسانوں کا اپنا بھی علم ہے' اس میں وحی کی ضرورت اس لیے پیش آجاتی ہے کہ اس کائنات کے متعلق تمہارا علم کتنا ہی وسیع ہو' یہ مستقل اقدار' یہ اصولِ ہدایت' وہ چیزیں ہیں' جن میں انسانی علم بہت ہی قلیل ہے۔یہ خود ان چیزوں کو نہ وضع کرسکتا ہے' نہ خود ان کا کہیں سے انکشاف کرسکتا ہے۔یہ اقدار تو خالص وحی کے ذریعے سے مل سکتی ہیں۔یہ جو تمہارے علم کا کم ہونا ہے' اس کی وجہ سے وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔تو یہ جو ہمارے ہاں آیت ہے۔فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (91:8)۔اس میں عجیب عجیب غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا علم رکھ دیا ہے۔اگر یہ بات ہے تو پھر یہ رسول' یہ نبی' یہ وحی' یہ ساری چیزیں' یہ سب سلسلہ کاہے کے لیے ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ چوزے کے اندر یہ رکھ دیا ہے کہ خشکی کے اندر رہے گا' تو محفوظ رہے گا' پانی میں جائے گا تو ڈوب جائے گا' دانہ دنکا کھاؤ' گوشت کی طرف نظر نہ اٹھاؤ' چیل کا سایہ پڑے تو ماں کے نیچے گھس جاؤ۔بلی میاؤں کرے تو بھاگ جاؤ' یہ نہ تو کسی استاد نے اس کو پڑھایا' نہ اس کی طرف کوئی وحی ہوئی' نہ کوئی رسول آیا ہے۔یہ اس کے اندر کیا ہے' انسان کے اندر یہ سب چیزیں ہوتیں تو وحی کی ضرورت نہیں تھی۔یہ اس کے اندر نہیں ہیں اور یہ جو انسان کے اندر کی کمی ہے کہ یہ چیزیں اس میں نہیں ہیں' ان کا علم نہیں مل سکتا۔تو یہ ہے وہ کمی جس کو پورا کرنے کے لیے وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔

ذکر کچھ عالمِ امر اور عالمِ خلق کا

یہ چیزیں وحی کے ذریعے سے ملیں گی' تو وحی کیا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیفیت کیا ہے؟ ماہیت کیا ہے؟ ملتی کیسے ہے؟ نازل کیسے ہوتی ہے؟ کہا کہ ان امور کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔تم یہ نہیں سمجھ سکتے لیکن عالمِ امر میں سے خدا کی وہ تعلیم جب الفاظ اور حروف کی شکل کے اندر آگئی' تو یہ عالمِ خلق کی چیز ہوگئی' محسوسات کی بات ہوگئی اور اب یہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہے یعنی وحی کی تعلیم تو ہماری سمجھ میں آسکتی ہے' وحی ہوتی کیا تھی؟ ملتی کیسے تھی؟ یہ نبی کے سوا کسی اور کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی' اور نہ ہی نبی اسے کسی دوسرے کو سمجھا سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی خالصتاً انفرادی چیز تھی۔اب باقی رہا یہ کہ وہ وحی تو اس لیے دی جاتی ہے کہ اس میں نبی کے اپنے فکر اور خیال کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگلی بات یہ رہی کہ جو وحی ہم نے اس کو دی ہے' وہ محفوظ ہے' وہ تم تک آج قرآنِ کریم کے ذریعے پہنچ رہی ہے۔

قرآنِ حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس کی مثال کوئی نہیں لاسکتا

کہا: سیدھی سی بات تھی۔وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا (17:86)۔اور میں سمجھتا ہوں کہ اسکے لیے یہ ایک ہی آیت کافی ہے جبکہ قرآنِ کریم کی حفاظت کے لیے آیتیں تو بہت سی ہیں۔اس کی

Marfat.com

حفاظت کے لیے یہ بھی ایک بڑی سند ہے۔ کہا: یہ چیز کہ یہ قرآن تیرا اپنا پیدا کردہ نہیں ہے‘ اس کی تو سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اس قرآن میں سے واپس لے جاتے‘ تو نہ تو کہیں سے اس کو واپس لا سکتا تھا‘ نہ ہی کوئی دوسرا ایسا ہو سکتا تھا جو اس سلسلہ میں تیری کوئی مدد کرتا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ آگے بتایا ہے کہ کیوں ایسا نہیں ہو سکتا تھا؟ کہا کہ اگر ہم یہ چاہتے تو ایسا ہوتا مگر ہم نے ایسا چاہا ہی نہیں ہے۔ قرآن دیا اور اس کے بعد ہم نے یہ چاہا ہی نہیں کہ اس میں سے کچھ حصہ کم ہو جائے‘ کچھ تو بھول جائے‘ یہ ناقص رہ جائے‘ یہ غیر محفوظ رہ جائے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ ہم نے اسے نازل کیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ ہم نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے تو ہم نے اس کو محفوظ کر دیا ہے کہ اس میں سے کوئی ایک حرف تک بھی ایسا نہیں ہے کہ جو غیر محفوظ ہو جائے‘ منسوخ ہو جائے‘ مٹ جائے‘ نہ رہے اور یہ تمہیں جو ملا ہے تمہاری اپنی سعی و عمل کی وجہ سے نہیں ہے۔

مقامِ نبوت انسانیت میں عظمتوں کا بلند ترین مقام ہے

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (17:87)۔ یہ تو اس کے فضل و رحمت سے تمہیں عطا ہوا ہے۔ یہ بہت بڑا فضل ہے جس پر یہ ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑا مقام ہے اور پھر مقام بھی نبوت کا اور نبوت بھی وہ جو آخری نبوت ہے۔ اس مقام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے! اس میں تو انسانی تصور عاجز آ جاتا ہے۔ مقامِ نبوت اور نبوتِ محمدیؐ کا مقام عزیزانِ من! اس کی عظمتوں کو دیکھ کر انسانی تصور کانپنے لگ جاتا ہے۔ نبی کا تو مقام ہی نہیں سمجھ میں آتا۔ جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ نبی بھی قیامت تک کے لیے رہنے والا نبی تھا۔ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (17:87)۔ باقی رہا یہ کہ اگر اس میں سے کوئی چیز نہ رہتی تو؟ ہمارے ہاں امتحانوں میں Fill in the blanks یا Fill in the gaps کا پرچہ آیا کرتا ہے۔ تو اس کے اندر خود ہی گیپ‘ Blanks‘ رکھ لیتے ہیں اور ان لڑکوں سے جن کا امتحان لینا ہوتا ہے‘ کہتے ہیں کہ ان کو پُر کرو۔ کہا: اگر قرآن کی صورت یہ ہو جاتی کہ اس میں کہیں Gaps آ جاتے تو پھر‘ تیرے متعلق ہم نے یہ کہہ دیا ہے کہ تجھے تو اس سے پہلے پتہ ہی نہیں تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں‘ کتاب کیا ہوتی ہے‘ تیرے بس کی تو یہ بات نہیں تھی۔

یہ چیلنج تو ہر دور کی ہر نسل کے لیے ہے

باقی عزیزانِ من! جہاں تک دنیا بھر کے اربابِ دانش و بینش کا تعلق ہے تو اس کے لیے وہ آیت بار بار دہرائی گئی۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (17:88)۔ کہا کہ ساری دنیا کے دانشوروں کو اکٹھا کر کے آواز دے لو اور ان سے کہو کہ ”لاؤ اس قرآن کی مثل۔“ سارے مل کے بھی نہیں لا سکیں گے۔ تو اس میں خدانکردہ کہیں گیپ آ جاتا تو اس گیپ کی فلنگ کرنے والا کون تھا۔ نبی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ نبوت سے پہلے خود اس کو

Marfat.com

کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا۔ ساری دنیا کے اہلِ فکر واہلِ دانش وبینش کے لیے چیلنج ہے' عزیزانِ من! اور جیسا میں نے اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ چیلنج کچھ یونہی نہیں ہے۔ یہ تو بڑی عظیم چیز ہے۔ حقیقت میں یہ مذاق نہیں ہے کہ تیئس برس تو نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں یہ عرب جیسی وہ قوم' وہ قریش' جنہوں نے پہلے تیرہ برس مکہ میں اتنی مخالفت کی' اس کے بعد سات برس تک مسلسل لڑائیاں لڑتے رہے' جنگ کرتے رہے' کتنا اپنا نقصان کرایا' شکست کھائی' مکہ ہاتھ سے گیا' وہ ساری عظمتیں ضائع کیں۔ چیلنج تو اتنا ہی تھا کہ قرآن نے کہا تھا: ''اس کی آیت کی مثل بنا کے بتا دو۔''

آج تک کسی نے قرآن کا یہ چیلنج قبول کیوں نہیں کیا؟

عربوں کی زبان کی کیفیت یہ تھی۔ میں جو کہہ رہا ہوں' اسے تو چھوڑ دیجیے۔ لفظِ عربی کے معنی ہی کچھ یوں بیان ہوتے ہیں۔ ان کا نام ہی عرب اس لیے ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ فصیح البیان کہتے تھے اور باقی ساری دنیا کو عجمی کہتے تھے' جس کے معنی ''گونگے'' ہیں۔ ان کو گونگے کہتے تھے' اپنے آپ کو فصیح البیان۔ ان فصیح البیان لوگوں سے یہ چیلنج دیا جا رہا ہے کہ بابا! یہ ٹکراؤ' یہ تصادم' مخاصمت' یہ جنگیں یہ لڑائیاں' کاہے کے لیے ہیں؟ قرآن کی آیت کی مانند' ایک آیت کی مثل' بنا کے لے آؤ۔ بناؤ تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے شکست کھائی' ہم جھوٹے۔ یہ ان کے لیے کتنا آسان تھا' تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ سن لیا ہوگا اور چپکے سے بیٹھ گئے ہوں گے' انہوں نے کچھ نہیں کیا ہوگا۔ جنہوں نے جانیں تک دے دیں' مال تک لٹا دیے' بیویاں تک ان کی چلی گئیں' گھر بار لٹ گیا' حکومت چلی گئی' تولیتِ کعبہ چلی گئی؛ تو انہوں نے کبھی بیٹھ کے سوچا ہی نہ ہوگا کہ صاحب! پورا قرآن نہیں یہ تو ایک آیت کہہ رہا ہے۔ ایک سورۃ کہہ رہا ہے' چند آیتیں کہہ رہا ہے۔ آؤ تو سہی۔ یہ نہیں کہ کہیں میدان گرم ہوا ہو' وہاں شکست کھائی ہو۔ وہ سامنے آئے ہی نہیں' تو یہ یونہی آیتیں نہیں ہیں۔ اور پھر اس چودہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں اور اسلام کی دشمن قوتوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔

آپ کو یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ ایک صلیبی جنگیں لے لیجیے۔ سارے یورپ کی ساری عیسائی سلطنتیں تین سو سال تک مسلمانوں کے ساتھ لڑتی آئی ہیں۔ کیا ضرورت تھی! ان کے ہاں عربی کے بڑے بڑے فاضل' ان کے لکھے ہوئے عربی کے بہترین لغت تھے۔ عیسائی' عربی والے عیسائیوں کی آبادیاں' عربوں کے اندر موجود تھیں۔ یہ سارا مشرقِ وسطیٰ ان عیسائیوں سے اٹا پڑا ہے۔ ان کے اندر عربی کے اتنے بڑے بڑے ادیب ہیں' عربی ادب کی' ان کی کتابیں سند ہیں' یہ لڑائیاں جو وہ چودہ سو سال تک لڑتے رہے' ان میں سے کسی نے اتنا نہیں کیا کہ چلو بھئی! اس قرآن کی ایک مثل اس کا چیلنج ہے' چلو ان کو کہیں سے بنا کے دیدیں کہ لو بھئی! تو یہ نہیں ہے کہ کسی نے یہ کیا ہے اور فیل ہوگئے۔ کسی نے چیلنج ہی قبول نہیں کیا ہے۔ اسے معجزہ کہتے ہیں عزیزانِ من! انسان عاجز آجائے' سامنے آنے کی جرأت نہ کرے۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز اور پھر یہ ہے اس کا انداز!

قرآن کا اندازِ بیان تصریفِ آیات ہے

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (17:89)۔ اس کا انداز یہ ہے کہ ہم لوٹا لوٹا کے بات کو لاتے ہیں، پھرا پھرا کے بات کو لاتے ہیں، تصریفِ آیات سے سمجھاتے ہیں، بار بار یوں کرتے ہیں، ہر بات سمجھاتے ہیں، ہم نے اس قرآن میں ہر بات اس طرح سے سمجھائی ہے۔ نہایت واضح قرآن، ایسا شفاء و رحمت والا، اتنا واضح، اس قدر بے مثل و بے نظیر!! لیکن سب سے زیادہ مخالفت کیوں؟

سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے

اس مخالفت کے باوجود فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (17:89)۔ کیفیت یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ہیں، جن کی اس کے خلاف انکار اور نفرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ کونسے لوگ تھے؟ سب سے پہلے یہ وہی قریش تھے۔ کیا ہو رہا تھا؟ وہی بات کہ ان کی مفاد پرستیوں پر اس قرآن سے زد پڑتی تھی۔ یہ نہیں ہے کہ جانتے نہیں اور اس کے بعد بھی اس چودہ سو سال کے اندر باطل کا نظام جہاں بھی ہے، خواہ سیاست ہو، معیشت ہو، مذہب کی دنیا ہو، جانتے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ عزیزانِ من! اپنی مفاد پرستیاں ہیں، جو اس طرف آنے نہیں دیتیں۔ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (17:89)۔ کہتا ہے ہم تو قرآن کی یہ تہدید پیش کر رہے ہیں کہ یہ اس کا مقام ہے اس لیے لاؤ اس کے مقابلے میں۔ مگر یہ ہیں کہ اس کے باوجود، ضد اور تعصب کی بنا پر، بلا سوچے سمجھے، اس سے انکار کیے چلے جاتے ہیں۔

غور و فکر کرنے کی بجائے کسی معجزے کا مطالبہ

یہ بار بار کیا کہتے ہیں: کوئی معجزہ دکھاؤ۔ دراصل یہ ان کی جہالت تھی۔ ذہنِ انسانی کا طفلانہ پن تھا۔ معمول کے خلاف ذرا سی چیز بچوں کے سامنے لا کے رکھیے۔ دیکھیے کیسے لپک کر اس کی طرف جاتے ہیں۔ یہ سارا قرآن، یہ ساری تعلیم، یہ مہارت، یہ حقائق اور یہ سارا کچھ ایک طرف اور اس کے برعکس وہ سامنے، وہاں ٹینکی کے نیچے، ایک پرانے لمبے بالوں والا کھڑا ہو، پرانے اس لیے کہا کہ اب تو ہمارے ہاں سارے ''مردِ قلندر'' ہیں، اللہ کا فضل ہے، سب قلندر ہیں۔ ''اور اوتاں دی قلندری نے آپنے آپنے ناں وکھرے وکھرے رکھ لئے ہوئے نیں، گل ایہوئی ہیگی اے'' [1] چوغا پہنے ہوئے، یہ کہے کہ آؤ، وہ دیکھو میں اس سے آگ نکالتا ہوں، بالوں کو نچوڑتا ہوں، دودھ نکلتا ہے، یہ سارے قرآن سننے والوں کا جمگھٹا، اس کے گرد کھڑا ہو جائے گا۔ انسانی ذہن کا طفلانہ پن تو ابھی تک ایسا ہے۔ شکر فروش اسی لیے اس کے سامنے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہر ڈگڈگی بجانے والا کچھ نہ کچھ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ جناب! کرامات دکھاتا ہے، نبوت کا دعویٰ ہوتا ہے اور اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے۔ کہ ''میں نے کہا تھا زلزلہ آئے گا، وہ آ گیا'' کیا کبھی زلزلے نہیں آتے؟ دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں زلزلے آتے ہیں۔ دعا یہ مانگے کہ الٰہی عمرِ خضر دراز ہو۔ ادویات بہتر ہوئیں، خطرناک بیماریوں کا علاج ممکن ہوا، عمریں پہلے کی

---

[1] اور ان کی قلندری نے اپنے اپنے الگ الگ نام رکھ لیے ہیں۔ بات یہی ہے۔

نسبت بڑی ہوگئیں۔ لیکن قرآن کی مثل لانے کا چیلنج آج بھی قائم ودائم ہے۔ کہا: ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ آؤ' قرآن کی مثل' ایک سورۃ' ایک آیت بنا کے لاؤ۔ یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ نہیں' ہم اس طرح ایمان نہیں لائیں گے۔ بھئی! تو پھر بتاؤ' کیسے ایمان لاؤ گے؟ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (17:90)۔ زمین کو یہ حکم دو کہ پانی کا ایک چشمہ جاری ہو جائے۔ اچھا جی کہا گیا! کہا: پانی کا چشمہ ہی نہیں اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ (17:91)۔ بلکہ یہاں لہلہاتے باغ لگ جائیں۔ انہیں انگور لگے ہوئے ہوں۔ یہاں پہ کیلے اُگے ہوئے ہوں۔ صاحب! یوں حکم دو اور یہ سب چیزیں لگ جائیں۔ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (17:91)۔ باغ بھی لگ جائیں اور ان کے نیچے سے پانی کی نالیاں بھی خود بخود تمہارے کہنے سے بہنے لگ جائیں۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (17:92)۔ پھر یہ تم روز ڈراتے رہتے ہو کہ یہ ایک ناگہانی آفت آئے گی' یہ عذاب آئے گا' تمہارے اوپر تباہی آئے گی۔ پھر ہم اپنے اوپر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتا دیکھیں کہ یہ کیسے تباہی آتی ہے۔ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (17:92)۔ نہیں' خدا اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کے کھڑا کرو' تب ہم ایمان لائیں گے۔ سنیے جو ان کی شرائطِ ایمان ہیں۔ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ (17:93)۔ نہیں' بھئی! ایک اور بولا: اتنی بات نہیں ہے جی! یہ کھڑے کھڑے اس میدان میں تمہارے لیے ایک مکان بن جائے' مکان سونے کا ہونا چاہیے۔

آپ کو ایک کتاب لانے کے لیے آسمان پر چڑھنا اور واپس آنا ہوگا

دوسرا بولا: نہیں اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ (17:93)۔ ہمارے سامنے' ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تُو آسمان پہ چڑھ جائے۔ مگر ہاں' صرف آسمان کے اوپر ہی نہ چڑھ جائے کیونکہ محض اتنی سی بات سے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے' پھر کہا: صرف اتنے سے کام نہیں چلے گا۔ البتہ' ہاں! تو اس طرح سے چڑھ جا: وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (17:93)۔ اور وہاں سے جب تُو واپس آئے تو تمہارے پاس ایک کتاب ہو' لیجیے صاحب! وہ کتاب ابھی ابھی اللہ میاں نے چھاپی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو' ابھی تو اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔ ''اوچھٹا جیا پے گیا سی اوہدے سر دے اُتے' ہن تک سام کے رکھیا ہویا اے''[1] تماشا ہے' یہ اسے پڑھ کر دیکھ لیں کہ اسے واقعی خدا نے لکھا ہے۔ اور یہ کہیں کہ میں اسے دستخط کروانے کے لیے لے گیا تھا۔ ان کے ہاں یہ موجود ہے کہ اس نے جو اس کے اوپر دستخط کیے وہ سرخ سیاہی سے تھے' انہوں نے سرخ سیاہی سے لکھا ہوا ہے' یہ کیفیت ہے سرخ سیاہی کی۔ یہ الہامی زبان ہے تو انہوں نے اس پر لکھا ہے کہ یہ چھڑکا ہوا قلم ہے۔ ہاں یہ جو میرے ساتھ پٹواری صاحب تھے' ان کے کُرتے (Shirt) کے اوپر اس سرخ سیاہی کے چھینٹے پڑ گئے اور صبح وہ کُرتہ دکھاتے پھر رہے تھے۔ اللہ میاں نے وہ سرخ سیاہی کا قلم رکھا ہوا ہے۔ ''او پہلی جماعت دا منڈا

---

[1] اس کے سر پہ ذرا چھینٹا سا پڑ گیا تھا' ابھی تک اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

ہیگا او تھے ڈوبالے کے چھڑ کے تے ماسٹر طمانچہ مار داہیگا اے' ساری تختی خراب کرتی۔'' ❶ یہ قلم! وہ سرخ سیاہی اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ میرا گرتا اور پھر قلم جھڑکنے سے اس پر سرخ نشان۔ اس افسانے کو کیا کہیے عزیزانِ من! دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں! ❷

مذہب کی تعلیم' اس کے افسانے' قوم کی علمی سطح اور سوچ

عزیزانِ من! آپ کیا باتیں سنتے ہیں۔ ان کا تو کوئی دوش ❸ نہیں ہے۔ قوم ہی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ انہیں بھی اس قوم کے اندر سے' اپنے متبعین (Followers) مل جاتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قوم کی ذہنی سطح کیا ہے۔ آپ کے ہاں اس مذہب نے' ان افسانوں نے' مشاکلت کتنی تنگ کر دی ہے۔ انہیں بھی اپنے متبعین مل جاتے ہیں' انہیں بھی ماننے والے مل جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس پہ دنیا ہنس دیتی ہے۔ خیر' بات آگے لے کر چلتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! اوپر سے لکھی لکھائی کتاب لانی چاہیے' یوں ماننے کی بات ہے۔ اب اس میں دو باتیں ہو گئیں: تو معجزے دکھا' اگر تو نہیں دکھاتا تو بہرحال تو کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے یہ تباہی آئے گی' تو پھر اپنے خدا سے کہو کہ دکھاؤ' وہ تباہی کہاں ہے۔

ذاتِ خداوندی اس طفلانہ پن سے بہت بلند ہے

عزیزانِ من! یہ سارے دعاوی ایک طرف رہے۔ چار لفظ ہیں۔ کہا: خدا کی بات کہتے ہو تو سنو: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي (17:93)۔ میرا رب تمہارے ان طفلانہ پن کے تصورات سے بہت بلند ہے' بہت آگے ہے' بہت دور ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (23:93)۔ اس کے متعلق جو کچھ بھی تم اپنی فکر سے تصور قائم کرتے ہو' یہ اس سے بہت بلند اور بالا ہے۔

برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

خدا تمہاری ان بچپن کی باتوں سے بہت بلند ہے کہ تمہیں یہ شعبدے دکھاتا پھرے تاکہ تم ایمان لے آؤ۔ اب جہاں تک رسولؐ خدا کی ذات کا تعلق ہے تو عزیزانِ من! سنیے: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (17:93)۔ میں تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں' ایک انسان ہوں' فرق صرف اتنا ہے کہ خدا ایک پیغام دیتا ہے' تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ لہٰذا یہ کیا سوال ہے کہ یہ کر کے دکھاؤ' وہ کر کے لاؤ۔ خدا تو اس بستی میں آتا نہیں ہے۔ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں لیکن ایک ہی بات ہے جو اس میں کہہ دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمہارے جیسا انسان ہوں لیکن فرق یہ ہے کہ میں رسول ہوں۔ بات پھر وہیں آ گئی کہ میں جو پیغام لایا ہوں' کم بختو! اس پہ غور کرو۔ کیا بات ہے جو وہ (اقبال (1877-1938) ایک مسلم فلاسفر) کہہ جاتا ہے! ''قلندر ہم کراماتِ جہاں بین است'' اس کا خوب انداز ہے۔ ہم قلندر ہیں'

---

❶ گویا کہ وہ پہلی جماعت کا بچہ ہے۔ وہ سیاہی میں قلم ڈبو کر چھڑ کے تو ماسٹر صاحب اس کے منہ پہ طمانچہ (تھپڑ) دے ماریں' کہیں: ارے کم بخت! تُو نے تو ساری تختی خراب کر دی۔ یاللعجب!

❷ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں (غالب)

❸ قصور' Fault۔

Marfat.com

یہ جو سمجھنے والے نکات اٹھائیں گے کہ یہاں جمع کا صیغہ آیا ہے' قلندر کہہ کے قلندر ہم اپنے آپ کو مستغنی کہتا ہے:

قلندریم و کراماتِ ماجہاں بنی است

زمانگاہ طلب ' کیمیاچہ می جوئی

کہا: مجھ سے مانگنا ہے' ہم سے مانگنا ہے' تم مانگنا چاہتے ہو تو وہ نگاہ مانگو جو تمہیں سب کچھ دکھائے۔ اوہم سے تیلیاں مانگتے ہو۔ کیا بدبختی ہے۔ کہا کہ میں تو ایک بشر ہوں' رسول ہوں۔ یادرکھو! پیغام لایا ہوں' پیغام کی بات کرو۔ اور پیغام کی بات میں نے تمہیں بتادی ہے: جاؤ' اس پیغام کی ایک آیت کی مثل لاؤ' پھر پتہ چل جائے کہ معجزہ کسے کہتے ہیں۔ میرا یہ معجزہ تمہارے بھی سامنے ہے اور قیامت تک کے لیے انسانوں کے بھی سامنے رہے گا۔

نبی اکرم ﷺ کے دو معجزے

عزیزانِ من! قیامت تک اربابِ دانش وبینش کے سامنے یہ معجزہ ہے: ''جاؤ' اس پیغام کی ایک آیت کی مثل ہی لے آؤ۔'' اس کے سامنے سب اربابِ دانش وبینش عاجز ہیں۔ عزیزانِ من! اسے معجزہ کہتے ہیں۔ دو ہی تو معجزے تھے جو حضور ﷺ نے دکھائے۔ پہلی بات وہ کہی کہ جب انہوں نے ان کی مخالفت کی ہے کہ آپ نے یہ کیسے دعویٰ رسالت کر دیا؟ اس کے لیے کوئی محسوس چیز تو ہے نہیں' جو آپ پیش کر دیتے۔ کوئی کرامت نہیں' کوئی معجزہ نہیں' کوئی شعبدہ نہیں۔ کیا کہتے ہو؟ عزیزانِ من! پہلا معجزہ علی الاعلان یہ پیش کیا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16)۔ میں کہیں باہر سے نہیں آ گیا۔ اجنبی نہیں ہوں کہ تم میرے متعلق کچھ جانو نہیں۔ کوئی سیلانی' کوئی جوگی نہیں ہوں کہ تمہیں میرے ماضی کا پتہ نہ ہو۔ میں نے اس سے پیشتر تمہارے اندر اپنی ساری عمر بسر کی ہے۔ خود ایمان سے کہو کہ ایسی عمر ایک سچے کی عمر ہوتی ہے یا ایک جھوٹے کی عمر ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! مخالفین کے بھرے مجمع کے اندر کھڑے ہو کے کہا' کسی میں انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوئی کہ ہاں تمہاری زندگی میں ہم نے یہ بات یوں دیکھی ہے۔ خاموش ہو کے' عاجز ہو کے' چلے گئے۔ یہ پہلا معجزہ سیرتِ نبوی ﷺ کا ہے۔ دوسرا معجزہ قیامت تک کے لیے ''پیغامِ نبوی'' ہے' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملا۔ بس یہ ہیں وہ معجزے۔ آج بھی کوئی معجزہ دکھانا چاہتا ہے تو معجزہ یہ ہے کہ اپنی زندگی سامنے پیش کرے۔ اپنا ''ماضی'' اپنا Past سامنے پیش کرے۔ دعویٰ کے بعد کی زندگی نہیں بلکہ اپنے دعوے سے پہلے کی زندگی پیش کرے۔ دعوے کے بعد تو آدمی بڑا محتاط ہو جاتا ہے' سب حضرت جی بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کی زندگی مِنْ قَبْلِهٖ (10:16) کو پیش کرے کہ وہ کیسی ہے۔ اور اسے ہی آپؐ نے پیش کیا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 93 تک آ گئے۔ 94ویں آیت اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

سولہواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 94 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾
قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ
كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ
مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ
مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ
تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى
تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْــَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾
فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ
اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ
اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا
بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّ
يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدۃ
قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا
تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ
فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 94 سے ہو رہا ہے۔

17:94 - سابقہ آیات میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ مخالفین کا نبی اکرمؐ سے مطالبہ یہ تھا کہ آپ ہمیں معجزات دکھایئے تو پھر ہم ایمان لائیں گے اور جواب یہ دیا گیا تھا کہ اگر تم یہ معجزے اللہ کی طرف سے مانگتے ہو تو وہ تمہارے اس طفلانہ پن سے بہت اونچا، بہت بلند و منزہ ہے۔ وہ تمہارے جذبات کی تسکین کے لیے اپنے قوانین میں تبدیلیاں نہیں کرسکتا اور اگر مجھ سے معجزے مانگتے ہو تو هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (17:93) - میں تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں بس اتنی سی بات ہے کہ خدا کا ایک پیغام ہے، جو مجھے ملتا ہے، میں وہ تم تک پہنچا دیتا ہوں اور اس کے بعد تو میں تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ اور اگلی آیت میں اسی کو دہرایا کہ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (17:94) - یہ آج کی بات نہیں ہے، یہ شروع سے ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے الھدٰی پیش کرتے ہیں، صحیح راستے کی طرف راہنمائی کا چارٹ پیش کرتے تھے کہ اس دوراہے (Cross-roads) سے اس طرف کو جاؤ جو تمہیں منزلِ مقصود کی طرف پہنچانے والا راستہ ہے، اور اس کے برعکس ادھر نہ جاؤ کیونکہ یہ غلط سمت کی طرف لے جائے گا۔ جبکہ ان راہروؤں کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ اگر تم کوئی شعبدہ دکھاؤ تو ہم مانیں گے کہ یہ راستہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ یہ ہے انسانی ذہن کا وہ طفلانہ پن جو ہمیشہ مانع رہا ہے، خواہ ان سے کتنی بھی عقل و فکر کی بات کیوں نہ کی جائے لیکن پھر بھی ان کا مطالبہ شعبدہ بازیوں کا ہی ہوتا ہے۔

مذہب انسان کو بہلاتا ہے جبکہ دین انسان کو ذمہ داریوں کا شعور بخشتا ہے

اصل تو یہ ہے عزیزانِ من! کہ قرآنِ کریم اس دور میں آیا تھا، جب انسانیت اپنے عہدِ شباب میں پہنچ رہی تھی۔ وہ اسے اس کے بچپن کے زمانے سے نکالنا چاہتا تھا۔ مذہب اور دین میں فرق ہی یہ ہے کہ مذہب میں بچوں کو بہلایا جاتا ہے، دین بالغ انسانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے کہ ہر بات میں آپ پوچھیں گے کہ مولوی صاحب! میں کیا کروں؟ مولوی صاحب! یہ ہوگیا، فرمایئے کیا ہوگا؟ اب کس طرح سے ہوگا؟ سونا کیسے ہے؟ جاگنا کیسے ہے؟ بیٹھنا کیسے ہے؟ اٹھنا کیسے اور کھانا کیسے ہے؟ پینا کیسے ہے؟ بچہ یہی کچھ کرتا ہے، بالغ آدمی تو یہ کچھ نہیں کرتا۔ وہ تو ایک اصولی بات پوچھتا ہے کہ نئے راستے پہ جانا ہو تو پوچھ لیتا ہے کہ صاحب! یہاں سے جاؤں تو کس سمت کو جاؤں اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ یہاں سے سیدھے جاؤ، نہر کا پل آئے گا، وہاں سے دائیں کو لوٹ جانا۔ بس اس کو الھدٰی کہتے ہیں۔ یہ باقی جتنی بھی چیزیں ہیں، سب بچپن کی ہیں۔ اب اس کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ اتنی سی بات جو اسے معلوم نہیں تھی، وہ بتا دی اور اس کے بعد اس پہ چھوڑ دیا کہ راستے میں اگر کوئی Unforeseen چیز آئے گی، غیر متوقع چیز آئے گی تو اس اصول کی روشنی میں خود فیصلہ کر لینا۔ اور یہی انسانیت کے بالغ ہونے کی شے ہے، علامت ہے۔ ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں کہ اب بتانے والا بھی کوئی انسان نہیں چاہیے۔ ٹائم ٹیبل آپ کے گھر کے اندر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ نے یہ اپنے ساتھ سٹیشن ماسٹر بٹھا رکھا ہوتا ہے کہ

Marfat.com

صاحب! وہ شیخوپورہ کی گاڑی کتنے بجے جائے گی۔ یہ ہے جسے ختمِ نبوت کہتے ہیں۔ سو سال سے بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ پوچھو انسان بالغ ہو گیا یا ابھی بچہ ہی ہے؟ اب انسانیت بالغ ہو گئی۔ ختمِ نبوت کے معنی یہی تو ہیں۔

انسان کے لیے پہلا انقلاب: انسان حیوان سے ممتاز ہے

قرآن جو انقلابات لایا ہے عزیزانِ من! یہ بڑا انقلاب ہے۔ پہلا انقلاب تو یہ تھا کہ اس نے انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کیا۔ حیوانوں کے اندر الہام موجود ہوتا ہے' ان کو غلط اور صحیح کی تمیز دی ہوئی ہوتی ہے۔ انسانوں میں یہ چیز نہیں ہوتی۔ انہیں یہ چیز باہر سے ملتی تھی۔ اسی کے لیے مشیت کے پروگرام نے انبیاء کرام کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ہمارے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ تک آ کر ختم ہو گیا۔

انسان کے لیے اگلا انقلاب: اس کی بلوغت کا اعلان

اس کے بعد دوسرا انقلابِ عظیم یہ ہے کہ انسان غلط اور صحیح کی تمیز کے لیے شخصیتوں پر انحصار کیے جاتا تھا' وحی اس کے سامنے ہوتی نہیں تھی جو اسے صحیح راستے پر چلائے۔ چنانچہ اس کے بعد صحیح راستے کا چارٹ اسے دیدیا اور انسان کو درمیان میں سے نکال دیا گیا۔ وہ اس لیے کیا کہ اب بچہ جوان ہو گیا ہے' جس بچے کو آج لے کے آپ انارکلی [1] میں جاتے ہیں' آپ بھی احتیاط برتتے ہیں' اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور اگر کسی وقت انگلی چھوٹ جاتی ہے تو وہ لپک کے آپ کی انگلی پکڑ لیتا ہے تاکہ وہ کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے' وہی بچہ جب جوان ہو جائے تو آپ کبھی انارکلی میں اس کی انگلی پکڑ کے چلانے کی کوشش کیجیے' جھٹکا دیگا: ابا جی! شرم آتی ہے۔ کیا کر رہے ہیں؟ بیٹا! تم تو خود اسی طرح سے میری انگلی پکڑتے تھے۔ جی! وہ تو میں ''ایویں چھوٹا جیا بچا ہوندا سی'' [2]۔ روز یہ کہتے سنائی دیں گے: ابا جی! آپ مجھے ابھی تک بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ یہ انسانیت کی توہین ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بھی اس کو بچہ سمجھا جائے۔ اب یہ چیز انسان کے طفلانہ پن کی علامت ہے۔ عقل و فکر کی رو سے فیصلہ کرنے میں بڑی محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچے میں ایک تو اس کی استعداد نہیں ہوتی اور دوسری یہ ہے کہ ابھی اس میں Dependability ہوتی ہے' اس میں دوسرے کے اوپر یونہی سب کچھ ڈال دینا ہوتا ہے۔ یہ بڑی مزے کی چیز ہوتی ہے:

جو غم ملا' اسے غمِ جاناں بنا دیا

یہ مرضی مولا کی کیفیت ہوتی ہے۔ برہم ہو گئے' بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تو ہمارے لیے فیصلے کر۔ ''اینوں ہور کوئی کم ای نئیں ہیگا تہاڈے فیصلے او کرے' [3] ''اپنے فیصلے آپ کرو۔'' یہ ذمہ داری کا قبول کرنا ہے جس سے انسان بھاگتا ہے۔ دوراہے پہ کھڑا ہو کے غلط اور صحیح راستے

---

[1] لاہور پاکستان کا ایک پرانا مشہور بازار۔　[2] ابھی چھوٹا سا بچہ ہی ہوتا تھا۔

[3] گویا اسے کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے' وہی تمہارے فیصلے کرے۔ ارے او! اب اپنے فیصلے آپ کرو۔

Marfat.com

کا فیصلہ کرنا' بڑی ذمہ داری چاہتا ہے۔ یہ Sign post چاہتا ہے۔ یہ چیز کہ ایک راہرو کو ساتھ لے لیا جائے' جو اُسے یہاں سے وہاں تک لیے چلا جائے' دراصل دوسرے پہ ذمہ داری ڈالنا ہے۔ اب قرآن نے انسانیت کو اس دور میں داخل ہوتے دیکھ لیا کہ اب یہ ذمہ داریاں اٹھانے کے لائق ہو گیا ہے تو اس نے اس پر ذمہ داریاں ڈال دیں۔ زندگی کے راہنما اصول دے دیئے لیکن اس کی تفصیلات نہیں دیں۔ تفصیلات بچوں کے لیے چاہئیں' بالغ کے لیے نہیں چاہئیں۔

انسان کو بچوں کی سطح پر رکھنا مذہبی پیشوائیت کے فائدے میں ہے

یہ بیچارے ملا ذہنیت کے لوگ تو اس بات کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ یہ ان کے فائدے میں ہے کہ ان کو بچہ رکھا جائے۔ وہ ہر بات میں انہی کے محتاج ہی رہیں۔ کہا: یہ چیز حائل ہوتی رہی' ہم الھدیٰ دیتے رہے' راستہ بتانے والے Sign post دیتے رہے' رہنمائی کا چارٹ دے کر آگاہ کرتے رہے لیکن یہ حضرتِ انسان کرامات مانگتا رہا۔ ہم اس کی عقل و فکر کو اپیل کرتے رہے مگر وہ اپنے جذبات کی تسکین چاہتا رہا۔

انسانوں کی بستی میں انسانوں کی سطح پر بات ہوتی ہے

وہ زندگی کی حقیقتوں کا اعلان پہ اعلان کرتا چلا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ چیز مانع رہی ہے کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے اور یہ کہتا کچھ ہے۔ کہا: ان سے کہو: قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (17:95)۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ یہ انسان ہمارے جیسا کیوں ہے؟ ارے تم انسان بستے ہو۔ انسانوں کے لیے بات کرنے والا انسان ہی چاہیے۔ اگر یہاں فرشتے بستے تو ہم کسی فرشتے کو رسول بنا کے بھیجتے۔ سیدھی سی بات ہے۔ بستے ہیں انسان' چاہتے یہ ہیں کہ رسول وہ آئے جو انسانوں جیسا نہ ہو' کوئی فرشتہ ہونا چاہیے۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! کیا جوابات ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پھر ہم دین کو مذہب کی سطح پر لائے ہیں تو کس قدر ہم نے اپنے آپ کو بچپن میں رکھا ہوا ہے اور کس قدر مطمئن ہیں۔ ہم وہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ قرآن قدم قدم پہ کہتا چلا جا رہا ہے کہ وہ معجزات والی بات چھوڑ دو۔ یہ کرامات کی کوئی چیز نہیں ہے۔ رسول اللہ کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ آپ ہمارے ہاں کی یہ کتابیں اٹھا کے دیکھیے۔ بڑے فخر سے سارے رسولوں کے معجزے ایک طرف گنائے جاتے ہیں اور پھر رسول اللہؐ کے معجزے ان سے کم از کم دگنے گنائے جاتے ہیں۔ یہ سب ان کتب میں ہے۔ ایک ایک ہزار معجزہ بتانے والی کتابیں آپ کے ہاں موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہاں انسان بستے ہیں۔ اسلیے انسان رسول آتا ہے۔ فرشتے بستے تو فرشتوں کو ہم رسول کر دیتے۔ تمہاری طرح کا انسان ہو گا جو کہتا ہے: اسے غور سے سنو' اور یہ سب کچھ کہہ دیا: غور و تدبر کی رو سے بات کا سمجھانا' ایک ایک شک کا ازالہ کرنا' ایک ایک اعتراض کا جواب عقل و فکر کی بناء پر دینا' یہ سب کچھ دے دیا۔ اور اس مقام پہ کہا کہ یہ سب کچھ میں کر بیٹھا اور

Marfat.com

اس کے باوجود اگر تم نہیں مانتے ہو تو قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا (17:96)۔ تو اس کے بعد میں تم پہ داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ میرا کام بتانا تھا' وہ میں نے بتا دیا۔ تمہیں سمجھانا تھا' سمجھا دیا۔ تمہیں تمہارے اعتراضات کا جواب دیا' تمہارے شکوک کا ازالہ کیا' سب کچھ کیا۔ اب اس کے باوجود اگر تم اسے نہیں مانتے' مخالفت پہ اترے ہوئے ہو تو پھر تمہارے اور میرے درمیان خدا نگران ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جانتا ہے کہ کون کیا کرتا ہے۔ اس کے مطابق فیصلہ ہو جائے گا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

مروجہ تراجم عقل وبصیرت کی ساری عمارت کو ڈھیر کر دیتے ہیں

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (17:97)۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اس قسم کی جتنی آیات آتی ہیں ان کا غلط ترجمہ ہمیں اس قدر غلط راستے پہ لیجاتا ہے کہ اس سے قرآن کی وہ ساری عمارت ڈھے جاتی ہے' جو اس نے عقل وبصیرت کی بنیادوں اور انسان کی اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی بنیادوں پر استوار کی ہوئی ہوتی ہے۔ وہی ترجمہ ''کہ جسے اللہ ہدایت دے وہ ہدایت پہ ہوتا ہے' جسے وہ گمراہ کر دے وہ گمراہ رہتا ہے''۔ چل بھئی' تو یہ جو سارا کچھ ہے' کاہے کے لیے ہے؟ یہ سارے دلائل اور براہین اور یہ عقل وفکر' غور وتدبر' قرآن کی ہدایت' یہ سب کچھ ان پہ ذمہ داریاں کس لیے ڈالی گئیں؟ انہوں نے بس ایک آیت لی اور اس کا یہ ترجمہ کیا اور کہا کہ بس یہ سب ٹھیک ہے' جو کچھ قرآن کہتا ہے: دیکھیں بات یہ ہے کہ جسے وہ مولا ہدایت دے' بس وہ ہدایت پا سکتا ہے اور جسے وہ چاہے اسے گمراہ کر دے۔ یا میرے اللہ! کیا یہ کہتے ہوئے سینے کے اندر ان کا دل نہیں کانپتا کہ خدا گمراہ کرتا ہے۔ توبہ توبہ! اور کہتے یہ ہیں کہ صاحب! پرویز نے یہ نیا قرآن سمجھا' ہزار برس سے کسی نے سمجھا ہی نہیں۔

خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ شیطان گمراہ کرتا ہے

مجھے قرآن کو سمجھنے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ خدا کے متعلق یہ کہتے ہوئے تمہیں تھوڑی سی جھرجھری بھی نہیں آتی کہ ''وہ گمراہ کرتا ہے''۔ سارے قرآن میں تو یہ لکھا ہوا ہے کہ ''شیطان گمراہ کرتا ہے اور ہم ہدایت دیتے ہیں''۔ لیکن اگر خدا گمراہ کرتا ہے تو یہ رسول کاہے کے لیے' یہ عقل وفکر کاہے کے لیے' یہ قرآن کاہے کے لیے ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دیدے وہ ہدایت پہ چلا گیا' جسے وہ گمراہ کر دے گمراہ ہو گیا۔ یہ تو وہی ذمہ داری سے بچنے کی بات ہے۔ جبکہ بات تو صاف ہے۔ لہٰذا یہ یاد رکھو' ہم نے یہ سب کچھ تمہیں کہہ دیا ہے اور صحیح راستہ وہی ہوگا جسے خدا نے صحیح قرار دیا ہے۔ جسے اس نے غلط قرار دیا ہے وہ راستہ غلط ہے۔ یہ اس آیت کا ترجمہ ہو گیا' یہ اس کا مفہوم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ بات نہیں ہے کہ میں تمہیں کہہ کے چلا ہوں تو پھر تم اپنے فیصلے کی رو سے کسی راستے پہ

Marfat.com

چلے جاؤ وہ راستہ منزل پہ پہنچا دے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ لہٰذا ایک بار پھر جاتے جاتے میں کہہ دیتا ہوں کہ اس Sign post کو دیکھ لو۔ یہ خدا نے لٹکا رکھا ہے۔ اس نے جس سمت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شہر کی طرف جائے گی تو پھر وہی شہر کی طرف جائے گی' کوئی دوسری سڑک آپ کو شہر کی طرف نہیں لے جائے گی۔ اس لیے اسے سمجھ لو کہ جس راستے کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یہ شہر کی طرف نہیں جائے گا' وہ شہر کی طرف نہیں جائے گا' خواہ ہزار راہنما بھی ساتھ لے لو' وہ تمہیں شہر کی طرف نہیں لے جا سکتے۔ اس سڑک پہ' جس پہ اس نے لکھ دیا کہ یہ شہر کی طرف نہیں جائے گی' وہ کبھی شہر کی طرف نہیں جائے گی۔ یہ ہے اس کے معنی عزیزانِ من! یہ نہیں ہے کہ جسے خدا ہدایت دے وہ ہدایت پہ ہوگا' اور جسے وہ گمراہ کر دے (معاذ اللہ) وہ گمراہ ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ جس راستے کو اس نے کہہ دیا کہ یہ سیدھا منزل تک تمہیں پہنچائے گا' وہی پہنچائے گا۔ جس راستے کے متعلق اس نے کہا کہ یہ راستہ جنت کی طرف نہیں جائے گا' بلکہ تمہیں جہنم کی طرف لے جائے گا' اس پہ چلنے والا ہزار راہنماؤں کے باوجود کبھی جنت میں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ آخر کار جہنم میں جائے گا۔ تو یہ قرآنی آیات کا قرآنی مفہوم ہے اور اس کے بعد ساتھ ہی اگلی آیت ہے کہ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِه (17:97)۔ یاد رکھو کہ انہیں ان کا کوئی بھی نگران' سرپرست' مددگار' ساتھی' رہنما' اس راستے پہ چلا کر' جو اس منزل کی طرف نہیں جاتا' اس راہرو کو صحیح منزل پہ نہیں پہنچا سکتا۔

قرآن تو بار بار کہتا ہے کہ تم اندھے' بہرے اور گونگے نہ بنو

اس کے معنی یہ ہیں: اس صورت حال میں کوئی ان کی مدد نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ (17:97)۔ ذلیل وخوار ہو کر' جسے وہ اوندھے منہ کہتے ہیں' جہنم کا راستہ ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ قرآن انہی کو اندھے' بہرے' گونگے کہہ رہا ہے۔ اگر اس نے انسانوں کے متعلق یہ سب کچھ کرنا ہوتا تو پھر اندھے ہوں' بہرے ہوں' گونگے ہوں' کچھ بھی ہوں' ان کے لیے تو مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (17:97) تباہی ہے' بربادی ہے۔ اور یہ تباہی اور بربادی بھی عارضی اور وقتی نہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پہ یہ بتایا ہے۔ بات دوسری طرف نکل جائے گی ورنہ آج تو محققین کے نزدیک سلسلہ ارتقاء کے سارے انکشافات بتا رہے ہیں کہ جس مقام کے اوپر کوئی نوع رک گئی ہے' وہ وہاں رکی ہوئی ہے' وہ آگے نہیں چل سکتی۔ ارتقاء کی اگلی منزلیں صرف وہ نوع طے کرتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لے' جو اس صلاحیت کو کھودے' وہ وہیں رک کے رہ جاتی ہے۔

"یہ رک کے رہ جانے کا مقام" جہنم کہلاتا ہے۔ اس میں سے نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ تو ہمارے تصور کا جہنم ہے' جسے ہم نے خود اپنے ہاں جیل خانہ تصور کر لیا ہے اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ بہر حال جی! اس جیل خانے کی سزا کی کوئی مدت ہونی چاہیے۔ ملازدہ بیچارے میرے پاس روز آتے ہیں کہ جی! جسے عمر قید کہا جاتا ہے' وہ بھی تو چودہ سال' دس سال یا سات ہی سال کی گنی جاتی ہے۔ یہ آپ نے کہا کہ جو جہنم میں گیا تو بس وہ جہنم میں ہی رہا صاحب! انہیں کون سمجھائے۔ اصل چیز یہ ہے عزیزانِ من! کہ اس کے احکام' اس کی

Marfat.com

ہدایات تو عام سطح کے اوپر سمجھ آتی ہیں لیکن قرآن کے حقائق ذہن کی بلند سطح چاہتے ہیں' قرآن بہت بلند فکر چاہتا ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک مُلا کی حیثیت

یہی ہے وہ چیز جس کے لیے اقبالؒ [1] (c.1877-1938) نے یہ کہا ہے کہ جو اپنی ذہنی وفکری سطح کو اتنا نیچا رکھنے والے ہیں' قرآن کے معارف اور حقائق ان کی علمی سطح کو بلندیوں پر لے جاتے ہیں اور اِس کے برعکس:

مکتب وملا واسرارِ کتاب

یہ بے چارے مکتبوں کے اور دار العلوموں کے پڑھے ہوئے ملا ہیں۔کہاں وہ اور کہاں کتابِ عظیم کے یہ حقائق اور معارف! سچ کہا تھا:

کورِ مادر زاد نورِ آفتاب

جو پیدائشی اندھا ہے' سورج کی روشنی اس کو نصیب ہی نہیں ہوسکتی۔

یہ مکتبِ ملا کو ''کورِ مادرزاد'' قرار دیتا ہے۔دراصل بات یہ ہے کہ ان کے ذہن کی سطح اتنی پست ہوتی ہے کہ یہ حقائق وہاں نہیں آسکتے۔وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ان نشانیوں پہ غور کرنے سے قرآن کے حقائق تمہاری سمجھ میں آئیں گے اور جن کے دار العلوموں کی دنیا ہی ہزار برس پیچھے ہو'ان کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔آپ کبھی ان کے نصاب اٹھا کے دیکھیے' ان کتابوں کو کھولنے سے گھن آتی ہے۔ان کے ہاں کی پرانے بوسیدہ کاغذ پہ چھپی ہوئی کتابیں اس قسم کی ہیں۔ان کے اندر جو لکھا ہوا ہوتا ہے' اسے آپ دیکھیے کیا ہوتا ہے: اپنی بچپن کی ذہنی سطح اور امت کو اپنے سے نیچے رکھنا۔یہ ہے ان کتابوں کا لب لباب۔

مذہبی مدارس کے طالب علموں کی ذہنی کیفیت

عزیزانِ من! مذہب امتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ان کی ذہنی سطح اونچی ہوتی ہی نہیں ہے۔صرف راستہ دائیں بائیں بتاتے ہوئے لڑکے کو شہر بھیجے آپ دیکھیے کہ واپسی پہ وہ کتنا تجربہ حاصل کر کے لوٹتا ہے۔لہٰذا یہ جو کہا ہے کہ جہنم میں گئے سو ہمیشہ کے لیے گئے تو قرآن یہ کہتا ہے کہ اس سے نکلنے کا کتنا ہی ارادہ کریں گے مگر نکل نہیں سکیں گے۔یہاں بھی وہی بات کہی ہے کہ اگر اس کی آتش' اس کی آگ' اس کی گرمی' ذرا سی بھی ماند پڑنے لگے گی تو اور بھڑک جائے گی۔

خود گمراہ کیا اور پھر خود ہی جہنم میں ڈال دیا

اس آیت کے مروجہ غلط ترجمے کی رو سے تو خدا ہی گمراہ کر رہا ہے اور پھر خود ہی اس کا نتیجہ جہنم بتاتا ہے۔سوال تو یہ ہے کہ یہ تو خدا نے کہا کہ جسے ہم گمراہ کر دیں' اسے کوئی راہِ راست پہ نہیں لا سکتا۔تو پھر اس میں میرا قصور کیا ہے؟ مجھے خود ہی اس نے گمراہ کیا ہے اور اسکے بعد مجھے کہہ رہے ہیں کہ اسے جہنم میں ڈال دیجیے۔مجھے کاہے کے لیے جہنم میں ڈال رہے ہو؟ اور واقعی کسی کے سامنے یہ بات کرو' وہ کہے گا

[1] بحوالہ سال پیدائش ڈاکٹر محمد اقبال' ملاحظہ ہو گلزار اردو (حصہ دوم)' سندھ ٹکسٹ بک بورڈ جام شورو۔سندھ' 1995ء ص۔169۔

Marfat.com

کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے: آج بچے سے کہنا کہ آج سکول مت جاؤ' یہاں بیٹھے رہو۔ وہ بیٹھا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد چابک لے کے پیچھے پڑ جانا کہ آج سکول کیوں نہیں گئے۔ اب اس کے بعد اس قسم کے باپ کے سامنے لب کشائی بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کے باپ کے سامنے کہہ کے دیکھیے' دو اور لگا دے گا۔ لہٰذا اس کے لیے تو وہی مسلک ہوگا جو حافظ کہہ گیا ہے:

گناہ گرچہ نہ بود از خطائے ما حافظ

گناہ ہماری مرضی سے نہیں ہوا' اس میں ہماری خطا نہیں ہوئی' وہ خود کراتا ہے:

تو بر طریق ادب پیش و گنا ہے من است

لیکن ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے کہے کہ نہیں جی! میری غلطی ہے۔

کیا خوب کہا: ادب کا تقاضا ہے! پہلی آیت میں یہ تھا' جس کے غلط ترجمے سے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' یہ مراد لیتے ہیں کہ جسے وہ گمراہ کر دے حالانکہ بات یوں نہیں ہے۔ بات یوں ہے کہ ذٰلِکَ جَزَآؤُھُمْ بِاَنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا (17:98)۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے قوانین سے انکار کیا' سرکشی برتی۔ یہ وجہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات سے خود کفر کیا۔ ایک ہی سانس میں کہا۔ آپ قرآن کو کیا سمجھتے ہیں؟ عزیزانِ من! میں عرض کر رہا ہوں کہ انہوں نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں۔

قرآنِ حکیم تو متضاد تعلیم پیش ہی نہیں کرتا

وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (6:92)۔ انہوں نے خدا کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا کی ہر بات نرالی اور اچھنبے والی ہونی چاہیے' ورنہ اس نے تو ایک ہی سانس میں کہہ دیا ہے کہ جسے ہم گمراہ کر دیں' اسے کوئی راہِ راست پہ نہیں لا سکتا اور اس گمراہی کا نتیجہ جہنم ہے۔ کیوں؟ ذٰلِکَ جَزَآؤُھُمْ بِاَنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا (17:98)۔ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا تھا۔ دیکھیے خدا کی اس کتاب میں کیسا تسلسل ہے اور اس سے بڑے اعجازوں میں ایک یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اگر ایک فقرے میں کوئی مصنف اپنی کتاب میں کچھ لکھے اور اس کے بعد کچھ اور لکھے' تو پھر دیکھیے کہ اس کتاب کا حشر کیا ہوگا۔ انسانی مصنفوں کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! بیس سال پہلے کی لکھی ہوئی کتاب کے اندر اگر آج کوئی کہہ دیتا ہے کہ صاحب! وہاں تو تم نے یہ کہا تھا' آج یہ کہتے ہو' انسان ہے وہ کہہ سکتا ہے لیکن اس خوددار مصنف کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ یہ متضاد باتیں جو کہتا ہے۔ لیکن یہاں خدا کی کتاب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ایک ہی سانس میں کہے جا رہا ہے کہ ذٰلِکَ جَزَآؤُھُمْ بِاَنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا (17:98)۔ انہوں نے ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کر کے اپنے لیے غلط راستہ تجویز کر لیا تھا' جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ اس

Marfat.com

انکار اور اقرار پر بنیادی چیز تو ساری ذمہ داری کی ہے۔ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (17:98)۔ کہتے یہ ہیں کہ ہاں صاحب! اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ اس میں سارے اعمال کا حساب ہوگا۔ ایک ایک چیز سامنے آئے گی۔ اس کے نتیجے کے طور پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں: یہ سب غلط ہے۔ یہ انسان کا جسم ہے' جس پہ موت آئی تو مر گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' اللہ اللہ خیر سلا' کس کا اٹھنا کس کا اٹھانا' کس کی دوبارہ زندگی! یہ سب کچھ نہیں۔ کہا: یہ ہے وہ بنیادی چیز جسے ذمہ داری کہتے ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان کی بات ہے۔ یہ جو میں کر رہا ہوں' اس کا نتیجہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔ اس سے نکلنے کی' اس سے فرار کی' راہ یہ ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اگر میں یہاں انتظام ایسا کر لوں کہ پکڑا نہ جاؤں تو راوی عیش لکھتا ہے۔ اور جب معاشرے کے اندر یہ خرابیاں عام ہو جائیں تو پھر پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا:

رہیں نہ رند' یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے' دو چار دس کی بات نہیں

تمام شہر کو کیا کرو گے۔ لیکن اگر یہ ایمان ہو تو سوال یہ نہیں ہے کہ میں یہاں پکڑا جاتا ہوں یا نہیں پکڑا جاتا۔ میں دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ چلا جاؤں ضرور پکڑا جاؤں گا۔ مجھے ضرور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان ہے۔ کئی مفرور اشتہاری مجرم' کئی کئی سال عذاب کے احساس کی یہ کیفیت لیے کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں' کئی دفعہ گرفتاری دینے کے لیے خود آ جاتے ہیں۔

یہ چیز بڑی بنیادی ہے کہ زندگی صرف یہیں ختم نہیں ہوتی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس بنیادی چیز سے انکار کی وجہ سے یہ ساری چیزوں میں بے باک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو جی میں آئے کر لیا جائے۔ یہاں انہوں نے انتظام کر رکھا ہوتا ہے کہ پکڑا نہ جاؤں' پکڑا بھی جاؤں تو چار پیسے دیدونگا۔ یہ ہے بنیادی چیز اور یہ جو آج ہر کس و ناکس دیکھ رہا ہے کہ اتنے جرائم' اتنی عام بداخلاقیاں' اتنی عام حیات سوزیاں' ہر قسم کی برائیاں عام ہیں۔ ان کی وجہ یہی نہیں ہے کہ کسی کو یقین ہی نہیں ہے کہ میں پکڑا جاؤنگا بلکہ یہاں قانون کا احترام اٹھ گیا ہے۔ یہاں جو قانون کے نظم و ضبط والی قوتیں تھیں' ڈھیلی پڑ گئیں۔ یہاں جو اس کے متعلق اطمینان ہوا تو اس کے بعد عزیزانِ من! اپنے سینوں کو ٹٹولیے تو سہی' کہیں اس کا یقین اور ایمان ہے کہ ''بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی' مجھے ضرور ایک دن کسی عدالت کے سامنے جانا ہے' مجھے ضرور سزا ملنی ہے''۔ یہ ہے جسے آپ ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔ یہ کچھ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ کے الفاظ دہرا لینے سے نہیں ہوتا۔ سوچیے ہے کسی کے دل میں یہ یقین!

ایمان بالآخرت کی عملی شکل

عزیزانِ من! یہ یقین ہو تو پھر اس قسم کی کوئی چیز سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ انسان اتنا بے خوف ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اب یہ یقین نہیں

Marfat.com

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مخالفین کھلے بندوں یہ کہہ دیتے تھے کہ ہمیں اس کا یقین نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ اب تو سیکولر والوں نے کھلے بندوں کہا: ہم منافقت برتتے ہیں۔ عموماً افراد اپنی زبان سے یہ نہیں کہتے کہ ہم منافقت برتتے ہیں کیونکہ ابھی اس معاشرے میں یہ چیز ہے کہ یہ اسے برا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عملاً ان میں سے ہر شخص انکار کر رہا ہے اور یہ اس کا Trust ہے' یہ ٹرسٹ ہے عزیزانِ من! جو آج کل آپ کے سامنے آتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں رسم بن کے رہ گئیں۔ رمضان کے مہینے میں روزہ ایک ایسی چیز ہے کہ مئی جون کی گرمیاں ہوں' دوپہر کی شدت ہو' پیاس سے تڑپ رہے ہوں' کمرے میں تنہائی ہو' ٹھنڈے پانی کی صراحی بھی رکھی ہوئی ہو' کوئی دیکھنے والا بھی نہ ہو' اس شدتِ پیاس کے باوجود آپ پانی کا ایک گھونٹ نہیں پیتے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ چیز بھی ہمارے ہاں ایک رسمی سی ہو گئی ہے کہ روزے میں صبح سے شام تک نہ کھایا جائے' نہ پیا جائے کیونکہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں محض اک ٹوٹ جانے کا خیال ہے' ورنہ یہ چیز نہیں ہے کہ ''جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو بھی شدتِ پیاس کے باوجود میں نے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی''۔ اگر اس چیز کا ایمان ہے کہ مجھے ایک دن کسی عدالت کے سامنے جانا ہے' مجھے میرے کیے کی سزا ضرور ملنی ہے تو معاشرے کا کوئی فرد کسی قسم کا کوئی جرم کر ہی نہیں سکتا۔

تمام تر معاشرتی تباہیوں اور بربادیوں کی وجہ اور اس کا علاج

ایسا شخص جو روزے میں پانی نہیں پی رہا ہوتا' یہ ایمان اس کے دل میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی فقہ ہی کا مسئلہ لیے بیٹھا ہوتا ہے کہ اگر میں نے پانی پی لیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ بعض چیزیں تو آدمی Habitually کرتا رہتا ہے' عادتاً کرتا رہتا ہے۔ ایسی ہی ہماری نمازیں اور ہمارے روزے ہیں۔ میں ہر ایک کو یہ چیز نہیں کہتا۔ روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے کے باوجود ہمارے معاشرہ میں یہ ساری تباہیاں آ رہی ہیں۔ یہ کیوں آ رہی ہیں؟ بہر حال ابھی آپ کے ہاں معاشرے میں دو' چار' دس فیصد صحیح روزہ دار ہیں۔ یہ اکیلے تنہائیوں میں جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا' اس وقت بھی پانی نہیں پیتے اگر یہ چیز اس ایمان پر ہو کہ میرے ہر عمل کا نتیجہ میرے سامنے آنا ہے' اس وقت کے پانی پینے کا بھی آنا ہے تو اس طرح کے ایمان والا شخص باہر جا کے یہ کچھ نہیں کرے گا' جہاں فرض کرو کوئی نہ دیکھنے والا ہو یا اسے یقین ہو کہ یہاں دیکھنے والا نہیں ہے تو بھی وہ کوئی چیز خلافِ قانون نہیں کرے گا۔ لیکن آج روزہ رکھنے کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے: روزہ نہیں توڑے گا۔ وہ جیل کاٹ رہا ہوگا۔ پکڑا جائے گا تو اس کے بعد وہ کہے گا کہ ''میرے لاگے ناں آئیں' میں روزے ناں آں''[1] اور روزے کے ساتھ تو آپ کو پتہ ہے روزے کی شان ہوتی ہے۔ اس وقت تو عام طور پہ کہتے سنا ہوگا: ''او مینوں کجھ نہ کہیں' اوئے میں روزے نال ہیگا ایں' جیوں شارٹ مار داہیگا اے''[2]۔ گرمیوں کے دن کے روزے میں عصر کے وقت آپ دیکھیے' ہر روزے دار شارٹ مارتا ہے حالانکہ اس کو ضبط سکھایا گیا تھا' اس کو تو سہار سکھائی گئی تھی' اس کو تو برداشت کرنا سکھایا گیا تھا۔ سب سے زیادہ برداشت کرنے والا روزے دار ہوتا ہے۔ اس کا اپنے ہاں سارا دن برداشت کا امتحان ہو رہا ہے اور آج سب سے زیادہ بے برداشتہ وہ روزے

---

[1] ارے میرے پاس نہ آنا' میں روزے سے ہوں [2] ارے مجھے کچھ نہ کہنا' میں روزے سے ہوں۔ یوں ہوتا ہے جیسا کہ کرنٹ لگا رہا ہے۔

Marfat.com

دار ہوتا ہے۔ دیکھا ایک چیز کے رسم کے طور پہ ادا کرنے اور ایک چیز کے مفہوم کے اعتبار سے ادا کرنے میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ آج یہی چیز ہم میں نہیں ہے کہ ''میں اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہوں۔'' ہم صرف رسمی طور پر یہ کچھ کیے جا رہے ہیں' اس کام کی حکمت کیا ہے' وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ یہی معاشرتی برائیوں کی وجہ ہے۔

صلوٰۃ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد اور ہمارا عمل

صلوٰۃ کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (29:45)۔ ہر بے حیائی سے' ہر نامعقول حرکت سے صلوٰۃ تمہیں روک دے گی۔ کیا آج یہ صلوٰۃ روک رہی ہے؟ اس صلوٰۃ کی صاحب! کتنی پابندی ہوتی ہے: اذان آئی' سارے کام چھوڑ دیئے' نہیں' بھائی! میں نے باجماعت نماز پڑھنی ہے' میں نے آج تک کبھی کوئی نماز باجماعت سے قضا نہیں کی۔ چلے جا رہے ہیں' صلوٰۃ کے لیے بھاگے ہوئے جا رہے ہیں' پوری شدت سے پڑھ رہے ہیں' اس کے سارے ارکان و تعدیل اسی طرح سے ادا کر رہے ہیں۔ یہاں تک ہاتھ اٹھاؤ' یہاں باندھو' اتنا جھکو' یہ زاویہ بنے۔ یہ تمہارے الفاظ؟ ہاں! ان کا تلفظ یوں صحیح ہو' مخرج میں یوں ہو۔ یہ سارا کچھ کر رہے ہیں بلکہ ان کے Behalf وہ کر رہا ہوتا ہے اور یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ پھر آج جا کے آٹے میں کیا ملانا ہے۔ جی! وہ کونسی صلوٰۃ ہے جو روکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ہر قسم کے بے حیائی کے کاموں سے' ہر قسم کے گناہ سے' الصلوٰۃ تمہیں روک دے گی۔ آج کیوں نہیں روک رہی؟ Habits ہو جاتی ہیں' مذہب میں یہ چیزیں Habit کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ یہ ساری بحثیں کہ چار رکعتیں ہیں یا دو رکعتیں ہیں' ایک سجدہ ہے۔ یہ تمام محض رسماً اور عادتاً ہوتی ہیں۔ سوال تو یہ تھا کہ آج صلوٰۃ برائیوں سے نہیں روکتی۔ کیوں؟

اچھے یا برے راستے پر چلنے کا اختیار انسان کے اپنے پاس ہے

قرآن کریم نے کہا تھا کہ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (29:45)۔ جو صلوٰۃ تمہیں برے کاموں سے روکے گی' آپ اسے قرآنی صلوٰۃ کہیں گے' جی! کہا کہ یہ وہ چیز ہے جس کی بناء پہ جرأتیں بے باک ہو جاتی ہیں۔ جب اس سے ایمان اٹھ جائے کہ زندگی آگے بھی چلنی ہے' میرے ہر عمل کا نتیجہ میرے سامنے آنا ہے تو زندگی کی ڈگر بدل جاتی ہے۔ وہ صلوٰۃ قرآنی صلوٰۃ نہیں رہتی۔ کہا: یہ وجہ ہے کہ برائیاں نہیں رکتیں۔ اب وہ سمجھ لیا جو کہا تھا کہ جو غلط راستے پہ چلتا ہے' اسے کوئی صحیح راستے پہ نہیں لا سکتا۔ یہ نہیں ہے کہ اسے خدا غلط راستے پہ چلاتا ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ یہ سوال ان کی طرف سے اٹھا ہے کہ صاحب! ہمارے سامنے مرگیا' دیکھا کہ جسم ریزہ ریزہ ہو گیا' طبعی جسم کی Disintegration ہو گئی۔ اس کے بعد پھر نئے سرے سے اٹھنا ہے۔ قرآن تو یوں بات کرتا ہوا آگے چلا جاتا ہے۔ اَوَلَمۡ يَرَوۡا (17:99)۔ لہٰذا یہ کہا ہے کہ انہوں نے اعتراض تو فلسفیانہ سا' تدریجی سا' اٹھایا ہے۔ دراصل ''یروا'' کے معنی ہوتا ہے: ''جو چیز محسوس طور پہ سامنے دیکھ لو''۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ بات چھوڑ دو۔ ان سے کہو کہ ذرا دیکھو تو سہی' کیا تم نے یہ نہیں دیکھا ہے؟ کہا: اَنَّ اللّٰهَ

Marfat.com

اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (17:99)۔ یہ تو مانتے ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب یہ ارض و سما' یہ کائنات' نہیں تھی اور پھر یہ سب کچھ وجود میں آ گیا تو جس خدا کی یہ کیفیت ہے کہ جب کچھ بھی نہیں تھا' وہ اتنی بڑی کائنات وجود میں لے آیا۔ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (17:99)۔ تو کیا اب اس کو اتنی بھی قدرت' اتنا بھی اختیار' نہیں رہا ہے کہ بہر حال کچھ تو' ریزہ ریزہ ہی سہی' چلو تمہاری بات مان لیں' کچھ نہ ہونے سے اس نے اتنی بڑی کائنات پیدا کر دی او! یہ ریزہ ریزہ بھی تو کچھ موجود ہو گا تو کیا ''مِثْلَهُمْ'' اس کی مثل پہ میں ایک زندگی پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا دلیل ہے! بڑے سے بڑا دہریہ Scientist بھی اس چیز سے انکار نہیں کر سکتا صاحب! کہ یہ کائنات عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں آئی ہے۔ کہا: اتنی سی بات ہے' تم یہ کہتے ہو یہ یونہی By chance ہو گیا۔ کہا: یہ تو تمہارے Scientific اصول کے خلاف ہے۔ تم تو سائنس کی دنیا میں چانس (Chance) کو مانتے ہی نہیں ہو۔

یہ پوری کائنات Cause & Effect پر مبنی ہے

سائنس کی دنیا اور توہمات کی دنیا میں فرق ہے۔ توہمات میں کہتے ہیں کہ ''جی! پتہ نہیں ہے ایویں ایناں نوں تاپ چڑ گیا ہیگا''[1] Scientist یہ نہیں کہتا کہ ''ایویں'' چڑ گیا[2]۔ یہ کہنا اس کے اصولِ سائنس کے خلاف ہے کہ ایویں چڑھ گیا۔ وہ تو ہر Effect کا Cause بتائے گا کہ یہ اس لیے چڑھ گیا۔ Scientist سے یہ کہا کہ تم بتاؤ' تم تو بائی چانس (By Chance) نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں Scientist یا سائنس تو اپنا اعترافِ علل کر رہی ہے۔ کہا: کائنات کے سلسلہ میں تو مانتے ہو کہ یہاں کچھ نہیں تھا لیکن پھر بھی یہ کائنات وجود میں آ گئی' کوئی میٹریل (Material) پہلے نہ تھا۔ مسالہ نہ تھا' وہ اتنی بڑی کائنات وجود میں لے آیا تو کیا اب اس کی قدرت میں یہ نہیں رہا؟ یہاں تو بہر حال ہڈیاں' چورا' کچھ نہ کچھ جتنا بھی ہے' تھا تو سہی۔ Disintegrate ہی ہوا ہے ناں۔ تم تو خود کہتے ہو: مادہ (Matter) کبھی بھی معدوم نہیں ہو سکتا۔ سائنس کا اصول ہے کہ مادہ (Matter) شکل تو بدلتا ہے' معدوم نہیں ہوتا۔ تو شکل ہی بدلی ہوئی ہے۔ جب وہ کچھ نہیں تھا تو اس نے اتنا کچھ بنا دیا تو اب تمہارے ذہن کے مطابق' تمہارے جسم کی کچھ شکل بدلی ہے تو وہ دوبارہ یہ شکل نہیں پیدا کر سکتا۔ چلو' تمہارا ہی اصول لیا جائے لیکن اس نے یَخْلُقَ مِثْلَهُمْ (17:99) کہا ہے کہ کیا اس زندگی کی مثل وہ ایک زندگی پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا بات ہے قرآن کی صاحب! مِثْلَهُمْ ٹھیک ہے' یہی نہیں کہ یہی گوشت' اسی قسم کا' اسی شکل کا' اسی طبعی جسم کا' یہ انسان! مثلھم۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے۔ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ (17:99)۔ یہاں تو طبعی زندگی کی ایک مدت متعین ہے۔ اس طبعی زندگی کی مدت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے کہتے ہو کہ آگے ناممکن ہے تو جس نے یہ پہلی طبعی زندگی کو تخلیق کیا ہے' اس کے لیے اس کی مثل تخلیق کر دینا کونسا مشکل ہے۔

---

[1] جی ہمیں معلوم نہیں ہے' انہیں یونہی تپ چڑھ گیا ہے۔

[2] کہ یونہی' بلاوجہ ہو گیا ہے۔

Nothingness (معدوم) سے Being (ہستی) میں آنے تک کا عمل

آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک بدو کے لیے یہ دلیل اور آج کے آپ کے ہاں کے سب سے بڑے Scientist (سائنسدان) کے لیے بھی یہ دلیل۔ کیا خوب ہے! آج کا یہ سائنسدان ۱۴۰۰ سال پہلے کا وہ بدو نہیں ہے۔ وہ اس بناء پہ اس کا انکار نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اس کو مانتا ہے کہ یہ Nothingness سے Being میں آئی ہے اور یہ پوری کی پوری کائنات ہمارے اصولِ سائنس کے خلاف نہیں اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ آج بھی اس کائنات میں اضافہ اصولِ سائنس کے خلاف نہیں ہے۔

مومن کی پہچان اس فکر سے ہوتی ہے کہ میری انتہا کیا ہے

یہ سائنسدان ابتدائے آفرینش کی بات اس لیے مانتے ہیں کہ اس سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور انتہا کی بات سے اس لیے انکار کرتے ہیں کہ ساری ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں۔ اصل بات تو ذمہ داری کی ہے۔ اسی لیے وہ جو ایک مردِ مومن اقبالؔ (C.1877-1938) کی پکار ہے' بڑی اہم ہے۔ وہ بڑی بات صاف کر گیا ہے کہ:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں' میری انتہا کیا ہے [1]

مومن کی یہی فکر ہے کہ میری انتہا کیا ہے۔ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (17:99)۔ کچھ تو یہ ہے کہ ظلم کرنے والے لوگوں کی باتوں سے نفرت یا انکار بڑھتا ہے۔ ان کے اسی فعل (Action) کی بناء پر تو کہا ہے: ظلم کی بناء پہ پکڑے جائیں گے۔ ان کا انکار ضد نفرت اور ہٹ دھرمی ہی انہیں ادھر نہیں آنے دیتی ورنہ عقل وفکر کی بناء پہ تو بڑے سے بڑا سائنسدان' Scientist بھی یہاں آکے مجبور ہو جائے گا کہ اس کو تسلیم کرے۔ باقی رہا یہ کہ تم وہ نظام چاہتے ہو' جس سے ظلم مٹتا ہے تو ٹھیک ہے' اس کے لیے آپ کو کچھ خرچ بھی کرنا پڑے گا' قربانیاں دینی پڑیں گی' ایثار کرنا پڑے گا۔ یہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ تم اپنے بدن کی صحت کو قائم رکھنے کے لیے کتنی محنت کرتے ہو۔ جسے پرہیز کہتے ہیں وہ یہی ایثار ہی تو ہے کہ یہ نہیں کھانا' اتنا کھانا ہے' اتنا سونا ہے' اتنا سیر کرنا ہے۔ تم نے کتنی پابندیاں عائد کی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہتا ہے: اس کے لیے بھی تو یہ کچھ کرنا پڑے گا۔ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (17:100)۔ اور پھر یہ بات نہیں کہ تمہیں یہ ڈر ہے کہ صاحب! اگر ہم نے صرف یہ کر دیا' دوسروں کی مدد کرنے کے لیے یہ دیدیا تو ہم بھوکے مر جائیں گے' ہمارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ تم میں ایسے بھی ہیں کہ جن کے پاس اس کے باوجود بہت کچھ رہتا ہے۔ وہ بھی یہی کچھ کرتے ہیں' کچھ اس میں سے چار پیسے دینے کے لیے موت پڑتی ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟

---

[1] اقبال: بالِ جبریل' 1996' ص۔ 70

Marfat.com

کہنے لگا کہ اگر انسان کو اس کی حالت کے اوپر چھوڑ دیا جائے تو یہ بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔ اس کے قلب کے اندر کشادنہیں پیدا ہوتی۔

غلط نظام کے اندر پیدا ہونے والے خدشات

قرآن قلب کے اندر کشاد پیدا کر دیتا ہے اور پھر یہ بات' عزیزانِ من! یہی نہیں ہے کہ جی وہ توکل بخدا بیٹھے ہیں۔ توکل بخدا بیٹھنے والے بھوکے مرجاتے ہیں۔ یہ اس نظام کے اندر ہوتا ہے' جہاں رزق کی تقسیم خدا کے قاعدوں کے مطابق ہوتی ہے' وہاں کسی کو یہ پریشانی نہیں ہوتی کہ اگر میں نے یہ دیدیا تو کل کو اپنے تنگ حال وقت میں میری مدد کون کرے گا۔ یہ باطل نظام ہے جس میں ہر وقت یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے یہ کچھ دیدیا تو کل کو مجھ پہ مصیبت پڑی' اگر میرے بچے بھوکے رہ گئے' کل کو یتیم ہی ہو گئے تو ان کو کون پوچھے گا۔ انہیں ایک وقت کی روٹی بھی کہیں سے نہیں ملے گی۔ یہ ہے وہ چیز جو غلط نظام کے اندر انسان میں ایثار کا جذبہ پیدا نہیں ہونے دیتی۔ انسان کے قلب میں کشاد پیدا ہونے والی یہ چیز وہیں پیدا ہو سکتی ہے جہاں یہ کہا جائے گا: اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:16)۔ ہم تمہارے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:152)۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں' تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ چھوٹی سی رقم کی انشورنس کرا کے آدمی آدھی رات اطمینان سے سو جاتا ہے' کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ ایسا وقت آیا تو کچھ بچت ہو جائے گی اور اگر تمہاری اور تمہاری اولاد کی بھی پوری Insurance دی ہوئی ہو تو اس کے بعد کسی فکرمندی کا سوال ہی نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے وہ دردِ سر کا ہے کو لینا ہے' مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے ہاں یہ چار پیسے سنبھالتا پھروں۔

انسان کی ذمہ داری تو صرف اس نظام کو قائم رکھنا ہے اور بس

یہاں اس عالم النفس میں تو صرف تمہیں اس نظام کو قائم و دائم رکھنا ہے۔ باقی رہا تمہاری اور تمہاری اولاد کے رزق کا مہیا کرنا' یاد رکھو کہ اس کا دینا میری ذمہ داری ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ میں اس Insurance کے بعد جو تم نے ہمیں دے رکھی ہے اسے اپنے لیے رکھوں:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

اسے ایمان کہتے ہیں۔ یہ اُس نظام میں حاصل ہوتا ہے عزیزانِ من! جو اس بات کی ضمانت دیتا ہے۔ یہاں انسان یہ کہتا ہے کہ ایک تم ہمارے ہو' یہ ہے Insurance! باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے۔ اس سے کس قدر سکون کی زندگی بسر ہوتی ہے!

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا

کیسے بنا دیا؟

جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

Marfat.com

اس نظام کا نتیجہ: نہ خوف نہ حزن

''ایہدی فیس ٹھیں دینی جی''❶ جوغم ملا' اسے غمِ جاناں بنادیا۔ یہ عزیزانِ من! نظام قائم کرنے والی بات آئی ہوئی ہے۔ یہ قرآن کے فقہی مسائل نہیں ہیں کہ جن میں کہا گیا ہو کہ ہاتھ یہاں باندھ لو' ہاتھ یہاں چھوڑ دو' گو یہ بھی قوموں کے اندر Discipline پیدا کرنے کے لیے نہایت ضروری چیزیں ہیں جیسے سپاہی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بوٹ کا تسمہ کیسے باندھو' تمہاری پیٹی کیسی ہونی چاہیے۔ یہ نظم وضبط سوسائٹی ہے۔ اصل چیز اقدار ہیں' جن پر ایمان کی ضرورت ہے صاحب! وہ نظام ہے جس میں یہ Insurance ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ نظام ہے' جسکے لیے شروع سے ٹکراؤ چلا آرہا ہے۔ مفاد پرست قوتیں اس کو قائم ہونے دینا نہیں چاہتیں۔ حق کا علمبردار اسے قائم کرنے کے لیے' اس رہن گاہ میں اترتا ہے اور سب سے بڑی مثال قرآن ہمیشہ کشمکشِ فرعون وموسیٰ کی دیتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا (17:101)۔ اس کشمکش کے اندر کیا ہوتا ہے؟ کہا: قاعدہ یہ ہے کہ یہی نہیں ہوتا کہ قومیں یکلخت پہلی ہی غلطی کے اوپر تباہ کردی جاتی ہیں۔ غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے خمیازے سامنے آتے ہیں۔ بظاہر یہ چیزیں چھوٹی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ مملکت ہی غرق ہوجاتی ہے۔ ہم نے موسیٰ کو قومِ فرعون کی آخری تباہی سے پہلے نوکھلی کھلی نشانیاں دی تھیں۔ جب موسیٰ قومِ فرعون کی طرف آیا تو فرعون نے سب کچھ سننے کے بعد اس سے کہا: یا تو تمہیں خود کو دھوکا لگ گیا ہے یا تم دوسروں کو دھوکا دیتے ہو۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی باہمی گفتگو

فرعون کو حضرت موسیٰ نے کہا تھا کہ یادرکھو کہ ہر غلط معاشرے کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ جواب ملا تھا کہ جاؤ جاؤ تم دھوکے میں ہو' یا فریب دینے والے ہو یا فریب خوردہ ہو۔ ہماری مملکت کے اس طول وعرض میں بہت کچھ ہے۔ پوچھیے نہیں اگر پہاڑوں کو کھودیں تو ہم ساری دنیا میں سونا سپلائی کرسکتے ہیں۔ ٹھیک ہے' کھودوتو پھر سپلائی ہوتا ہے۔ یہاں فرعون کی طرف سے قرآنِ حکیم ایک جامع لفظ لایا ہے کہ اے موسیٰ! تم فریب خوردہ ہو' تم جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے ہو کہ ہماری Potentialities کیا ہیں' ہم کیا کرسکتے ہیں۔ دراصل جو بھی صحیح بات کہتا ہے' اسے یہی کہا جاتا ہے یا اسے پاگل قرار دے دیا جاتا ہے' یا اس کو دھوکے باز کہا جاتا ہے۔ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (17:102)۔ حضرت موسیٰ نے اس کو یہ جواب دیا کہ فرعون! بات یہ نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' یہ قیاس نہیں ہے' اندازے نہیں ہیں' فریب خوردگی اور فریب کاری

---

❶ ابھی! اس کی کوئی فیس نہیں دینی۔

Marfat.com

نہیں ہے' کچھ حقائق ہیں جنہیں بیان کرتا ہوں اور علم کی بنیادوں پر یہ بیان کر رہا ہوں' اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' کائنات کے پروردگار کی طرف سے یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم مجھے یہ کہہ رہے ہو کہ میں: رَجُلٍ مَّسۡحُوۡر فریب خوردہ ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسے انسان ہو جو تباہی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ دیکھو' تم تو کنویں میں گرے۔۔۔ کیا جواب ہے صاحب! میری فکر چھوڑو' اپنی آنکھیں کھول کے دیکھو۔ میں تمہیں دیکھ رہا: یٰـفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًا (17:102)۔ اے فرعون! تم برباد ہو رہے ہو' تم میں عقل کی کمی ہے' تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ فَاَرَادَ اَنۡ یَّسۡتَفِزَّهُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ (17:103)۔ اس کے بعد کا آخری حربہ تو یہ ہے کہ ان کو ملک سے نکال باہر کرو۔ دو بڑے آئے رسول بن کے ہمیں سمجھانے والے! جب مستبد کی' ظالم کی' نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو سننا تو ایک طرف رہا' وہ کہتے ہیں کہ سننے والے بھی اس طرح سے کہتے ہیں: نظر بند کر دو' ملک سے باہر نکال دو' پھانسی پہ چڑھا دو کہ سنانے والا بھی کوئی نہ رہے۔ کہا: یہ وقت آتا ہے' وہ مقام آجاتا ہے۔ پھر؟

قوموں کی تباہی ہمیشہ اپنے محسنوں کو فراموش کر دینے سے ہی واقع ہوتی ہے

فَاَغۡرَقۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ جَمِيۡعًا. وَّقُلۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ لِبَنِىۡۤ اِسۡرٰٓءِيۡلَ اسۡكُنُوا الۡاَرۡضَ (17:103-104)۔ اتنی بڑی مملکت کا مالک تباہ ہو گیا' ختم ہو گیا۔ اس مقام پہ وہ ختم ہوتے ہیں' جو کہنے والے کی بات سننے کی تاب نہ لائے اور اس کا گلہ گھونٹ دے کہ یہ بات نہ کہے۔ جب بات کہنے والا ہی کوئی نہیں رہے گا' تباہی تو آئے گی عزیزانِ من! وبائی امراض کے زمانے میں آپ ڈاکٹروں کو نکال کے باہر بھیج دیجیے تو اس کے بعد پھر دیکھو' تباہی آتی ہے یا نہیں؟ کہنے والا آپ نے ختم کر دیا۔ یہ کرتے یہ ہیں کہ جو صحیح بات کہتا ہے' اس کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں۔ کیا بات ہے تباہی کی! اس کہنے والے کا گلہ گھونٹ دیجیے' پھر بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہ وہی بنی اسرائیل قوم تھی جنہیں تم نے اپنے ہاں اس طرح محکوم اور مغلوب قوم بنا کے رکھا تھا۔ وہی قوم اتنی بڑی مملکت کی وارث ہو گئی لیکن ہم نے ان سے بھی یہ کہہ دیا کہ یاد رکھو! اس طرح سے یہ مملکت تمہیں مل تو گئی ہے لیکن وہ ملی ہے عظیم رہنما حضرت موسیٰ کے تدبر اور ایمانداری اور شرافت کے صدقے میں۔ اب اسے سنبھالنا تمہارا کام ہے۔

ہم نے بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ یہ تمہیں مل تو گئی ہے' اگر تم نے بھی یہی کچھ کیا' جو فرعون نے کیا ہے تو تمہارا بھی وہی حشر ہو گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ کیا فرعون سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی تھی؟ ہم نے کہہ دیا تھا کہ نہ فرعون سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی تھی' نہ تم ہماری چہیتی اولاد ہو۔ یہاں تو اصولوں کی بات ہے۔ اس نے غلط روش اختیار کی ہوئی تھی' وہ تباہ ہوا۔ تم غلط روش اختیار کرو گے' تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس کو بھی مہلت ملی تھی' تمہارے ہاں بھی یہ ہو گا۔ ایک دفعہ سو سال تک کے لیے تباہی آئے گی' یاد کرو گے کہ تباہی کیا ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! بابل کی اسیری کا زمانہ آیا۔ آپ بنی اسرائیل کے اس زمانے کے نوحے دیکھیے۔ عزیزانِ من! پھر بھی ان سے سنبھلا نہیں گیا۔ کہا: پھر اگر

Marfat.com

دوبارہ یہ کچھ کرو گے تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔

افراد زندہ رہتے ہیں مگر قوم زندہ نہیں رہتی

ہم نے ان سے کہہ دیا تھا: فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيۡفًا (17:104)۔ تو پھر یاد رکھو اس کے بعد تمہاری پوری کی پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔ تباہی کے یہی معنی نہیں ہوتے کہ اس قوم کے افراد کو زمین نگل جاتی ہے' وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔ نہیں' ان افراد کو زمین نہیں نگل جاتی بلکہ وہ چلتی پھرتی لاشیں رہ جاتی ہیں اور اس طرح ان کا شمار زندہ قوموں کے زمرے میں نہیں ہوتا۔ وہ ذلیل ہوتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہوتا ہے کہ مٹ جائیں عزیزانِ من! زندہ رہنا اور ذلیل و خوار ہو کر زندہ رہنا! اس سے تو مٹ جانا' معدوم ہو جانا' ختم ہو جانا لاکھ درجہ بہتر ہے' اچھا ہے:

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ عشق میں بلا ہے
کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا مگر ایک بار ہوتا [1]

ختم ہو جانا تو زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ابھی تک زندہ ہو' سانس لے رہے ہو' چل پھر بھی رہے ہو۔ وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ (17:105)۔ چنانچہ راہنمائی کے سلسلہ میں تمہارے لیے خدا کی طرف سے ایک موقع پھر آ گیا۔ یہ صحیفہ حق کے ساتھ اتارا ہے۔ تم تک یہ حق کے ساتھ پہنچا ہے۔ چلا ہے تو اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ پہنچا ہے تو راستے میں بھی کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ اس فقرے میں بڑی عجیب چیز ہے۔ وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ (17:105)۔ عربی جاننے والے اس سے لطف اندوز ہونگے کہ یہ ''انزلنٰہ'' اور ''نزل'' کے کیا معنی ہوگئے۔ خیر' کہاں تک بڑھاؤں داستان! وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا (1:105)۔ اے رسولِ ﷺ خدا! ہم نے تمہیں بھی موسیٰ کی طرح رسول اسی لیے بھیجا ہے تاکہ انہیں ان لوگوں کی غلط سوچوں کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو' صحیح راستہ چلنے والوں کو بشارت دو کہ تمہارا ہر قدم تمہاری منزل کو تمہارے قریب لاتا چلا جا رہا ہے' اس لیے تمہیں بھیجا ہے۔

قوموں کی تعلیم و تدریس کا طریق اور انقلاب کا قرآنی مفہوم

وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ وَّنَزَّلۡنٰهُ تَنۡزِيۡلًا (17:106)۔ ان کا بھی یہ تقاضا تھا کہ یہ سارا قرآن ''جملۃ واحدۃ'' کیوں نہیں نازل ہوگیا۔ ایک ہی جگہ یہ جو ساری کتاب ہے' وہ نازل ہو جائے۔ عزیزانِ من! قوموں کی تعلیم' تدریس' اصلاح' بتدریج (Gradual) ہوتی ہے۔ یہ اصلاح آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ Over night فساد (Disorder) تو برپا ہو سکتا ہے'

---

[1] غالب کا یہ شعر اور مطالب الفرقان فی دروس القرآن النحل کے صفحہ نمبر 102 پر چھپنے والا یہی شعر دیوانِ غالب میں یوں تحریر ہے:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

Marfat.com

انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ انقلاب (Revolution) کا تو مادہ (Root) ہی (ق ل ب) ہے' یہ تو دل کے بدلنے سے ہی بدلا جاتا ہے اور دل کے بدلنے میں تو بڑا وقت چاہیے۔ جو کچھ پہلے سے چلا آ رہا ہے' اس کو مٹانا' پھر اس کی جگہ حق کی بات کہنا ہے' یہ لمبا پروگرام ہوتا ہے۔ یہ راتوں رات کی چیز نہیں ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ ایک فرد کا نام بدل دیں گے تو کچھ وقت کے بعد انسان اس نام سے مانوس ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی صبح کو یہ اعلان کر دیجیے کہ لاہور کی ہر سڑک کا نیا نام رکھ دیا گیا ہے تو اس کے بعد ''دیکھو ہونداکی اے ایتھے فیر''[1] یہ ہے وہ انقلاب جس کے لیے کہا جا رہا ہے۔ جسے یہ انقلاب کہتے ہیں یہ فساد ہوتا ہے' یہ Disorder ہوتا ہے۔

انقلاب بتدریج آتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تک نفسیات میں تبدیلی نہیں ہوتی' تمہارے ذہن اور قلوب نہیں بدلتے' خارجی ماحول میں صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ تباہی تو آ سکتی ہے' فساد تو برپا ہو سکتا ہے مگر اصلاح (Reformation) نہیں ہو سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسی لیے بتدریج نازل کیا تھا کہ یہ ایک درسی کتاب (Academic Book) تھی۔ لڑکے کو بتدریج پہلی جماعت سے ایم اے تک لے جانا تھا' ان میں آہستہ آہستہ ہی ترقی ہونی تھا۔ اس لیے ہم نے اس کو ایسے نازل کیا ہے اور اسی لیے تم بھی اسی طرح سے قوم کی اصلاح کرو' بتدریج اصلاح کرو۔ یہ ہے اصلاح کا طریقہ عزیزانِ من! میں کہا کرتا ہوں کہ قوم کے اندر صحیح اصلاح کا صرف ایک ہی طریقہ ہے: نوجوان نسل کی تعلیم ہی اس انداز سے کی جائے کہ ان کے دل ونگاہ کو بدل دیا جائے تو قوم خود بخود بدلی ہوئی آپ کے سامنے آ جائے گی۔ جس قوم کے ہاتھوں آج آپ ٹوٹ رہے ہیں' یہ ہماری تیار کردہ وہ قوم ہے جسے ہم نے گذشتہ پچیس سال میں بنایا ہے۔ کم بختو! یہ ہمارے نوجوان جن کے ہاتھوں آپ اپنا رونا رو رہے ہیں' کن کے بنائے ہوئے ہیں؟ کنھوں نے ان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس قسم کی کی ہے؟ ہم نے کی ہے لیکن ہم ہیں کہ اس کا الزام اپنے سر لیتے ہی نہیں۔ یہی چیز تو ہماری بربادی کی وجہ ہے' یہی تو ہماری کمزوری ہے۔ یہ منافقت ہے کہ ہم سارا الزام ان کے اوپر دے مارتے ہیں کہ یہ نوجوان بے حیا ہو گیا ہے' یہ بدتمیز ہو گیا ہے' سرکش ہو گیا ہے' بیباک ہو گیا ہے۔ یعنی اس بگاڑ میں ہماری کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ کس نے یہ ایسا کیا ہے؟ تم اس کے ذمہ دار ہو اور یہ ہے بتدریج اصلاح کرنے کا طریقہ۔ آپ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کیجیے۔ قرآن کو اس طرح تئیس سال تک بتدریج نازل کرنے کا یہ مقصد ہے۔

قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریق

عزیزانِ من! اس کے سمجھنے کا بھی یہی طریق ہے۔ اس کو بتدریج سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک ایک منزل سے بتدریج گزر کے اسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (17:107)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اگر تم خدا کے احکامات نہ مانو گے تو پھر وہ کائنات ڈھے جائے گی۔ سارا دارومدار تمہارے اوپر ہے۔ یہ سارا کچھ تم نے مان لیا تو خدا' خدا ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ ساری دنیا

[1] پھر دیکھو کہ یہاں پھر کیا کچھ ہو جاتا ہے۔

آنکھیں بند کرلے‘ سورج پھر بھی روشنی دیتا چلا جائے گا۔ وہ روشنی دینے کے لیے تمہارا محتاج نہیں ہے‘ تم اس کے محتاج ہو۔ جن لوگوں کو علم ہے‘ آج جو لوگ علم رکھتے ہیں‘ وہ دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کیا ہے۔ وہی بات جو میں نے پہلے کہی تھی کہ قرآن علم کا متقاضی ہے۔ یہ اس طرح علم سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہتا ہے: ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے یہ آیات آتی ہیں‘ یہ غور وفکر کرتے ہیں تو وہ اس کے سامنے بے ساختہ جھک جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وَيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (17:108) ۔ وہ اس پہ یقین رکھے ہوتے ہیں کہ ہاں جو کچھ تُو اس کے اندر کہتا ہے‘ یہ واقعی ہو کے رہے گا۔ اب علم کی بنیادوں کے اوپر یہ یقین حاصل ہوگا۔ یہ یقین (Conviction) حاصل ہو کے رہے گا۔

دل کی گدازی انسان کو حساس بنادیتی ہے

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (17:109) ۔ وہ جب پھر اپنی یا اپنے معاشرے کی اس قسم کی حدود شکنی‘ قانون فراموشی‘ اس قسم کی تباہیوں‘ بربادیوں‘ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو واقعی دل کی گہرائیوں سے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگ جاتے ہیں کہ یہ ”کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہوگا؟“ اس سے ان کے دل کا گداز زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ جس طرح بھی ممکن ہو اس قوم کو بچا لیا جائے۔ اس کے بعد ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں‘ یہ رونے لگ جاتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ وہ یہ نہیں ہوتا کہ ان کے جذبات رقیق ہوتے ہیں‘ ان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں کہ وہ یہ دیکھ کر اس لیے رونے لگ جاتے ہیں کہ اگر یہ کچھ نہ کیا گیا تو کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس احساس سے ان کے دل کی گدازی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کا دل آنسو بن کے ٹپک پڑتا ہے کہ اگر ہماری یہ چیز نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ بعض اوقات انسان کم ہمتی کی بناء پر بھی رونا شروع کر دیتا ہے لیکن یہ تو اعصاب کی کمزوری ہے۔ جبکہ ایک رونا یہ ہے کہ اپنی تباہی‘ اپنے انجام پہ نگاہ رکھ کے‘ اور اس سے متاثر ہونے کے بعد‘ آنکھیں پرنم ہو جائیں۔ ”یا اللہ اس قوم کا کیا حشر ہونے والا ہے؟“ یہ دلِ دردمند روتا ہے۔ اس طرح سے عزیزانِ من! قوم کی حالت کو دیکھ کے‘ خود رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت تھی۔ جو جتنا زیادہ حساس ہوتا ہے اتنی ہی اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

خدا کا صحیح تصور صرف قرآن حکیم میں محفوظ ہے

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (17:110) ۔ عربوں کے ہاں اللہ کا تصور موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے والد کا نام عبداللہ تھا لیکن یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے۔ جیسے ہم خدا کی صفات (Attributes) کہتے ہیں‘ ان کے ہاں یہ صفات کا تصور نہیں تھا۔ لہٰذا اس پہ وہ اعتراض کرتے تھے کہ اس تصور کا اللہ کیوں نہیں ہے جو ہم مانتے چلے آرہے ہیں۔ اللہ کا صحیح تصور صرف قرآن نے دیا ہے یا یوں کہیے کہ قرآن حکیم نے صرف خدا کا تصور بدلا ہے۔ اور تصور بدلنے سے تو ساری بات بدلتی ہے۔ یہ جنہیں آپ صفاتِ خداوندی کہتے

Marfat.com

ہیں' یہ اس کا صحیح تصور قائم کرتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ ضد کی بات نہیں ہے کہ تم اللہ کہتے ہو' رحمٰن کیوں نہیں کہتے۔ اس نے کہا کہ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا (17:110)۔ او بھئی! رحمٰن کہو تو کیا' اللہ کہہ دو تو کیا۔ سوال یہ نہیں ہے۔ فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (17:110)۔ یہ ساری صفات اسی ذات کی ہیں۔ یہ مختلف صفات ہیں جو قرآن دیتا ہے۔ ان کی بنیادوں کے اوپر جو تصور قائم ہوتا ہے' وہ خدا کا صحیح تصور ہے۔ لہٰذا بات صرف نام کی نہیں ہے۔ آپ کو بنگلہ دیش کے اس لڑکے کا خط یاد ہوگا' عزیز الرحمٰن اس کا نام تھا' وہ ایم اے کا طالبعلم تھا۔ یہ پوچھتے ہیں بنگلہ دیش میں کیا ہوا؟ اس نے کہا تھا کہ یہ پاکستان والے جو قرآن کا اسلام یا نظام لیے پھرتے ہیں' انہوں نے ہمارا اچھا بھلا دیسی خدا جسے ہم ایشور ❶ کہتے تھے' اس کو نکال کے ایک بدیشی ❷ خدا' اللہ کو ہمارے اوپر ٹھونس دیا۔ عزیز الرحمٰن نام ہے عزیزانِ من! پھر نفرت یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ کہتا تھا: ہمارے سارے نام ہی بدل دیئے۔ یہ جو ہمارے ہاں راجیو' گاجیو' غیرہم ہوا کرتے تھے' کیسے خوبصورت نام تھے! اور ان کی جگہ کہیں سے جناب شارق اور خالق لے آئے ہو۔ سو جب نفرت بڑھتی ہے تو اس کا یہ نتیجہ (Consequence) نکلتا ہے۔ اور یہ تھی وہ قوم جو ہم نے تیار کی تھی۔

صفاتِ خداوندی کی حقیقت

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے: سوال یہ نہیں ہے کہ نام اللہ ہو یا رحمٰن ہو۔ یہ ضد کی بات نہیں۔ ہم مناظرے نہیں کرتے۔ یہ اس کی صفاتِ حسنیٰ ہیں۔ یہ اس کے Assets ہیں۔ ان میں سے اُسے اس کے کسی Asset سے پکارو' بات بن جاتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ تم اس کے بھجن گاؤ' سنکھ بجا بجا کے پکارو' ناقوس پہ اس کا نام الاپو اور اس طرح تم خوش ہو جاؤ کہ خدا کو پالیا۔ تم یہ کچھ کرتے ہو' اور خاموشی سے کرتے ہو۔ ان کی Details میں نہیں جاتے اور کہتے ہو کہ اس قسم کی چیزوں کے اندر نہیں جانا چاہیے۔ سوال یہ نہیں کہ خدا کو کس نام سے پکارا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کس قسم کے خدا کو مانا جائے' خدا ہو۔ صحیح ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ان تمام صفات کو مانا جائے' جن سے اس نے قرآن میں اپنا تعارف کروایا ہے۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (17:110)۔ یہ ٹھیک ہے کہ لفظی نزاع میں نہ پڑو۔ اسے اس کے ذاتی یا صفاتی ناموں میں سے جس نام سے بھی پکارو' ٹھیک ہے۔ یہ سب اسی ذات کے حسن وزیبائی کے متنوع گوشے (Aspects) ہیں۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں بعض نے صلوٰۃ کے معنی دعا کے لیے ہیں۔ یہ بھی قرآن شریف کے نزدیک صحیح ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں اونچی آواز سے کچھ کہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں آہستہ آواز سے کچھ کہو۔ مگر یہاں یہ بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' ان کے مختلف طریقے ہیں۔ اس کو یاد کر لیجیے۔ میں یہاں صرف یہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں خاموشی سے کہنے کے جو معنی ہوتے ہیں' وہ یہ ہیں کہ ''دل میں ایک تصور پیدا ہو جائے' الفاظ نہ آئیں''۔

---

❶ بھگوان' پرمیشور ❷ غیر ملک کا

Marfat.com

الفاظ کی بات آ گے آ ئے گی۔اونچی آواز سے آ ئیں یا وہ ویسے ہی خاموشی سے آ ئیں۔بغیر الفاظ کے صرف تصور یا خیال ہوتا ہے' یہ متعین نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔اور صلوٰۃ میں نہ تو اس کی ضرورت ہے کہ اسے چلا چلا کر پکارا جائے اور نہ ہی بالکل خاموشی ہے۔ بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

خیالات یا تصورات کے لیے الفاظ کی اہمیت

خدا نے ہمیں اپنے خیالات کو قرآن کے الفاظ میں دیا ہے۔ یہ وحی ہے۔جس میں الفاظ ہیں اور لفظوں کے معنی ہیں۔صحیح تاثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ خیال لفظ میں آ کے ادا ہو' ورنہ آپ یوں بیٹھے ہوئے خیالات کی دنیا میں' Imagination کے اندر یہ کرتے رہیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ چیز ادا نہیں ہوتی' عملاً بھی سامنے نہیں آتی۔ جب آپ اسے ایک لفظ دیدیتے ہیں تو پھر اس کی وہ متعین شکل سامنے آتی ہے۔ پھر اس کے لیے اگلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ صحیح سمت کی طرف جارہی ہے یا نہیں جارہی ہے۔ لفظ بڑی ضروری چیز ہے۔

قرآنی الفاظ کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا

کوئی خیال' جو لفظ کے بغیر پیدا ہوتا ہے' وہ آدمی کے اندر واہمہ ہوتا ہے۔کوئی لفظ بغیر خیال کے نہیں ہوتا اور اسی طرح کوئی خیال بغیر لفظ کے نہیں ہوسکتا۔اسی لیے قرآن بلفظ ہی قرآن ہے۔اس کا ذہنی مفہوم قرآن نہیں ہے کہ ہاں' ہم نے سمجھ لیا ہے۔ یہ چیز متعین الفاظ میں آنی چاہیے۔ پھر یہ متعین شکل اختیار کرتا ہے۔اسے یاد رکھیے اور یہ جو قرآن کے لفظ ہیں' ان کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی اور زبانوں میں تو ایک طرف رہا' عربی میں بھی اس کا بدل نہیں ہوسکتا اور اس کا تو یہ عجیب اعجاز ہے۔ ہمارے ہاں عربی زبان کی ایسی تفسیریں بھی ہیں کہ جنہوں نے کچھ زیادہ تفسیر نہیں کی' صرف قرآن کے الفاظ کے آگے عربی زبان کے اور الفاظ رکھ دیئے ہیں۔آپ ان کو اکٹھا کیجیے اور ان کو ایک طرف رکھیے۔ پھر آپ دیکھیے ان میں اور تفاسیر کے عربی الفاظ میں' اسی عربی زبان میں' زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ کوئی ان پڑھ لوگ نہیں تھے۔آج بھی سن و بلاغت کے امام ہیں۔آپ جلالین کو دیکھیے' باپ بیٹے کا نام ہے صاحب! لیکن ان کی تفسیر میں جہاں انہوں نے قرآن کے الفاظ کی جگہ عربی کے مرادف الفاظ لکھے ہیں' نظر آتا ہے صاحب! کہ لفظ اور لفظ میں کیا فرق ہے۔ وہ تو پھر بھی دوسرے عام انسانوں کی بات ہے۔ یہ احادیث' جن کے مفہوم سے نظر آتا ہے کہ ہاں رسول اللہ کی سچی ہوسکتی ہیں ان احادیث کو قرآن کی آیتوں کے اندر رکھ دیکھیے' دور سے نظر آ جاتا ہے کہ یہ قرآن ہے اور یہ کچھ اور ہے اگر وہ اسی رسول کے الفاظ ہیں۔قرآن میں الفاظ کی اتنی اہمیت ہے۔

اردو میں نماز کے فتنہ پر پرویزؒ کی مخالفت نیز تین نمازوں اور نوروزوں کا الزام

یہ جو فتنہ اٹھا تھا کہ اردو میں نماز پڑھ لی جائے اور پھر تعجب خیز بات یہ کہ اسے پرویز کے ذمہ لگایا جاتا ہے' جھوٹ کی کوئی حد نہیں

Marfat.com

ہوتی' سب سے پہلے میں نے' اسی پرویز نے' اس کی مخالفت کی تھی۔ کراچی میں بیٹھے ہوئے' میں نے لاہور میں قدِ آدم اشتہارات بھیجے تھے کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ سوال اردو اور عربی کی نماز کا نہیں ہے۔ سوال تو قرآن کے الفاظ کا ہے۔ قرآن تو اپنے الفاظ میں ہی قرآن ہے۔ اس کے لفظ کا متبادل کوئی اور نہیں ہوسکتا اور صلوٰۃ میں چونکہ قرآن پڑھنا ضروری ہے' اس لیے کسی دوسری زبان میں صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔ میں نے یہ قدِ آدم اشتہارات لاہور کے در و دیوار پہ آویزاں کیے۔ وہی دس برس سے آپ یہاں یہ بھی بن رہے ہونگے کہ یہ شخص تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔ پھر یہ بھی کہ یہ منکرِ حدیث بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ یہ اردو میں نماز کا قائل ہے۔ ٹھیک ہے سچ کی تو ایک حد ہوتی ہے عزیزانِ من! یعنی آپ بات سچی کہدیں بس اس کے بعد ختم۔ جھوٹ کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی' بولتے چلے جایئے۔ خالص شے کی تو حد ہوتی ہے۔ ''گوالے دی کوئی حد ای نئیں' جناں مرضی دودھ وچ پانی پائی جاؤ''[1]۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111)۔ یہ اس سورت کی آخری آیت ہے۔ آپ کو یاد ہے' میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن آخری آیات میں پوری سورۃ سمٹا کے رکھ دیتا ہے۔ کہیے الحمدللہ کہ ہر باعثِ تہنیت و تدریس و تحسین جو کوئی تصوراتِ خیال و گمان میں ہیں' سب اس ذات کے لیے ہیں۔ اَلَّذِىْ اسے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی عصائے پیری بننے کے لیے بیٹا ہونا چاہیے' بوڑھا ہو جائے تو وہ کما کے کھلائے گا۔ اس نے عیسائیت کے باطل تصور کو کاٹ کے رکھ دیا۔ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (17:111)۔ یہ جو تم بتوں کو گھر کے شریک بنا لیتے ہو' یہ تو جہالت ہے۔

خدا کے اقتدار کو تسلیم کرنے کی عملی شکل

عزیزانِ من! شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (17:111)۔ اصل شرک اقتدار کے اندر کسی اور کا شریک ہو جانا ہے' اقتدار میں غیرِ خداوندی کی شرکت ہے' یہ شرک ہے عزیزانِ من! وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (17:111)۔ صرف خدا کا اقتدار۔ یہ ہے وہ چیز جسے آپ اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ خدا کے اقتدار کے معنی ہیں کہ سارا کاروبار اس کی کتاب کے مطابق ہو' اس کے دیئے ہوئے ضابطہ آئین کے مطابق ہو۔ اس کے خلاف اس میں کوئی اور ملاوٹ نہیں' کوئی Compromise نہیں' کوئی بین بین کی سی صورتِ حال نہیں۔ سبحان اللہ! اس دور میں جو کسی کے جی میں آئے کہدے۔ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (17:111)۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا! اسلامی مملکت تو بڑا فائدہ دیتی ہے۔ یہ بڑی ڈھال ہوتی ہے۔

چھ جنوری 1947ء کو ہم کراچی میں تھے' جب لوٹ پڑی ہے۔ ہندو جاتے ہی نہیں تھے تو وہاں مہاجران ہندوؤں کو نکالنے کے لیے گئے تھے۔ ''او تھے اوناں نے کھبی تی سی اوناں نوں''۔[2] نکل کے بھاگے تھے اور جب فساد ہوتا ہے تو ہر طرف لوٹ مچ جاتی ہے۔

---

[1] گوالے کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی جتنا اس کا جی چاہے' وہ دودھ میں پانی ملاتا چلا جائے۔

[2] تو وہاں جوانہوں نے انہیں گھور کر دیکھا

وہاں صراف کی ایک بہت بڑی دوکان تھی۔ وہ ہندو کی تھی۔ اس کے باہر لکھا ہوا تھا: یہ اسلامی صراف کی دوکان ہے' اسے نہ توڑیئے''۔ ٹھیک ہے' اسلام بڑی ڈھال ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (17:111)۔ خدا کا جو منزہ تصور قرآن پیش کرتا ہے' وہی خدا کا حقیقی تصور ہے۔ اس کی رو سے یہ غلط ہے کہ اس کے اقتدار واختیار میں کوئی اس کا شریک ہے۔ عزیزانِ من! بحث نہ لفظوں کی ہے' نہ کسی سے مناظرے کی ہے' جو الملک ہے' جو اقتدار ہے' اگر اس میں Sovereignty خدا کے احکام واقتدار وحدود کے ساتھ کسی انسان' کسی دوسری مملکت' کسی دوسرے تصور کی' آپ نے شرکت کر دی تو یہ خدا کے ساتھ شرک ہوگیا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ (17:111)۔ کیا کہتے ہو کہ اسے اپنی کمزوری کی وجہ سے' کسی مددگار کی ضرورت ہے؟ قطعاً نہیں۔ یہ تو اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ فلاں بات میں سقم رہ گیا ہے' ادھر سے پورا نہیں ہوسکتا' فلاں بات میں کچھ کمزوری ہے' وہ اُدھر سے پوری کر دی جائے۔ یعنی ہمارے ہاں جو دین ہے وہ تو ٹھیک ہے' اسلام ہے۔ لیکن اب اس کے اندر جو کچھ کمزوری آ گئی ہے' اسے اِدھر اُدھر سے ٹھیک کر دیا جائے۔ اس کے اندر معیشت کیا ہوگی؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ سوشلزم ہوگی۔ مِّنَ الذُّلِّ (17:111)۔ یہ کہ کمزور رہ گیا ہے' اتنا ناقص رہ گیا ہے۔ اس کے جواب میں کہا: کاہے کے لیے یہ کچھ کر رہے ہو؟ اس کی کوئی کمزوری نہیں ہے' اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ خدا بلا شریک وسہیم [1] تمام قوتوں کا واحد مالک ہے۔

المتکبر کا قرآنی مفہوم

تمہارا فریضہ تو صرف وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) ہے۔ دو لفظ ہیں۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا تکبیر یا کبرہ یا کبر کے لفظ سے والمتکبر بنا ہے۔ قرآن نے خدا کو المتکبر کہا ہے۔ یوں تو اردو میں اس کا ترجمہ متکبر کرتے ہیں جبکہ کسی فرد کے متعلق کہا جائے کہ وہ تو بڑا متکبر ہے تو ہمارے ہاں متکبر کا لفظ رعونت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں المتکبر ایسا نہیں ہے۔ کیا بات ہے یہ! کبریائی صرف اس کے لیے ہے۔

Sovereignty belongs to Him alone

خدا تو بغیر سہیم وشریک' تمام قوتوں کا مالک ہے۔ اس کا نظام قائم کر کے انسان نے تو اسے دیگر تمام نظام ہائے حیات اور قوانین زندگی پر غالب کرنا ہے۔

خارجی کائنات میں حکمرانی خدا کی اور انسانی دنیا میں یعنی ارض پر انسان کی کیوں؟

برادرانِ عزیز! میں اس تکبیر یا کبرہ یا کبر یا المتکبر کا کیا ترجمہ کروں۔ ''ک ب ر'' اس کا مادہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہے: ''وہ بلند ترین مقام جس میں کوئی دوسرا شریک ہی نہ ہو''۔ اور پھر اس میں ''ملک'' پہلے کہا ہے کہ بات ملک کی ہے۔ یاد رکھو کہ خارجی کائنات

---

[1] حصے دار' شریک

Marfat.com

میں مملکت خدا کی ہے جبکہ ہمارے ہاں کی کائنات یعنی انسانی دنیا میں مملکت ہماری ہے۔ یہ تو تقسیم ہے ناحق، اور بٹوارہ ہے باطل۔ مثلاً دو بھائیوں نے آپس میں جائیداد بانٹی تھی۔ منتظم نے کہا تھا کہ بانٹ دو۔ ٹھیک ہے، ہم بانٹ دیتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ ایک بھائی نے دوسرے بانٹنے والے کو کہا کہ یہ ایک تحفہ ہے۔ یہ باپ چھوڑ گیا ہے، تقسیم کر لیتے ہیں: صحنِ خانہ سے چھت تک کا یہ اتنا سا حصہ میرا ہو گیا۔ اب بامِ خانہ تا ثریا، چھت سے لے کے آسمان تک، تیری جائیداد ہے۔ ''توں کی یاد کرے گا کہ وڈے بھائی نے کوئی تقسیم کیتی ہیگی سی ساڈی، کوئی گل نئیں اسی اینیں اچ ای گذارہ کرلاں گے، جا موج لے''❶ پہلا Sentence آپ کے ہاں Constitution آئین میں یہی آیا تھا جس کی میں نے مخالفت کی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ساری کائنات کے اندر اقتدارِ خداوندی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے ''چھت توں لے کے آسمان تکر اے ایہدا، تے کوٹھا، تے کوٹھے دا صحن تہاڈے مولا بخش دا''❷ صاحب! میں نے کہا: ذرا نیچے اتریئے۔ بات اس کوٹھے کے تقسیم کی تھی۔ یہ بتایئے کہ یہ کوٹھا کس کا ہے؟ یہی تو مشکل آ جاتی ہے۔ ''او تو کوٹھے اچ دو کرائے دار برداشت ای نہیں کردا''❸۔ جب تک کعبے سے بت باہر نہیں نکلتے، اس میں خدا داخل نہیں ہو سکتا۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ یہ ہے اصل الاصل! کیا الفاظ ہیں!! تمہارا قول اب یہ ہے جو مانتے ہو کہ ''لا شریک لہٗ فی الملک'' کہ اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اب تمہارا کام وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ ہے یہ از خود نہیں ہوگا۔ یاد رکھو، تمہیں اب اس Sovereignty کو اس دنیا کے اندر متمکن کرنا ہوگا۔ تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ کبرہ کا حکم ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ وہی ایک ایسا ہے جس کی کبریائی کائنات میں ہے۔ اسی کی کبریائی ارض کے اندر بھی قائم کرنی ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ اس کو بڑا بنا ؤ جو حق ہے بڑے بنانے کا۔ اگر اس کے لیے بڑا ہی لفظ لانا ہے تو اس کا اقتدار قائم کرو جو اقتدار قائم کرنے کا حق ہے۔ كَبِّرْهُ تَكْبِيرًا آپ سورۃ مدثر میں دیکھیے۔

لفظ مدثر کا قرآنی مفہوم، انسانیت کے پژمردہ درخت کو بہارِ نو سے آراستہ کرنے والی شخصیت

میں دو چار منٹ اور لے لونگا۔ کبرہ تکبیرا کی بات بڑی اہم آ گئی۔ عزیزانِ من! يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمُدَّثِّرُ . قُمْ (74:1-2)۔ ہمارے ہاں وہی ترجمے ہیں کہ ''اے کملی والے! اٹھ''۔ کیا کہتے ہیں کہ جوگی اٹھ! اب قرآن لفظ ''مدثر'' کہاں لے آیا؟ کہا: اے مدثر! اٹھ۔ سوال یہ ہے کہ ''دثر'' کسے کہتے ہیں؟ عزیزانِ من! یوں سمجھو کہ جب درخت تو ہو، مگر اس پہ پوری طرح خزاں آ چکی ہو، اس کے اندر زندگی کے کوئی آثار باقی نہ رہے ہوں۔ اس کا از سرِ نو نئے برگ و بار لانا، اس کے اوپر نئی بہار آنا، اس میں نئی کونپلیں نکلنا، اس تمام عمل

---

❶ کیا یاد کرو گے کہ بڑے بھائی نے کوئی تقسیم کی تھی! کوئی بات نہیں، ہم اسی میں گزارہ کر لیں گے۔ جاؤ عیش کرو۔

❷ کوٹھے کی چھت سے لے کر آسمان تک تو اس کا ہے، مگر کوٹھا اور اس کوٹھے کا صحن تمہارا!

❸ وہ تو کوٹھے میں دو کرایے داروں کو برداشت ہی نہیں کرتا۔

Marfat.com

(Process) کو "تدثیر" کہتے ہیں۔ جو ایسا کر کے دکھائے اسے "مدثر" کہتے ہیں۔ "ہاں! ایسے وہ جو شجرِ کائنات 'شجرِ انسانیت' کی خزاں کو پھر سے بہار میں بدلنے کے لیے تمہیں ہم نے بھیجا ہے! اٹھ۔ انسانیت کے اوپر خزاں طاری ہوگئی ہے۔ کہیں کوئی پتی سرسبز نظر نہیں آتی' اٹھ اور اس شاخِ خزاں دیدہ کو پھر سے بہار بنا۔ تیرا فریضہ یہ ہے۔ ابھی اس درختِ انسانیت میں صلاحیت ہے۔ اس درخت کے اندر بہار آسکتی ہے' از خود نہیں آسکتی۔ یہ کچھ کرنے کے لیے اٹھ"۔

جنگلوں میں اُگنے والے درختوں کی خزاں کو تو اے خدا! تُو اپنے کائناتی اقتدار کی بناء پہ خود بدل دیتا ہے۔ انسانیت کے درخت کے اوپر جب خزاں آجاتی ہے' تو اس کے لیے کسی کو اٹھنے کی ضرورت ہوتی ہے عزیزانِ من! قُمۡ فَاَنۡذِرۡ (74:2)۔ ان کو کہو: بتاؤ' اگر اس کی جڑ کے اندر ذرا سا کیڑا لگ جائے' تو کتنی تباہیوں کے اندر آجاؤ۔ یہ درخت ایندھن بن جائے گا۔ اس کی لکڑی جل جائے گی۔ تمہارا یہ درخت تباہ ہو جائے گا۔ ابھی اس میں زندگی کی نمود کی صلاحیتیں باقی ہیں۔ فَاَنۡذِرۡ (74:2)۔ ان کو آگاہ کرو۔ کہو کہ ادھر دیکھو' یہ درخت جل رہا ہے' ختم ہو رہا ہے۔ اب کیا کرو؟ کہا کہ وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ (74:3)۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے اس نظام کو قائم کر کے دکھاؤ۔ یہاں لفظ "اٹھ" کے لیے قرآن "قم" لایا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ (74:3)۔ کو ادھر سے پڑھیے تب بھی "ربک فکبر" آتا ہے' اُدھر سے' الٹی طرف سے پڑھیئے' تب بھی ربک فکبر آتا ہے۔ گو کہ یہ ایک لطیف سی بات ہے' بس یونہی ایک بات ہے جو ذہن میں آئی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے۔ فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ (2:152)۔ تم میرے ذکر کو بلند کرو' میں تمہارے ذکر کو بلند کرونگا۔ تم میری تکبیر کا انتظام کرو' میں تمہاری کبریائی کا انتظام کرونگا: وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ (74:3)۔ اور پھر اگلی آیت آئے گی تو ان کے معنی بتاؤں گا۔ وہ آیت ہے: وَثِیَابَکَ فَطَهِّرۡ (74:4)۔ اس کے لیے ترجمہ کیا ہے: "اپنے کپڑے دھو کے پایا کر' اجلے" [1]۔ عزیزانِ من! اپنے آپ کو رَبَّکَ فَکَبِّرۡ (74:3)۔ تک رکھیے' ذہن کو دوسری طرف نہ جانے دیجیے۔ یہ "ربک فکبر" کیا ہے؟ رسول کو کاہے کے لیے بھیجا تھا: جسے کہا تھا کہ اٹھ اور رَبَّکَ فَکَبِّرۡ (74:3)۔ خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ (Sovereignty) کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی (2:152)۔ یہ ہے وہ کام' جو تم نے کرنا ہے۔ اس لیے اٹھ۔" کاہے کے لیے بھیجا تھا؟ یہ تھا وہ منصبِ جلیل جسے حاصل کرنے کے لیے آپ ﷺ کو بھیجا تھا۔

نظامِ خداوندی دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (9:33)۔

یہاں اس نے "شرک" کہا تھا۔ تمہیں اس لیے بھیجا ہے تا کہ یہ نظامِ خداوندی دنیا کے ہر نظام کے اوپر غالب آجائے' اس لیے تمہیں بھیجا

---

[1] یہاں اپنے کپڑے دھو کر پہنا کرو۔

ہے' خواہ شرک برتنے والوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ خدا کو جو کام کرنا تھا' رسول کو بھیجا ہی اسی لیے تھا۔ جو عزیزانِ من!۔ خدا کی کبریائی (Sovereignty) کو قائم کرنے کے لیے رسول کو بھیجا تھا۔ 9:33 آیت جو میں نے ابھی پڑھی ہے' وہ یہی ہے کہ "یہ دین تمام ادیان پہ غالب آ جائے"۔ ایک جگہ اور بھی خدا نے قرآن میں اس کبریائی کی' جسے ہم! اللہ اکبر کہتے ہیں' بڑی وضاحت کی ہے۔ آپ دیگر مقامات پر بھی دیکھیے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہاں' (40:12) میں قرآن نے کہا کہ یہ کبریائی (Sovereignty) یہ ہے۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12)۔ کہ حکومت صرف اس کی ہو' جو علی مرتبت ہے' ہر قسم کی کبریائی کا مالک ہے۔ اَلْحُكْمُ یہ اس کی تکبیر ہے۔ اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ (40:12)۔ حکومت اس کی قائم ہونی چاہیے۔ ایک اور آیت ہے (45:36) فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (45:36)۔ یہ کاہش وکاوش' یہ تگ ودو' یہ جہدِ مسلسل' یہ سعی وعمل کا ہے کے لیے ہے؟ توڑنے کے لیے نہیں' پرورش کرنے کے لیے ہے۔ یہاں "رب" کا تین دفعہ لفظ دہرایا ہے: رب السمٰوٰت' رب الارض' رب العالمین۔ یہ کس مقصد کے لیے ہے؟ ربوبیت عالمینی کے لیے ہے۔ اس کے لیے کیا کرنا ہے؟ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (45:37)۔ اس کی کبریائی (Sovereignty) خارجی کائنات میں ہی نہیں' والارض میں بھی ہو۔ یہ کبریائی تمہاری اپنی تمدنی زندگی کے لیے بھی ظاہر (Manifest) ہو وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (45:37)۔ یہ کبریائی قائم کرنے کا (Establish) کرنے کا سوال ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (45:37)۔ بتادو کہ جس طرح کائنات میں اس کا اقتدار ہے' وہ اتنے غلبے کا مالک ہے' استبداد کا نہیں ہے بلکہ حکیم ہے' Rationally سب کچھ کرنے والا ہے' اسی طرح ارض کے اندر بھی اس کی کبریائی آئے۔ یہ توحید ہے۔

مذہب کی دنیا میں تکبیر اور کبریائی کی عظمت مسئلے مسائل کی نذر ہوگئی

عزیزانِ من! یہ تھا اس چیز کا مقصد' جسے آپ اللہ اکبر کہتے ہیں۔ دین جب مذہب میں بدل جاتا ہے تو پھر آپ کو معلوم ہے کہ جو وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) کا حکم تھا' اس کی تفسیریں پڑھی جاتی ہیں۔ "کبرہ تکبیرا" مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ قرآن تو مسئلے مسائل کی کتاب بن گئی ہے۔ مثلاً پہلی تکبیر تحریمہ نماز میں اس طرح سے ہے۔ اس تکبیر کے ساتھ جماعت میں شامل ہو' اگر جماعت میں شامل ہو سکے تو پھر تکبیر کے وقت ہاتھ یہاں تک لے جانا۔ اگلا مسئلہ یہ ہوا کہ رکوع میں جاتے ہوئے تکبیر کہنی چاہیے یا نہیں کہنی چاہیے۔ یہ مسئلہ بن گیا۔ تکبیر' نماز سے پہلے اتنی دفعہ' اور اذان میں اتنی دفعہ ہونی چاہیے اور جب صف کھڑی ہوتی ہے تو اس وقت اتنی دفعہ چاہیے۔ سجدے میں اتنی دفعہ کہنی چاہیے۔ یہ تکبیر تھا کبرہ تکبیرا۔ پھر آپ کے ہاں مذہب میں اس تکبیر کا مطلب یہ ہوگیا کہ تُو اس تکبیریں کہا کر جیسا تکبیریں کہنے کا حق ہے۔ پھر تکبیر کہنے کا حق کیسے ادا ہو؟ ہزار برس سے آپ کے ہاں یہ تکبیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا' سارے اختلافات تکبیر کہنے پہ ہیں۔ اب آگے چلیے جناب! یہ تو ہمارے دور کے فقہی مسائل چلے آ رہے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے بار وہ ذکر کرنا پڑتا ہے' ورنہ یہ لوگ قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ہے کہ نہیں صاحب! وہ جو اللہ اکبر کہا جاتا ہے' بہت بڑی غل

Marfat.com

ہے۔ یہ بہت بڑا شرک ہے' جو چلا آتا ہے۔ اللہ اکبر نہیں کہنا چاہیے۔ بھئی! پھر کیا ہو؟ جی! اس کو کبیر کہنا چاہیے' اچھا جی۔ یہ فرقہ اہل قرآن والے آئے۔ یعنی اکبر کہنے سے اس کی کبریائی قائم نہیں ہوتی' کبیر کہہ لیجیے' کبریائی قائم ہو جائے گی۔ کبریائی کا تصور نہ وہاں ہے۔ نہ یہاں ہے۔ عزیزانِ من! یہاں تو مصیبت ہی یہ آ گئی کہ قرآن کا نام لے کے وہ انہی مسئلہ مسائل کے اوپر ہی ٹک گئے کہ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) کا مطلب ہی یہی ہے کہ تکبیر کیسے کہنی چاہیے۔ جو اللہ اکبر کہتا ہے۔ جی! یہ شرک ہے۔ اللہ کبیر کہنا چاہیے صاحب! عزیزانِ من! یہ تو کچھ کہنے کی بات نہیں تھی۔ یہ تو کچھ کرنے کی بات تھی۔

وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111)۔ کہا: اس کے اقتدار کو قائم کرو۔ كَبِّرْهُ یہ Sovereignty ہے' جس پر کسی اور کا اقتدار نہ ہو۔ یہ ہے اکبر! کتنا بڑا انقلابی اعلان تھا عزیزانِ من! جو آپ کے ہاں' ساری دنیا میں بیک وقت کوٹھے پہ کھڑے ہو کے' جسے آپ کہتے ہیں میناروں پہ کھڑے ہو کے' آپ ساری دنیا میں کہتے ہیں: اللہ اکبر اقتدار اور وہ بھی اس انداز سے جیسے کہ آپ انگریزی میں کہتے ہیں:

Soverignty belongs to Him and Him alone

کوئی اور اس اقتدار میں شریک نہیں ہے۔ ہم اسے یوں نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں اتنی بار دہرانا بھی واقعی اس کے اندر ایک حقیقت ہے۔ بار بار دہراؤ۔ دنیا سے کہو کہ ہم کسی کے اقتدار کو نہیں مانتے۔ وہ کہنے والی قوم تھی اور اس کے بعد اب یہ مسئلہ بن کر رہ گیا کہ پھر یہ تکبیریں کیسے کہی جائیں گی؟ آپ نے غور فرمایا کہ دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو کیا بن کے رہ جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس اطاعت ثواب کا اثر کیا ہوگا؟ کچھ نہیں ہوگا۔ امام مصائب نظری میں الجھ گیا ہے۔ یہ سارے مسائل میں الجھ گئے ہیں۔ یہ مذہب ہے۔ دین میں تو اس کا سوال ہی نہیں عزیزانِ من! اس مذہب کے اندر چار رکعتیں ہیں یا دو رکعتیں ہیں' اکبر کہنا چاہیے یا کبیر کہنا چاہیے' سب کا مفہوم اتنا ہی ہے کہ جو مذہب کا فریضہ ہے وہ پورا ہو جائے۔ دین وہ ہے کہ تکبیر اسی کی تکبیر ہے' عزیزانِ من! جو خدا کے اقتدار کو عملاً ثابت کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کرتا ہے۔ یہ ہوگا۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111)۔

سورۃ بنی اسرائیل آج ختم ہوگئی' آئندہ اتوار کو سورۃ الکہف لیں گے' جو اٹھارہویں سورۃ ہے اور اس کی چند ایک آیات کے اندر میں سمجھتا ہوں کہ یہ پندرہواں پارہ بھی ختم ہوتا ہے۔ اس طرح اس سورۃ کی 74 آیات تک آدھا قرآن' جسے ہم نصفِ قرآن کہتے ہیں' کے دروس پورے ہو جائیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

Marfat.com

میرا فہمِ قرآن حرفِ آخر نہیں

اس حقیقت کا دُہرا دینا ضروری ہے کہ میں قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہوتی ہے جو نہ سہو وخطا سے منزہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں' میں نے اسی لئے صرف قرآنی آیات کو پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان آیات کے مفہوم سے استنباطِ نتائج کیا ہے اگر آپ کو ان نتائج سے اتفاق نہ ہو تو آپ انہیں نظر انداز کر دیں اور قرآنی آیات پر غور و تدبر کے بعد' خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ میرا مقصد اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق' رہ نوردانِ جادہ قرآنی کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا ہے تا کہ وہ بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ میں ان کا رفیقِ سفر بنا چاہتا ہوں' خضرِ راہ نہیں اور میرے لئے یہی سعادت بہت ہے۔

(پرویز۔ قرآنی قوانین)

Marfat.com

کتابیات

سورۃ بنی اسرائیل کے اشاعتی مراحل میں جن کتب کو پیش نظر رکھا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ پرویز: لغات القرآن (جلد اول' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۰

۲۔ پرویز: لغات القرآن (جلد دوم' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۰

۳۔ انوار ہاشمی: تہذیب کی کہانی (نیا ایڈیشن)' کراچی بک سنٹر کراچی' ۱۹۷۹

۴۔ بستانی پطرس: محیط المحیط' بیروت ۱۸۷۰

۵۔ پرویز: لغات القرآن (جلد سوم' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۱

۶۔ پرویز: لغات القرآن (جلد چہارم' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۱

۷۔ پرویز: سلیم کے نام خطوط (چوتھا ایڈیشن)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' ۱۹۶۶

۸۔ پرویز: شاہکار رسالت...... حضرت عمر فاروق...... (ایڈیشن چہارم) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' ۱۹۸۷

۹۔ پرویز: برقِ طور (ایڈیشن چہارم)' ادارہ طلوع اسلام لاہور' ۱۹۹۳

۱۰۔ پرویز: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں (پانچواں ایڈیشن)' طلوع اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ)' لاہور' ۱۹۹۶

۱۱۔ پرویز: شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' ۱۹۹۶

۱۲۔ پرویز: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل (ایڈیشن اول)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' ۲۰۰۳

۱۳۔ ڈاکٹر عبدالسلام' ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی' شاہد عشقی' خالد وہات' ساقی جاوید' اور محمد ناظم خان ماتلوی' گلزار اردو (حصہ دوم) سندھ ٹیکسٹ بورڈ' جام شورو' 1995

۱۴۔ ڈاکٹر محمد اقبال ضرب کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' ۱۹۹۶

۱۵۔ ڈاکٹر محمد اقبال: ارمغانِ حجاز اردو' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' ۱۹۹۶

۱۶۔ ڈاکٹر محمد اقبال: بال جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' ۱۹۹۶

۱۷۔ ڈاکٹر محمد اقبال: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' ۱۹۹۶

Marfat.com

۱۸۔ رامپوری آ سی ضیائی، ایم ایس طاہر شادانی اور حفیظ الرحمٰن احسن، تحسین اردو، ایوانِ ادب، لاہور، ۱۹۹۲

۱۹۔ روزنامہ جسارت، کراچی، مجریہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ (خصوصی اشاعت)

۲۰۔ فیروز اللغات اردو جدید (نیا ایڈیشن)، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۲۱۔ علامہ تمنا عمادی و دیگر علمائے کرام: امام زہری (حدیث سیرت کے مدون اول) و امام طبری (تفسیر و تاریخ کے مدون اول) تصویر کا دوسرا رخ، الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، کراچی

۲۲۔ علامہ محمد اسلم جیراجپوری: مجلّہ طلوع اسلام اگست ۱۹۶۸

۲۳۔ مرزا اسد اللہ خان غالب: دیوان غالب، جہانگیر بک ڈپو، لاہور ۲۰۰۲

BIBLIOGRAPHY

English Section

24 Dorland's Pocket Medical Dictionary (24th edition), Oxford & IHB Publishing Co., Pvt., Ltd., New Delhi, 1987.

25 Manzoor-ul-Haque, Dr.: The Quran's Concept of Self Integration; The Motive-Valence for Learning, Slamming new Intrusions and old Obsessions, Islamic University: Quarterly Academic Journal, ICIS, London, Vol I, No. 3, 1994, pp 7-24.

26 Reader's Digest Universal Dictionary, Reader's Digest Association Limited, London, 1990.

Marfat.com

مطالب الفرقان

فی

دروس القرآن

قرآن مجید کی تفسیر [illegible]

سورۃ بنی اسرائیل

پرویز

زیرنگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، لاہور

Marfat.com